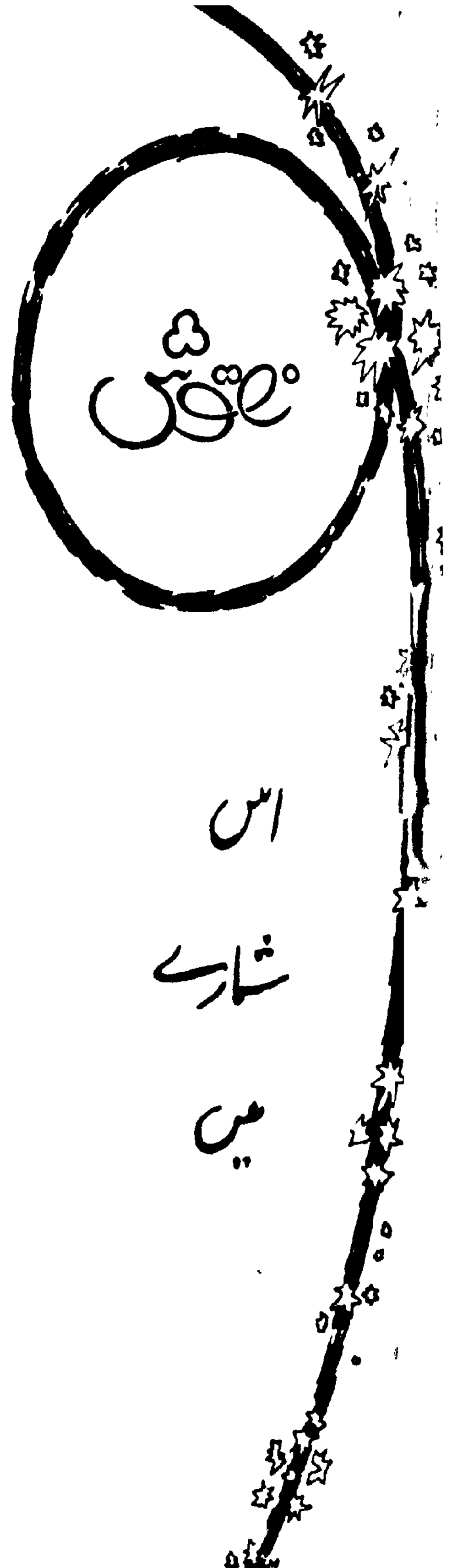


پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی —— ضرورت تھی کہ تھوڑا سا میں بھی آرام کر لیتا ۔ یہی سوچ کر خوبصورت وادیوں کی طرف نکل گیا تھا ۔

اس مرتبہ اُن تمام عنوانوں کے ماتحت مضامین پیش کئے جا رہے ہیں ۔ جن کا وعدہ سابقہ شمارے میں کیا گیا تھا ۔ نئے عنوان تھے گمشدہ مضامین —— حالات حاضر —— اور تصویریں —— ممکن ہے آپ اب کے بھی تصویریں نامی مضمونچے کو ڈھونڈیں اور وہ نہ ملے ۔ کیونکہ اس کی جگہ ایک اسکیچ (اختر اورینوی) پیش کیا جا رہا ہے ۔ ہرچند کہ دونوں مضمونوں کی حدود قدرے مختلف ہیں ۔ مگر ہیں یہ دونوں ایک ہی خاندان کے —— البتہ اس مرتبہ ایک اور نئے عنوان کے ماتحت ''کھلے خط'' چھاپے جا رہے ہیں ۔ کبھی کبھی مدیر کے نام بھی کام کے خط آ جاتے ہیں ۔ مگر وہ ذاتی چیز سمجھ کے ایک طرف ڈال دیئے جاتے ہیں ۔ اب کے راز یزدانی مرحوم کا ایک پرانا مگر تحقیقی نوعیت کا خط سامنے آ گیا تو میں نے اسے ایک اور خط کے ساتھ پیش کر دینا مناسب جانا ۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے ۔

جن ادیبوں نے ہمیں نیا انداز فکر دیا ۔ اُن میں ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ بھی ہے ۔ آپ کو علم ہی ہوگا کہ میں بڑے ادیبوں کے مرنے پر یقین نہیں رکھتا ۔ اگر کسی ادیب کی تحریریں زندہ ہیں تو وہ خود زندہ ہے ۔ اگر یوں نہ ہوتا تو آج ہم ایلیٹ کے انتقال کے بعد' ان کی تحریروں کو نہ ڈھونڈھتے —— اس شمارہ میں ان کے ایک مضمون اور ایک نظم کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں ۔

نصیرالدین ہاشمی کا بھی ایک غیر مطبوعہ مضمون ''اہل نوایط کی ادبی خدمات'' پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ مضمون وہ ہے ۔ جسے ہاشمی صاحب نے مرحمت فرماتے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط جلد ہی حیدرآباد جا کر بھجوادوں گا ۔ یہی وجہ ہے کہ مضمون کے آخر میں لکھا ہے ۔ ''باقی آئندہ'' —— میں مرحوم نصیرالدین ہاشمی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریں ۔

ممتاز مفتی نے اب کے اپنے ایک نمائندہ افسانے ''آپا'' کا تجزیہ خود کیا ہے ۔ یہ سلسلہ بھی بڑا اہم ثابت ہو سکتا ہے ۔ ہم کوشش کریں گے کہ بڑے ادیبوں سے، ان کی نمائندہ تخلیق کے محرکات پر بھی لکھوائیں ۔

شوکت تھانوی کی ایک اہم تخلیق ''نسیم منزل'' کو بھی قسط وار پیش کرنے کا ارادہ ہے ۔ پہلی قسط حاضر ہے ۔ آئندہ بھی ہم اس سلسلے کو قائم رکھیں گے تاکہ ادارہ نقوش آپ کو یاد دلاتا رہے کہ شوکت تھانوی اُردو کے صاحب طرز ادیب تھے ۔ یوں اس لئے کر رہے ہیں کہ ہم اپنے محسنوں کو جلد ہی بھول جانے کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں ۔

بعض تخلیقات بر وقت نہ ملنے کی وجہ سے' صحیح جگہ پر نہیں آسکیں ۔ یہ مجبوری تھی —— ہر چند کہ کوئی بھی کسی کی مجبوری کو معاف نہیں کرتا ۔ مگر میں آپ سے درگزر کی درخواست تو کر سکتا ہوں ۔

''مدیر نقوش''

• بابائے اُردو مولوی عبدالحق مجھے نقوش کہا کرتے تھے ۔ سوچتا ہوں ان کی یاد میں ... کبھی اس نام

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمایندہ

جسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۱۲

ٹیلیفون ۳۵۲۵
رہائشی ۶۴۸۹۸

نقوش



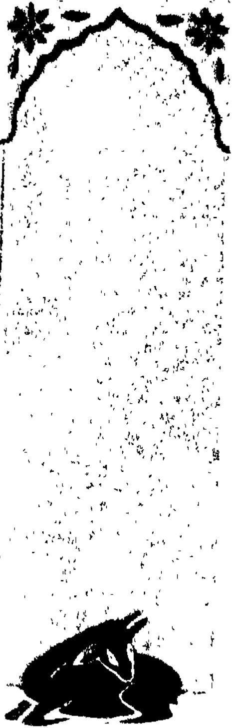
[illegible]

قیمت موجودہ پرچہ
۵/۵۰ روپے

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
بیرون ملک ۲۵ روپے

مدیر
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو ۞ لاہور



ترتیب

افسانے، طنزیے، خاکے

حالاتِ حاضرہ

فلمی خط

[illegible]

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے ک[illegible]
ایک ننھا سا دیا جلا دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ [illegible]
[illegible] نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں ادیب نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں رسالے نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چا[illegible]
کہ [illegible] ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا: زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے ج[illegible]

جو کچھ کرنا ہے!

مطلب؟

[illegible] ارمان ہو تو رات ہی جلد پورا کر لیجیے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو [illegible]

اُسے جلد سے جلد پورا کریں

پھر میں نے اپنے سارے ارمانوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔
چند ارمان ایسے تھے۔ جن میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان
ایسے تھے جن میں [illegible] دل کو بھلے [illegible] چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی د[illegible]
تعلق رکھتے تھے۔

اپنے ارمانوں کو جب دل و دماغ کے ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظ[illegible]
کبھی کوئی

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک
بے خبر تھا۔ یادوں نے ایک ساتھ چٹکی لی تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس مینا بازار میں ا[illegible]
خواہش [illegible] دوسری پر فوقیت دینا مشکل ہو گیا۔

میں نے سوچا زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو [illegible]
نہیں سکتا [illegible] وہ میری ساتھی ہیں۔ دونوں جہان کی ساتھی!

میری سوچیں ابھی مجھے چٹکی ہی دے رہی تھیں کہ قدرت نے ایک ایک کر دیے ج[illegible]

اور میرا سینہ تن گیا!

اور پھر — موت کو ایک ناآسودہ سی آرزو نے شکست دے دی!



محمد طفیل



سنتهالى

عمل : زين العابدين

طلوع

جب سے میں نے یہ پڑھا ہے کہ تاریکیوں کے خلاف واویلا مچانے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا دیا جلا دیا جائے۔ اُس وقت سے میرا سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ میں اب یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں ادیب نے کچھ نہیں کیا۔ فلاں سیاسی نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ اپنے طور پر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے۔ ادب کی راہوں میں چھوٹے چھوٹے دیے جلا دوں۔

میرے ایک دوست نے کہا: زندگی کسی کو مہلت نہیں دیتی۔ اس لیے جلد سے جلد سب پوری کر ڈالیں!

مثلاً؟

شادی کا ارمان ہو تو اسے بھی جلد پورا کر لیجئے۔ اچھے کاموں کی خواہش ہو تو انہیں بھی جلد سے جلد پورا کریں۔

تب میں نے اپنے سارے ارمانوں پر نظر ڈالی۔ جو ابھی ناآسودہ تھے۔

چند ارمان ایسے تھے جن میں ذہن کی تسکین کے سامان نظر آئے۔ چند ارمان ایسے تھے جن میں دل کی سوالی کر لینے والے۔ چند ارمان ایسے بھی تھے۔ جو محض خواب و خیال کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

اپنے ارمانوں کو جب دل و دماغ کے ترازو میں تولا تو کبھی کوئی پلڑا جھکتا ہوا نظر آیا کبھی کوئی۔

میرے ذہن کے نہاں خانوں میں تو ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔ جس سے میں کسی حد تک بے خبر تھا۔ یادوں نے ایک ساتھ ہلّا بولا تو نشے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس مینا بازار میں ایک خواہش کو دوسری پر فوقیت دینا مشکل ہو گیا۔

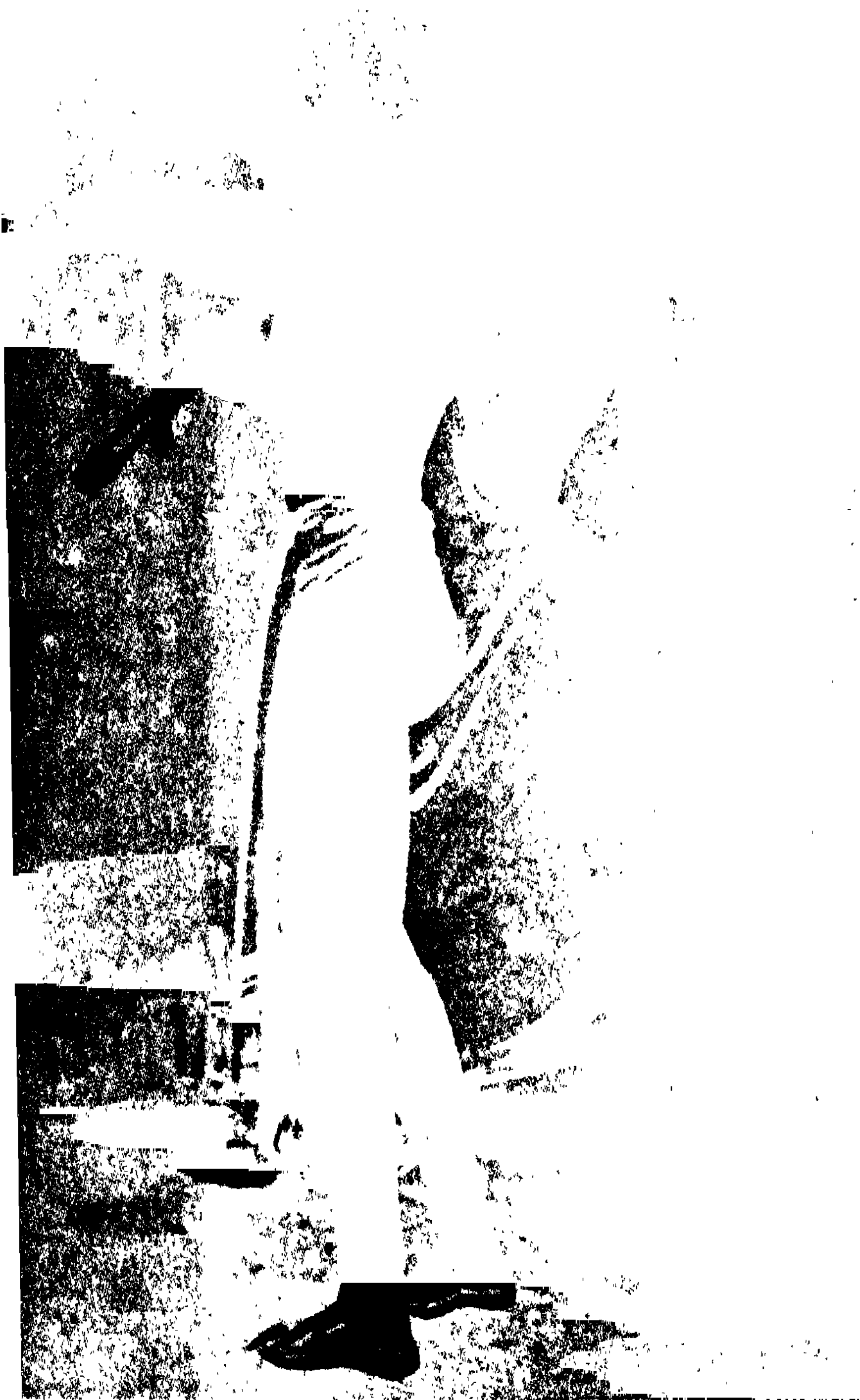
میں نے سوچا زندگی مہلت دے یا نہ دے۔ کوئی مجھ سے میری آرزوؤں کو تو چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ وہ میری ساتھی ہیں۔ دونوں جہان کی ساتھی!

یہی سوچ کر ابھی مجھے تسلی ہی ہوئی تھی۔ کہ میں نے دیکھا کہ حدِ نظر تک ایک ایک کر کے دیے جل اُٹھے اور میرا سینہ تن گیا!

اور ادھر حسرت کو ایک ناآسودہ سی آرزو نے شکست دے دی!

محمد طفیل





سنتهالى

عمل : زين العابدين

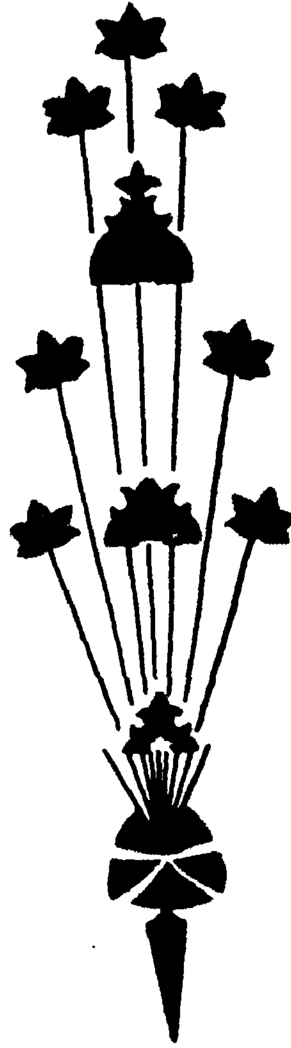
پیدائش [illegible] نومبر ۱۹۱۹ء

نیشنل کالج آف آرٹس سے فائن آرٹس کی سند حاصل کی۔ سپین، میکسیکو، جاپان اور ریاستہائے متحدہ میں کام کر چکے ہیں۔ کالج آف آرٹس اینڈ کرافٹس ڈھاکہ کے پرنسپل رہے ہیں۔ اور اس وقت پشاور یونیورسٹی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کے قائم مقام چیئرمین ہیں۔

یونیسکو اور دوسرے بین الاقوامی اداروں کے زیر اہتمام نمائشوں میں ان کی تصاویر نے خراج تحسین پایا۔ برطانیہ، فرانس، ترکی، جاپان، میکسیکو، ریاستہائے متحدہ اور روس میں ان کی یک شخصی نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔

ہلال امتیاز اور صدر کے انعام یافتہ ہیں۔





مقالے

شہر آشوب

سید مسعود حسن رضوی ادیب

میرا ایک مضمون 'شہر آشوب' کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی جرنل کے ۱۹۳۲ء کے سالنامے میں شایع ہوا۔ میں اُس مضمون میں وقتاً فوقتاً نئی معلومات کا اضافہ کرتا رہا۔ اس اثنا میں مکرمی ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک مبسوط تحقیقی مقالہ 'شہر آشوب کی تاریخ' کے عنوان سے لکھا جو اُن کے مجموعۂ مقالات 'بحث و نظر' میں شامل ہے۔ بہر حال میں اپنے مضمون میں اضافے کرتا رہا اور اب وہ مضمون تمام اضافوں کے ساتھ موجودہ صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ موضوع کی یکسانی کے باعث میرے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقالوں میں بعض مضامین کا اشتراک ناگزیر ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک مقالے میں ہیں اور دوسرے میں نہیں ہیں۔ اس لیے ان دونوں مقالوں کے مطالعے سے شہر آشوب کے بارے میں سب کچھ نہ سہی، بہت کچھ مزید معلوم ہو سکتا ہے۔

ادیب

شہر آشوب کا ابتدائی مفہوم اور اس کی وجہ تسمیہ

'شہر آشوب' ایک صنفِ نظم کا نام ہے' جو ابتدا میں ایسے قطعوں یا رباعیوں کا مجموعہ ہوتی تھی' جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لڑکوں کے حسن و جمال اور اُن کی دل کش اداؤں کا بیان ہوتا تھا۔ صرفی اعتبار سے لفظ 'شہر آشوب' یا مرکب اضافی ہے اضافت مقلوب کے ساتھ یعنی آشوبِ شہر، یا اسم فاعل ترکیبی ہے یعنی آشوبندۂ شہر۔ اس سے لغوی حیثیت سے شہر آشوب کے ایک معنی ہوئے شہر کے لیے فتنہ اور ہنگامہ، دوسرے معنی ہوئے شہر میں فتنے اور ہنگامے برپا کرنے والے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ حسین و جمیل لڑکوں کی ذات ہنگاموں کا باعث ہو سکتی تھی۔ یہی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ ہے۔ خواجہ حافظ اور ملا جامی کے مندرجۂ ذیل شعروں سے لفظ 'شہر آشوب' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے:۔

فغان کین لولیانِ شوخِ و شیرین کار و شہر آشوب
چنان بردند صبر از دل کہ ترکان خوانِ یغما را — حافظ

نہ تنہا خواہم این خوبانِ شہر آشوب را
کیست در شہر آنکہ خواہان نیست رُوے خوب را — جامی

اکبر اعظم کے عہد میں یوسف علی حسینی تو جانی نے سو رباعیوں کا ایک مجموعہ صفت الاصناف کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے دیباچے کی ابتدا اس رباعی در مدح خدا سے کی ہے جو حسب ذیل ہے :-

اے ماہ رُخ تو طالبان را مطلوب   یوسف بہ جمالت گمان چون یعقوب
چون حسن تو زد آتش شہر بجست   از حسن جمال تست در شہر آشوب

اس رباعی کے آخری دو مصرعے بھی 'شہر آشوب' کی وجہ تسمیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

شہر آشوب کا موضوع

حافظ محمود خان شیرانی نے 'شہر آشوب' کی تعریف یوں کی ہے: "اس قسم کی نظمیں جن میں پیشہ وروں کا تعلقات کی شکل میں ذکر ہو 'شہر آشوب' کہلاتی ہیں۔"* یہ تعریف ابتدائی شہر آشوبوں پر پورے طور پر صادق نہیں آتی۔ ان میں پیشہ وروں کا ذکر نہیں ہوتا بلکہ جیسا اوپر کہا جا چکا ہے 'پیشہ ور لڑکوں کے حسن و جمال اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعد کے بعض شہر آشوبوں کا موضوع بھی یہی ہے۔

شہر آشوب کی ہیئت اور موضوع میں تنوع

امتداد زمانہ کے ساتھ شہر آشوب کی ہیئت میں تنوع پیدا ہوتا گیا اور اس نے قطعوں اور رباعیوں کے علاوہ کبھی مختصر مثنویوں یا منفرد شعروں کے مجموعے کی شکل اختیار کی، کبھی قصیدے کی، کبھی مخمس کی اور کبھی مسدس کی۔ اس کے موضوع میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ اس میں کبھی شہر کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا بیان کبھی ہمدردی کے رنگ میں کبھی تضحیک اور ہجو کے انداز میں ہونے لگا۔ اور آخر کار شہر آشوب سے ایسی نظم مراد لی جانے لگی، جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بدحالی کا بیان ہو۔ اس طرح 'شہر آشوب' کی حسب ذیل تین قسمیں ہو گئیں :-

۱۔ ایسے قطعے، رباعیاں، مختصر مثنویاں یا منفرد شعروں کا مجموعہ جن میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن اور ان کی دل کش اداؤں کا ذکر ہو۔

۲۔ ایسی نظم جس میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر ہمدردی کے رنگ میں یا تضحیک و ہجو کے انداز میں کیا گیا ہو، خواہ قصیدے کی شکل میں، خواہ مثنوی، مخمس یا مسدس کی شکل میں۔

۳۔ ایسی نظم جس میں کسی شہر کی تباہی اور اہل شہر کی بدحالی کا بیان کیا گیا ہو، خواہ کسی شکل میں ہو۔

'شہر آشوب' کی ہیئت اور موضوع کی توضیح کے بعد اب فارسی اور اردو کے کچھ شہر آشوبوں کی کیفیت تاریخی ترتیب سے بیان کی جاتی ہے اور ان کے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس طرح 'شہر آشوب' کے تدریجی ارتقاء کا خاکہ سامنے آ جائے گا۔

شہر آشوب کا موجد

سب سے قدیم چیز جو 'شہر آشوب' کے نام سے ملتی ہے وہ مسعود سعد سلمان متوفی ۵۱۵ھ کے بانوے فارسی قطعوں کا مجموعہ ہے، جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔ اس لیے ہم اسی قدیم شاعر کو 'شہر آشوب' کا موجد کہہ سکتے ہیں۔ ان قطعوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جو یار اور دلبر کے لفظوں سے

کیے گئے ہیں۔ مثال کے لیے چند قطعے مع عنوانوں کے نقل کیے جاتے ہیں۔ ہر قطعے کا عنوان ایک مصرع ہے۔

صفت یار رنگریز گند

زچشم زرد کرد آن رخ رنگریز — کہ باوش سرد است و رخ آفتاب
بشستش پس از رنگ آب دو چشم — کہ شست آب ہجران آن ہر دو خواب
بلے ہر چہ رنگش کند رنگریز — از آن پس بشوید مرا در آب

در حق دلبر خباز بگفت

آنکہ او بر دکان ز بس خوبی — ہمچو خورشید بر سپہر آمد
شد قمر از تنور چون دل من — بار دوم رفت و بار دوم بر آمد

صفت یار کبوتر باز است

انس تو با کبوتر است ہمہ — سنگری از ہوس بجا کر خویش
ہم بساعت بر تو باز آید — ہر کبوتر کہ رانی از بر خویش
رفتن و آمدن نبرد رہی — چون بیاموزی از کبوتر خویش

صفت یار بربطی گفتہ

بتا زہرۂ آسمان جمالی — چو زہرہ بکن بر تو فرخندہ فالی
کنار تو خالی نہ باشد ز بربط — ز بربط نہ باشد بلے زہرہ خالی

اسی طرح بہت سے طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کا ذکر ہے، جن میں سے چند یہ ہیں۔ عنبر فروش، چاہ کن، رقاص، آہن گر، بردزہ فروش، کاتب، قصاب، طبیب، منجم، عطار، دیبا باف، شاعر، نجومی، چوگان باز، قلندر، لشکری، تیغ زن، کشتی گیر۔ بعض لڑکوں کا ذکر اُن کے اوصاف کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نوخط، خوش آواز، زرین کمر، خوش رو، حاجی، فلسفی۔ بعض لڑکوں کا ذکر ان کے عیوب کے ساتھ کیا ہے، مثلاً نابینا، گنگ، احول، رنگ زدہ، خط بر آوردہ، سیل چشم، گریان۔ یہ قطعے مختلف بحروں میں ہیں اور ان میں بیتوں کی تعداد دو سے نو تک ہے۔

اِن قطعوں میں جن یاروں یا دزدلبروں کا ذکر کیا گیا ہے، عالم خیال کے سوا خارجی دُنیا میں اُن کا وجود نہیں، اور تفنن طبع کے سوا ان قطعوں کی تصنیف کا کوئی مقصد نہیں۔ اس قسم کے تمام شہر آشوبوں کا یہی حال ہے۔

اسی طرح کا ایک شہر آشوب امیر خسرو متوفی ۷۲۵ھ کی طرف منسوب کیا گیا، مگر غالباً کسی بہت بعد کے شاعر کی تصنیف

ہے۔ یہ شہر آشوب مثنوی کی مختصر چھوٹی چھوٹی تصنیفوں کے ساتھ کتاب جواہر خسروی میں شامل کرکے شایع کر دیا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی ہے۔ یہ شہر آشوب ستر شعر رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر رباعی میں کسی لڑکے کے حسن اور اس کی اداؤں کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ لڑکے زیادہ تر پیشہ وروں کے ہیں، مثلاً بزاز پسر، حجام پسر، نجار پسر، زرگر پسر، بقال پسر، قصاب پسر، صراف پسر، حلاج پسر۔ لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو کسی پیشے سے نہیں، بلکہ کسی قوم یا فرقے سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہندو پسر، ترسا بچہ، ترک زادہ، پسر زاہد، افغان پسر۔

شہر آشوب کی ادبی حیثیت

شہر آشوب رباعیوں کی صورت میں ہو یا قطعوں کی، مختصر مثنویوں کی صورت میں ہو یا مفرد شعروں کی، شاعر اُن میں لفظی رعایتیں، ذومعنی لفظ اور فقرے اور اسی طرح کے دوسرے تکلفات کا استعمال اکثر اوقات کرتا ہے اور اپنے بیان کی بنیاد انھی چیزوں پر رکھتا ہے۔ اس لیے اُن کی حیثیت ادبی تفنن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ابتدا میں شہر آشوب کی تصنیف کا مقصد بھی تفنن طبع کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

رباعیات شہر آشوب منسوب بہ امیر خسرو

جو شہر آشوب امیر خسرو کی طرف منسوب ہے، اس کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

در صفت بزاز پسر

بزاز پسر که جامه اش جور و جفاست   با زلف سیاه تافته طرفه بلاست
مشتاق رخ بدین او مست ظلم و بیداد   گز آب نیاز راه او دیدهٔ ماست

در صفت حجام پسر

حجام پسر بخوبی و رعنائی   وی آینه بنمود بدان زیبائی
گفتم صنما در برت آیم نایم ؟   فریاد بر آورد که نائی نائی

در صفت رنگریز پسر

رنگریز بچه که دلم بیقرار اوست   کش رو به جلوه رنگ نمودن شعار اوست
شوخانه اشک چشم مرا آل کرده است   در شهر هر کجا رخ زردیست کار اوست

در صفت بقال پسر

بقال پسر که راحت جان آمد   یک گل ز رخش هزار بستان آمد

روئیش پس پچہ ترا زو می تاخت   گوئی کہ مگر ماہ بمیزان آمد

در صفتِ ترسا بچہ

اے بُت بسر مسیح گر ترسائی   باید کہ ببوسے بندہ بے ترس آئی
گر چشم ترم بہ آستین پاک کنی   گہ بر لب خشک من لب تر سائی

[ش]ہر آشوب کی غلط مثالیں امیر خسرو نے اپنے فارسی اشعار میں جو ہندی لفظ اور فقرے جا بجا داخل کر دیے ہیں، ان کی مثال میں حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اُردو میں یہ رُباعی [پ]یش کی ہے:

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے   از دست و زبانِ چرب او واویلے
خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تِل است   گفتا کہ بر و نیست درین تل تیلے

[اور] اس رُباعی کو از قسمِ شہر آشوب قرار دیا ہے لیکن صرف ایک رُباعی پر شہر آشوب کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ آگے چل کر فرماتے [ہیں] کہ اشعار ذیل بھی صنفِ شہر آشوب سے تعلق رکھتے ہیں:

رفتم بہ تماشا بہ کنارِ جوئے   دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مُوئے   فریاد بر آورد کہ دُر دُر موئے

[اس] رُباعی کو صنفِ شہر آشوب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں کسی پیشہ ور لڑکے کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک فقرہ 'دُر دُر موئے' [لا]یا گیا ہے جو ذو لسانین بھی ہے اور ذو معنین بھی۔ اس فقرے کو اگر فارسی سمجھیے تو ایک معنی نکلتے ہیں اور اگر ہندی سمجھیے تو دوسرے [مع]نی نکلتے ہیں۔[1]

---

۱ محمد عبدالباسط امیٹھوی (متوفی ۱۱۹۶ھ) نے اپنی کتاب منار الضوابط میں امیر خسرو کا اسی طرح کا ایک شعر لکھا ہے جو حسب [ذ]یل ہے:

گفتم کہ درین خانۂ مامون تو مانم   گفتا کہ درین خانہ بلا نیست ممانی

[ا]س شعر میں دو لفظ مامون اور ممانی ذو لسانین اور ذو معنین ہیں — باسط نے اسی مقام پر امیر خسرو کی ایک رُباعی بھی لکھی [ہ]ے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات   لالہ غلام روئے تو صد برگ زیر پات
ہر برہمن کہ دید رُخ خوب تو اے صنم   زنّار را گسست و لکد زد بروئے لات

[ا]س رُباعی میں نشان زدہ الفاظ پر ہندی ہونے کا دھوکا ہوتا ہے مگر وہ فارسی ہیں۔ بات یعنی باتو، 'لالہ' ایک مشہور و معروف پھول، 'پات' [یع]نی پائے تو، 'لات' ایک بُت کا نام — منار الضوابط کا ایک قدیم اور خوش خط لیکن ناقص نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ادیب

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب

اکبر کے عہد کی تصنیف صنعت الاصناف کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کی طرف توجہ فرمائی ۔ صنعت گروں کی صنعت ملاحظہ کی اور جس کسی کی صنعت دیکھی اس کے بارے میں ایک شعر کہہ دیا۔ چنانچہ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مطلع کہا:

دلبرِ چھیپی گر او در حسن بے ہمتا بود　　حرف ہائے چاپ او سرنوشت ما بود

اسی حال میں حکم ہوا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعروں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعر عرض کیے اور الطافِ خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور عنایت فرمائی لہٰذا یہ قطعہ نظم ہو گیا:

خسرو عادل سکندر ثانی　　شاہ اکبر شہ فلک مقدار
شعرا را لطف فرمودہ　　کہ فشانند گوہر اشعار
ہمہ رفتند و پیش کش کردند　　از وی انعام و لطف شہوار
بر ہمہ لطف فرمود و لے　　بر ہمہ اندک و بہ من بسیار
…　　… بہ پیش من ہمہ خار

… آخر میں … رسالہ ترتیب دیا اور صنعت الاصناف اس کا نام رکھا کہ خسروِ ملکِ سخن کی نظر میں شرفِ قبول حاصل کرے۔

یوسف جرجانی کا شہر آشوب مسمّیٰ بہ صنعت الاصناف

صنعت الاصناف میں کل سو[1] رباعیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

خدمت گزرے بے غش و دلخواہ است　　بادشاہ و گدا نفع رساں چون ماہ است
در عالم معنی شرفش بہ زر نعمت　　از نام جہان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اشعار سے رباعیوں میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف نام خود ہے جس پر شہر آشوب ختم ہوتا ہے۔ یہ ہے:

یوسف سخن از بتان بازار مگو　　تا کی … حکایت … مگو
در زاویہ نشیں کہ خاموشانند　　خاموش نشین بیہدہ بسیار مگو

یوسف جرجانی کی چند رباعیاں صنعت الاصناف سے نقل کی جاتی ہیں:

---

[1] صنعت الاصناف کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

در تعریف شاعر پسر

شاعر پسرے کہ چوں سخن شیریں است | در ملک سخن خسرو معنی بین است
ہم سرو قدش چو طبع او موزون است | ہم لعل لبش چو شعر او رنگین است

در تعریف آتشباز پسر

آتش بازے کہ آتش عشق افروخت | آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در معرکہ کہ آتش افشانی کرد | یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر کہ دل از وفاش نازد ما را | در بوتۂ ہجر می گدازد ما را
از لطف بدست ما دہد خاتم لعل | تا حلقۂ بگوش خویش سازد ما را

فارسی میں شہر آشوب کا وجود

گب ( ) نے اپنی کتاب "ترکی شاعری کی تاریخ" میں مسیحی متوفی ۱۰۱۹ھ کی ایک نظم "شہر انگیز" کا ذکر کیا ہے، جو اس نے شہر ادریانوپل کے متعلق لکھی تھی اور دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رد کرتے ہوئے تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک وحیدی قمی کی نظم تبریز پر اور دوسری حرفی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفۂ سامی میں ایسی دو نہیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آگہی خراسانی کا شہر آشوب

سلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۱ھ) ایک فاضل انشا پرداز اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرص دنیا بہت تھی۔ اس نے خسرو کے قصیدے "دریائے ابرار" کے جواب میں اہل ہرات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

عرصۂ شہر ہری رشک بہشت از زاست | در گہش را چشمۂ خورشید گل میخ زر است
جرم طین یک مشت خاک از خاک ریز خندقش | نرگس باغ جہاں آرائے او ہفت اختر است
پائے تخت صد ہزاران خسرو گیتی کشاست | کہنہ تاریخ بسے شاہان انجم لشکر است
چرخ کج رو بین کہ از تاثیر او شہر چنیں | مسکن جمع پریشان روزگار ابتر است

قصیدے میں رکیک الفاظ بہت آئے ہیں، جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواجہ معین کیال کے لیے کہے گئے ہیں ان میں اس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

اکبر بادشاہ اور شہر آشوب

اکبری عہد کی تصنیف صفت الاصناف کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں مصنف لکھتا ہے کہ ایک وقت بادشاہ نے کارخانۂ دولت کی طرف توجہ فرمائی۔ صنعت گروں کی صنعت ملاحظہ کی اور جس کسی کی صنعت دیکھی، اُس کے بارے میں ایک شعر کہہ دیا۔ چنانچہ چھیپی گر کی تعریف میں یہ مصرع کہا:

دلبر چھیپی گر او در حسن بے ہمتا بود   حرف ہائے چاپ او سرنوشت ما بود

اسی حال میں حکم ہوا کہ شعرا صنعت گروں اور پیشہ وروں کے حسن کی تعریف میں اشعار کہہ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔ شاعروں نے اس حکم کی تعمیل کی اور شاہی عنایتوں سے سرفراز ہوئے۔ میں نے بھی چند شعر عرض کیے اور الطاف خسروانہ سے مستفیض ہوا۔ چونکہ بادشاہ نے مجھ پر سب سے زیادہ توجہ اور عنایت فرمائی، یہ قطعہ نظم ہوگیا:

خسرو عالم سکندر ثانی   شاہ اکبر شہ فلک مقدار
شعرا را طلب نمود شبے   کہ فشانند گوہر اشعار
ہمہ رفتند و پیشکش کردند   از دُرِ نظم و رسمے شہوار
بہ ہمہ لطف نمود و لے   بہ ہمہ اندک و بہ من بسیار
گرچہ من خار بودم و ہمہ گل   من شدم گل بہ پیش من ہمہ خار[۱]

دربار سے واپس آکر میں نے یہ رسالہ ترتیب دیا اور صفت الاصناف اس کا نام رکھا، کہ خسرو ملک سخن کی نظر میں شرف قبول حاصل کرے۔

یوسف بوجانی کا شہر آشوب مسمّیٰ بہ صفت الاصناف

صفت الاصناف میں کل ستر رباعیاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سے شہر آشوب کی ابتدا کی گئی ہے۔

نقد سخنم ز بے غش و دلخواہ است   بادشاہ و گدا نفع رساں چون ماہ است
در عالم معنی شہرتش بر زر مہر   از نام جہان پناہ اکبر شاہ است

اس کے بعد اٹھاون رباعیوں میں مختلف صنعتوں اور پیشہ وروں کے لڑکوں کی تعریف کی گئی ہے۔ آخری رباعی در تعریف یوسف نام خود، جس پر شہر آشوب ختم ہوا ہے، یہ ہے:

یوسف سخن از بتان بازار مگو   تا کی باشد حکایت خار مگو
در زاویۂ فکر کہ خاموشانند   خاموش نشین بیہدہ بسیار مگو

یوسف بوجانی کی چند رباعیاں صفت الاصناف سے نقل کی جاتی ہیں:

---

[۱] صفت الاصناف کا ایک قدیم قلمی نسخہ راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

در تعریف شاعر پسر

شاعر پسرے کہ چوں سخن شیریں است — در ملک سخن خسرو معنی بین است
ہم سرو قدش چو طبع او موزونست — ہم لعل لبش چو شعر او رنگین است

در تعریف آتشباز پسر

آتش بازے کہ آتش عشق افروخت — آتش بازی ز طرۂ خویش آموخت
در معرکۂ کہ آتش افشانی کرد — یک چشم زدن تمام عالم را سوخت

در تعریف زرگر پسر

زرگر کہ دل از وفاش نازد مارا — در بوتۂ ہجر می گدازد مارا
از لطف بدست ما دہد خاتم لعل — تا حلقہ بگوش خویش سازد مارا

فارسی میں شہر آشوب کا وجود

گب (ـــ) نے اپنی کتاب 'ترکی شاعری کی تاریخ' میں مسیحی متوفی ۹۱۸ھ کی ایک نظم 'شہر انگیز' کا ذکر کیا ہے، جو اُس نے شہر ایدریانوپل کے متعلق لکھی تھی اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ فارسی میں اس طرح کی کوئی نظم موجود نہیں ہے۔ پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران میں اس دعوے کو رد کرتے ہوئے تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ فارسی میں کم سے کم ایسی دو نظمیں ضرور موجود ہیں، ایک وحیدی قمی کی نظم تبریز پر اور دوسری حرفی اصفہانی کی نظم گیلان پر۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تحفۂ سامی میں ایسی دو نہیں، چار نظموں کا ذکر کیا گیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

آگہی خراسانی کا شہر آشوب

سلطان حسین میرزا کے زمانے میں آگہی خراسانی (متوفی ۹۳۲ھ) ایک فاضل انشا پرداز اور قصیدہ گو شاعر تھا، مگر اس کے مزاج میں خباثت اور حرص دنیا بہت تھی۔ اُس نے امیر خسرو کے قصیدے 'دریائے ابرار' کے جواب میں اہل ہرات کی ہجو میں ایک شہر آشوب لکھا، جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

عرصۂ شہر ہری رشک بہشت افزاست — در گلش را چشمۂ خورشید گل بیخ زراست
جرم طین یک مشت خاک ز خاک او بر خندہ فش — نرگس باغ جہان آرائے او ہفت اختراست
پائے تخت صد ہزاران خسرو گیتی کشاست — کہنہ تاریخ پسے شاہان انجم لشکراست
چرخ کج رو بین کہ از تاثیر او شہر چنین — مسکن جمع پریشان رہزن و گمراہ تر است

اس قصیدے میں رکیک الفاظ بہت آئے ہیں جو ذکر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن دو شعر جو خواجہ معین کیال کے لیے کہے گئے ہیں اُن میں اُس کی تصویر کھینچ دی گئی ہے۔

از بس نشان پاے نجاست مدهمه از — اختر بر زآبلہ بر روے آن بداختر است
کشتش از کثافت مبلغ شد دو دا — گنده کلاه نیست لیکن لاؤن خاکستر است

مولانا احمد عیسیٰ جو احمد آتون کہلاتے تھے اور شاہ اسمٰعیل کے معتزلہ پچھے تھے، اُن کے بیے یہ شعر کہا:

احمد آتون کہ شیعہ گے سنی بود — چون خیرابے کہ شتش رمادہ و کششش مزاست

اس شہر آشوب سے ناراض ہو کر امیر خان حاکم ہرات نے آتون کا ہاتھ اور زبان کاٹ ڈالی۔

وحیدی قمی کا شہر انگیز

وحیدی قمی متوفی ۹۴۲ھ فن مالی و ذہن جلی رکھتا تھا۔ اُس میں اور مولانا حیرتی مروی میں عمر بھر چھتی رہی اور دونوں نے ایک دوسرے کی نہایت رکیک ہجویں کہیں جو نقل کرنے کے قابل نہیں۔

وحیدی نے تبریز کے لیے ایک شہر انگیز بھی کہا، جس کے چند شعر یہ ہیں:

شہر ما کہ بہر شہر انگیز — از هری آمدم سوے تبریز
تا وصف بتان تبریزی — هم چو طوطی کنم شکر ریزی
ده چه تبریز رشک بهشت بهشت — مردمش خوب رو و پاک سرشت
نازنینان به ناز و محبوبی — در کمال لطافت و خوبی

اس شہر انگیز میں پسر شیشہ گر کی تعریف میں یہ دو شعر کہے ہیں:

دلبر شیشہ گر بہ رعنائی — مردم دیدہ راست بینائی
بسکہ شد شیشہ اش پسندیدہ — ہر کہ عینک نہند بر دیدہ

ان شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحیدی کا 'شہر انگیز' قدیم مفہوم میں شہر آشوب ہے۔

عشقی کا شہر انگیز

عشقی مکتب داری کرتا تھا۔ اُس نے تبریز کے لیے ایک 'شہر انگیز' کہا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

ہر کہ او عاشق نمد مال است — بر سر کوے عشق پامال است

حرفی اصفہانی کا شہر آشوب

حرفی اصفہانی گیلان گیا اور اُس شہر اور اہل شہر کی ہجو میں ایک 'شہر آشوب' لکھا۔ اُس پر مرتد ہونے کی تہمت لگا کر اُس کی زبان کاٹ ڈالی گئی۔

ذاتی لاری کا ایک مطلع

ذاتی لاری تبریز میں صحافی کا پیشہ کرتا تھا۔ شہر تبریز کی تعریف میں اُس کا یہ مطلع تحفۂ سامی میں نقل کیا گیا ہے:

ہر طرف شوخے و ہر گوشہ بلا انگیزیست — بہ تماشا قدمے نہ کہ عجب تبریزیست

مگر یہ کسی مسلسل نظم کا مطلع ہے تو وہ بھی شہر آشوب ہی کی قسم کی نظم ہوگی۔

تحفۂ سامی اور مذکورۂ بالا شہر آشوبوں کی نوعیت

تحفۂ سامی کا مصنف سام میرزا شاہ اسمٰعیل بانی سلطنت صفویہ کا فرزند تھا۔ اُس نے یہ کتاب ۹۵۷ھ میں لکھی۔ کتاب میں سات صحیفے ہیں۔ پانچویں صحیفے میں فارسی کے شاعروں کا ذکر ہے، صرف ان شاعروں کا جو مصنف کے ہم عصر تھے۔ سام میرزا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگہی اور حرفی کے شہر آشوب میں ہرات اور گیلان کے لوگوں کی سخت ہجو کی گئی تھی اور وحیدی قمی کے شہر انگیز میں وصف بتانِ تبریزی، یعنی تبریز کے مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ عشقی کے شہر انگیز کا صرف ایک ہی شعر سامنے ہے اور اس سے گمان ہوتا ہے کہ اِس نظم کا موضوع بھی 'وصف بتانِ تبریزی' ہے۔ یہ چاروں شاعر سام میرزا کے ہم عصر تھے۔ ان کی زیرِ نظر نظموں میں دو ایسی ہیں، جن میں کسی شہر کے لوگوں کی ہجو کی گئی ہے اور دو ایسی ہیں جن میں مختلف طبقوں اور مختلف پیشہ وروں کے لڑکوں کے حسن کا ذکر کیا گیا ہے۔ شکل کے اعتبار سے ایک قصیدہ ہے، ایک مثنوی ہے اور دو کی کیا شکل تھی معلوم نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:-

"تبریز اور ہرات کے علاوہ بعض اور شہر آشوبوں کا ذکر بھی تحفۂ سامی میں آیا ہے، مثلاً فغفور لاہجی کا شہر آشوب گرجستان، عشقی کا شہر آشوب تبریز۔ اسی طرح وجیہ الدین عبداللہ لسانی شیرازی کا شہر آشوب خطۂ تبریز۔"

میرے مطالعے میں تحفۂ سامی کا وُہ ایڈیشن رہا ہے جو پٹنہ یونیورسٹی نے ۱۹۳۴ء میں شایع کیا تھا۔ اُس میں نہ فغفور لاہجی کا ذکر ملتا ہے نہ لسانی شیرازی کے شہر آشوب کا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے لسانی کا نام 'وجیہ الدین عبداللہ' لکھا ہے۔ یہ نام بھی تحفۂ سامی کے اس ایڈیشن میں موجود نہیں ہے۔

طاہر وحید کے 'ابیات در تعریف ہر فرقہ'

شاہ عباس ثانی صفوی (۱۶۴۲ء تا ۱۶۶۶ء) کے وقایع نگار طاہر وحید (متوفی ۱۱۲۰ھ و ۱۷۰۸ء عیسوی) نے اپنی ایک نظم میں ہر طبقے کے لڑکوں کا ذکر ایک دو شعروں میں اور بعضوں کا تین چار شعروں میں کیا ہے۔ یہ اشعار قدیم بیاض میں، جو میرے کتب خانے میں موجود ہے، 'ابیات در تعریف ہر فرقہ' کے عنوان سے درج ہیں۔ ان میں سے چند شعر نمونے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

زرگر پسر

زرگر پسران نازک اندام ... بستند ہمہ چو نقرہ خام
خواہد دل خستہ پریشان ... انگشتر زینہار ایشان

حداد پسر

حداد خبر ندارد از درد ... بیہودہ چہ کوبم آہن سرد

نثار پسر

نثار پسر زند ہمیشہ — بہ پائے دل ز جور تیشہ
گاہے کہ نہادہ بسن کشیدہ — چون اترہ امید من بریدہ

کمال

کمال کر دیگری فن اوست — چشم روشن ز دیدن اوست

نعمت خان عالی کا قصیدۂ شہر آشوب

عہد عالمگیری میں نعمت خان عالی کی مشہور کتاب وقائع محاصرۂ گولکنڈہ میں ایک قصیدہ شہر آشوب ملتا ہے، جس میں اہل دکن کی پریشاں حالی بیان کی گئی ہے۔ یہ قصیدہ شہر آشوب کے عام مفہوم کے مطابق شہر آشوب ہے۔ لیکن اس میں شہر آشوب کے پرانے مفہوم کی صفت بھی موجود ہے، یعنی اس میں مختلف پیشوں کے شخصوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس قصیدے کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

این فلک خوب [illegible] — چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانے
بسر رفتہ رسیدہ خلق از افلاس و ناداری — کہ معنی ہم ندارد این زبان حرف سخندانے
سپاہی را بہ میدان قیامت می‌کند جولان — ز شمشیر و سپر دارد دم آبے لب نانے
عجب از [illegible] دریا [illegible] — نباشد خوب تر از شربت دینار درمانے
منجم را [illegible] از فلک حاصل — ز نعمت جو ع چند قرص مہ را گردہ نانے
محاسب سال را [illegible] ماہ روزہ در دفتر — برائے آن کہ معلومش نشد شوال و شعبانے
[illegible] مشتاقی [illegible] — مگر از عشق بازان دام گیرد رشتہ جانے
رسد تا جان سپاری کار [illegible] — برائے سر فروشی چون ندارد بیستہ پانے
[illegible] از خانۂ خود را ندانستہ — مگر بر ریزۂ خوانش نمودہ تیز دندانے
نہ بیند روئے زر حجام اگر آئینہ نفروشد — کہ یک مو در بساطش نیست غیر از چشم حیرانے
[illegible] علاج آتشی است و پنبہ می گرید — برای نسبت برد بردار رفتن کار آسانے
[illegible] یکے پرسید از [illegible] چہ ماند آیا — بگفت احوال اگر این است بہرِ ساعتے آنے
[illegible] از خانہ بر خاست پرسیدم — چہ شد گفتند در این خانہ دارد گشت مہمانے
ز جائے غلغل شادی شنیدم گفت ہمسایہ — کہ شخصے دید شب در واقعہ آرد انبانے
یکے گفتہ خدا داد [illegible] — برائے قلعۂ گولکنڈہ کن ایجاد طوفانے

یکے می گفت اے رحمان بحق موسیٰ عمران — بیار از آسمان ترانگبین یا مرغ بریانے
یکے گفت اے خداوند کریم از حرمت موسیٰ — براے ما فرست امروز ہم چون مائدہ خوانے
یکے می گفت بہر قرض وادن خلق کن یارب — یہودے، ہندوے، نصرانیے، گبرے، مسلمانے

یکتا خوشابی کا جہان آشوب احمد یار خان یکتا خوشابی خلد مکان (شہنشاہ اورنگ زیب) کے اواخر عہد میں ملک سندھ کا صوبہ دار تھا۔ مثنوی خوب کہتا تھا۔ ایک مثنوی عالم گیر کے مرثیے میں کہی جس کا نام 'جہان آشوب' رکھا۔ اس کے دو شعر یہ ہیں:۔

امیران کہن بے قدر و قیمت — چو مال مردہ پامال غنیمت
ہمہ در خاک بے قدری فسردہ — چو شمشیر اصیل زنگ خوردہ

(تذکرہ بے نظیر)

فارسی کے کل شہر آشوبوں کا پتا لگانا مقصود نہیں ہے۔ اوپر جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا جا چکا ہے وہ شہر آشوب کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور اس کے بنیادی یا ابتدائی اور ثانوی یا توسیعی مفہوموں اور ہیئتوں کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔

اُردو شہر آشوب کی ایک مشکوک مثال اردو میں متعدد شہر آشوب کہے گئے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ میں ذیل کا قطعہ شہر آشوب کی مثال میں پیش کیا گیا ہے اور امیر خسرو کی طرف منسوب کیا گیا ہے:۔

ہندو بچہ بین کہ عجب حسن دھرے چھے — بر وقت سخن گفتن مکہ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم — گفتا کہ ارے رام نرک کا ہیں کرے چھے

یہ قطعہ امیر خسرو کی تصنیف ہو یا نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ کسی قدیم شاعر نے اس ابتدائی دور میں کہا ہے، جب فارسی اور ہندی کی آمیزش سے اردو کا پیکر تیار ہو رہا تھا۔ اس ایک قطعے کو انفرادی حیثیت میں شہر آشوب نہیں کہہ سکتے، مگر ممکن ہے کہ یہ کسی مجموعۂ قطعات میں شامل ہو، جس کو مجموعی حیثیت سے شہر آشوب کہہ سکتے ہوں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا عام رواج محمد شاہ کے عہد میں ہوا۔ اس عہد کے کئی شاعروں نے شہر آشوب کہے ہیں، جن میں زمانی ترتیب قائم کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ان ہم عصر شاعروں کے شہر آشوب بلا لحاظ ترتیب پیش کیے جاتے ہیں۔

ناجی کا شہر آشوب محمد شاکر ناجی محمد شاہی عہد کے نامی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں آزاد آبحیات میں لکھتے ہیں:۔

"نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار کا رنگ شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور اس پر ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور

[illegible] پوری کی ایک مروجہ مخمس میں ہے۔
جس سے اس مخمس کو شہر آشوب کہہ سکتے ہیں۔ تذکرہ نویس نے اس مخمس کے حسب ذیل دو بند نقل کیے ہیں:

تھے جو سنے زر پر سو ہیں اب گر بیٹھے تھے　　دغا کے زور سے دال دوا کی بیچتے تھے
شہر میں گھر کی شال سے بچتے تھے　　سو روز نقش میں منہ برگرا کر بیچتے تھے
گلے میں جھنیاں باندھ کر پھرتے کنگال

قضا سے بچ گیا مرا نہیں تو تھانا تھا　　کریں شان کے ہاتھی اوپر نشانہ تھا
نہ پانی پینے کو پایا روا نہ کھانا تھا　　بے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ وقت صبح دو دانہ نہ لقمہ و بقال

یہی کہ دونوں بند چند لفظوں کی تبدیلی کے ساتھ مجموعہ نغز میں بھی نقل کیے گئے ہیں۔

کمترین کا شہر آشوب

[illegible] خان کمترین جو آرزو و [illegible] ہی کے زمرے تھے اور میر و سودا کے ہم عصر۔ [illegible] بزرگی [illegible] زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ علی ابراہیم خان تذکرہ گلزار ابراہیم میں لکھتے ہیں: "کمترین شہر آشوب و ہجو و ترجیع بند [illegible] حالات کے موافق تازہ بیانی پر قادر تھے۔ ہفت صد شعر [illegible] شہر آشوب [illegible] دیکھا ہے۔" اگر تذکرہ نویس کا یہ بیان صحیح ہے تو شاید اس سے زیادہ طویل شہر آشوب نہ فارسی میں کہا گیا اور نہ اردو میں۔ ہفت صد شعر میں سے صرف پانچ شعر میر نے نکات الشعرا میں اور پانچ ہی شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ شعرا میں نقل کیے ہیں۔ علاوہ ایسے خلاف تہذیب ہیں کہ تذکرہ میر حسن کے پہلے طبع شدہ نسخے میں حذف کر دیے گئے۔ ان شعروں میں [illegible] ان والی [illegible] [illegible] وزیر، قاضی اور کچھا [illegible] کی ہجو کی گئی ہے۔

ان شعروں پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمترین کے شہر آشوب میں مختلف پیشوں کے آدمیوں کی ہجو ایک ایک قطعہ شعر میں کی گئی ہے اور ان شعروں میں ایک طرح کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔

حاتم کی بارہ صدی

شاہ حاتم کی دو نظمیں بارہ صدی [illegible] قدیم بیاض میں شامل ہیں۔ دونوں شکل میں مخمس اور موضوع کے اعتبار سے شہر آشوب ہیں۔ ان میں سے ایک نظم شہر آشوب حاتم دہلوی کے عنوان سے رسالہ نقوش لاہور کے دسمبر ۱۹۶۰ء کے شمارے میں شایع کر دی گئی ہے جس میں اکیس بند ہیں۔ [illegible] بارہ بند ہیں مگر ان میں تین بند ایسے موجود ہیں جو نقوش میں نہیں ہیں۔ ان میں ایک اس نظم کا پہلا بند ہے اور ایک آخری۔

۱۔ [illegible] مرتبہ [illegible] مطبوعہ [illegible] پریس اورنگ آباد ۱۹۳۰ء۔ شایع کردہ ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۳ء

اس مخمس کا پہلا بند، جس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ 'بارہ صدی' سے حاتم کی مراد ہے بارھویں صدی ہجری جس میں اُن کی زندگی گزر رہی تھی، حسب ذیل ہے:-

تو کھول چشم دل اور دیکھ قدرت کرتار — کہ جن نے ارض و سما اور کیا ہے لیل و نہار
زمانے سیں نگارو سدا تو ہر کے دوار — کہ دور بارہ صدی کا ہے سخت ناہنجار
جہاں کے باغ میں یکساں ہے اب خزاں و بہار

اس آخری بند یہ ہے:-

کرے ہے چرخ اگر تجھ اُپر جفا حاتم — تو سنگ پاس نہ کر جا کے التجا حاتم
ترے ہے رزق کا ضامن سدا خدا حاتم — تو انقلاب زمانے کا غم نہ کھا حاتم

تیسرا بند جو نقوش میں چھپا ہے حسب ذیل ہے:-

ذکر تو جا کہ کہ نقارچی کی نوبت ہے — مصاحبت کی اگر چاہ اس کو خدمت ہے
کمینہ قوم کو ہر اک مکاں پہ عزت ہے — تو کیا ہوا کہ رذالے کی زر پہ ہتی پت ہے
ہے افتخار نجیبوں کا فقط عزت و وقار

حاتم کے اس شہر آشوب کا بنیادی موضوع وہ سماجی انقلاب ہے، جو نادر شاہ کے حملے سے وجود میں آیا تھا اور جس کے نتیجے میں طبقاتی نشیب و فراز میں کچھ ہمواری پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی اونچے طبقے کچھ نیچے اُتر رہے تھے اور نیچے طبقے اوپر اُٹھ رہے تھے۔ حاتم اونچے طبقے کے آدمی تھے۔ وہ اس انقلاب کو ایک مصیبت عظیم سمجھ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ان کو حاکموں، امیروں، منصب داروں اور اہلکاروں کی بد اخلاقی اور بد اعمالی کی شکایت بھی تھی۔ اس شہر آشوب کے کچھ ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں:-

شہروں کے بیچ صداقت کی کچھ نشانی نہیں — امیروں بیچ سپاہی کی قدردانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے مہربانی نہیں — تواضع کھانے کی چاہو نہیں پانی نہیں
گیا جہان سے یارانہ سخاوت و پیار

یہاں کے قاضی و مفتی بنے ہیں شہنہ — یہاں کے دیکھو سب اہلکار ہیں گے چور
یہاں کرم ہے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور — یہاں سبھوں نے صداقت ہے دل سے توڑ دی ڈور
یہاں نہیں ہے مدار نسب و دار و مدار

امیر زادے ہیں جیسے اپنے حال کے بیچ — تھے آفتاب پہ اب آ گئے زوال کے بیچ

رذالے آج نشے بیچ زر کے ماتے ہیں — پہن لباس زری سب کو کچھ دکھاتے ہیں

نظر میں آتے ہیں جو کیسے آہ ادائی کے   کہ لگتے پھرتے ہیں پاپوش کے دُھلائی کے

شگفتہ سب ہے یہ اک آن بھلا آوے گا   بھلا یا دیکھیے صاحب دل سے فرح گا دے گا

پھریں ہیں بیچتے جابجا تیل چنبیلی کے   ملیں ہیں تیل سدا بیچے اور چنبیلی کے
جو تھے ہیں صاحب مال و زر و حویلی کے   رکھیں ہیں شوق سدا دل کے بیچ جیلی کے
گئے ہیں بھول مزہ نان قند پاش و جوار
حرام خور جو تھے اب حلال خور ہوئے   جو چور تھے وہ ہوئے شاہ، شاہ چور ہوئے
جو زیر دست تھے سر اوپر وہ زور ہوئے   جنہوں کو زور تھا سو اب مثال مور ہوئے
جو خاک پھانکتے پھرتے تھے سو ہوئے زردار
پھرا ہے میوہ فردوس کے پستہ و بادام   نظر میں وقت نہیں اپنے صاحبوں کو طعام

جہاں ہیں صاحب حسن خانہ گماں بلائے ہیں   محل جنوں کے تھے ان کو گھنڈ ملکے لٹے ہیں

جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں   نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

نجیب خانہ بدوش ایک ہیں اور دو گردش   ہے باغباں کے گھر میں بہار جوں گلزار

جہاں ہیں صاحب شمشیر ہوئے ہیں مبتذل گھر   ہے گھر میں کا شعر سدا دکان اور گھر
ہمیشہ کانوں میں ہجر ہے پتے بجتوں پر   امیر زادہ ملائی دیکھتے ہیں گھر گھر
بنا ہے نانۂ تماشہ ہر ایک نقش و نگار
وروں کے بیچ صفائی نہیں ہے یہ دوروں میں   کہیں جو جگہ بھی شاید تو اب ہزاروں میں
صندوق سازنے زر ہے بھرا انباروں میں   جو تھے سیٹھ سو ذکر ہیں اب سوالوں میں
جو امیروں کے ہوئے ہیں سر و پا بیمار

حاتم کی دوسری بارہ صدی

حاتم کی دوسری بارہ صدی میں بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔ چند ... ملاحظہ ہوں۔

...وقت جو امرا قلعے میں آتے ہیں　　بنی ہے جن کی وضع کیا کیا ہمیں دکھاتے ہیں
...میں جیسے پیچ و تاب کھاتے ہیں　　کتنے خراب ہیں اور کتنے زر کماتے ہیں
غرض خدا بھی یہی شعبدے ہمیں دکھاتے ہیں

...دو رہے شرفا کا کچھ نہیں روزگار　　بہت عجیب قسم زندگی سے ہیں بیزار
...کمسے پیسے پیستے ہیں جنڈائی خوار　　کہو تو کس طرح بیٹھے سپہ گری کا وقار
بہادر اپنے غضب بیچ کے کھاتے ہیں

...نقدی کی بالکل طلب سے رہ بیٹھے　　بہت امیر جو شیروں سے ہاتھ دھو بیٹھے
...دن طرف صوبہ دار ہو بیٹھے　　جہاں پناہ بھی ملک کو ڈبو بیٹھے
دیکھ دور سے تو بھی دھکے کھاتے ہیں

...دیکھتے ہی کچھ زمانہ اور آیا　　دوں سے ہو گئی اب جفا و جور آیا
کیا کریں دنیا کا اور طور آیا　　کہنے چلی گئی پاجیوں کا دور آیا
گلی و کوچوں میں بن کے بھیس دکھاتے ہیں

...میں اس بند کے آخری مصرعے کی شرح کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ نیچے طبقے کے لوگوں کی مالی حالت ...خود آرائی اور خود نمائی کا شوق تو پیدا ہو گیا ہے لیکن سلیقہ ابھی نہیں آیا ہے۔ مختلف پیشے والوں کی ...ـحکہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً

...ے کی کمر بندھے کے چلے بن ٹھن　　پھرا سرے [illegible] سیرو کی [illegible]
...نقد کی چوگان لینے [illegible]　　پھرتے ہیں کھیلتے میدان کرکے گھر آنگن
پھر ان کے باپ بھی اس [illegible] جاتے ہیں

...نے بیچ بھی کر بیٹھ کر طلب کندی　　منڈا کے ڈاڑھیاں مونچھوں کو رکھے پیوندی
...ستی ہوتے ہیں جو کہ [illegible]　　پھرتے ہیں لٹکتے ہم بات گھاٹ میں رندی
ہمیشہ [illegible] ڈھلاتے ہیں

...ر چھوڑ کر سے [illegible]　　کسی [illegible]
...بل پہ [illegible]　　[illegible]
[illegible]

...کھنڈیاں پہرے [illegible]　　[illegible]
...میں کھنڈیاں [illegible]　　[illegible]

مسدود دروازہ کا مجنیوں سے آنکلتے ہیں

اس مخمس کے اشعار بنسلے ہیں اور یہ ناتمام ہے۔ مقطع موجود نہیں ہے۔ اس کی زبان میں اتنی خامیاں ہیں کہ یہ آ کا کلام نہیں معلوم ہوتا۔

شفیق کا قصیدہ "حسب حال زمانہ" | لچھمی نرائن صاحب شفیق اورنگ آبادی نے "حسب حال زمانہ" کے عنوان سے ایک قصیدے کی شکل کا شہر آشوب لکھا جس کے ابتدائی شعر یہ ہیں:

ایک دن دل نے کہا مجھ سے کہ صاحب سنو ادھر
کیوں ریاست دن بدن ایسی ذلیل اور ہے بتر

اس دکن کے بیچ پچھلے وقتوں کے تھے بادشاہ
عادل اور فیاض، صاحب علم اور صاحب ہنر

اُن کی دولت میں مرفہ اور سبھی خوش حال تھے
کیا رعیت کیا سپاہی کیا امیر نامور

آسماں وہی ہے اور وہی زمیں خلقت ہے وہ
پھر جو کس واسطے یہ زندگانی مختصر

شامت نیت سے یا تقدیر میں ہے کچھ قصور
تب تو دشواری پڑی ہے ہر کسی کو اس قدر

یہ پورا قصیدہ سامنے نہیں ہے۔ اس لیے اس کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

میر حسن کی رباعیات در تعریف اہل حرفہ | میر حسن کے کلیات میں "رباعیات در تعریف اہل حرفہ" کے عنوان سے جو ملتی ہیں ان میں تماش، حجام، نجار، کسان، زرگر، سقا، باغبان، تیلی، جلاد، نمبولی، بقال اور سنار کے پیشوں کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے:

سقے کا پسر سب کو وہ بھیلا ہے
اس خوبی سے وہ آرزو پاتا ہے
وہ چاہ سے کھینچتا ہے اپنے دل کو
اور ہاتھ سے اس کے کچھ بھر آتا ہے

عیار تماشا ہے سب شہر کی
کرتا ہے اور گرہ نہ اپنی کھولی
جوشش وہ دو آب وتوان دل کی ہے
جو کچھ کرامات خاص تھی سب کھولی

ان رباعیوں کا مجموعہ شہر آشوب ہے۔ یہ ابتدائی معلوم ہیں۔

سودا کا قصیدہ شہر آشوب | سودا کے دو شہر آشوب ہیں: ایک قصیدے کی شکل میں اور ایک مخمس کی شکل میں۔ قصیدہ شہر آشوب چھپا ہوا ہے۔ شہر کی بربادی کی نظم ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زبان ہے

اس قصیدے میں اہل دہلی کی مفلسی اور اہل کمال کی بے قدری اس انداز سے بیان کی گئی ہے کہ قصیدے میں ہجو کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ چند شعر نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے

گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے ہاں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت — دکھن میں بکے وہ جو خریدا صفاہاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح گزارش — کچھ ہے فراغت [illegible] دزدی کا گماں ہے

[illegible] اگر کیجے تو [illegible] کی بہت بات — [illegible]

[illegible] آخر کا اب کیا میں بتاؤں — [illegible]

دن گزر گیا [illegible] — شب [illegible]

وہ بیت [illegible] لکھے جاتے [illegible] — [illegible]

[illegible] گزری [illegible] — [illegible]

چاہے جو کوئی شیخ بنے [illegible] — [illegible]

دنیا [illegible] — [illegible]

دنیا میں [illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

یاں خوبی صحبت ہے تو [illegible] — [illegible]

مندرجہ بالا اشعار مختلف مقامات سے چن لیے گئے ہیں۔ شاعر نے اپنے زمانے کے طبیبوں اور شاعروں کی جو حالت [illegible]
[illegible] دو دو اشعار نقل کرتے ہیں:

طبیب

[illegible] طبیب [illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

[illegible] — [illegible]

رکھتے ہیں غرض مرگ سے ڈرنے کو سپاہ کو گر ذکر ہو مجبوری مصاحبت کی کہاں ہے

شاعر

شاعر جو ہیں صاحب مستغنی احوال دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات امیروں کا کسی دن نہ کسی ملنا نہیں اُس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانہ نیت کو غزل تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی ہے اک شعر پہر بھر گر رحم میں بیگم کے کہیں نطفۂ خاں ہے
استاد حسن ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

سودا کا مخمس شہر آشوب سودا کا دوسرا شہر آشوب چھتیس بند کا مخمس ہے۔ اس میں بھی دہلی کی تباہی، وہاں کے لوگوں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شریفوں کی کس مپرسی کا بیان ہے۔ اس شہر آشوب میں بھی کہیں کہیں ہزل کا رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول جو میں کہوں گا تو کہے گا کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

بس اُن کا ملک میں ایسی جو ویراں ہو تباہ زر ہو نہ ہو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
بند وہ راہ سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کمیت سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط وہ ہی بات ہے پر اُنھوں کی شان جو چاہو اس کو نہ بکرائیں تو یہ کیسا استان
پر ان کا گھر ہے تضحیک خرچ پر ہے آن رہے کا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
بجے ہیں تاشہ کمہاروں کے پائی میں ڈھول

مخل ہو یہ سماعت زمیں بہت پچانی کئی وہ جو کہ دیں تیس میں ہو سودا پانی[ط]
تمام گھر ہے تہ بستہ ملک میں کاڈی مدام کر کے جل کر گھر اینٹ کا مانی
پر اپنے زعم میں ہر ایک جانے گو دا بسول

ط کلیات سودا کے دو مطبوعہ مخطوطوں کی مدد سے بھی یہ مصرعہ صحیح نہیں پڑھا جا سکا۔ (ادیب)

پڑے جو کام انھیں تو نکل کے کھائی سے ‏ رکیں وہ فوج جو موتی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے ‏ سوار گر پڑیں سوتے ہیں چارپائی سے
کسے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری ‏ سپاہی تا متصدی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری ‏ سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنو دے باندھ اور کسی کو کٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار ‏ تلاش کر کے ڈ جیتے انھوں نے ہو ناچار
تمام فسق میں بنیوں کے دی سپر تلوار ‏ گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچول

امیر اب جو ہیں وہ انھوں کی ہے یہ چال ‏ ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھا ہے سوزنی خوجہ کھڑا جھلے ہے رومال ‏ حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

سودا بڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخر کار متاثر ہوتے۔ آخر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا ایک حصہ دلی مرحوم کا مرثیہ بن گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس ‏ کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس ‏ بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے محول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم ‏ نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم ‏ مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

عجب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول ‏ وہ برقع سر پہ ہے جس کا قد تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول ‏ اور اُن کے حسن طلب کا جواب ہے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا ‏ مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا ‏ عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

رکھتے ہیں غرض مرگ سے رونے کو سپاہی — گر ذکر کو سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے

شاعر

شاعر جو نے جاتے ہیں مستغنی الاحوال — دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس — ملنا انھیں اس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جاکے دوگانہ — نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے کسیں نطفۂ خاں ہے
استفادہ جو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

سودا کا مخمس شہر آشوب سودا کا دوسرا شہر آشوب چھبیس بند کا مخمس ہے۔ اس میں بھی دہلی کی تباہی، وہاں کے نوکروں کی بے روزگاری، امیروں کی پریشان حالی اور شریفوں کی کس مپرسی کا بیان ہے اس شہر آشوب میں بھی کہیں کہیں طنز کا رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

حاجی آج جو سودا سے بیوں تو ڈانواں ڈول — پھرے ہے جا کہیں نوکر ہوئے کے گھوڑا مول
اگاؤ دو کہتے ہیں اس کے جواب میں دو بول — جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند — سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
گیا ہے ملک تو قدرت سے سرکشوں نے پسند — جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

بس ان کا ملک میں کارنسی جو ہیں جو شاہ — کہ کرو زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پر کاہ
بندہ ووزن سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ — کہاں سے آویں پیادے سے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی نقد و عربی باجے پر انھوں کی شان — جو چاہو اس کو نہ بجوائیں تو یہ کیا امکان
پر ان کا فکر ہے تخفیف خرچ پر ہر آن — رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

محل ہو جو نہ سمائے زمیں بہت پھاٹی — کئی دہ شہر کی کیسیں میں ہو سودا پاٹی
تمام عمر ہے تدبیر ملک میں کاٹی — ندان کرا کے نوکر غرامینٹ کا ماٹی
پر اپنے زعم میں ہر اک بجائے خود بہلول

[illegible]

پڑے جو کام اُنھیں تو نکل کے کھائی سے   دکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے نائی سے   سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری   سپاہی تا متصدی سبھوں کو بے کاری
اب آگے دفتر تن کی کہوں میں کیا خواری   سوال دستخطی کو پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آزر دے باندھ اور کسی کو کنڈول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار   تلاش کر کے ڈھیلتے اُنھوں نے ہو ناچار
نمان فسترمن میں بنیوں کے دی سپر تلوار   گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

امیر اب جو ہیں دانا اُنھوں کی ہے یہ چال   ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کا حال
بچھا ہے سوزنی خوب کھڑا جھلے ہے رُمال   حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال
دھری ہے سامنے ایک پیکدان اک تنبول

بڑے زندہ دل تھے۔ جن باتوں پر دُوسرے روتے اُن پر وہ ہنستے تھے۔ لیکن اپنے شہر کی تباہی سے وہ بھی آخر کہاں متاثر نہ ہوتے۔ آخر ہنستے ہنستے رو دیے اور شہر آشوب کا آخری حصہ دہلی مرحوم کا مرثیہ بن گیا۔ چند بند ملاحظہ ہوں:

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس   کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اُداس   بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم   نہ جانے کن نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس جگہ ہے زقوم   مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

عجب زمانہ یوں کا ان دنوں ہے یہ معمول   وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں ڈبا گلاب کا سا پھول   اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا   مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا   عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کر دیں کی خاک سے بستی تھی خلق مرتی رو دل

سودا کے ان شہر آشوبوں کے متعلق [illegible] لکھتے ہیں:

"یہ دونوں ظاہر میں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کی ہے۔ غور سے دیکھو تو [illegible] سودا نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے۔"

میر کے چند مخمسوں میں شہر آشوب کی جھلک

میر نے کوئی باقاعدہ شہر آشوب نہیں کہا۔ لیکن ان کے چند مخمس ایسے ہیں جن میں بعض مقامات پر شہر آشوب کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ دو مخمسوں میں لشکر کی ابتری [illegible] سپاہیوں کی فاقہ کشی اور بے سرو سامانی کا بیان کیا ہے۔ ایک مخمس کے چار بند اور دوسرے مخمس کے دو بند یہاں درج کیے جاتے ہیں:

[illegible]   آرزو ہیں رکھو امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نہ شاہ   جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکٹھے آہ

[illegible]   بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
[illegible] سب نے ساز و لباس   چیتھڑوں بھی نہیں کسو کے پاس
یہی حاضر یراق بیٹھے سپاہ

جان آفت ہے صبح سے تا شام   شام سے صبح تک ہے فکر طعام
رہ گئی جا ہے حال [illegible] نام   اب وہ ہوں نوکری کسو کا نام
[illegible] بدتر ہیں آہ

[illegible]   خورش و خواب بیچے خواب و خیال
[illegible]   زندگی اپنے طور پر ہے محال
[illegible] خاطر خواہ

[illegible]   آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
[illegible]   ہے سب اس پہ سر بجگہ پرخاش
[illegible] آب ہے نہ کچھ آش

[illegible]   لوگ بے جیبکیں ہیں روتے ہیں بقال
[illegible]   ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال

بادشاہ و وزیر سب قلاش

پھٹے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر — تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب عزیز صغیر و کبیر — مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

ایک مخمس میں ایک "شیخ جی" کی ہجو کی ہے، جن کے پاس دستخطی فرد، اجرا کے لیے گئے ہیں اور انھوں نے جھوٹے وعدے کرکے میر کو خوب دوڑایا ہے۔ ذیل کے دو بند انھیں شیخ جی کی زبان سے ہیں:

گھوڑے جو ہیں دانہ کو ہم سنتے ہیں — سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکے مرتے ہیں — و بُر پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال

دینے کا ہو کہیں ٹھکانا بھی — جو دو کو چاہیے زمانہ بھی
یاں نہیں شہر کے گھر میں دانہ بھی — کبھو ہوتا ہے پینا کھانا بھی
ورنہ بھوکے رہے ہیں بیٹھے نڈھال

ایک مخمس میں شہر سے میں خود اپنی پریشان حالی بیان ہے۔ اس مخمس کا آخری بند مشہور ہے، جو حسب ذیل ہے:—

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ — دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ — ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

ان نظموں کے متعلق آزاد نے یہ لکھا ہے:

"چند مخمس شکایت زمانہ میں بطور شہر آشوب کے کہے ہیں۔۔۔۔ مگر ایسے کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہے۔" (آب حیات ص ۲۱۶)

متفرق ابیات در تعریف بر فرقہ ان مخمسوں کے علاوہ میر کی غزلوں میں جا بجا ایسے شعر ملتے ہیں، جن کو میر کی رباعیات در تعریف اہل حرفہ کے قبیل کی چیز کہہ سکتے ہیں یا ظاہر دیدہ کے منثورہ یا لا اشعار ——— کی طرح "ابیات در تعریف ہر فرقہ" کہہ سکتے ہیں۔ ان اشعار میں جن فرقوں کے نام آئے ہیں وہ یہ ہیں: نائی، دھوبی، معمار، عطار، بزاز، صراف، زرگر، گل فروش، آتش کش، آتش باز، باغبان، افسانہ خوان، مطرب، مغنی، سپاہ کشتی گیر، قاضی، مُفتی، طبیب، سید، برہمن، ترک، مُغل، ہندو، اہل دول، امیر۔ اگر میر کے یہ منتشر اشعار یک جا کر دیے جائیں تو ایک شہر آشوب اپنے ابتدائی مفہوم میں تیار ہو سکتا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

جیش مند بہت ہے وہ زور پسر   پڑے ہیں کھاٹی میں مدت سے ہم

پر شور ہے بے عشق مغنی پسراں کے   یہ کاسہ سر کاسۂ طنبور ہوا ہے

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

نظر آک سپاہی پسر سے لڑی   قریب اُس کے تلوار کر کر گئے

افسانہ خواں کا لڑکا کیا کہیے دیدنی ہے   قصہ ہمارا اُس کا یارو شنیدنی ہے

وہ باغباں پسر کچھ گل گل شگفتہ ہے جب   یہ اور گل کھلا ہے اک پھولوں کی دکاں کا

وہ آتش کا بھی پرکالہ ہے سرگرم جفا   مارے تلواروں کے اُن نیم جانوں کو قتل کیا

گیند سے ہو وہ گرم جنگ آتش باز   ہم اپنے چہرے پہ اُڑتے ہوائیاں دیکھیں

دل لشکر میں ایک سپاہی زادے نے ہم سے چھین لیا   ہم درویش طلب میں اس کی ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

وہ دھوبی کا نام خدا ہے سیں وراں او دھج ہے بہت   کوئی کہے اس سے ملنے میں تجھ کو کیا ہم دھوبی ہیں

اس طرح کے اشعار بالعموم حقیقت پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ ابتدائی شہر آشوبوں کے زیرِ اثر تقلیدی اور روایتی انداز میں کہے گئے ہیں۔

قائم کا شہر آشوب

قائم چاند پوری نے بھی چھتیس[25] بند کا ایک مخمس شہر آشوب کہا ہے، جس میں شہروں کی ویرانی اور شہریوں کی پریشانی کا بیان ہے۔ ابتدا بادشاہِ وقت کی سخت ہجو سے کی گئی ہے، کہ وہی ملک کی تباہی اور رعایا کی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔ شروع کے دو بند دیکھیے:

کیسا یہ شہ کہ حشم پر اس کی نگاہ ہے   ہاتھوں سے جس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
گویا کہ آپ ساقۂ لشکر کا سپاہ ہے   ناموس خلق سایے میں اس کے تباہ ہے

شیطان کا یہ خلق ہے، نہ خلق اللہ ہے

رہتی تھی ایک خلق کے جی میں یہ آرزو — ہووے گا بادشاہ بھی پھر ہند میں کبھو
تا زمرے وہی ہوں سبز تو وہی غلو — سو آسماں نے لا کے مسلط کیا تو تو
جس کے ستم سے چار طرف آہ آہ ہے

آگے چل کر بادشاہ کے باپ دادا تک کی خبر لی گئی ہے اور اس کی حماقتوں کو اُس کے بزرگوں کا ورثہ قرار دیا گیا ہے۔

تُو تو خدا کے فضل سے اُس باپ کا پسر — جس کا خطاب شاہِ حماقت پناہ ہے
دادا ترا جو لال کنور کا تھا مبتلا — کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا
اس خاندان میں حمق کا جاری ہے سلسلہ — وہ دو وش کس طرح سے ہیں تیرے نہیں بھلا
آخر گدھا پن اُس کا ترا عذر خواہ ہے

اس بادشاہ کے عہد میں شہر ویران اور ضروریاتِ زندگی نایاب ہیں:۔

جو شہر میں تھے مصر سے ہر چیز میں خراج — ٹھیکے دوا کے بیچ میں رہتے تھے جوں اناج
وان درد سے شکم کے کوئی مر نہ جاؤ آج — کس چیز سے حکیم کرے بیٹھ کر علاج
نے زیرہ ہے نہ سونف ہے نے نانخواہ ہے

اجڑے پڑے ہیں شہر میں وے وے مکان خوب — جن کی صفا سے جائیں تھے موتی عرق میں ڈوب
اک ریزہ خس پہ جان جہاں دیں تھے خاک روب — تو دوں اب اُس زمین میں حاضر سفید دوب
دیکھوں اب اُس جگہ پہ دھتورا سیاہ ہے

غریب ہوں یا امیر سب کے سب افلاس کا شکار اور فقر و فاقے میں گرفتار ہیں۔

اک نانِ خشک شب جو میسر کسی کو آئے — ممکن ہے کیا کہ بیٹھ کے آسودگی سے کھائے
نیچے چھپے زمین کے یا آسماں پہ جائے — یوں گرد و پیش گھیرے ہے اک خلقت خدائے
جیسی طرح حصار میں ہالے کے ماہ ہے

تن زیب پہرتے جنہیں آتی تھی جی میں عار — خاصہ ہمیشہ جسم میں اُن کے تھا بے شمار
سو ظلم سے ترسے ہیں وہ یاں تک ذلیل و خوار — دستار موسے سر سے ہے ان کے سروں پہ بار
جامہ اگر ہے تن پہ تو وہ گرد راہ ہے

کیا جانے آسماں کی بگڑ کیا گئی ہے کل — ممکن نہ ایہ داہنے لے تا بہ کر بغل
کوئی روز آگے گھر میں تھی جن کے چہل پہل — مطبخ میں اُن کے آج نہیں گر پکا تھا کل

پہروں سے اصطبل میں نہ دانہ نہ کاہ ہے

مفلسی نے سب کے اخلاق خراب کر دیے ہیں۔

اس سب پہ ہے عاشق و معشوق کا یہ ڈھنگ　　دیکھے جو زر شمع پہ تو جل مرے پتنگ
عالم سے اٹھ گیا غم ناموس و پاس ننگ　　جس سے کہو زر نکالے بیٹی کے ماں ہے تنگ
دیکھو جدھر تو باپ کو بیٹے کا داہ ہے

روزی کمانے کا دروازہ بند اور سرکاری ملازمت نایاب ہے۔

حاکم جو اس ضلع کا ہے ماجد گلاب رائے　　روزی ہزار پالکی تھی واں بلکہ کچھ سوائے
سو اب جو نوکری کو کوئی اس کے پاس جائے　　کہتا ہے کہ ترکوں میں یہ چھتا کہاں سے آئے
شہ ملک ہے نہ مال نہ دولت نہ جاہ ہے

یہ زبوں حالی اور بداخلاقی شہروں سے گزر کر قصبوں میں بھی پہنچ گئی ہے۔

قصبات اک جگہ تھی شریفوں کی بود و باش　　فاسق نظر پڑے ہے جو کوئی وہاں ہے بدقماش
عصمت زنوں کی عصمت مرد سے زیادہ فاش　　تقوے کی رو سے مرد فرشتوں کی سی معاش
سو مجھ کو کہتے تہمت ہیں پہ ان کی نگاہ ہے

اس شہر آشوب میں مختلف فرقوں طبقوں اور پیشہ وروں کا ذکر کم ہے، مگر ہے ضرور۔

آیا ہے قاضیوں پہ جو کرنی دنوں کا پھیر　　سر رشتہ دار دفتر الٰہی بیچے یہ گھیر(؟)
ڈاہیں ہیں لوگ پیشہ میں یہ کافروں کے ڈھیر　　تیس دہ کون ہے جو خریدے چہار سیر
... کو ہو مزد ورنہ ...... کو چاہ ہے

مفتی پھریں ہیں مجھ کو کہتے کرتے فتنہ　　قاضی کے ہے کسی تھی مری بی قسمت سو
ہے چودھری کے گھر میں بیٹا سر بیٹھ　　عاشق کے یہاں بھی ہیں تو ....
اللہ جس طرح سے رکھے واہ واہ ہے

یہ چند بند جو اوپر نقل کیے گئے ہیں، قائم کے شہر آشوب کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

حسرت کا مخمس در احوال دہلی — جعفر علی حسرت نے بھی ایک شہر آشوب لکھا ہے جو مخمس در احوال دہلی کے عنوان سے اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ اس مخمس میں چالیس بند ہیں۔ ڈاکٹر محمد ... نے رسالہ نقوش، لاہور کے اکتوبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں مطلع کو چھوڑ کر اس مخمس کے انتالیس بند دیوان حسرت کے اس قلمی نسخے سے شائع کیے ہیں، جو بقول ان کے رضا لائبریری، رامپور میں محفوظ ہے اور مصنف دیوان کے ہاتھ کا لکھا ہے۔

"اگرچہ اس دیوان کا اندراج فہرست کتب خانہ میں ذوقی رام حسرت کے نام سے
ہے، لیکن حقیقت میں یہ میر محمد حیات المخاطب بہ ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی
المتوفی سنہ ۱۲۱۰ھ [۹۶-۱۷۹۵ء] کا دیوان ہے۔"

میرے استفسار پر مولانا عرشی ناظم رضا لائبریری نے تحریر فرمایا کہ "حسرت کے دیوان میں یہ مخمس نہیں ہے۔ اس کو شایع کرنے والے نے انتساب میں سخت غلطی کی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ مخمس جعفر علی حسرت کا ہے، جو مشہور معاملہ بند شاعر جرأت کے اُستاد تھے۔ وہ دہلی کے رہنے والے تھے، مگر اُن کی عمر کا زیادہ حصہ فیض آباد اور لکھنؤ میں گزرا۔ جعفر علی حسرت کے کلیات کا ایک قلمی نسخہ جلسۂ تہذیب لائبریری لکھنؤ میں محفوظ ہے، اور اس میں مخمس در احوال دہلی، بھی شامل ہے۔

حسرت نے اپنے شہر آشوب میں پہلے افغانوں کے حملے سے دہلی کی تباہی کا حال تیرہ بندوں میں بیان کیا ہے۔ ابتدائی چار بند سُنیے :-

نہیں ہے مرثیے سے کم جہان آباد کا حال — اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال
وگر پڑھوں تو کہاں غم سے ہے سخن کی مجال — اگرچہ چرخ ستمگر نے اس پہ لایا زوال
پر آپ روتے ہے رکھ منہ پہ ابر کے رومال

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں — کہ جیسے باد خزاں سے ہو حالت بستاں
نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں — گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا یہ کشت سبز سب پامال

وہ باغ جس میں کہ گل رو تھے سب حسیں گل سے — اور اُن کی زلفیں فزوں تر تھیں جعد سنبل سے
چمن کے رشک تھے رخسار دختر و کاکل سے — دراز اُس پہ ہو دست ستم تطاول سے
دریغ مٹ گیا نقشہ رہا نہ وہ خط و خال

سواد اُس کے سے تھی زلف مہوشاں زنجیر — بہار اُس کی سے عرق آب شرم تھا کشمیر
ہر ایک اُس کے مکاں میں بہشت کی تعمیر — جدھر نظر کرو سو جیسے تھا عالم تصویر
نہ سیر کے واں سے جدھر جا پڑے نگاہ خیال

اس کے بعد یہ دکھایا ہے کہ بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد، امیر، جاگیردار، ملازمت پیشہ، سپاہی، نجیب، نجومی، طبیب، شاعر، مصور، سوداگر، پیرزادے، مرثیہ خواں سب کے سب مفلسی اور بے روزگاری کا شکار ہیں۔ چند بند نقل کیے جاتے ہیں :-

جو بادشاہ وہاں کا رکھے تھا تخت و تاج — وہ اپنے تُرت کو اطفال کے ہوا محتاج
خدائی ہے جسے دیتا تھا ملک بندو خراج — غنیم آن کے لے اُس سے اُس کے شہر کا باج

وہ شکل ہے کہ کرے شیر کو شکار شغال

جو حشم اور خزانہ تو سب لٹا بیٹھے، رہیں سو کس پہ یہ فرقے کے لوگ اور چاکر
رہا نہ مال بجز سنگ کوٹھوں کے اندر جو چھت تھی چاندی کی دیوان خاص کے اندر

سو وہ وزیر نے کی غرق یک قلم پامال

نجیب تو ہوئے فاقوں سے اب سبھی رنجور رہی نہ منہ پہ بے رونق نہ اس کی چشم میں نور
جو اہل حرفہ ہیں اُن کا تو کیجیے کیا مذکور جنھوں کا کسب تھا حلوائی اُن کا یہ دستور

کہ جا کے چوک میں دیکھیں ہیں اک دمڑی پہ فال

وہ جو کہ فن طبابت میں تھے ارسطو سے اُنھوں نے دیکھا فقط ہوئے شربت ما کوئی کھائے
مرض ہے جو تاب نہ قرار سو کس طرح سے جائے وہ چھوڑ طب کو کہیں جو کچھ اب خدا دکھلائے

سلائی سرمے کی بازار میں بیچتے کنگال

جنھوں کا پیری مریدی کا تھا سلسلہ جاری اُنھوں کے رہنے لگی گھر میں آن بد شماری
مرید فاقوں سے مرتے ہیں خود یہ ناچاری سُنی جہاں کہیں مجلس ہے واں کی تیاری

دو روٹی قلیے پہ جا کر لگے وہ کرنے حال

مصوّر اُن میں جو تھے کھینچتے ہیں حیرانی لگے کہ کھینچ دے تصویر گرچہ ہو مانی
جو خط کے لکھنے میں ہر طرح کے تھے ثانی قلم کو اُن کے ہے دن رات خون افشانی

کہیں ہیں مرثیہ کو شاخ خط پشت لب کی مثال

آخری بند میں شاعر کہتا ہے کہ شہر کی تباہی اہلِ شہر کی بد اعمالی کا نتیجہ ہے۔

جہاں آباد نہ ہوتا کسی طرح سے تباہ جو حسرت ایسے عمل کرتے ہم نہ نامہ سیاہ
پرائے مال پہ ناموس پر رکھیں جو نگاہ تو اُن پہ کیونکہ نہ بھیجے بھلا غضب اللہ

ہمارے آگے ہی آئے ہمارے یہ اعمال

جرأت کا مخمس

حسرت کے شاگرد جرأت کا ایک ترجیع بند مخمس ایک قدیم بیاض میں ملا، جس کا مصرعِ ترجیع "حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی" لازمی قرار دیتا ہے کہ ہر بند کو ایسی بات پر ختم کیا جائے جو اس مصرعے سے مناسبت رکھتی ہو۔ یہ پابندی اس مخمس کا خاص عیب ہے لیکن اس میں شہر آشوب کی شان پوری طرح موجود ہے۔ متعدد دوسرے شہر آشوبوں کی طرح اس میں بھی شاعر کو زمانے سے یہ شکایت ہے کہ اس نے امیروں کو مفلس اور غریبوں کو تونگر کر دیا ہے، اور شریفوں کو رذالوں سے دو چار کر کے کمینوں کو عروج عطا کیا ہے۔ اس مخمس میں بائیس [۲۲] بند ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں، جن سے اس کی شہر آشوبی نوعیت واضح ہو جائے گی۔

اب ان کو دے شفق چرخ شال نارنجی　　　بُنا جو کرتے تھے لیل و نہار شطرنجی
یہ دیکھ کیونکے نہ آ بیٹھے بخانۂ تن جی　　　ظہور حشر نہ کیوں ہو جو کلچھڑی گھبنی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

جو گل فروش تھے اب ہیں وہ مالکِ صد باغ　　　جو مفلس ازلی تھے رکھیں ہیں عیش و فراغ
جو خاک روب تھے اب ان کا عرش پر ہے دماغ　　　یہ کائوں کائوں خوش آئے کسے جو مادہ زاغ
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

سمجھتے خاک نہیں سانڈے کے جو تیل سوا　　　حکیم جیو کہا دیں سب ان سے پوچھیں دوا
چلے جب ایسی کسافت کی اس چمن میں ہوا　　　تو کیوں نہ پھر سر و گردن ہلا ہلا کے لوا
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

دیا سلائی جو بیچے تھا پا کر سرکنڈا　　　ہوا ہے صاحب لشکر بنا کے اک جھنڈا
ہوائے باغ جہاں سے ہو کیوں نہ دل ٹھنڈا　　　جو ٹینی مرغ کا بچہ کھٹکتے ہی انڈا
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

گداگر اُن کو دے چرخ منصب شاہی　　　جو گھس کھدے تھے وہ اوڑھیں و دستار کلاہی
لگا کے بیٹھے تھے جو خوانچہ کہلانے ہے خان　　　بڑا گھر اس کا ہے بیت الخلا تھا جس کا مکان
جو بیچ کھاتے تھے کنجشک دام میں لا کے　　　کریں ہیں عرش پہ پرواز اب سو چڑیا کے
جنھوں کے گھر تھی امارت گھر اُن کا ہے سونا　　　بنی گھر اس کے عمارت جو بیچے تھا چونا
معاملات میں اب اعتبار اُن کا ہے　　　کہ جن کو کہتے تھے پیسے کی ضامنی کیا بات

آخری بند:-

جہت حد و کہ ہے جرأت کی ہمسری کا خیال　　　وہ بھولے اپنی بھی کو ا چلے جو ہنس کی چال
کہو ادلے انہیں لا ہ احسد کر جی سے نکال　　　ہنسیں گل اس پہ جو تپید کی پھلا پھلا پر و بال
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

راسخ عظیم آبادی کی مثنوی در بیان انقلاب زمانہ

غلام علی راسخ عظیم آبادی متوفی ۱۲۳۸ھ نے مثنوی کی شکل میں ایک شہر آشوب کہا ہے، جو مثنویات راسخ مرتبہ ممتاز احمد میں حسب ذیل عنوان کے ساتھ شامل ہے:-

"مثنوی در بیان انقلاب زمانہ و شکایت فلک و مجملِ احوال متینان بلدۂ عظیم آباد۔"

اس مثنوی میں راسخ نے عظیم آباد (پٹنہ) کی گزشتہ خوش حالی و فارغ البالی اور موجودہ مفلسی و ناداری کا ذکر کرنے

کے بعد جن [stain] پیشہ وروں کا حال لکھا ہے وہ یہ ہیں: مشایخ، خلفاء، معلم، شاعر، وکالت، زراعت، تجارت، طبابت، مصاحب، ... مثنوی میں کل ایک سو بیس شعر ہیں۔ نمونۂ کلام درج ذیل ہے:-

گزرتی تھی آرام سے بے تعب　　　کرتے جمع اسباب عیش و طرب
کہیں مجلس عیش و بزم نشاط　　　کہیں دوستوں میں بہم اختلاط
جہاں اک عجب باغ تھا دل کشا　　　ہر اک گل میں تھی اس کے بوئے وفا
یہ گلزار اب ہو گیا خار زار　　　خزاں ہو گئی ہائے اس کی بہار
کوئی اس چمن میں تو نکہت نہیں　　　کوئی غنچہ ساں صاحب زر نہیں
ہے اب خاک وہ پانے اور ان کا فرق　　　جو تھے سر سے پا تک جواہر میں غرق
جنھیں مسند تھی قاقم پہ تھی دار و گیر　　　ہوئے ہیں وہ محتاج فرش حصیر
معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے　　　فقط مفلسی برسر کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے در بدر　　　ہیں آوارہ ارباب فضل و ہنر
ہنر مند کا ہے جگر ریش ریش　　　نہیں جاتا ہے کوئی پیشہ بھی پیش

مشایخ جو ذی عزت و تعظیم ہیں　　　دل ان کے بھی صد مرکز بیم ہیں
غم رزق ہے یاں تلک ہر زماں　　　کہ ہیں رشتۂ سبحہ ساں ناتواں

لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا　　　نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا
بہت فکر روزی سے ہیں دردناک　　　قلم غم سے ان کے ہوا سینہ چاک

وکالت کا بازار بھی سرد ہے　　　وکیل اب جو ہے وہ بڑا مرد ہے
کہاں اب وکالت ہو رونق پذیر　　　موکل ہی سب ہو گئے ہیں فقیر

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے　　　زر دعایاں تو نایاب ہے
کرے کب یہ پیشہ کسو کو نہال　　　کہ سرسبز ہونا بہت ہے محال

طبابت میں بھی کچھ نہیں اب حصول　　　اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول

ہر اک کو مرض مفلسی کا ہے آج — طبیب اب بچارے کریں کیا علاج

سپاہی کی مٹی بھی ہے اب خراب — کہ بنتا ہوا نوکری کا تو باب
جو انجم ہیں اب اُن کا یہ رنگ ہے — کہ قسمت سے اپنی انھیں جنگ ہے
ہیں افلاس سے ایسے اندوہگیں — کہ مٹی کا گھوڑا میسر نہیں
نہ ترکش ہے نے تیر ہے نے کماں — خدنگ الم کے نشاں ہیں زماں
کماں کی کماں ہو رہے ہیں تباہ — اگر تیر ہے تو فقط تیر آہ

مختلف پیشوں اور پیشہ وروں کی کس مپرسی اور مفلسی کا بیان کرنے کے بعد شاعر شہر کی خوش حالی اور بدحالی کو اہلِ شہر کی اخلاقی حالت کا نتیجہ قرار دیتا ہے:۔

یہ پٹنہ عجب دل کشا شہر تھا — طلسمات تھا واہ کیا شہر تھا
تھے صدق و صفا پیشہ اس کے مقیم — طریقِ وفا پر بہت مستقیم
بہت نیتیں نیک رکھتے تھے سب — زباں اور دل ایک رکھتے تھے سب
اب اس شہر کا طور ہی اور ہے — مکینوں کا اس کے بُرا طور ہے
کوئی ان میں غمّاز و نمّام ہے — کسو کا سخن چینی ہی کام ہے
بہت جانتے ہیں فریب اور زور — بہت بڑھ گیا حد سے فسق و فجور
نہیں نیک نیت کوئی یاں ولیک — اگر ہے تو ہے وہ ہزاروں میں ایک

نظیر کا شہر آشوب

نظیر اکبرآبادی نے پچیس مخمس بند کا ایک شہر آشوب کہا ہے، جس میں آگرے کے پیشہ وروں، سپاہیوں اور امیرزادوں کی پریشاں حالی بیان کی ہے۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:۔

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند — رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند
دریا سخن کی فکر کا ہے موج دار بند — ہو کس طرح نہ منہ میں زباں بار بار بند
جب آگرے کی خلق کا ہو روزگار بند

اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ — آتا نظر کسی کا نہیں ایک دم نباہ
مانگو عزیزو ایسے بُرے وقت سے پناہ — وہ لوگ ایک کوڑی کے محتاج ہیں اب آہ
کسب و ہنر کے یاد ہیں جن کو ہزار بند

صراف بنئے جوہری اور سیٹھ ساہوکار — دیتے تھے سب کو نقد سو کھاتے ہیں اب اُدھار

بازار میں اڑے ہے پڑی خاک بے شمار　　بیٹھے ہیں یوں مکانوں میں اپنی دکان دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار　　اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لوہار تو پیٹے ہے سر سنار　　کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کا ہے کاروبار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں　　جلتے ہیں نانبائی تو بھڑ بھونجے بھنتے ہیں
دھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں　　روتے ہیں وہ جو شربتی و داراٹی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنے تھے ازار بند

ہر دم کماں گروں کے اوپر پیچ و تاب ہیں　　صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں جلد ساز مصور کباب ہیں　　نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

حجام پر بھی یاں تئیں ہے مفلسی کا زور　　پیسہ کہاں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے سر پکڑتے ہوئے اس کی پور پور　　کیا بات ایک بال کٹے یا ترا شے کور
یاں تک ہے استرے کی دھار بند

کیا چھوٹے کام والے وکیا پیشہ ور نجیب　　روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب آ شام کی قریب　　اٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات　　سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روئیے اور کس کی کہیے بات　　روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اجاڑ سا　　غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا　　نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے　　ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیہہ کہو آگرے کا ہے　　شاہ کہو فقیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ[1] چار بند

اب تک جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب نادر شاہ اور شاہ دُرّانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہل دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں ـ جو فرق آ گیا تھا اور اس سے امرا اور شرفا کے اقتدار اور سربلندی میں جو خلل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۂ کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و ـت کا بازار گرم کر کے شریف، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے ـزامی لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان الم ناک اور وحشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی نظمیں کہی گئیں۔ یہ نظمیں حقیقت میں ـرحوم کے مرثیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو ـ اور وہ نظمیں بھی شہر آشوب کے دائرے میں آ گئیں، جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ ـلی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغانِ[2] دہلی کے نام سے شایع کیا، جن ـچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریادِ دہلی اور انقلابِ دہلی کے دُہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع کیا۔ ان نظموں ـ زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں، مگر چند مخمس اور مسدس بھی ہیں۔ داغ دہلوی کا مسدس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسری ـوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مشہور رہے۔ خود ـمنف نے اپنی اس نظم کو "شہر آشوب" قرار دیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کی بنیاد اسی نظم سے ـی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت <u>ڈاکٹر</u> سید عبد اللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جا سکتی ہے، جو شہر آشوب کی ـیخ کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش ـے جاتے ہیں :-

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی   بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی

---

[1] پانچ چار کے عدد اگر اسی طرح جمع کیے جائیں جیسے جند سوں میں لکھے جاتے یعنی ۴۵ تو اس مخمس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہو گی جو پینتالیس ہے۔

[2] ڈاکٹر سید عبد اللہ نے فغانِ دہلی مطبوعہ احسن المطابع، دہلی ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ تین شماروں میں منقسم ہے۔ شمارہ اوّل کلام حضرت محمد سراج الدین ظفر و مرزا رفیع السودا، شمارہ دوم در مسدسات شہر آشوب، شمارۂ سوم در غزلیات وغیرہ" میرے کتب خانے میں فغانِ دہلی کا وہ نسخہ ہے جو مطبع اکمل المطابع، دہلی میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں صرف دو شمارے ہیں۔ مؤلف کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے: "نامش فغانِ دہلی گذاشتہ بر دو شمارہ بہ انجام رسانیدہ ... نخستین شمارہ در مسدسات شہر آشوب، دوم در غزلیات و قطعات وغیرہ"

بازار میں اُڑے ہے پڑی خاک بے شمار   بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکاں دار
جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند

ماریں ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار   اور جتنے پیشہ دار ہیں روتے ہیں زار زار
کوٹے ہے تن لہار تو پیٹے ہے سر سنار   کچھ ایک دو کے کام کا رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے داروں کا ہے کاروبار بند

بیٹھے بساطی راہ میں تنکے سے چنتے ہیں   جتنے ہیں نانبائی زبس بھوجے بھنتے ہیں
دھنیے بھی ہاتھ ملتے ہیں اور سر کو دھنتے ہیں   روتے ہیں وہ جو مشروع و دارائی بنتے ہیں
اور وہ تو مر گئے جو بنیں تھے ازار بند

ہر دم کماں گروں کے اُوپر پیچ و تاب ہیں   صحاف اپنے حال میں غم کی کتاب ہیں
مرتے ہیں جلد ساز مذہب کباب ہیں   نقاش ان سبھوں سے زیادہ خراب ہیں
رنگ و قلم کے ہو گئے نقش و نگار بند

حجام پر بھی یاں نہیں ہے مفلسی کا زور   جیسے کماں جو سان پہ ہو استروں کا شور
کانپے ہے رنج ہونے سے اس کی پور پور   کیا بات ایک بال کٹے یا تراشے کور
یاں تک ہے استرے و نہرنی کی دھار بند

کیا چھوٹے کام والے وہ کیا پیشہ ور نجیب   روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب
ہوتی ہے بیٹھے بیٹھے جب شام کی قریب   اُٹھتے ہیں سب دکان سے کہہ کر کہ یا نصیب
قسمت ہماری ہو گئی بے اختیار بند

جتنے ہیں آج آگرے میں کارخانہ جات   سب پر پڑی ہیں آن کے روزی کی مشکلات
کس کس کے دکھ کو روویے کس کس کی کہیے بات   روزی کے اب درخت کا ہلتا نہیں ہے پات
ایسی ہوا کچھ آ کے ہوئی ایک بار بند

دیکھے کوئی چمن تو پڑا ہے اجاڑ سا   غنچہ نہ پھل نہ پھول نہ سبزہ ہرا بھرا
آواز قمریوں کی نہ بلبل کی ہے صدا   نہ حوض میں ہے آب نہ پانی ہے نہر کا
چادر پڑی ہے خشک تو ہے آبشار بند

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے   ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے   شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اُس نے لکھے پانچ چار بند[1]

اب تک جن شہر آشوبوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے ابتدائی مفہوم کے شہر آشوبوں کو چھوڑ کے باقی سب شہر آشوب نادر شاہ اور احمد شاہ دُرّانی کے حملوں سے دہلی کی تباہی اور اہلِ دہلی کی بد حالی کے اثر سے وجود میں آئے ہیں۔ ان میں شہر آشوب کے ابتدائی مفہوم کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یعنی ان میں مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا حال بیان کیا گیا ہے، طبقاتی درجہ بندی میں یکایک جو فرق آگیا تھا اور اس سے امرا اور شرفا کے اقتدار اور سربلندی میں جو خلل پڑ گیا تھا، اس پر غم و غصّے کا اظہار کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ہنگامے نے دہلی کے زمین و آسمان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آس پاس کے دیہاتیوں نے شہر میں گھس کر قتل و غارت کا بازار گرم کر کے شریف، معزز اور خوش حال باشندوں کو بڑی مصیبتوں میں مبتلا کر دیا اور انگریزوں نے دہلی کے بڑے بڑے نامی گرامی لوگوں کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ ان الم ناک اور وحشت خیز واقعات کے بیان میں بہت سی نظمیں کہی گئیں۔ یہ نظمیں حقیقت میں دہلی مرحوم کے مرثیے ہیں۔ ان کو شہر آشوب کہنا کچھ بہت مناسب نہ تھا۔ لیکن اب شہر آشوب کے مفہوم میں اور وسعت پیدا ہو گئی اور وہ نظمیں بھی شہر آشوب کے دائرے میں آگئیں، جن میں پیشہ وروں اور طبقوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر نہیں ہے، بلکہ شہر کی تباہی کا عمومی انداز میں بیان ہے۔

اس طرح کی نظموں کا ایک مجموعہ منشی محمد تفضّل حسین خاں کوکب نے مرتب کر کے فغانِ دہلی[2] کے نام سے شایع کیا، جن میں کچھ نظموں کا اضافہ کر کے نظامی بدایونی نے فریادِ دہلی اور انقلابِ دہلی کے دُہرے نام سے ۱۹۳۱ء میں شایع کیا۔ ان نظموں میں زیادہ تر غزل کی شکل میں ہیں، مگر چند مخمّس اور مسدّس بھی ہیں۔ داغ دہلوی کا مسدّس اپنی نوعیت میں اس مجموعے کی دوسری نظموں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، لیکن شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خود مصنّف نے اپنی اس نظم کو "شہر آشوب" قرار دیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ شہر آشوب کے نئے مفہوم کی بنیاد اسی نظم سے پڑی ہو۔ اس مجموعے کی نظموں کی تفصیلی کیفیت ڈاکٹر سید عبداللہ کے اُس مقالے میں دیکھی جا سکتی ہے، جو "شہر آشوب کی تاریخ" کے عنوان سے ان کے مجموعۂ مقالات بحث و نظر میں شامل ہے۔ یہاں صرف داغ کے شہر آشوب کے چند بند پیش کیے جاتے ہیں:۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی بہشت و خلد سے بھی انتخاب تھی دلّی

---

[1] پانچ چار کے عدد اگر اسی طرح بطور فاصلہ چند سطروں میں لکھے جائیں یعنی ۴۵ تو اس مخمس کے بندوں کی تعداد ظاہر ہوگی جو پینتالیس ہے۔

[2] ڈاکٹر سید عبداللہ نے فغانِ دہلی مطبوعہ اکمل المطابع، دہلی ۱۲۸۰ھ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ مجموعہ تین شماروں میں منقسم ہے شمارۂ اوّل کلام حضرت محمد سراج الدین ظفر و مرزا رفیع سودا، شمارۂ دوم در مسدسات شہر آشوب شمارۂ سوم در غزلیات وغیرہ"۔ میرے کتب خانے میں فغانِ دہلی کا وہ نسخہ ہے جو مطبع محمدی، دہلی میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا تھا۔ اس میں صرف دو دفتر ایسے ہیں۔ مؤلف کتاب نے دیباچے میں لکھا ہے "نامش فغانِ دہلی گذاشتہ بہ دو شمارہ بہ انجام رسانیدہ ... نخستین شمارہ در مسدسات شہر آشوب، دوم در غزلیات و قطعات وغیرہ"۔

…ہے کہ تھا وہ جواب تھی دلی   مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھا دلی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ انسان و جان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدر دان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا   یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا
رہی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

عجب شکل گل و گلستاں نظر آئی   پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اٹھ کے تماشۂ خوبیاں نظر آئی   تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی
وہ گلعذار سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلان خوش الحان کے چہچہے نہ رہے

ہر ایک بڑے گل اہل چمن چمن سے چلے   غریب چھوڑ کے اپنا وطن وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے   قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے
مقام امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

پیادہ پا ہوں رواں شہسوار صد افسوس   لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوں اہل وقار صد افسوس   ہزار حیف، دل بیقرار صد افسوس
جھکے ہیں بار الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں بنائے بنے ہوئے کیسے

برق لکھنوی کا شہر آشوب

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ پر جو مصیبتیں ڈھائیں، اُن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن کے بیان میں شاعروں کی زبان خاموش اور قلم بے حرکت نہ رہے ہوں گے۔ لیکن ان نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے کا کسی کو خیال نہ آیا۔ اور اب اتنی مدت گزر جانے کے بعد اُن کی تلاش میں کامیابی مشکل ہے۔ اس وقت صرف ایک مسدس میرے سامنے ہے جو اپریل ۱۹۳۸ء کے الہ آباد یونیورسٹی اُردو میگزین میں ایک قلمی بیاض سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس کے مصنف برق لکھنوی نے خود اس کو 'شہر آشوب' کہا ہے ۱

---

۱ یہ مسدس برق کے مجموعہ دیوان میں نہیں ہے۔ لیکن ان کے ایک قلمی دیوان میں شامل ہے۔ اس کے چھبیس ۲۶ بند جو ضمیر مجلّی

لیکن یہ مسدس بھی ۱۸۵۷ء کے غدر سے متاثر ہو کر نہیں کہا گیا ہے۔ اس کے مضامین، شاعر کا لب و لہجہ، اس کے غم کی نوعیت، ان سب چیزوں سے صاف ظاہر ہے کہ غدر سے متاثر ہو کر واجد علی شاہ کی معزولی اور کلکتہ کو روانگی کے بعد لکھنؤ کی بے رونقی اور اداسی کا اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت تک شہر ان تباہیوں سے اور اہلِ شہر ان مصیبتوں سے محفوظ تھے، جو کچھ دن بعد غدر کے نتیجے میں پیش آنے والی تھیں۔ اس مسدس کا آخری بند، جس میں اس کو شہر آشوب قرار دیا گیا ہے، حسب ذیل ہے:

ہم پہ اے برق جو گزرا ہے سنایا ہم نے　　　نقشہ سب کھینچ کے شعروں میں دکھایا ہم نے
شہر آشوب کہا رو کے رُلایا ہم نے　　　وقت پر دوستوں کو دوست نہ پایا ہم نے
خلق میں نیرِ اقبال ہمارے وہ تھے
سب کو ثابت ہے کہ سیارستارے وہ تھے

اس بند کی بیت کے دونوں مصرعوں میں وہ کا اشارہ واجد علی شاہ کی طرف ہے۔ دو اور بندوں میں بھی اسی طرح اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔ اس نظم میں واجد علی شاہ سے محبت اور ہمدردی اور اودھ کے تختِ سلطنت پر ان کی واپسی کی تمنا کا اظہار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے انگریزوں کے خوف سے بادشاہ کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس مسدس میں انتالیس بند ہیں۔ اس کے چند بند نقل کیے جاتے ہیں:

کل کے مذکور یہ ہیں اپنے بھی افسانے تھے　　　رشکِ فردوس پریں شہر کے مینا نے تھے
تھالیاں ہیروں کی تھیں لعلوں کے پیمانے تھے　　　ماہ و خورشید رخ شمع کے پروانے تھے
سب ہوا خواہ سلیمان کہا کرتے تھے
رات دن پریوں کے جمگھٹ میں جھکتے تھے

قہقہے اڑتے تھے جمگھٹ تھے پریزادوں کے　　　میلے ہر روز ہوا کرتے تھے آزادوں کے
نالے سنتے تھے نہ ہرگز کبھی فریادوں کے　　　کبھی آگاہ نہ تھے نام سے بیدادوں کے
کیا کہیں کس سے کہیں ہائے وہ صحبت کیا تھی
راجہ اندر کے اکھاڑے کی حقیقت کیا تھی

جانتے تھے کہ اسی طرح گزر جائے گی　　　چمنِ عیش میں ہرگز نہ خزاں آئے گی
آرزو نخلِ محبت سے ثمر پائے گی　　　یہ نہ سمجھے تھے قضا رنگ نیا لائے گی

تیرہ ۱۸۵۷ء ـــــ نے تذکرہ جلوۂ خضر میں درج کیے ہیں، وہ تذکرہ ابن طوفان کے حاشیہ نمبر ۹۲ میں نقل کر دیے گئے ہیں۔
(تذکرۃ الشعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان ص ۳۹۔۴۲)

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ایک بھی پیشِ نظر ان میں کی تصویر نہیں   قدر دنیا میں نہیں خلق میں توقیر نہیں
جز اجل اور کچھ اس خواب کی تعبیر نہیں   تیر ہے دل کے لیے ناز شمشیر نہیں
زخم نے داغوں سے بنا جسم مرقع اپنا
بٹ گیا سامنے آنکھوں کے مرقع اپنا

اب بھی آجائیں جو وہ پھر وہی صورت ہو جائے   وہی خیاباں وہی چہلیں وہی عشرت ہو جائے
سب کو سب جانئے رہیں روح کو راحت ہو جائے   پھر وہی شان ہو اپنی وہی شوکت ہو جائے
پھر وہی سیر کریں پھر وہی آبادی ہو
پھر وہی ناچ وہی رنگ وہی شادی ہو

ایک بس ان کے نہ ہونے سے یہ سب کچھ ہوا   شربت زندگی بھر ہمیں زہر ہوا
دل کو حشر ہے دو دم آپ سے بے خبر ہوا   ہم کو دوزخ سے زیادہ چمن شہر ہوا
نازدل سے دل عرش ہلادے یارب
موت آنے ہمیں یا ان سے ملادے یارب

موت جینے سے کہیں اپنے لیے بہتر ہے   بال نشتر ہیں تو ہر ایک نفس خنجر ہے
تکیہ ہے خشت لحد فرش زمیں بستر ہے   دو ہیں آغوش اجل گور سے بدتر گھر ہے
چارہ اس میں نہیں ہرچند جو قسمت ہو جائے
زہر کھانے کے لیے کھائیں تو امرت ہو جائے

جان صاحب کا شہر آشوب

لکھنؤ کے مشہور ریختی گو شاعر جان صاحب نے بھی ایک شہر آشوب اپنے زمانے کی مذمت میں کہا ہے۔ یہ بیالیس بند کا مخمس ہے۔ چند بند اس کے بھی سن لیجیے۔

کم ہمتی تھا وہ ہے ہر ایک کی خصلت آجکل   دفن مردے کی طرح گھر گھر ہے دولت آجکل
مردوں کی ہو گئی نامردی بہت آج کل   لکھنؤ میں شاد ہے شوموں کی خست آجکل
گو رہا حاتم کے روتی ہے سخاوت آجکل

ہیبت ہے یہ پیٹ بھر کھائیں نہ ہرگز فرق کھائیں   پیسے دارے اک ٹکے کے واسطے سر کو ڈھائیں
ساتھ ہی اپنے ولی گھر کے بھی چوہا نہ لگائیں   پہلے جلنے کے گھر کو ڈیں محل بھڑ کے بنائیں
غیر کی جا ہے ہر ایک دل میں کدورت آجکل

رنگ یہ بدلا زمانے نے ہر اک حیران ہے
مفلسی کے ہاتھ سے انسان بھی حیوان ہے
جو کہ حیوان تھا پیسے سے وہ انسان ہے
اے دوگانہ جان دیکھو کیا خدا کی شان ہے
ہوش میں پاجی ہیں اور ہم کو ہے وحشت آجکل

مفلسی میں کام آتا ہے نہ کوئی رشتہ دار
باپ ہے ماں ہے جو کچھ ہے ہے بڑا پروردگار
غیر کیسے حال اپنوں کا یہ ہے اب آشکار
ایک بھائی کو ہے فاقہ ایک ہے کرتا نہ ہر بار
اٹھ گئی دنیا سے پیسے سے محبت آج کل

ہو گئی راحت بے دشمن رنج ہے غم حبیب
دور دولت ہو گئی کس طرح ہو عشرت قریب
پاؤں جو پھیلا کے سوتے پھر نہیں جاگے نصیب
جو کہ تھے پیسے والے اب وہ ہیں مفلس غریب
ان کے گھر مہمان رہتی ہے قناعت آجکل

نائی دھوبی کنجڑے بھٹیارے قصائی نابکار
ایک گاڑی کے لیے ہوتے ہیں گردن پر سوار
رشک کر کے ہم کو رہتے تیلی تنبولی مالدار
ہم فقیر ان سے ہیں بدتر دیکھو تو ہے آشکار
پاجیوں کے گھر میں ہو کیوں کر نہ دولت آجکل

کیفی دہلوی کا 'عالم آشوب'

بعد کے بعض شاعروں نے شہر آشوب کے طرز پر 'عالم آشوب' اور 'دہر آشوب' لکھے ہیں۔ اردو کے ذی علم اور ممتاز ادیب اور شاعر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے ۱۹۲۲ء میں ایک نظم 'عالم آشوب' کے نام سے کہی۔ انھوں نے میری طلب پر حسن خط کے ساتھ یہ نظم مجھے بھیجی تھی۔ اس میں اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے:

"یہ نظم شہر آشوبوں سے مختلف ہے۔ ان میں اکثر تضحیک یا ایک قسم کی ہجو کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ یہ محض مرثیہ حال ہے۔"

اور اس نظم کی وجہ تصنیف یہ بتائی ہے:

"یکم مارچ ۱۹۲۲ء کو دہلی میں کونسل آف اسٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی میں حکومت ہند کا بجٹ (موازنہ) پیش ہوا۔ تیس کروڑ سے زیادہ گھاٹا دکھایا گیا۔ نئے ٹیکسوں کی تجویزیں پیش ہوئیں۔ سارے صوبوں میں گھاٹے کے بجٹ پیش ہوئے۔ وطن کا افلاس مدت سے دل کو دکھ دے رہا تھا۔ یہی صورتیں اس نظم کی محرک ہوئیں۔"

یہ عالم آشوب قصیدے کی شکل کی بہت طولانی نظم ہے اور اس میں ہندوستان کے افلاس کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ مصنف نے پہلے عام اہل ملک کی مفلسی کا بیان کیا ہے، پھر ملازمت پیشہ، تجارت پیشہ، تعلیم یافتہ، مزدوری پیشہ، اہل حرفہ اور زراعت پیشہ طبقوں کی پریشان روزگاری دکھائی ہے۔ یہ مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر کرنا شہر آشوب کے قدیم مفہوم کا پرتو ہے

مگر اس نظم کے اور حصے ایسے بھی ہیں جو شہر آشوب سے مختلف ہیں اور جن کو بقول مصنف حقیقت حال کہنا چاہیے۔ ان میں سے بعض کے عنوان یہ ہیں۔ "وطن پرستی اور کفایت شعاری" "حکومت اور رعیت کی فرض" "عالمگیر افلاس کے اسباب" اس عالم آشوب کے چند اقتباس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:-

تمہید

چھائے ہیں ملک پہ افلاس کے منحوس اثر — تنگ دستی کا ہے جو سر پہ خلائق کے سوار
شہر آشوب لکھا کرتے تھے پہلے شعرا اب — عالم آشوب کے لکھنے کا ہے مضمون تیار

زراعت پیشہ

زر زمیندار ہیں ان کا نہ پوچھو احوال — ان پہ رہتی ہے مصائب کی ہمیشہ بھرمار
پیدا کرتے ہیں مگر اس سے کہیں بیش آپ — ہونے لگتا ہے چندر روپے کی پلی کا شمار
سادہ خوراکی کی ہے ان پہ نہایت دو دو — پہلے سالن اڑا پھر دال سے چھوڑا ہے گھبار
نوبت اب یہ ہے جیسے ہیں ہے باقی ہفتہ — پان بیڑی سے تو چھوڑا ہے میاں سے بھی سگار
ذرا سی خرچ وہ بار ہم ہیں آٹھ سیں — روٹی بھر روٹی کا ہے نہ کوئی غم خوار
جو پیسے کسی کی مدد ہاتھ بٹا ہیں کسی کا — خود مصیبت میں ہوں تو ایک ہیں یار و اغیار

تجارت پیشہ

ملک کی ان کو تجارت کا سمجھانا نہ دیکھو — تر کر دیتے ہیں دکھائی جو یہ بڑھیا تجار
ان کے ہاتھوں یہ چلتی ہے وطن کی دولت — قوم کے سر پہ چلاتے ہیں یہی تو تلوار
نفع آتے ہیں نہیں سے جو سامان نہیں — ملک میں ان کی درآمد کے یہ ہیں ذمہ دار
ہیں یہ دلال اگر حیثیت اصلی دیکھو — غیر ملکوں کی یہ آڑھت کے ہیں فرمانبردار

تعلیم یافتہ

کیا چاہیں نہ وہ کاریگری سیکھیں ہاتھ کا کام — وہ تو اک نوکری پہ بیٹھے ہیں بس کھائے ادھار
بھول بیٹھے ہیں بزرگوں کے ہنر اور فن کو — ایک سے لے کے تو رہ گیا ان کا ہتھیار
اک اسامی کہیں خالی ہوئی پھر دیکھیں آپ — بابوؤں کی دو روپیہ رہ دفتر میں قطار
عرضیاں مضمون پر ہیں کرتے آتی ہیں — منت جو سے سفارش کے خطوں کے طومار

پیچ در پیچ کچھ الجھاؤ پڑے ہیں ایسے — عقل انسانی ہے سمجھانے میں جن کے بیکار
واقعی اس کا نتیجہ جو ہے وہ ظاہر ہے — ملک حاضر سے جو گھبرائے ہیں سب لی بیزار

ہے حکومت جو تھی دستِ ملیت کشال　　　کون امداد کرے کس کی سبھی ہیں ناچار

صفی لکھنوی کا 'دھر آشوب'

لسان القوم سید علی نقی صفی لکھنوی نے اپنی مثنوی تنظیم الحیات مطبوعہ ۱۹۲۵ء کے دیباچے میں اکتیس شعر کا ایک 'دہر آشوب' لکھا ہے۔ اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

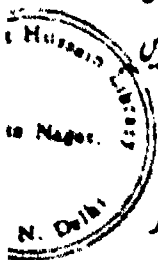
پُرشور و شر آج کل ہے آفاق　　　ایسے بگڑے ہوئے ہیں اخلاق
اگلوں نے لکھے تھے 'شہر آشوب'　　　مجھ کو لکھنا ہے 'دھر آشوب'
افریقہ و ایشیا و یورپ　　　ہر خطہ سواد کفر سے گھپ
چھائی ہوئی مادہ پرستی　　　فرضی فقط خدا کی ہستی
کمتر ان میں خدا کے بندے　　　اکثر حرص و ہوا کے بندے
فرماں بر نفس ہر کہ و مہ　　　باشندۂ شہر و ساکن دہ
جنباں رگ مادہ پرستی　　　ہر نفس میں انتہا کی پستی
کھانا پینا مزے اڑانا　　　جو اس پہ عمل کرے وہ دانا
افراد کو زعم کبریائی　　　انکار کو دعویٰ خدائی
مخصوص اقوام ابیض اللون　　　ایک ایک دماغ تخت فرعون
خونخوار آئین زندگی ہے　　　تہذیب بشر درندگی ہے
جب عقل فساد حکمراں ہو　　　درہم برہم نہ کیوں جہاں ہو

(تنظیم الحیات ص ۱۳-۱۵)

عمر انصاری کا 'دھر آشوب'

اخبار ترقی لکھنؤ کے یکم جولائی ۱۹۳۵ء کے پرچے میں عمر انصاری لکھنوی کا ایک مسدس 'دہر آشوب' کے عنوان سے شایع ہوا جس میں پچیس بند ہیں۔ ابتدا کے چند بندوں میں اپنے زمانے کی برائیاں بیان کرنے کے بعد اس مسدس میں 'قاضی' واعظ، مولوی، فلسفی، جوگی، سادھو، لیڈر، ماسٹر، حاسب علم، شاعر ہدف ملامت بنائے گئے ہیں۔ چند بند اور کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:

آج اک قصۂ دیرینہ سناتا ہوں میں　　　خواب غفلت سے زمانے کو جگاتا ہوں میں
عہد پارینہ اسے یاد دلاتا ہوں میں　　　خود بھی روتا ہوں جہاں کو بھی رلاتا ہوں میں
درد جا پہنچی ہے اس وقت نگاہیں میری
اب کسے روکے سے رکتی نہیں آہیں میری


... Hussain Library ... Nagar ... N. Delhi

نہ وہ ہم ہیں نہ وہ مستی ہے نہ وہ کیف و خمار　　　نہ وہ ساقی نہ وہ مطرب نہ وہ ہنگام بہار

نہ وہ دنیا نہ وہ عالم نہ وہ دشمن نہ وہ یار   نہ وہ صیاد نہ گلچیں نہ وہ گلشن نہ بہار
وہ محبت نہیں وہ مجمع احباب نہیں
وہ خریدار نہیں وہ درِ خوش آب نہیں
ساز کے ٹوٹے ہوئے تار ہیں محفل برہم   نغمہ مفقود ہے موجود ہے شورِ ماتم
گرد سے تیرہ و تاریک فضائے عالم   بلکہ غبار کا بستر ہے سراب شبنم
پھول مرجھائے گلستاں میں گرد چھٹی ہے
پتی پتی کفِ افسوس پڑی ملتی ہے

ان نظموں میں مختلف صنعتوں کا جو کمال انداز ہے:

زاہد اب وہ ہے کہ جس کو کوئی شب تاب نہیں   قاضی وہ ہے کہ جسے علم سے مطلب ہی نہیں

مولوی وہ ہے کہ تا ناف رکھے ریش دراز   صوفی وہ ہے کہ جسے ہو خرافات پہ ناز
جوگی وہ ہے کہ ہو عریانی پہ اپنی جسے ناز   شافی وہ ہے کہ جو اللہ کا ٹھہرے ہم راز
سامعہ وہ ہے جو گراں رہے کانا پیچے
سب سے بہتر وہی پیشہ ہے جو کھٹ پٹ سے
طالب علم وہ بہتر ہے کہ جب ناچ جانے   نعت شب کہہ کے جس طرح سے خوب سنائے
پھر وہ استاد جو وہ ناز کرے زیبا تانے   جلسہ لے جائے کے بعد ناز وہ گردن کر لے

ماشاء وہ ہیں کہ تعلیم کو کہتے ہیں جو آئیں   خانہ بدوش وہ کہ کچھ شعر سنائیں
پہلے جس طرح سے ممکن ہو کہیں خوب اڑائیں   گھر نہ جانے تو لوٹے سے وہ خدمت لائیں

شعراء ایسے کہ ہر اک کی ہے معانی نایاب   متفق کسی مطلب سے نہ ہو رائے صواب

زندہ وہ عمر میں کچھ فرق نہ سمجھا جائے   باندھ لے شاہ غزل جو جہاں سے پائے

بزم میں جا کے جو اچھا گا نہ گا لیتا ہے   گھٹنے دو دو کو وہ البتہ بجا لیتا ہے

اے مقرب ہیں زمانے کے یہی لیل و نہار — یعنی ہر مذہب وقت کے یہی ہیں اطوار
مجھ کو اچھے نہیں آتے ہیں نظر کچھ آثار — صاف کہتا ہوں کہ ہے صاف دلی میرا شعار
دہر آمادہ ہے کچھ رنگ بدلنے کے لیے
جانب غرب سے سورج ہے نکلنے کے لیے

یہی عشرت ہے تو پیدا کوئی زحمت ہوگی — یہی راحت ہے تو ظاہر کوئی کلفت ہوگی
یہی دن ہے تو یہاں شام مصیبت ہوگی — یہی شب ہے تو عیاں صبح قیامت ہوگی
پھر زمانے کے سب اطوار بدل جائیں گے
وہی دنیا وہی اوضاع کہنہ آ جائیں گے

شریر بن باسی کا 'شہر آشوب'

شریر بن باسی کا چوالیس بند کا مخمس 'شہر آشوب' کے عنوان سے اخبار 'ہمدم' لکھنؤ میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۲ء کو شایع ہوا۔ ایڈیٹر نے جو نوٹ اس پر لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریر اس وقت زندہ تھے اور اُن کا کلام ہمدم میں شایع ہوتا رہتا تھا۔ اس شہر آشوب میں شاعر پہلے خطۂ لکھنؤ کے پُر فضا باغ، پُر شکوہ عمارتیں، آباد محلے، اہل فن، اہل علم اور لکھنؤ والوں کی شیریں زبانی، خوش پوشاکی، شائستگی اور تہذیب یاد کر کے افسوس کرتا ہے۔ پھر دوسرے شہر آشوبوں کے خلاف مختلف پیشہ وروں کی جگہ مختلف اداروں کا حال زار بیان کرتا ہے اور منشی، پیر، فقیر، صوفی، عالم دین، مفتی، ڈاکٹر، سرجن، نرس، عطار، انجنیئر، معمار، چنگی کے ممبر، ٹیلی فون والیاں، لیکچرر، پروفیسر، ڈین، ایڈیٹر اور شاعر کی ہجو کرتا ہے۔ چند بند نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

کیا لکھنؤ کے شہر کی حالت کروں بیاں — باغوں کا شہر کہتے تھے جس کو کبھی میاں
جس کی صفت میں تھا کبھی رطب اللساں جہاں — ہوتا تھا جس پہ خلد بریں کا کبھی گماں
افسوس اس کو میٹ گیا دور آسماں

وہ باغ کیا ہوئے وہ گلستاں کدھر گئے — وہ بوستاں بہشت بہ داماں کدھر گئے
ہر شاخ سے طیور غزل خواں کدھر گئے — فوارے کیا ہوئے وہ خیاباں کدھر گئے
ہم نے کبھی تو ایسی نہ دیکھی کوئی خزاں

منشی نہیں دبیر نہیں منطقی نہیں — مُلّا نہیں فقیہ نہیں مولوی نہیں
مرشد نہیں مرید نہیں متقی نہیں — عارف نہیں فقیر نہیں باطنی نہیں
ڈھونڈا کہاں کہاں ملتا نہیں نشاں

ر یعنی لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔

جو پیر ہے فقیر ہے مرشد ہے شاہ ہے
چالاک ہے مریں ہے نامہ سیاہ ہے
اور صوفیوں کی جو بھی یہاں خانقاہ ہے
سب تو تماش بینوں کی آماج گاہ ہے
کیونکر نہ دل کی آگ سے اُٹھنے لگے دھواں

کالج یہاں پہ جتنے ہیں سب لاجواب ہیں
اسکول بھی ہمارے یہاں بے حساب ہیں
بیکار کچھ ہیں بعض حماقت مآب ہیں
بیکار مدرسے ہیں مکاتب خراب ہیں
بڑھ کر ہے جامعہ[15] تو از اندیشہ و گماں

گو ممبر ہیں ڈین ہیں اور ہیں پروفیسر
کچھ ان میں بے وقوف ہیں بعض ان میں بے خبر
کی بحث کم نگاہ قیامت کے بے ہنر
تنقید کی ہے فکر نہ تدریس پر نظر
پیسہ غریب لوگوں کا کرتے ہیں رائیگاں

آتا نہیں ہے کوئی ہنر اور ہیں شریر
نالائقی میں جن کی نہ ہوئے کہیں نظیر
بے شرم بے حجاب سیہ بخت اور فقیر
اب ایسے لوگ ہو گئے اخبار کے مدیر
جن کو لگانی بھی نہیں آتی ہیں سرخیاں

مطلب مروں سے نہ قوافی پہ ہے نگاہ
کیا ہو فصاحت اور بلاغت میں دستگاہ
ان شاعروں کے غزل سے اللہ کی پناہ
اک شعر پر بھی ہو گئی گر اُن کے واہ واہ
اپنے کو آپ سمجھتے ہیں خاقانیٔ زماں

سب ہو چکا بیان تباہی کا ماجرا
جو کچھ ہوا ہمارے گناہوں کی ہے سزا
ہر ایک دل سے اب تو نکلتی ہے یہ دعا
اُجڑا ہوا یہ دیس بسے پھر سے اے خدا
تو ہے کریم فضل کی اپنے دکھائے شاں

اس مخمس کا آخری بند نظیر اکبرآبادی کے 'شہر آشوب' کے آخری بند کی نقل ہے۔ دونوں بند ملاحظہ ہوا

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
مُلّا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے
اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند

قیدی کہو اسیر کہو لکھنؤ کا ہے
قاصد کہو سفیر کہو لکھنؤ کا ہے

---

۱۵ جامعہ ، یونیورسٹی

شاعر کو فقیر کو لکھنؤ کا ہے
احمق کو شریر کو لکھنؤ کا ہے
جو کسی طرح نہ اُس کی تباہی پہ نوحہ خواں

خاتمۂ کلام مسعود سعد سلمان سے شرؔ یربن باسی تک تقریباً نو صدیاں گزری ہیں۔ اس طویل مدت میں فارسی اور اُردو میں بہت سے شہر آشوب کہے گئے ہوں گے۔ ان میں سے چند جو راقم کے علم میں آئے اُن کا ذکر اور اُن کے نمونے اس مقالے میں تاریخی ترتیب سے پیش کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح جو شہر آشوب' کے مفہوم میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں اور اس کی ہیئت اور موضوع میں جو تنوّع پیدا ہوتا رہا' اُس کا ایک خاکہ قاریوں کے سامنے آگیا ہوگا اور یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبد الماجد دریا بادی

جو حلقۂ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن ہو نہ ہو، اس شان، اس ادا، اس خو کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے نظم حقیقت بنکر کی چلتی ہوئی، پچاس برس دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی؟ ایسی سچائی، نک سک سے درست، رنگ پکے سے راست، کجی کی مجلس ہوں یا یاروں سے صحبت کا جی، ذرا آپ دیکھئے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، شخصی، ہر قسم کے تذکرے اور زمزمے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر گنگنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کر رہے ہوئے ہیں اور صحبت کی گرم جوشی بیان کر رہی ہے ؎

ہے زبان میری ابر گوہر بار

گلشنوں نہیں پہ ان میں اور دل نہ گھبرائے، نہ اکتائے نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے غیرت اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑ گئی، وہ خلوت ہو یا جلوت، تقریر ہو یا تحریر، اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، اژدہا ہے کہ پھنکار رہا ہے، زلزلہ ہے کہ خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آگ پھر سانپ اگلتی ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شریعت ہر آنی کے دور کو چھوڑ کر قدم، زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر ملتی پر اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا، اشتعال کے سمندر سے جیسے موجیں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

ایک دن کی بات سنیے، کسی چشم دید قصہ کے سلسلے کا ذکر آج سے تینتالیس[۴۳] سال قبل سنہ ۲۲ء کا ہے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لکھنؤ یو۔ پی کا ایک مسلم و معروف دینی مرکز، انجمن خلافت مرکزی بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدودِ کفر میں داخل اور اس کے علمبردار دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنا ایک کانفرنس بھی اسی شہر میں کیجیے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا، اور گویا مخالفین کے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بگڑ اٹھے اور چلے کہ آج عام جلسہ کو جی بھر کر درہم برہم کیجیے اور بڑے سے بڑا فرق ہی کر کے واپس آئیے اور جلسۂ خلافت

ہ دامن کو اپنی معترضانہ تحریر سے تار تار کر کے رکھ دیجیے! ——— ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں انگلی اپنی

جام دیکھیے کیا ہو، مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ پیچھے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں آ اترا گیا۔ کشتی پر کشتی مارے ہوئے، داؤ پیچ کی استادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اس نے تقریر یہ مارا، وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری۔ ب یاد نہیں کہ صدر جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہرحال جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے ا نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، 'بلڑ گڑ' کی متوقع ——— لیکن ——— لیکن ...... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تحقیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں، نہ تعریض، نہ تشنیع، نہ تضحیک، نہ تنقیص! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ مناقشہ، نہ مکابرہ، نہ مجادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پیکروں میں گندھی ہوئی ——— حریف اب نا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان پھیکے پڑ کر رہ گئے، غالب کے پرزے اڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے علم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

جو پڑھا مثنوی میں تھا، اس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سنی ہی تھی کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دور دور سے اچھے ے بڑے سب کے سب کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدء فیض سے پائے ہوئے۔ رسمًا کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتاً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ع

شاگرد رشید حق تعالیٰ

ے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ سے نکالا تو صحافت کی صباحت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آ نکلے تو ڈپٹی بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور جب ویکلی 'الہلال' ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دور دور چمکا دیا اور یہ سب اس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں جب کلی کے کھلنے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے افق سے آفتاب سا نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبد الماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی اور مومن اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس تزک کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلم حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی اپنے زمانہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! بالکل سچی، نک سک سے درست، نوک پلک سے آراستہ۔ بزم کی محفلیں ہوں یا یاراں کے صحبت کا مجمع، تو آپ دیکھیے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر سنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے ہوئے ہیں اور حقیقت کی آمد ہے کہ زمین بچھا رہی ہے —

ہے زباں میری ابر گوہر بار

گھنٹوں نہیں پہروں بیٹھیے اور دل نہ گھبرائے، دماغ تھکنے نہ پائے۔

اور جو کہیں مرتبہ اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیر اخلاقی یا حس دینی پر پڑی، کہ وہ خلوت ہو یا جلوت، تنہائی ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، اثبات یا دعوے ہیں کہ دلائل کی خطابت کی آگ برسا رہا ہے اور زبان ہے کہ آگ پر صدا اٹھائے ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شرع جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر منطق پر اور نفس پر جیسے پہرا لگا ہوا! اشتعال کے سمندر سے جیسے موجیں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

ایک دن کی بات سنیے، لیکن چشم تصور کے سامنے زمانہ آج سے تینتالیس سال قبل ۱۹۲۱ء کا لے آئیے۔ وقت تحریک خلافت و تحریک ترک موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے لکھنؤ یو۔پی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز، اینٹی خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریک خلافت حدود کفر میں داخل اور اس کے علمبردار دائرۂ اسلام سے خارج۔ اور خلافت والوں کو یہ شوق کہ اپنی ایک کانفرنس بھی اسی شہر میں کیجیے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا، اور گویا مخالفین کے طبل جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بپھر اٹھے، چلے کہ آج عام جلسہ کو بھی درہم برہم کیجیے اور جلسے کو مزہ ہی چکھا کے واپس آئیے اور جلسہ خلافت

ے دامن کو اپنی معتراضی تحقیر سے تار تار کر کے رکھ دیجیے ! ——— ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے منہ میں اُنگلی اپنی

انجام دیکھیے کیا ہو، مناظرہ، ٹکراؤ، تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ لیجیے جلسہ شروع ہو گیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا ایک پہلوان، شہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں اُتارا گیا، کشتی پر کشتی مارے ہوئے، داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس نے تقریر یہ مارا، وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے جاری۔ اب یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہرحال جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہونے لگے کہ لوہے کی کاٹ کے لیے وہ نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر، ہلڑ گلڑ کی متوقع ——— لیکن

——— لیکن .... یہ کیا! تقریر تو شروع ہو کر ختم بھی ہو گئی اور کہیں نہ تحقیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں، نہ توہین، نہ تشنیع، نہ تضحیک، نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ مشاجرہ، نہ مکابرہ، نہ مبادلہ! تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی ——— حریف اب رد بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان چپٹا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے حلم و تدبر کے آگے سرد ہو کر دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغِ حلم از تیغِ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہو گیا اور دُور دور اسی دھوکے میں پڑے سب کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہو گا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کتنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہونے۔ فیض بس منبعِ فیض سے پائے ہوئے۔ رسماً کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ؏

شاگردِ رشیدِ حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کلکتہ نے علاوہ وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آ نکلے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور جب وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکا دیا اور یہ سب اُس سن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہوتے ہیں۔ جب کل کے کچھ بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آب و تاب سے نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

مولانا ابوالکلام کی شخصیت

مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کوئی مردِ مومن اس آن، اس شان، اس سج دھج، اس خو بو کا ہو یا نہ ہو، ان آنکھوں نے ایک تصویر تو اقبال کے قلمِ حقیقت رقم کی کھینچی ہوئی، پچھے زمانہ میں دیکھ لی۔ اور تصویر بھی کیسی! اپنی سجاوٹ، نوک پلک سے آراستہ، ناک نقشہ سے درست، بزم کی محفلیں ہوں یاراں کی صحبت، سامنے آپ دیکھیے کہ مولانا کے منہ سے کس طرح پھول جھڑ رہے ہیں، لطیفوں پر لطیفے، دینی، ادبی، سیاسی، علمی، ہر قسم کے تذکرے اور تبصرے، لطیف و شگفتہ، ایک سے بڑھ کر ایک، کہیں شعر گنا رہے ہیں، کہیں بول چال کی نثر کو شعر بنائے دے رہے ہیں، ادبیت کی آمد ہے کہ برابر جاری رہتی ہے —

ہے زباں میری ابر گوہر بار

لفظوں میں میٹھے رس بھرے ہوئے اور دل نہ گھبرائے، نہ اکتائے، نہ پچھتائے۔

اور جو کہیں موقع اس کا آگیا کہ چوٹ مولانا کے ضمیرِ اخلاقی یا حسِ دینی پر پڑی، وہ خلوت ہو یا جلوت، تخلیہ ہو یا مجمع، تحریر ہو یا تقریر، اب سماں ہی دوسرا ہے۔ ایک شیر ہے کہ گرج رہا ہے، ایک ثابت و راسخ دیو ہے کہ دلائل کی، خطابت کی آگ برسا رہا ہے، اور زبان ہے کہ آپ ہی صدا لگا رہی ہے کہ

ہے قلم میرا تیغ جوہر دار

لیکن جوش و خروش کے عالم میں بھی شرح جوانی کے دور کو چھوڑ کر قلم یا زبان قابو سے باہر نہیں، قابو کے اندر، منطق پر اور نفس پر جیسے پہرا بیٹھا ہوا، جذبات کے سمندر سے جیسے لہریں اٹھ رہی ہیں اور حلم و متانت کی چٹان سے ٹکرا کر واپس چلی جا رہی ہیں۔

اب دن کی بات نہیں، لیکن چشمِ تصور کے سامنے زمانہ آج سے بیتالیس[42] سال قبل ۱۹۲۰ء کا ہے آجیے۔ وقت تحریکِ خلافت و تحریکِ ترکِ موالات کی بھرپور جوانی کا۔ بچہ بچہ کی زبان پر خلافت کے پرجوش نعرے اور "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کے ترانے۔ لکھنؤ، یو۔پی کا ایک معلوم و معروف دینی مرکز، یہیں خلافت مرکز بھی۔ اس کے مفتی کا حکم کہ تحریکِ خلافت حدودِ کفر میں داخل اور اس کے ممبران دائرۂ اسلام سے خارج۔ ادھر خلافت والوں کو یہ سوجھی کہ اپنی ایک کانفرنس عین اسی شہر میں کیجیے ——— اچھا صاحب، جلسہ ہوا اور گویا مخالفین کے طبلِ جنگ پر چوٹ پڑ گئی۔

مخالفین بپھرا اٹھ کر چلے کہ آج عام جلسہ کو تتر بتر کر کے درہم برہم کیجیے اور بیڑے کو غرق ہی کر کے واپس آئیے اور جلسۂ خلافت

کے دامن کو اپنی معتراضی تکفیر سے تار تار کرکے رکھ دیجیے! ـــــــــ ادھر خلافت والے بھی فکر مند کہ آج تو

ہے سانپ کے مُنہ میں اُنگلی اپنی

انجام دیکھیے کیا ہو؟ مناظرہ "ٹکراؤ" تصادم تو رکھا ہی ہوا ہے۔ لیجیے جلسہ شروع ہوگیا۔ مخالفین کی طرف سے میدانِ خطابت کا پہلوان، شہ زور اور ریلی تن اکھاڑے میں اُتارا گیا کُشتی پر کُشتی مارے ہوئے، داؤں پیچ کی اُستادی میں نام پائے ہوئے۔ اور اُس تقریر یہ مارا، وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔ جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظ کے اب یاد نہیں کہ صدرِ جلسہ خود مولانا ابوالکلام ہی تھے یا کوئی اور، بہرحال جوابی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے لوگ سمجھے کہ لوہے کی کاٹ کے لوہا نکلا اور بس کوئی دم میں اینٹ کے جواب میں پتھر چلا۔ ادھر پولیس ہر طرح لیس، ہنگامے فساد کی منتظر "ہلڑ گُلڑ" کی متوقع ـــــــ لیکن ـــــــ لیکن . . . . . . یہ کیا! تقریر تو شروع ہوکر ختم بھی ہوگئی اور کہیں نہ تکفیر نہ تفسیق، اور یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں طنز، تعریض، نہ تشنیع نہ تضحیک نہ تفضیح! شروع سے آخر تک بس تفہیم و تذکیر، تشریح و تبیین، نہ مناظرہ نہ متاخرہ، نہ مکابرہ، نہ مباد لہ تقریر دلائل و حقائق کے رنگ میں رنگی ہوئی، معقولیت اور سلامت روی کے پھولوں میں گندھی ہوئی ـــــــ حریف اب کرتا بھی تو کیا کرتا۔ سارے ارمان چیپٹا کر رہ گئے، غالب کے پُرزے اُڑنے کی جو خبر گرم تھی وہ مولانا کے حلم و تدبّر کے آگے سرد دھری کی دھری رہ گئی اور تماشا ہو نہ پایا! ؎

تیغ حلم از تیغ آہن تیز تر
بل ز صد لشکر ظفر انگیز تر

شعر پڑھا مثنوی میں تھا، اُس کا سماں آنکھوں سے آج دیکھ لیا۔

قدرت نے گویا پیدا ہی بڑائی کے لیے کیا تھا۔ کم سِن ہی تھے کہ تحریر و تقریر دونوں کا شہرہ بلند ہوگیا اور دُور والے اسی دھوکے میں پڑے رہے کہ یہ لڑکا کوئی بوڑھا ہوگا۔ اور شاگرد تو علوم و فنون میں کہنا چاہیے کہ کسی کے بھی نہ ہوئے۔ فیض بس مبدِء فیض سے پائے ہوئے۔ رسماً کسی سے کچھ پڑھ پڑھا لیا تو اور بات ہے ورنہ حقیقتہً شاگردی کے نام سے ناآشنا اور مصداق ع

شاگردِ رشید حق تعالیٰ

کے بنے ہوئے۔

خدنگِ نظر لکھنؤ کا ایک ادبی ماہنامہ تھا، اس کے صفحات پر جب نظر آئے تو خود ہی مرکزِ نظر بن گئے۔ لسان الصدق کو نکالا تو وقت کی صحافت میں چار چاند لگا دیے۔ الندوہ کے کوچۂ علم و فضل میں جب آنکلے تو اڈیٹر بنے بغیر اڈیٹر بن گئے اور وکیل (امرتسر) ہاتھ میں لیا تو اس کا نام دُور دُور چمکا یا اور یہ سب اُس سِن کی باتیں ہیں جب لڑکے کالج کے درجوں میں پڑھتے ہیں، جب کلی کے پھول بننے کا وقت آیا اور اپنا ذاتی ہفتہ وار کلکتہ کے اُفق سے آپ نے نکالا تو

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ نام کا الہلال چند ہی روز میں ماہ دو ہفتہ یا بدر کامل تھا۔ انگلیاں ہر طرف سے اٹھنے لگیں اور مرحبا اور [illegible] پھول ہر شہر اور ہر قریہ سے برسنے لگے۔

تقریر و تحریر کی جامعیت جیسی اس بھرپور شخصیت کے حصہ میں آئی کم تر ہی کسی کے نصیب میں آئی۔ خطابت میں اپنی [illegible] تھے۔ اردو میں خطابت کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ عین زندگی سے لے کر شام حیات تک سینکڑوں نہیں ہزاروں تقریریں کر ڈالیں، ہر تقریر انتخاب جگہ اپنی جگہ اور جواب مخالفین کے مجمع میں یہ جوہر اور زیادہ چمکتا اور ان کے ہوائی قلعوں کو دم کے دم میں ڈھا دیتا۔ جواب کے پہلو ہو یا نقد ہو، سے عوام یا خواص کی زبان پر بھی "دندان شکن" ہے لیکن ابوالکلام کی تقریر نے نہ کسی کا دانت توڑا نہ جبڑا، کانوں کی راہ سے سیدھی دل میں اترتی اور وہیں اپنی جگہ بنا لیتی۔

تحریر و انشا میں اپنے اسلوب کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ شروع میں اسلوب بیان ذرا ثقیل تھا اور کتاب تذکرہ میں تو ثقیل سے ثقیل تر الفاظ و ترکیبات لیکن جاذبیت نے لطافت اس حال میں بھی نہ چھوڑی۔ رفتہ رفتہ ثقل لطافت میں تبدیل ہو گیا۔ غبار خاطر و کاروان خیال شگفتہ بیانی کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ دین کی خدمت علمی رنگ میں اپنی تفسیر کے ذریعہ سے بھی کی اور متعدد فقہی رسالے جو اپنی یادگار چھوڑ گئے وہ اس کے علاوہ ——— ان کی ادبی شخصیت کی وسعت اور بلندی دونوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ہزارہا صفحات پر چھاپ لگی ہوئی ان کی انفرادیت کی، ان کے قلم کے بانکپن کی، ان کی خدمت تخلیق کی۔ زبان کے باب میں کیا ملکہ لے کر آئے تھے: لکھنؤ میں مستقل قیام کچھ زیادہ لمبا نہیں رہا تھا، چند ہی ہفتے تو شاید رہے تھے۔ لیکن زبان لکھنؤ کی نزاکتوں پر وہ عبور حاصل کر لیا کہ جیسے سدا کے لکھنؤ ہی ہوں

سیاسیات نے ادھر جب قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ نوبت یہ پہنچی کہ سردار پٹیل سے ایسا لوہا منوا لیا اور گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے ان کا کلمہ ہی پڑھنے لگے، کلمہ ان کی پر جوش خطابت کا نہیں، کلمہ ان کی فہم و فراست کا، دانش و بینش کا، دور بینی اور تدبر کا ——— کسی دوسرے کی شخصیت سے مرعوب بلکہ متاثر ہونا تو شاید ابوالکلام نے عمر بھر جانا ہی نہیں، البتہ اپنی شخصیت سے دوسروں کو متاثر کرتے رہے۔ نظریاتی اختلاف کیا دینی، اور کیا سیاسی، اپنے معاصرین میں خدا معلوم کتنوں سے تھا اور وہ ہونا لازم تھا ہی لیکن اپنے ذاتی تعلقات میں فرق نہ کسی دینی اختلاف سے آنے دیا نہ کسی سیاسی اختلاف سے اور نہ اپنی طرف سے کسی اختلاف کو مخاصمت میں تبدیل ہونے دیا ——— حیدر آباد میں پولیس ایکشن کے بعد جو انقلاب آیا اس کی لپیٹ میں قریب تھا کہ عربی زبان اور اسلامی علوم کا نادر و نامور ادارہ دائرۃ المعارف گردش روزگار کی نذر ہو جائے، عین وقت پر ابوالکلام کی شخصیت آڑے آئی اور اس نے اس بین الاقوامی ادارہ کو قائم و برقرار رکھ کر بھارت کے سیکولرزم کا بھرم قائم رکھا اور اپنے ملک و وطن کی نیک نامی پر آنچ نہ آنے دی۔



بابائے اردو

ذکرِ عبد الحق

مولوی عبد الحق، ترتیب: معین الرحمٰن

"چند ہم عصر" مولوی عبد الحق کا معروف نثری مجموعہ ہے۔ مختلف اوقات میں لکھی گئی ان تحریروں کو سب سے پہلے مولوی عبد الحق کے ایک عزیز شاگرد شیخ چاند (مرحوم) ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ (ریسرچ اسکالر، جامعۂ عثمانیہ) نے جمع کیا، لیکن وہ اسے اپنی زندگی میں طبع نہ کرا سکے۔ اُن کی موت کے بعد یہ مجموعہ سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیِ اُردو (ہند) نمبر ۱۹۲ کے تحت اب سے کوئی پچیس برس پہلے شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں چودہ ۱۴ مضامین شامل تھے۔ اِن میں سے کچھ تو رسالوں میں پہلے چھپ چکے تھے، کچھ اس مجموعے کے لیے خاص طور پر لکھے گئے اور بعض شیخ چاند مرحوم نے کتابوں کے تبصروں یا مولوی عبد الحق کے خطوط سے اقتباس کر کے اس میں داخل کر دیے۔ شیخ چاند کا خیال تو یہ بھی تھا کہ ہر تصویر کے ساتھ صاحبِ مضمون کی تصویر بھی لگا دی جائے لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ دُوسرا ایڈیشن اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت، منیجر انجمن ترقیِ اُردو (ہند) دہلی کی مختصر "التماس" کے ساتھ جمال پریس دہلی سے ۱۹۴۲ء میں طبع ہوا۔ اس میں راس مسعود اور میرن صاحب کے حالات کا اضافہ کیا گیا جو رسالہ "اُردو" میں شائع ہوئے تھے۔ نام دیو مالی کا تذکرہ خاص طور پر اسی ایڈیشن کے لیے لکھا گیا۔

یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ تقسیمِ ہند کے بعد، نظرِ ثانی و اضافہ کے ساتھ اس کا تیسرا ایڈیشن سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان نمبر ۱۹۲ کے تحت قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی (مرحوم) کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ سرسید پر مولوی عبد الحق کا بسیر حاصل مضمون اسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ چوتھا ایڈیشن انجمن کے اسی سلسلۂ مطبوعات کے تحت تحسین سروری کے دیباچے کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں چھپا، جس میں عبد الرحمٰن صدیقی، حسرت موہانی، پروفیسر اقبال، پروفیسر ری۔ ہٹ سک اور عبد الرحمٰن بجنوری پر مضامین کا اضافہ کیا گیا۔ "چند ہم عصر" کا پانچواں ایڈیشن بھی انجمن ہی کی جانب سے شایع ہوا۔ اس پر سالِ اشاعت کہیں درج نہیں لیکن انجمن کے کتب خانۂ خاص میں نسخے کے اندراج سے سالِ اشاعت ۱۹۵۹ء قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نواب عماد الملک پر مضمون اسی ایڈیشن میں پہلی بار شامل ہوا۔

"چند ہم عصر" کا چھٹا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن مولوی عبد الحق کے اپنے مختصر دیباچے کے ساتھ

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی کی طرف سے ۱۹۵۹ء میں شایع ہوا۔ اس ایڈیشن میں منشی امیر احمد مینائی پر مضمون، جو مولوی عبدالحق نے امیر مینائی کی وفات ہی کے روز لکھ کر رسالہ "افسر" میں شایع کر دیا تھا، اس اعتذار کے ساتھ حذف کر دیا ہے کہ: "یہ بہت ہی سرسری مضمون ہے جس میں نہ پوری سیرت نگاری ہے اور نہ اُن کے کلام پر مکمل تبصرہ۔"

آخری ایڈیشن میں کل چوبیس[24] شخصی خاکے شامل ہیں، جن میں سے مرزا حیرت پر مضمون مولوی عبدالحق کا لکھا ہوا نہیں ہے، اس کی نشاندہی اُنھوں نے دیباچے میں کی ہے۔ بقیہ تیئیس[23] خاکوں میں سب سے پرانی تحریر پروفیسر ری۔ جے۔ ٹی۔ بک پر ہے، جو پہلی بار رسالہ "افسر" شمارہ جون ۱۹۰۱ء میں چھپی اور جسے "چند ہم عصر" کے چوتھے ایڈیشن میں شامل کیا گیا۔ آخری خاکہ خالدہ ادیب خانم کا ہے جو لکھا "چند ہم عصر" کے اس ایڈیشن ہی کے لیے گیا تھا لیکن پہلی بار یہ ہفت روزہ "لیل و نہار" کے سالنامہ ۹، اپریل ۱۹۵۹ء (جلد: ۹ شمارہ نمبر ۱۵) میں شایع ہوا۔ اس طرح یہ سیرتیں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۵۹ء تک کوئی ساٹھ سال کی طویل مدت میں مختلف مواقع پر لکھی گئیں۔ اس صدی کا یہ عرصہ ہی قریب قریب مولوی عبدالحق کی زندگی کا عملی دور بھی ہے۔ اُردو کے رشتے سے اپنی زندگی میں مولوی عبدالحق کا بے شمار افراد سے براہِ راست اور قریبی تعلق رہا۔ شناساؤں کی کثرت اور وقت کے اس پھیلاؤ کے باوصف صرف ان چند ممدوحین کا انتخاب اپنی جگہ قابلِ غور اور توجہ طلب ہے۔

مولوی عبدالحق کو سمجھنے کے لیے ایک بات پیشِ نظر رکھنی بہت ضروری ہے۔ "بیکاری اور بیگاری" اُن کی طبعِ بلند رسا کی ضد تھیں۔ وہ عمر بھر مصروف رہے اور جو کام بھی کیا جی سے کیا، پیشہ وری کے داغ سے اپنے دامن کو کبھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہ خاکے بھی نہ سیرت نگاری کی خانہ پُری کے لیے لکھے گئے اور نہ سیرت کشی کے لیے افراد کا یہ انتخاب ہی اضطراری تھا۔ دراصل وہ زندگی کے وسیع میدان میں ان افراد سے کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طور متاثر ہوئے اور اسی داخلی ربط نے اُن سے یہ خاکے لکھوائے۔ منشا محض ان معنوں ہی میں نہیں کہ ان شخصیتوں کو اُنھوں نے اپنے تئیں آدمیت و انسانیت کی مثالی اقدار، عظمت و بزرگی اور بڑائی کا معیار جانا، یقیناً اُنھوں نے ایسا جانا اور سمجھا اور شاید شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کی پیروی بھی کی ہو، لیکن اس سے ہٹ کر اس انتخاب اور چناؤ کے پس پشت بہت کچھ ان افراد سے خود مولوی عبدالحق کی اپنی ذہنی ہم آہنگی، طبعی رجحان و میلان اور قدرِ حیات کے اصولوں اور ضابطوں میں یک گونہ اشتراک کو بھی دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "چند ہم عصر" کے نگارخانے میں قدم قدم پر ہمیں

مولوی عبدالحق کی اپنی سیرت کی جھلکیاں اور پرچھائیاں ملتی ہیں ۔ انھوں نے اپنے بعض بزرگوں اور ہم نشینوں کی سیرت و کردار کے جو خاکے اور نقشے تیار کیے ہیں، اُن میں غیر شعوری طور پر انھوں نے اپنی ہی طبیعت کا رنگ کچھ یوں بھر دیا ہے کہ اُن کے آئینہ خانۂ فن کے عرض میں اُن کی شخصیت کا جوہر تڑپتا نظر آتا ہے اس طرح ہم عصروں کے اس انتخاب کے سہارے ہمیں خود مولوی عبدالحق کی سیرت تک رسائی میں بڑی مدد ملتی ہے اور یہ اس دستاویز کا بہت ہی دلچسپ اور نادر پہلو ہے۔

مولوی عبدالحق کی مُرقع نگاری سے متعلق اپنے ایک مضمون (ادبی دُنیا : شمارہ نہم) میں ضمناً "چند ہم عصر" کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ :

> شخصیتوں کی آڑ میں اُن کا 'شوقِ بے اختیار' دیدنی ہوتا ہے اور اُن
> پر 'عشق پیشہ' میر کے ایسے آفتِ زماں کا گمان ہونے لگتا ہے جو
> 'اپنے سارے مطلب پردے میں ادا کرے ہے'۔

اپنے اس بیان کے حق میں بخوفِ طوالت میں نے مثالیں پیش کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ ذیل کا یہ مضمون اس فرض کی ادائیگی کے لیے وقف ہے۔ دیکھیے کہ در بیانِ حکایتِ دیگراں مولوی عبدالحق نے اپنی ذات و صفات سے کیسے نقاب اُٹھائے ہیں۔ یہ مضمون تمام کا تمام مولوی عبدالحق کی اپنی زبان و عبارت میں ہے، جسے میں نے "چند ہم عصر" کے مضامین سے اقتباس کیا ہے ۔ عبارت کے اصل حوالہ جات صفحہ وار ذیلی حاشیے میں دے دیے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں "چند ہم عصر" کا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۵۹ء کا نسخہ میرے پیشِ نظر رہا ہے۔

مضمون میں ربط اور تسلسل قائم رکھنے کے لیے مجھے ضمیروں اور صیغوں میں خفیف رد و بدل کرنا پڑا ہے لیکن اسے جہاں تک ممکن ہو سکا' قوسین کے ذریعے نمایاں کر دیا گیا ہے تاکہ تشابہ اور التباس کا امکان باقی نہ رہے۔ اِس کے علاوہ مضمون کی واقعیت کے اتمام کے لیے ایک فنی رعایت کے ساتھ کچھ تعزیتی پیغامات اور تاریخی قطعات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ میں اس ضمن میں ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری، پروفیسر حامد حسن قادری اور حضرت رئیس امروہوی کا ممنون ہوں کہ ان بزرگوں نے اس مضمون کے لیے مجھے اپنے رشحات سے نوازا اور "رعایتِ خاص" کے استقرار میں میری مشکل کشائی فرمائی۔ بیجا نہ ہوگا اگر میں یہاں اپنے بزرگ حکیم اسرار احمد کریوی کا شکریہ بھی ادا کر دوں، جن کی رہ نمائی مجھے حاصل رہی۔

معین الرحمن

خطاب یا نام اتفاق سے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مسمی کی خصوصیات کا ان میں مطلق لحاظ نہیں ہوتا۔ نام رکھتے وقت تو ممکن ہی نہیں، خطاب کے وقت بھی اس کا خیال نہیں کیا جاتا لیکن "بابائے اردو" عبدالحق مرحوم کا نام اور خطاب (دونوں) اُن کے لیے بہت ہی موزوں نکلے ——— فرہاد کو شیریں سے اور قیس کو لیلیٰ سے اتنا عشق نہ ہوگا جتنا انہیں (اردو) سے تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے بس اُن کا اوڑھنا بچھونا۔ وہ بلا مبالغہ فنافی (الاردو) کے درجے کو پہنچ گئے تھے (اور) سچائی، بات کی اور معاملے کی، اُن کی سرشت میں تھی خواہ جان ہی پر کیوں نہ بن جائے۔ وہ سچ کہنے سے کبھی نہ چوکتے تھے اس میں انہیں نقصان بھی اٹھانے پڑے۔ مگر وہ سچائی کی خاطر سب کچھ گوارا کر لیتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) مرحوم عجیب و غریب شخص ہوئے ہیں۔ وہ مختلف، متضاد اور غیر معمولی اوصاف کا مجموعہ تھے۔ اگر انہیں ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشیر سے تشبیہ دی جائے تو کچھ زیادہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان دونوں میں عظمت و شان ہے لیکن دونوں میں خطرہ اور تباہی بھی مرکوز ہے۔

وہ بہت بڑے ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے محقق تھے۔ . . . . . . وہ آزادی کے دل دادہ اور جبر و استبداد کے پکے دشمن تھے لیکن اگر کبھی ان کے ہاتھ میں اقتدار آ جاتا تو وہ بہت بڑے جابر اور مستبد ہوتے۔ وہ محبت و مروت کے پتلے تھے اور دوستوں پر جان نثار کرنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتے تھے کہ دوستی اور محبت طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ دوست بھی اُن کے جاں نثار اور فدائی تھے، لیکن اس طرح بچتے تھے جیسے آتش پرست آگ سے بچتا ہے۔ وہ اپنے رفیقوں اور مددگاروں کے ساتھ بڑی شفقت اور عنایت سے پیش آتے تھے اور طرح طرح کے سلوک کرتے تھے لیکن جب بگڑتے تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے اس وقت انہیں نہ کسی کی عزت و آبرو کا خیال رہتا تھا نہ اپنے کام کا۔ اسی لیے وہ ہم کاروں سے نباہ نہ سکے اور وہ لوگ جنہیں وہ کچھ سمجھ کر لائے تھے آخر کار ایک ایک کر کے الگ ہو گئے (لیکن)۔ غصہ ہو جانے کے بعد پوچھتے تو بالکل صاف ہو جاتے اور دل پر مطلق میل نہیں رہتا تھا۔ یہ ان میں لاکھ خوبیوں کی ایک خوبی تھی۔

مرحوم (ہاپوڑ) کے ایک نہایت شریف و نجیب خاندان سے تھے۔ شادی آخر عمر تک نہ کی۔ وہ میانہ قد اور اکہرے جسم کے آدمی تھے۔ چہرے سے ان کے رعب و داب اور متانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ بھاری بھرکم، سر بڑا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور دیکھنے سے رعب اور اثر پڑتا تھا۔ سفید گول داڑھی رکھتے اور ہمیشہ شیروانی پہنتے۔ اُن کی ٹوپی اکثر ترکی ہوتی تھی۔ کھلا گندمی رنگ، خوبرو آدمی تھے. . . . سفید داڑھی بھلی معلوم ہوتی تھی. . . . جامہ زیب تھے ہمیشہ ہندوستانی لباس پہنتے تھے. . . . اُن کے قوا بہت اچھے تھے۔ صحت قابل

---

(۱) چند ہم عصر صفحہ ۱۳۱ محسن الملک
(۲) صفحہ ۳۵ ۱۵۲ مولوی محمد علی ...
(۳) صفحہ ... ...
(۴) صفحہ ۱۹۲ مرحوم ... ...
(۵) صفحہ ۲۰۰ سر سید احمد خاں
(۶) صفحہ ... مولوی سید علی بلگرامی
(۷) صفحہ ... مولوی چراغ علی
(۸) صفحہ ... نواب عماد الملک
(۹) صفحہ ۲۴۳ گدڑی کا لال نور خاں
(۱۰) صفحہ ۹۷ مولوی سید علی بلگرامی
(۱۱) صفحہ ۲۵۵ خاصہ ادیب تھا ...

نک تھی ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور نہ کبھی میرا سر دکھا۔ کبھی کبھار زکام البتہ ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ
ماغ صاف ہو جاتا ہے۔ اُن کا . . . . . پُر رعب چہرہ، اُن کی شان اور اُن کا وقار ایسا تھا کہ درحقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔
ن کے اکثر ہم عصر اور ہم رتبہ لوگ اُن کا بہت احترام اور ادب کرتے تھے اس طرح ملتے تھے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ علاوہ شکل و صورت کے لوگوں پر اُن کے علم و فضل اور قابلیت کا بھی رعب پڑتا تھا۔

. . . بچپن سے ذہین و ذکی مشہور تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ اپنے ہمسروں میں ممتاز رہے اور (اعزاز) کے
ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تمام طالب علم (سوائے بعض کھلنڈروں کے) اور پروفیسر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے . . . . . . خود سرسید مرحوم انھیں اُن کی قابلیت کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم کی یہ خوش نصیبی تھی کہ انھوں نے بزمانۂ
یام (علی گڑھ) ایسے ماہرینِ فن اور علمائے نامور سے تلمذ حاصل کیا جو اس وقت آسمانِ فضل و کمال کے آفتاب و ماہتاب تھے مثلاً
پروفیسر (آرنلڈ) پروفیسر (بیک) پروفیسر (ماریسن اور شبلی وغیرہ) جن میں سے ہر ایک اپنے فن میں یکتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں
ن سے پہلے اور غالباً اُن کے بعد بھی کوئی ایسا طالب علم نہیں ہوا جس کا مطالعہ ایسا گہرا، معلومات ایسی وسیع اور جو کام کرنے میں
یسا انتھک ہو . . . . وہ ہمیشہ علمی معاملات پر گفتگو کرتے . . . . وہ درحقیقت علی گڑھ کالج کے سپوت تھے۔

یہ مولوی عبدالحق کی خوش نصیبی تھی کہ اُن کی والدہ بڑی دانش مند اور نیک سرشت بی بی تھیں اور اُن میں انسانی اخلاق
کی بہت سی خوبیاں تھیں (مولوی عبدالحق) کی زندگی پر اُن کا بڑا اثر تھا۔ جس طرح انھیں طالب علمی میں مولانا (شبلی) جیسے بے مثل
ادیب استاد ملے اسی طرح اس کے بعد سرسید اور مولانا حالی جیسے عالی خیال پیشوا بھی نصیب ہوئے۔ ان بزرگوں نے اُن کے خیالات
اور ادب پر بہت بڑا اثر ڈالا مگر وہ عمر بھر طالب علم ہی رہے۔ مصلحت وقت اور زمانہ شناسی اُن کے نصیب میں نہ تھی اور جو کبھی
بدنصیبی سے انھوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم میں لغزش کھائی۔ اس چیز کے لیے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیے
اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے اُن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ایام طالب علمی و ملازمت میں وہ جہاں کہیں رہے انھوں نے اپنے
فرض منصبی کو ایسی مستعدی و جفاکشی اور دیانت کے ساتھ ادا کیا کہ لوگ قائل ہو گئے اور جب قومی خدمت پر کمر باندھی تو اسے
بھی خوش اسلوبی، بے نفسی اور بے ریائی کے ساتھ انجام دیا اور ثابت کر دیا کہ حبّ وطن اور قومی درد کسی خاص طبقے یا
کسی خاص عمر پر موقوف نہیں ہے۔

اُن میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک شریف انسان میں ہونی چاہییں۔ گھر میں اُن کی تربیت والدہ کی زیر نگرانی ہوئی اور یہ
ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے جو نکتے اس فرزانہ اور نیک بیوی نے اپنے عمل اور قول سے
اُن کے دل میں بٹھا دیے تھے وہ عمر بھر نہ بھولے اور اُن پر عامل رہے۔ بڑے ہو کر جو صحبت ملی وہ اس زمانے کے بہترین افراد

---

۱ صفحہ ۲۷۴ درویش پروفیسر ری ہیٹ مک
۲ صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
۳ صفحہ ۱۰۹ خواجہ غلام الثقلین
۴ صفحہ ۹۶ مولوی محمد عزیز مرزا
۵ صفحہ ۱۰۵ سر سید راس مسعود
۶ صفحہ ۱۰۸ خواجہ غلام الثقلین
۷ صفحہ ۲۴۶ سر سید احمد خاں
۸ صفحہ ۲۳۱ سر سید احمد خاں
۹ صفحہ ۴۸ مولوی چراغ علی
۱۰ صفحہ ۸۱ مولوی سید علی بلگرامی
۱۱ صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم

تھے۔ اُن میں سے ہر ایک جوہر قابل تھا۔ اُن کے نام اب تک ہمارے ادب میں عزت سے لیے جاتے ہیں۔ تحریک [illegible]
بڑی چیز ہے۔ علم سے لگاؤ تھا۔ اہل علم اور ارباب سخن کی صحبت نے صحیح ذوق پیدا کیا۔ مطالعہ کا شوق پہلے سے تھا۔ [illegible]
محنت رسی کا ملکہ قدرت نے ودیعت کیا تھا اُن سب کے بل پر اُنھوں نے وہ کام کیے جو رہتی دُنیا تک یادگار رہیں گے۔

طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد وہ حیدرآباد آ گئے۔ اگرچہ ابتدا میں وہ معمولی خدمت پر مقرر ہوئے لیکن [illegible]
اور قابلیت کی وجہ سے اُنھوں نے یہاں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس میں شک نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کو مولانا [illegible] پروفیسر
نہیں مل سکتا تھا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ جس یونی ورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے وہاں اُردو کا پروفیسر بھی ایسا ہی ہونا چاہیے
جو اس کی شان اور ضرورت کے مناسب ہو۔ اُنھوں نے اس جامعہ کے طلبہ میں جو علمی اور ادبی ذوق پیدا کیا وہ اُنھیں کا کام تھا۔
اور یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تعلیم کا اصل منشا ذوق پیدا کرنا ہے اور پھر وہ اپنا رستہ خود نکال لیتا ہے۔

حیدرآباد کی زندگی عجیب و غریب زندگی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ یہاں کے اطراف و حوالی کا اثر انسان پر نہ پڑے اور کچھ نہیں
تو کاہل تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن مرحوم کی جفاکشی اور مستعدی میں آخر دم تک فرق نہ آیا۔ وہ کبھی راست بازی اور دیانت کے راستے
سے نہ ہٹے۔ اُن کی زندگی جیسی سادہ اور بے ریا تھی ویسے ہی آخر دم تک رہی۔ غالباً مولوی (عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص
نے سرکاری کام کبھی اس قدر بے تعلق اور بے غرض ہو کر انجام نہ دیا ہوگا۔ وہ رعایت اور جانبداری جانتے ہی نہ تھے۔ معاملات
میں وہ بالکل بھول جاتے تھے کہ اُن کا تعلق کسی انسان سے ہے۔ صرف واقعات اُن کے پیش نظر رہتے تھے اور انھیں پر سے وہ
بے رو رعایت فیصلہ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اہل حیدرآباد جو ان باتوں کے عادی نہیں اُن سے کبھی خوش نہیں رہے۔ لیکن آخر
میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے کون ہے جس میں
کوئی عیب نہیں اور خامی کسی صفت نہ ہو۔ اُن کی زندگی نہایت سادہ اور بے ریا تھی۔ باوجود جاہ و منصب اور قیام حیدرآباد
کے کبھی عہدے سے بھی راحت و عیش کی طرف مائل نہ ہوئے اور ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

جب اہل علم میں سے کوئی شخص حیدرآباد میں وارد ہوتا خواہ وہ کہیں کا ہو تو اُن کی یہ بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اُن کا مہمان
ہو چنانچہ (مختلف موقعوں پر مشہور قوم پرست ترک خاتون خالدہ ادیب خانم اور رؤف بیگ، سابق امیر البحر ترکی) جب
حیدرآباد تشریف لائے تو مولوی (عبدالحق مرحوم) کے مہمان ہوئے۔

کوئی پچاس سال ہوتے ہیں جب .... آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چند صیغے الگ الگ قائم ہوئے
(ترقی اُردو) کا صیغہ اُن کے سپرد ہوا۔ اُنھوں نے اپنے اس فرض کو جس مستعدی اور قابلیت سے انجام دیا وہ مخفی نہیں ہے۔
کانفرنس کے کئی صیغے تھے اور ان کے بعض سیکرٹری بھی اُن سے زیادہ نامور نامور لوگ تھے لیکن جیسا (ترقی اُردو) کا صیغہ

---

1 صفحہ ۵۹ مولوی محمد عزیز مرزا
2 صفحہ ۹۰-۱۵ مولوی [illegible] علی
3 صفحہ ۹۰ مولوی سید علی بلگرامی
4 صفحہ ۱۲۰ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
5 صفحہ ۹۵-۹۶ مولوی محمد عزیز مرزا
6 صفحہ [illegible] مقدمہ تنقید
7 صفحہ ۹۴ مولوی محمد عزیز مرزا
8 صفحہ ۹۳ مولوی محمد عزیز مرزا

چمکا دہ بات کسی صورت سے غیب نہیں ہوتی۔

(شیخ سر عبدالقادر[1] کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اُردو کے صدر (عبدالحق) ہی منتخب ہوئے۔ انجمن سے اُنھیں بڑا شغف تھا اور اس پر اُن کا بڑا احسان ہے۔ اس کے لیے اُنھوں نے جگہ جگہ سے چندے وصول کیے (اور) بلا مبالغہ سُخنے، قدمے، درمے مدد دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا بلکہ سب سے آگے رہتے تھے۔ انجمن پر جب کوئی کٹھن وقت آیا تو وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے وُہ تو اپنی ذات[2] سے ایک انجمن تھے!

مرحوم[3] نے حیدر آباد سے ایک ادبی رسالہ "اُردو" نامی (۱۹۲۱ء) میں جاری کیا تھا جس کے چیف ایڈیٹر مرحوم ہی تھے سالہا سال[4] تک (یہ رسالہ) اُن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس رسالے نے ادبی ذوق کے پھیلاؤ میں بڑا کام کیا۔ اس میں اچھے تنقیدی اور ادبی مضمون نکلتے رہے۔ رسالہ اُردو[5] سے اُنھیں خاص لگاؤ تھا۔ (خود) اُن کے بعض بہترین مضامین "اُردو" میں (ہی) شائع ہوئے (یہ رسالہ[6] جاری کر کے (اُنھوں نے) اپنے اندازِ تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے (مضمون) نویسی کا پایہ بڑ(ھایا) (اس) کے ذریعے اُردو ادب میں انقلاب پیدا کیا (اور) ٹائپ کو رواج دیا۔ لیکن افسوس[7] ہے کہ (یہ رسالہ اُن کے انتقال) کے بعد بند ہو گیا۔ ایسے رسالوں اور اخباروں کی اب بھی ضرورت ہے۔

(مرحوم[8]) بحیثیت ایک عام انسان کے ایک عجیب و غریب شخص تھے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی نسبت رائے قائم کرنے میں لوگوں کو مغالطہ ہوتا ہے۔ عموماً ہر شخص دُوسرے سے اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق توقع رکھتا ہے اور چونکہ وہ تقریباً ہر شخص سے جُدا اور نرالی طبیعت رکھتے تھے اس لیے بہت کم لوگ ایسے تھے جو اُن کی صحیح طور سے قدر کر سکتے تھے۔ مثلاً مولوی صاحب مرحوم ایک تو طبعاً خاموش طبع تھے اور دُوسرے اُنھیں اپنے وقت کی قدر بہت تھی۔ (وہ[9]) ایک کم سخن...... فلاسفر مزاج کو وقار اور عالی خیال شخص تھے (اور وقت[10]) ایسی بیش بہا شے کو فضول باتوں میں ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہر وقت[11] مطالعہ یا غور و فکر یا لکھنے میں مصروف رہتے تھے اور ایسے وقت میں کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ[12] اسی وجہ سے وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے سے بہت گھبراتے تھے اور جو لوگ ملنے آتے تھے اُن سے صرف کام کی بات کے سوا دُوسری بات نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے بہت جلد ملاقات ختم ہو جائے۔ یہی[14] نہیں کہ بات چیت کم کرتے ہوں بلکہ فضول اور زائد باتوں سے اُنھیں طبعی نفرت تھی اور جو کوئی[15] خواہ مخواہ دیر لگاتا تھا اور نہیں ٹلتا تھا تو وہ بہت جُز بز ہوتے تھے...... اور سوائے بعض ہم مذاق احباب کے کسی سے زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن چھوٹے بچوں سے بے تکلف باتیں کرتے تھے اور ان سے مزے مزے کے سوالات کرتے اور ان کے سوالوں کے جواب نہایت شرح و بسط اور خوبی کے ساتھ دیتے...... لیکن جب لڑکا سیانا ہو جاتا اور اس میں ادب و تمیز پیدا ہو جاتی تو پھر اُس سے باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ چھوٹے بچوں میں جو بھولا پن

---

[1] صفحہ ۲۰۲ سر سید راس مسعود
[2] صفحہ ۳۶۶ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
[3] صفحہ ۱۷۱ حکیم امتیاز الدین
[4] صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی
[5] صفحہ ۳۶۲ مولانا حسرت موہانی
[6] صفحہ ۱۲۱ مرزا وحید الدین سلیم
[7] صفحہ ۲۸۹ سر سید احمد خاں
[8] صفحہ ۷۷ مولوی سید علی بلگرامی
[9] صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
[10] صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی
[11] صفحہ ۴۰ مولوی چراغ علی
[12] صفحہ ۴۳ مولوی چراغ علی
[13] صفحہ ۴۱-۴۰ مولوی چراغ علی
[14] صفحہ ۴۲ مولوی چراغ علی
[15] صفحہ ۴۱ " "

خیال کے ظاہر کرنے میں بے تکلفی اور سادگی، گفتگو میں بے ساختہ پن اور سب سے بڑھ کر جو مساوات ہوتی ہے وہ جیسے ہو کر نہیں رہتی بڑے ہو کر خیال کے ظاہر کرنے میں کچھ تصنع اور کچھ ادب اور لحاظ مانع ہوتا ہے۔ پھر وہ مساوات کا خیال بھی نہیں رہتا طرح طرح کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے چھوٹے بچے پیارے ہوتے ہیں اور اگر کوئی بتانے والا ہو تو اس وقت انھیں بہت کچھ سکھا سکتا ہے۔

اگرچہ بہت کم باتیں کرتے تھے مگر معاملات میں خوب گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں بھی کوئی لفظ زائد اور فضول نہیں کہتے تھے اور ان کا جملہ اکثر دو تین یا ایک دو لفظ سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ صرف کام کے دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے جس میں مافی الضمیر ادا ہو جائے۔ جب کسی کتاب میں کچھ بنا دیتے تو گویا ساری تحریر میں جان ڈال دیتے تھے۔ اگرچہ وہ خاموش طبع تھے اور ان میں علاوہ متانت پائی جاتی تھی لیکن اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں خوب باتیں کرتے تھے جس سے ان کی زندہ دلی کا ثبوت ملتا تھا۔

زندہ دلی اُن کی فطرت میں تھی۔ اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات اور واقعات اُن پر ہجوم کر کے ٹوٹ پڑتے تھے لیکن اُن کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے بلکہ بزرگوں سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ یہ زندہ دلی اُن کے کٹھن کام میں سہارے کا کام دیتی۔ (اُن کے چہرے پر (بالعموم) مسکراہٹ۔ جس کو بھی دیکھ کر خوشی ہوتی تھی۔ وہ بچوں میں بچے، جوانوں میں جوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے۔ غم اور فکر کو پاس نہ آنے دیتے تھے اور ہمیشہ خوش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے تھے۔ اُن سے ملنے اور باتیں کرنے میں غم غلط ہوتا تھا اور آخر دم تک اُن کی زندہ دلی ویسی ہی رہی۔ اُن کے دوستوں کو اُن کی زندہ دلی، خوش طبعی، اُن کے لطیفے اور اُن کے سفر کے عجیب و غریب واقعات ...... ہمیشہ یاد آئیں گے۔ اُن کی ظرافت، خوش طبعی اور شوخی کے چٹکلے اور لطیفے ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں جو افسوس کسی نے جمع نہیں کیے اگر ان کے خطوط جو تعداد میں بے شمار تھے یکجا مرتب ہو جائیں تو ان میں علاوہ اور بہت سے نکتوں کے ان کی ظرافت کے پُر لطف لطیفے بھی ملتے۔ اُن کے خطوط کا جو مجموعہ شایع ہوا ہے وہ اصل خطوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ظرافت دلیل ذہانت ہے اور زندہ دلی سلامت طبع اور رجائیت کی نشانی ہے۔ یہ کام کے بار گراں کو ہلکا کرنے میں سب سے بڑی معین اور ایک کثیر الاشغال شخص کے لیے بعض کٹھن منزلوں کے طے کرنے میں سب سے اچھا بدرقہ ہے۔

جن صاحبوں کو اس بے نظیر شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ ہر فن میں خواہ ادب ہو یا فلسفہ یا تاریخ وہ ایسی باریکیاں پیدا کرتے تھے کہ خود اس فن کے ماہرین بھی دنگ رہ جاتے تھے۔ قدرت نے (مولوی عبدالحق) مرحوم کو بہت سی خوبیاں عطا کی تھیں۔ وجاہت، ذہانت، خوش بیانی اور فیاضی اُن کی ایسی عام اور ممتاز صفات تھیں کہ ایک راہ چلتا بھی

۱۔ صفحہ ۱۰ مولوی چراغ علی
۲۔ صفحہ ۱۳۹ گزری کا لال نوزعلی
۳۔ صفحہ ۱۴۸ سید محمود
۴۔ صفحہ ۲۵۰۔۵۸ ڈاکٹر محمد اقبال
۵۔ صفحہ ۲۹۰ ۔ عبدالرحمٰن صدیقی
۶۔ صفحہ ۱۴۱ محسن الملک
۷۔ صفحہ ۲۳۷ سر سید احمد خاں
۸۔ صفحہ ۲۴۹ سر سید احمد خاں

منٹ کی بات چیت میں معلوم کر لیتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی۔ کوئی ہو، کہیں کا ہو، اُن سے چھوا نہیں اور کندن ہو نہیں۔ اُن[۱] کی باتیں نہایت پُرلطف اور مزے کی ہوتی تھیں۔ ان میں ایک جادو ہوتا تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص ہر فرقے میں مقبول تھے۔ وہ[۲] بڑے پُر اثر اور پُر جوش مقرر تھے اور بلا تکلف تقریر کرتے تھے لیکن تقریر سے زیادہ اُن کی تحریر پُر زور اور شاندار ہوتی تھی۔ چنانچہ اُن کے بعض مضامین اُردو انشا پردازی کے بہت عمدہ نمونے ہیں۔ اُن کے قلم[۳] اور آواز میں بڑا زور تھا۔ اُن کے چہرے سے اُن کی طباعی اور ذہانت معلوم ہوتی تھی۔ باتیں[۴] مزے لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ جلدی اُن کے مزاج میں نہ تھی۔ آواز میں شیرینی اور دل کشی تھی۔ اکثر لوگ جو ان سے ملنے یا کسی معاملے میں گفتگو کرنے آتے تو ان کی ذہانت اور لیاقت کے قائل ہو جاتے۔

حافظہ[۵] اُن کا بڑے غضب کا تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لی یا نظر سے گزر گئی وہ پتھر کی لکیر تھی۔ (وہ) صبح[۶] کے نو بجے سے شام کے ۵ بجے تک لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اُن کا علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا زندہ انسائیکلوپیڈیا تھے۔ اور اس لیے اُن کی باتیں نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھیں۔ کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اُن کے سامنے پیش کیجیے وہ کوئی نہ کوئی بات ـــ مزور سمجھا دیتے۔

وہ بڑے ظریف بھی تھے۔ اُن کی ظرافت عجیب شان کی ظرافت تھی۔ ان کے ایک ایک ٹھٹول میں دو دو مضمون و نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعہ اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتے تھے۔ اُن کے خاص لفظ اور جملے جن میں جدت اور طباعی کی بو پائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چبھتے ہیں اُن کا لب و لہجہ (اور) اُن کی شیریں بیانی بعض اوقات . . . . . . انسان کو پھڑکا دیتی تھی۔ اُن کی گفتگو میں جو سحر تھا وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے اُن سے باتیں کرنے میں جو سبق حاصل ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ ورنہ صحیح نتیجے کا اخذ کرنا محال ہے۔ رسوم کی پابندی، عادت کی بندش ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑ چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سے معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی۔ وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتے جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا اور معمولی سے معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتے تھے جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مفید نہیں ہو سکتی لیکن افسوس کہ اب ہم اُن کی صحبت سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے گو وہ ہم میں سے تھے مگر اُن کی باتیں ہم سے نرالی تھیں ؎

یا وہ جوہری الگ تھا جوہرِ انسان سے ۔۔۔ یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے[۱]

---

(۱) صفحہ ۴ سید محمود
(۲) صفحہ ۸۰ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی
(۳) صفحہ ۷۰ مولانا سید علی بلگرامی
(۴) صفحہ ۳۶۶ آ، عبدالرحمن صدیقی
(۵) صفحہ ۲۲۱ میرن صاحب
(۶) صفحہ ۳۷۳ ڈروئیل پروفیسر ہٹ سک
(۷) صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
(۸) صفحہ ۱۳۶ محسن الملک
(۹) صفحہ ۵/۲ سید محمود

وہ[۱] بڑے ذکی الحس (اور) کسی قدر نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے[۲] خوددار (بھی) تھے اور کسی ایسی بات کو جو [illegible] کے خلاف ہوتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ[۳] جس کام کو لیتے تھے اس میں ہمہ تن منہمک ہو جاتے تھے اور چاہتے تھے کہ جو [illegible] آگ اُن میں ہے وہی دوسروں میں بھی ہو لیکن یہ کہاں ہوتا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جہاں ہمیں پتھروں سے سر پھوڑنا ہے۔ [illegible] ظاہر ہے کہ مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی اُنھیں پریشان کر دیتی تھی۔ چنانچہ انھیں ناکامیوں اور ناکامیوں نے اُنھیں ایک بار (صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں سے رجوع ..... ہونے پر) مجبور کیا۔

مخالفت[۴] سہنے کا اُن میں عجیب و غریب مادہ تھا۔ کیسا ہی اختلاف ہو وہ صبر کے ساتھ سہتے رہتے تھے جواب دیتے تھے لیکن بحث نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات اعتراضات اور نکتہ چینی پر (ضرور) غصہ آتا تھا خاص کر جب[۵] کسی دوست کی طرف سے مخالفت ہوتی تو انھیں بڑا صدمہ ہوتا تھا۔ وہ[۶] دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس میں وہ بہت مبالغہ کرتے تھے اور اکثر عقل پر جذبات غالب آ جاتے تھے کارزارِ دنیا میں بڑے بڑے کام نہیں چلتا یہاں ہو کے بھی سہنے پڑتے ہیں، زخم بھی کھانے پڑتے ہیں، سر بھی دینا پڑتا ہے جو اس کے لیے تیار نہیں اس کے لیے بہتر ہے کہ پیچھا ہو جائے بلکہ سرے سے اس میدان میں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے (لیکن) رائے[۷] کے اختلاف سے ذاتی تعلق اور ملاقات میں کبھی فرق نہ آتا۔ ان معاملات میں وہ خوب بحث کرتے اور بعض اوقات شدت کے ساتھ لیکن اُن کا دل صاف ہوتا ... وہ عمر بھر مخالفتیں برداشت کرتے رہے اور (آخر آخر) یہ اُن کے لیے معمولی بات ہو گئی تھی۔

وہ[۸] نہایت ذہین، فہیم، صاحب الرائے، جفاکش، مستقل مزاج اور اپنے ارادے کے پکے تھے۔ کام[۹] سے سچا لگاؤ تھا اور اسی میں اُن کی جیت تھی۔ بڑے[۱۰] غور و خوض کے بعد رائے قائم کرتے اور رائے قائم کرنے کے بعد پھر اس سے کبھی نہ ٹلتے تھے گویا وہ رائے پتھر کی لکیر ہوتی تھی۔ آدمی[۱۱] مفکر بھی ہو اور عمل بھی ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے ...... (وہ) جو کہتے اور سمجھتے تھے اس پر عامل بھی تھے۔ وہ ہمیشہ[۱۲] علمی مباحثوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے تھے ..... اُن کی رایوں میں خاص بات ہوتی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کے دماغ کا نتیجہ ہیں جو غور و فکر کا عادی ہے۔ (لیکن) مرحوم[۱۳] میں ایک بڑا نقص تھا کہ بعض اوقات خود غرض لوگوں کے بہکانے سے بہک جاتے تھے (اور) ایسی باتیں کر گزرتے تھے جو ان کی شان کے شایاں نہ ہوتی تھیں۔

عام[۱۴] طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور ہوتا ہے — آرام طلبی ہم میں کچھ موروثی ہو گئی ہے (لیکن وہ) مستعد[۱۵] ایسے تھے کہ اچھے اچھے جوان اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دن ہو یا رات ہو، ہر وقت کام کے لیے تیار۔ ہر طرح کے کام کرنے والے تھے۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے تھے (نثری رسالے) اور (اردو) کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔ معترضین کے جواب بھی دیتے تھے۔ (اردو) کالج کے حساب

ف۱ صفحہ ۱۰۱ سر سید راس مسعود
ف۲ " ۱۱۱ خواجہ غلام الثقلین
ف۳ " ۲۴۰ سر سید احمد خاں
ف۱۱ " ۲۴۰ "
ف۱۲ " ۲۳۰ [illegible]
ف۱۳ " ۲۴ خواجہ غلام الثقلین
ف۱۹ " ۱۳۴-۳۵ [illegible]

ف۴ صفحہ ۱۰۰ سر سید راس مسعود
ف۵ " ۱۶۲ حالی
ف۷ " ۱۰۰ سر سید راس مسعود
ف۱۱ " ۲۹ مولوی چراغ علی
ف۱۲ " ۲۸ "
ف۱۶ " ۱۰۲ مولوی سید علی بلگرامی
ف۲۰ " ۲۲۵-۲۶ سر سید احمد خاں

ف۳ صفحہ ۲۴۳ سر سید احمد خاں
ف۶ " ۱۹۸ سر سید راس مسعود
ف۹ " ۲۴۴ مولانا حسرت موہانی
ف۱۰ " ۱۵ مولوی چراغ علی
ف۱۵ " ۱۸۰ حالی
ف۱۸ " ۲۲۸ نام دیو مالی

کتاب اور دُوسرے اہم کاموں کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے، مُلاقاتیوں سے ملتے۔ ۔ ۔ ۔ کِس کِس کام کا ذکر کیا جائے کاموں کا ایک ہجوم تھا جسے وہ استقلال اور اطمینان سے صُبح سے لے کر شام تک برابر کرتے رہتے تھے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں بھی اُن کے انہاک اور محنت کا یہی حال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کام اور محنت کرنے ہی سے انسان بنتا ہے اور اسی سے اس کی سیرت بنتی ہے اور اسی سے اس کے دماغی اور اخلاقی قوا کی جلا ہوتی ہے۔ اس سے مُراد وہ کام ہے جس کے کرنے میں انسان کو لذّت ملے اور شوق اسے اور اُبھارے، ورنہ کام، کام نہیں رہتا بیگار ہو جاتی ہے۔ (عبدالحق) کا یہی حال تھا وُہ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا کام ایسے شوق اور تندہی سے کرتے تھے گویا اُن کی دُنیا اور عاقبت کا انحصار اسی پر ہے۔

اُن[1] کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا اور ان کی مستعدی کو دیکھ کر دل میں اُمنگ پیدا ہوتی تھی۔ ان کی زندگی بے لوث تھی اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں صرف ہوتا تھا۔ مجھے وہ اکثر یاد آتے ہیں اور یہی حال ان کے دُوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسے اچھے آدمی تھے۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

وُہ[2] بہت سادہ مزاج، بھولے بھالے اور مُنکسر المزاج تھے مگر بکارِ[3] (اُردو) ہوشیار اور بکارِ دُنیا بے کار تھے۔ اُن[4] کی کاردانی اور کارگزاری ریاست حیدر آباد میں ضرب المثل (تھی) وُہ کام کرنے میں بجلی اور محنت کرنے میں آندھی تھے۔ معاملات کی تہ کو اس قدر جلد پہنچتے تھے کہ جن لوگوں نے انھیں معاملات کو ہفتوں اور مہینوں مُطالعہ کیا تھا وُہ بھی دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سرکاری خدمت کی کٹھن اور دُشوار منزلوں کو اُنھوں نے ہمیشہ اس آسانی سے طے کیا کہ کبھی ان کی طبیعت پر گراں نہ گزرا جو کام دُوسرے لوگ آٹھ آٹھ دس دس گھنٹوں میں طے نہیں کر سکتے تھے۔ وُہ مرحوم نے دو تین گھنٹوں میں بھگتا دیا اور پھر اس دقیق النظری کے ساتھ کہ کیا مجال کہ کوئی بات رہ جاتے اپنے فرائض نہایت دیانت داری اور دلچسپی کے ساتھ ادا کیے۔ اور نہ کبھی کام کرنے سے اُکتائے اور نہ آج کا کام کل پر چھوڑا ـــــــ تعلیم[5] یافتہ شخص کے یہی معنی ہیں کہ وہ جس کام پر ہاتھ ڈالے اسے حُسن وخُوبی کے ساتھ ادا کرے۔ خُدا[6] نے اُنھیں ایسا جوہر عطا کیا تھا جس کے سامنے بڑی بڑی تصانیف کی کچھ حقیقت نہیں، وُہ جوہر ان کی غیر معمولی دماغی قوت تھی جو نہ امتحانات کے پاس کرنے سے حاصل ہوتی ہے نہ کتابوں کے پڑھنے اور فضیلت کی دستار باندھنے سے۔ مرحُوم کی ذہانت، قابلیت اور وُسعتِ معلومات پر ایک عالم گواہ ہے۔

اگرچہ[7] بظاہر اکھڑ تھے مگر دل میں خلوص تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوستوں کے قدر دان تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تصنّع سے دُور نہایت بے تکلف اور آشنا پرست تھے۔ وہ[8] کم آمیز اور دیر آشنا تھے مگر نہایت[9] باوضع، دوستی کے پکے اور صادق القول شخص تھے۔

ر۱ صفحہ ۳۰، گمشدگی کا حال نوز خاں
ر۲ صفحہ ۹۰ مولوی محمد عزیز مرزا
ر۳ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
ر۴ صفحہ ۲۱۱ میرن صاحب
ر۵ صفحہ ۲۳۰ نام دیو ـــ مالی
ر۶ صفحہ ۹۱ مولوی محمد عزیز مرزا
ر۷ صفحہ ۱۵۷/۵۸ الشیخ غلام قادر گرامی
ر۸ صفحہ ۱۵۸ الشیخ غلام قادر گرامی
ر۹ صفحہ ۲ سید محمود
ر۱۰ صفحہ ۲۴۸ سرسید احمد خاں

وہ اُن کے سچے ہمدرد اور اُن کی بہبودی اور سلامتی کے خواہاں تھے اور جس سے جو تعلق ہوگیا اُسے آخر دم تک نبھایا۔ ...... وہ دوستی کے مقابلے میں رشتے ناتے کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ "اگر ساری دنیا قبضے میں ہو اور کوئی دوست نہ ہو تو وہ ہیچ ہے اگر ساری دنیا کے بدلے میں ایک دوست ہاتھ لگ جائے تو ارزاں ہے"۔ لیکن اُن کی دوستی آسان نہ تھی۔ وہ کہا کرتے تھے دوستوں میں جانے اور بہت سے دوست پیدا کرنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اور بہت سی فضول اور بے مصرف باتیں کرنا پڑتی ہیں بجز دو تین خاندانوں کے اور کسی سے راہ و رسم نہ تھی مگر جن کے ساتھ محبت تھی خلوص دل سے تھی۔

وہ مصیبت کے وقت کام آتے اور ایسی حالت میں بے طلب مدد کے لیے پہنچتے اور جہاں تک امکان ہوتا وہ ہر قسم کی مدد کرتے۔ اُن کی دوستی پرانے لوگوں کی سی دوستی تھی جو دوست کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ وہ جس طرح دوستی میں پکے تھے اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھے۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے، ذاتی فائدے کے لیے ایمان بیچنے کے لیے تیار ہو جاتے یا قوم سے غداری کرتے اُن سے نفرت ہی نہیں انھیں سخت عداوت ہو جاتی تھی وہ ایسے لوگوں کو کبھی اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے جو بدتمیز یا گندے ہوتے چونکہ وہ خود صاف گو تھے اس لیے غیبت کو پسند نہیں کرتے تھے خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہ کرتے تھے (وہ خود بھی) دوست کا اختلاف گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دوستی پرانے وقتوں کی دوستی تھی۔ پرانے بزرگ اسی پہ عامل تھے کچھ بھی کہے یا کچھ بھی کرے وہ اور بھلا کے دوست کا ساتھ دیتے۔

قدامت اور جدت عجب طرح سے اُن کے مزاج میں سموئی ہوئی تھیں۔ قدامت ایسی کہ اچھے اچھے پرانے بزرگ اُن کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے تھے اور جدت ایسی کہ نئی روشنی کے ستارے بھی اُن کے آگے ماند تھے۔ وہ کسی ملازم کی شکایتیں سننے کے بعد برطرف نہ کرتے۔ یہ بات اُن میں پرانی تہذیب کی تھی۔ میں نے ایسے کئی بزرگوں کو دیکھا ہے کہ جب انھوں نے کسی پر اعتماد کر لیا تو پھر کوئی کچھ کہا کرے اور کیسی ہی شکایت کرے اُن پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا بلکہ اُلٹا خفا ہونے لگتے اسی قسم کی مروت (مولوی عبدالحق) میں بھی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے "خانۂ مروت خراب" چنانچہ اُن کے (ایک پروردہ نوجوان) کے معاملہ میں یہی ہوا۔ یہ شخص (لکھنو) کے (ایک) ممتاز خاندان کا تھا۔ ...... بارہا اُن تک شکایت پہنچی کہ یہ آدمی قابل اعتماد نہیں ہے (کسی ذریعۂ معاش کے باوجود) بڑی شان سے رہتا ہے۔ اُس کی دیانت مشتبہ ہے۔ میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تھا۔ وہ فی الحقیقت رئیسوں کی طرح رہتا تھا۔ ان شکایتوں کے جواب میں وہ کہتے کہ شریف زادہ ہے گھر سے خوشحال ہے۔ وہ صاف ستھرا اور سلیقے سے رہتا ہے تو لوگ اُس سے جلتے ہیں۔

اُن میں قدیم وضع اور جدید تہذیب کی بعض خوبیاں اس خوش اسلوبی سے باہم ملی ہوئی تھیں کہ اس امتزاج نے اُن

۱۔ صفحہ ۳۰۹۔ ۳۳۳ سرسید احمد خاں
۲۔ صفحہ ۳۰۹ سرسید احمد خاں
۳۔ صفحہ ۲۰۰۔ ۳۰۰ درویش پروفیسری بٹ سک
۴۔ صفحہ ۱۱۶ حکیم امتیاز الدین
۵۔ صفحہ ۲۲۳ نواب عمادالملک
۶۔ صفحہ ۲۶۶/۹۰ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
۷۔ صفحہ ۲۲۱ سرسید احمد خاں

ا روشن زندگی میں ایک قسم کا حسن پیدا کر دیا تھا۔ وہ[1] کبھی کبھی مغربی مزاج کے آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اکثر وہ ٹھیٹ ہندی تھے۔ اُن[2] کی طرزِ معاشرت پُرانے اور نئے دونوں طبقے کے لوگوں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ تھی۔

وہ اگرچہ کبھی کبھی رنجیدہ ہو جاتے تھے لیکن یہ[3] عارضی صورت ہوتی تھی کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص اور محبت سے ملتے جیسے پہلے ملا کرتے تھے۔ کبھی[4] دل میں کینہ یا بغض نہیں رکھتے تھے۔ اُن کا فیض عام تھا دوست، دُشمن بلا امتیاز اس سے متمتع ہوتے تھے۔ انتقام کا کبھی خیال نہ کیا بلکہ جن لوگوں نے اُن سے بُرائی کی اُنھوں نے اس کا بدلہ ہمیشہ بھلائی سے دیا اور بیسیوں مثالیں ہمارے سامنے ایسی موجود ہیں کہ دوستوں سے بڑھ کر اُنھوں نے دشمنوں کو نوازا۔

حقیقت[5] یہ ہے کہ (مجموعی طور پر) اُن کو دوست بھی ایسے ملے تھے کہ اُن پر جان چھڑکتے تھے اور یہ اُن کی بڑی خوش نصیبی تھی۔ یہ سب (مولوی عبدالحق) کے خلوص، سچائی، راست بازی اور محبت کا اثر تھا۔ اس جاں[6] لیوا بیماری میں (اُن کے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی، اُن کے نیاز مند متین الرحمٰن مرتضیٰ اور (اُن) کے ملازم (بنارس خاں) نے جیسی خدمت کی نہ جو رو کر سکتی تھی نہ فرزند کر سکتا تھا (یہ) اُن کی خفگی، درشتی اور چڑچڑے پن کو ہنس ہنس کے گوارا کرتے تھے اور اُنھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔

(مولوی[7] صاحب کو) عامیانہ خیالات سے بہت چڑ (اور) جھوٹ[8] سے سخت نفرت تھی۔ جھوٹے کو کبھی مُنہ نہیں لگاتے تھے ہمارے شرفا مروت میں آکر یا تالیفِ قلوب کی خاطر یا اس خیال سے کہ دل شکنی نہ ہو سچ کو چھپاتے یا جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں یا ایسے کام کی حامی بھر لیتے ہیں جو وہ نہیں کر سکتے یا ان کا کرنا ان کے ضمیر کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ کذب یا پشیمانی ہوتا ہے (مولوی عبدالحق) کا مسلک بالکل صاف تھا جب وہ کسی کام کو نہیں کر سکتے تھے یا نہیں کرنا چاہتے تھے یا اسے اپنے اصول اور وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ وہ[9] راست گفتاری اور صاف گوئی میں نیک نام نہیں بدنام تھے۔ اُنھوں[10] نے اپنے خیالات کو کبھی نہیں چھپایا۔ جو دل میں تھا وہی اُن کی زبان اور قلم پر تھا۔ کبھی اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے اُن کی ذات کو نقصان پہنچے گا۔ اُن کی زندگی میں اکثر ایسے موقعے آئے جب اُن کے خیر اندیش اور مخلص دوستوں نے ان کو کسی فعل سے باز رہنے کی صلاح دی اور دُنیاوی اعتبار سے معاملے کی اُونچ نیچ سمجھائی لیکن اُنھوں نے وُہی کیا جو اُن کے ضمیر نے کہا اور ہمیشہ کمال اخلاقی جرأت سے کام لیا۔ بے ریائی اور صداقت عمر بھر ان کا شعار رہا۔

مصلحت[11] کا داغ اُن کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے اور جو چاہتے کر گزرتے تھے جہاں کسی نے غلطی کی ٹوک دیتے تھے کبھی یہ نہ سوچا کہ اس کا محل و موقع بھی ہے یا نہیں یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں

---

1. صفحہ ۲۰۴ سر سید راس مسعود
2. صفحہ ۲۹۰ آہ! عبدالرحمٰن صدیقی
3. صفحہ ۲۹۰ ؍؍
4. صفحہ ۲۱۴ نواب عماد الملک
5. صفحہ ۶۳ مولوی محمد عزیز مرزا
6. صفحہ ۶۴ ؍؍
7. صفحہ ۱۰۴ نواب عماد الملک
8. صفحہ ۳۲۷ سر سید احمد خاں
9. صفحہ ۶۴ مولوی محمد عزیز مرزا
10. صفحہ ۳۴۰ سر سید احمد خاں
11. صفحہ ۲۱۵ نواب عماد الملک
12. صفحہ ۱۱۹ مولانا وحیدالدین سلیم

یہ اکثر ناراض ہو جاتے تھے۔ اُن کے مذہب میں وہ آزادی کے قائل تھے لیکن رائے کی آزادی میں وہ سب سے آگے تھے۔ وہ اصول پر ست باز اور بے لوگ تھے کہ سچ بات کہنے میں کبھی کسی کی پروا نہیں کرتے تھے اس لیے بعض لوگ ان سے خوش نہیں رہتے تھے مگر ان کی لیاقت اور سچائی کے سب قائل تھے۔

انھوں نے ہمیشہ ہر جگہ سچ کی حمایت اور آزادی کی تائید کی۔ اصول کی خاطر دنیاوی نقصان اٹھایا، دوستوں کی ناراضگی اور لیڈروں کی خفگی برداشت کی لیکن اصول نہ چھوڑا۔ وہ حساب کے کھرے، بات کے کھرے اور دل کے کھرے تھے۔ وہ انگریزی سوسائٹی کو پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے آداب و تکلفات کو مہمل سمجھتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انگریزوں کی قوم محض حبِ جاہ و مال میں مبتلا رہتی ہے اور اسے صرف روپیہ کمانا اور اس کا صرف کرنا آتا ہے۔ اور باقی کسی دوسری بات کی پروا نہیں۔ وہ انگریزی قوم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے (دوسری قوموں کی نسبت مرحوم کا خیال تھا کہ یہ پچاس سال میں فنا ہو جائیں گے کیونکہ ثروت کا مدار تجارت پر ہے اور یہ لوگ تجارت چھوڑ کر نوکری کی طرف ڈھل رہے ہیں۔

اُن کا گھر مہمان سرائے تھا۔ آنے جانے والے کھانے کے وقت بے تکلف اُن کے گھر پہنچ جاتے اور وہ اس سے بہت خوش ہوتے تھے۔ . . . . . بعض اوقات ٹولیاں کی ٹولیاں پہنچ جاتی تھیں اور وہ اُن کی دعوتیں بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔ اُن کی مہمان نوازی دیکھ کر سب ان کی ضرب المثل مہمان نوازی یاد آتی تھی۔ ہندوستان اور بیرونِ ملک کے سیاح اور علما کے لیے اُن کا مکان مہمان خانہ تھا اور بڑی فراخدلی کے ساتھ میزبانی ادا کرتے تھے۔ بڑے دل سے خاطر تواضع کرتے اور مہمان کے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

مولوی عبدالحق کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی، دوسری وسعتِ دل . . . . خاکساری اور فروتنی خلقی تھی۔ اس قدر بڑے ہونے پر بھی چھوٹے بڑے سب سے محبت اور خلوص سے ملتے تھے . . . . . . اُن کا رتبہ بہت بڑا تھا مگر انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت تو وہ کرتے ہی تھے لیکن بعض اوقات وہ اپنے سے چھوٹوں کا بھی ادب کرتے تھے۔ اس سے بڑھ کر خاکساری کا کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی کتابوں پر جو اصلی اور حقیقی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ "مرتبہ" لکھا۔ "مؤلفہ" یا "مصنفہ" کا لفظ نہ لکھا۔

وہ بے حد دردمند دل رکھتے تھے۔ مصیبت زدوں کی داستان سن کر اُن کا دل بھر آتا تھا اور فوراً مدد کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ ایسے متعدد واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ خود میں نے اُن سے کہہ کر بہت سے لوگوں کے کام نکالے۔ مشکل کے وقت اُن کے دوست انھیں گھیر لیتے تھے۔ وہ بلا تامل سینہ سپر ہو جاتے، یہاں تک کہ انھوں نے بعض

---

۱ صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر ...
۲ صفحہ ۲۰۷ ...
۳ صفحہ ۲۰۹
۴ صفحہ ۱۹۱ حالی

۵ صفحہ ۲۰۹ ... غلام مصطفیٰ
۶ صفحہ ۲۰۳ ... مولوی سید علی بلگرامی
۷ صفحہ ۲۰۴
۸ صفحہ ۱۹۲ حالی

۹ صفحہ ۲۲۵ ... عبدالرحمٰن صدیقی
۱۰ صفحہ ۱۰۱ مولوی سید علی بلگرامی
۱۱ صفحہ ۱۹۳ حالی
۱۲ صفحہ ۲۰۲ سر سید ...

ایسے دوستوں کو مصیبت اور تباہی سے بچایا جو شاید اس کے مستحق نہ تھے۔ حاجت مندوں[1] کی حاجت روا کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیتے تھے...... (اور) اپنے پرائے خصوصاً مصیبت زدہ لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے۔ سفارشیں کر کے لوگوں کے کام نکالتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ (انھوں[2] نے) غریبوں اور مستحقوں اور مفلوک الحال شرفا کی ہمیشہ مدد کی۔ اکثر اس طرح دیتے تھے جس پر یہ قول صادق آتا ہے کہ "دہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔" مولوی[3] صاحب مرحوم اپنے دوستوں اور عزیز و اقربا سے بھی سلوک کرتے تھے لیکن کبھی کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ روپے پیسے کی بالکل محبت نہیں تھی، بہت سیر چشم اور عالی ظرف واقع ہوئے تھے۔ جب[4] روپیہ اُن کے پاس آتا تو اس کے دینے میں وہ بڑی فیاضی سے کام لیتے تھے، اگرچہ اکثر اس سے وُہی متمتع ہوتے تھے جو چالاک یا چلتے پُرزے ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے پاس کبھی روپیہ جمع نہ ہوا اور خالی ہاتھ اس دُنیا سے کوچ کیا۔ مرحوم[5] کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص علمی کام یا تجارت کے لیے روپیہ طلب کرتا تو حتی الامکان بڑی خوشی سے اس کی مدد کرتے تھے۔ مرحوم[6] بہت بامروت (بھی) تھے اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی درخواست کرتا اور وہ اسے پُوری نہ کر سکتے تو خاموش ہو رہتے مگر جب دُوسری بار پھر آتا تو اس شرمندگی میں سب سے مقدم اس کا خیال کرتے اور حتی الامکان اس کی مقصد براری میں کوشش کرتے۔

مرحوم[7] اپنے دوستوں کو مدد دینے اور ان کے کام نکالنے میں بڑے بہادر تھے اور اس میں وہ کسی قسم کی رکاوٹ یا مشکل کی پروا نہیں کرتے تھے (اُس[8]) کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے اور بعض اوقات دلیرانہ کام کر گزرتے تھے۔ بیکسوں اور درماندوں کا سہارا اور مایوسوں کی آس تھے نہایت بے تعصب اور روشن خیال مسلمان تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ اس درماندہ قوم کی دستگیری کرنا فرض ہے۔ لڑ[9] جھگڑ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے، غرض ہر طرح کام نکال لیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے سینکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا بھی خوب ڈھب یاد تھا۔ دوسروں[10] سے کام لینے کا انھیں بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ وہ کچھ ایسے مہر آمیز طریقے سے کہتے تھے اور اس طرح ہمت افزائی کرتے تھے کہ لوگ خوشی خوشی ان کا کام کرتے تھے۔ اپنے ملازموں اور ماتحتوں سے بھی اُن کا حسنِ سلوک ایسا تھا کہ وہ اُن کی فرمائش کی تعمیل ایسی تن دہی اور شوق سے کرتے تھے جیسے اُن کا کوئی ذاتی کام ہو اور وقت پر جان لڑا دیتے تھے۔ کام[11] کرنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے اور انھیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے اور بے دھڑک فائدہ پہنچاتے تھے مگر اپنے دوستوں سے بھی خوب پھسلا کر کام لیتے تھے۔ وہ[12] اپنے دفتر کے ملازموں پر نیچے کے نوکروں سے بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی سختی یا درشتی سے پیش نہیں آتے تھے اور اُن کے عیوب سے چشم پوشی کرتے تھے۔ وہ[13] اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے کہ ملازموں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا

---

[1] صفحہ ۱۹۳ حالی
[2] صفحہ ۱۰۴ مولوی سید علی بلگرامی
[3] صفحہ ۵۰ " "
[4] صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود
[5] صفحہ ۲۲۱ " " "
[6] صفحہ ۲۷۷ سر سید احمد خاں
[7] صفحہ ۴۴ مولوی محمد عزیز مرزا
[8] صفحہ ۵۰ مولوی سید علی بلگرامی
[9] صفحہ ۱۴۲ محسن الملک
[10] صفحہ ۲۲۲ سر سید راس مسعود
[11] صفحہ ۴۴ مولوی چراغ علی
[12] صفحہ ۹۲ مولوی سید علی بلگرامی
[13] صفحہ ۱۰۵ " " "
[14] صفحہ ۲۰۱ سر سید راس مسعود

جائے۔ نوکروں کو مار پیٹ اور بد زبانی کو نہایت مکروہ فعل اور بد اخلاقی سمجھتے تھے۔ نوکروں پر کبھی سختی نہیں کرتے تھے نہ کبھی کسی
معاملے میں ان سے باز پرس کرتے اور نہ کبھی کوئی سخت کلمہ کہتے۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی نوکر نے ان کی کوئی عزیز یا بیش قیمت
چیز توڑ ڈالی، خفا ہونا تو درکنار اُنھوں نے پوچھا تک نہیں کہ کیوں کر ٹوٹی اور کس نے توڑی۔[1]

آدمی کے پہچاننے میں اُنھیں خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی ملاقات اور بات چیت میں آدمی کو پوری طرح بھانپ لیتے تھے۔
اُن کے ملنے والے بُرے اور بھلے ہر قسم کے آدمی تھے۔ دُنیا نیکوں ہی کے لیے نہیں اس میں بدوں کا بھی حصّہ ہے اور شاید دُنیا کی
بہت سی رونق انھیں کے دم سے ہے۔ وہ دونوں سے کام لیتے تھے ——[2]

مرحوم کی چال ڈھال، اُن کی ہیئت، ان کی طرزِ معاشرت، اُن کا برتاؤ سب نرالے تھے ...... وہ اپنے فن
میں باکمال تھے ...... وہ غریبوں کے غمخوار اور دوستوں کے ہمدرد تھے۔ افسوس کہ مُلک ایک ایسی ذات سے خالی ہو گیا
جس کی نظیر اب نہیں ہے لوگ اُنھیں بہت یاد کریں گے۔ احباب کے جلسے اُن کے بغیر سونے ہوں گے اور سب سے زیادہ اُن کے
غریب دوست اُن کا ماتم کریں گے۔[3]

دُنیا میں جہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی فتنہ بپا رہتا ہے اور ایک جھگڑے سے نجات نہیں ملتی کہ دوسرا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔
وہ اسی طرح رہے جیسے طوفان موج خیز میں [illegible] ...... وہ اپنے تمام سرکاری نیز (ذاتی) اُمور میں ہر قسم کے
تعصبات سے بری تھے (اور) سب جھگڑوں کو فضول اور ہیچ سمجھتے تھے اُن کی توجہ اور ان کا دل کہیں اور تھا ؎

پاک ہیں کوششوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
بستے ہیں دُنیا میں لیکن درمیان سب سے الگ (حالی)[4]

بے تعصبی کا وصف اُن ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ اُن کے احباب میں ہندو اور
عیسائی بھی تھے اور ان سے اُن کا برتاؤ ویسے ہی خلوص اور محبت کا تھا جیسا مسلمان دوستوں سے۔ اُنھوں نے کبھی کوئی ایسی بات
نہیں کی جس سے دوسرے مذہب والوں کی دل آزاری ہو۔ اگرچہ بعض معاملات میں اُنھیں ہندو سرگروہوں سے اختلاف تھا
لیکن اس اختلاف کا اثر کبھی ان کے اخلاق یا برتاؤ پر نہیں پڑا۔ کسی مذہب و ملت سے اُنھیں خصومت یا پرخاش نہ تھی یہاں تک
کہ وہ اسلامی فرقوں میں سے بھی کسی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ آخر زمانے میں وہ گفتگو میں اکثر محاسن اسلام کا ذکر کرتے تھے اور
افسوس کیا کرتے تھے کہ لوگ اصول سے زیادہ فروع پر زور دیتے ہیں اور توہمات کو مذہب سمجھ رکھا ہے۔
شیعہ سُنی کے جھگڑے کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ یہ پولیٹیکل جھگڑا ہے۔ وہ اکثر اپنے رفیق حکیم اسرار احمد کریوی سے)
ایک مصری عالم کی کتاب (کا ذکر کرتے تھے) جس میں اس نے اس پر خوب بحث کی ہے۔ مرحوم کا ارادہ تھا کہ اس کتاب کا ترجمہ

---

۱ صفحہ ۹۹ سروری چراغ علی
۲ صفحہ ۱۰۶ " "
۳ صفحہ ۹۹ " "
۴ صفحہ ۱۴۱ …
۵ صفحہ ۱۰۲ حالی
۶ صفحہ ۴۴۰ نواب عماد الملک
۷ صفحہ ۵۰ حکیم امتیاز الدین
۸ صفحہ ۲۵۰ سر سید احمد خان
۹ صفحہ ۹۹ مولوی سید علی بلگرامی

اردو میں (کرائیں) لیکن افسوس یہ خیال عمل میں نہ آیا ۔ مرحوم[1] صحیح بخاری کے بڑے مدّاح اور قدردان تھے اور رکھتے تھے کہ عربی زبان سیکھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ۔ مرحوم[2] مولوی نذیر احمد کے ترجمۂ قرآن کو (بھی) بہت پسند کرتے تھے ۔

مگرچہ[3] مرحوم تعصب سے بری اور مشرب وسیع رکھتے تھے لیکن غیرت و حمیت قومی اُن میں ضرور تھی[4] اور اسلام و بانیٔ[5] اسلام پر دل سے یقین رکھتے تھے ۔ مگر مولویوں کی جاہلانہ اور متعصبانہ باتوں سے سخت ناراض ہوتے تھے ۔ وہ[6] اس اسلام کو جس کی تعلیم قرآن نے دی ہے حقیقی مذہب خیال کرتے تھے باقی تمام تفریقوں کو فضول اور لچر سمجھتے تھے ۔ مرحوم[7] ہندوستان کے مروّجہ پردے کو بہت بُرا سمجھتے تھے نیز ان لوگوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو تعدّدِ ازدواجات کے حامی ہیں ۔

(مرحوم[8]) طالب علموں اور اہلِ علم کا بہت خیال کرتے تھے اور[9] خواہ اُن کی دُنیاوی حیثیت کیسی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اور وہ کیسے ہی پھٹے حال میں کیوں نہ ہوں اُن سے بڑی مروّت اور اخلاق سے پیش آتے تھے اور جائز مدد دینے میں کبھی دریغ نہ کیا تھا، اُن کی صحبت سے خوش ہوتے تھے ۔ وہ اہلِ[10] علم سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور ایسے اشخاص پر جن میں طالب علمانہ جستجو اور صحیح ذوق ہوتا بہت مہربان ہوتے اور اُن کے لیے جو بھی ممکن ہوتا کرنے کو تیار ہو جاتے ۔ اور[11] جب ان کے علم میں آجاتا کہ فلاں عالم کوئی مفید علمی کام کر رہا ہے تو سفارش کر کے حکومت سے امداد دلوانے میں دریغ نہ کرتے (اور اسی لیے[12]) اُن کی مجلس میں عموماً علمی چرچے رہتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسوس کہ اب کوئی جگہ ایسی نہ رہی جہاں ایسی صحبت کا لطف حاصل ہو سکے ۔ جب[13] کسی ہونہار تعلیم یافتہ نوجوان کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے ۔ یوں[14] تو عام طور پر اور ہم لوگوں میں خاص کر یہ بڑا عیب ہے کہ اپنے لوگ ہم عصروں کے کمال کی داد دینے میں بڑا بُخل کرتے ہیں لیکن مرحوم اس میں بڑے فیاض تھے ۔ وہ صرف اہلِ علم کی قدر و منزلت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے کام کو بھی وُقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ قدردانی[15] کا یہ حال تھا کہ جہاں کوئی اچھی تحریر نظر سے گزری تو فوراً داد دیتے اور خط لکھ کر لکھنے والے کی ہمت بڑھاتے ۔

(مرحوم[16]) جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہے لیکن آخر عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی ۔ (انھیں) اکثر[17] یہ خیال رہتا تھا کہ تحصیلِ علم کے لیے سہولتیں پیدا کی جائیں ۔ طلبہ[18] میں وہ خاص طور پر مقبول تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ طالب علموں سے انھیں دلی ہمدردی تھی اور طرح طرح سے اُن کی مدد کرتے تھے ، وہ[19] اپنی جیب سے نادار طلبہ کو وظیفے دیتے تھے ۔ سفارشیں کرتے تھے ، نوکریاں دلواتے تھے ، اُن کی مشکلوں میں کام آتے تھے ، جائز معاملات میں اُن کی حمایت کرتے تھے ، اُن کے وقار کو اپنا وقار اور اُن کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے ۔ نام و نمود کی خاطر یا[20] اپنے کی غرض سے نہیں بلکہ وہ ان کے سچے خیر اندیش اور بہی خواہ تھے اور

---

[1] صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
[2] صفحہ ۴۴ " چراغ علی
[3] صفحہ ۱۰۴ "
[4] صفحہ ۹۳ " محمد عزیز مرزا
[5] صفحہ ۱۰۵ حالی
[6] صفحہ ۱۹۰ سر سید راس مسعود

[7] صفحہ ۸۰ مولوی سید علی بلگرامی
[8] صفحہ ۱۰۱ "
[9] صفحہ ۴۲۵ نواب عماد الملک
[10] صفحہ ۱۰۵ حالی
[11] صفحہ ۱۰۱ "
[12] صفحہ ۱۹۰ سر سید راس مسعود

[13] صفحہ ۹۸ مولوی سید علی بلگرامی
[14] صفحہ ۰۰ "
[15] صفحہ ۳۹۸ نواب عماد الملک
[16] صفحہ ۹۶ سید علی بلگرامی
[17] صفحہ ۴۴ "
[18] صفحہ ۲۶۸ سر سید احمد خاں

بھی اُن سے دلیسی ہی محبت کرتے تھے اور اُن کی سعادت مندانہ اطاعت کرتے تھے۔

(مولوی چراغ علی) کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا۔ اُن کا مطالعہ طالب علمی سے لے کر آخر تک جاری رہا۔ مطالعے میں بے حد شغف تھا۔ گرمیوں میں اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا . . . . تین چار گھنٹے سونے میں اور ایک آدھ گھنٹہ کھانے پینے میں ضرور صرف ہوتا تھا ورنہ باقی تمام وقت کام میں اور خاص کر مطالعہ کتب اور تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا۔

تحقیق و تفتیش کی یہ کیفیت تھی وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہ تک پہنچتے اور اس کے ماخذ و علیہ کے سراغ میں پھرتے اور وہاں تک پہنچ کر پتا لگا کر اس کی خبر لاتے۔ اپنی کتاب (اعظم الکلام) کے واسطے سامان جمع کرنے کے لیے کتابوں کے دفتر چھان ڈالتے۔ اور لوگوں کو بھیج کر دیگر مقامات سے نایاب کتابیں تلاش کرا کر بہم پہنچاتے . . . . اور بعض اوقات ایسے ایسے مقامات سے خوشہ چینی کرتے جہاں دوسروں کا خیال بھی نہ پہنچتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس مضمون پر انھوں نے قلم اٹھایا دوسروں کے لیے بہت کم گنجائش چھوڑی ہے۔ اُن کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا اور مواد فراہم کرنے کے لیے انھوں نے کس قدر محنت اور مشقت اٹھائی ہے۔ وہ قدامت پرست نہ تھے بلکہ انھوں نے بہت سی پرانی رسموں کو توڑ پھوڑ کے رکھ دیا۔ ہر بات کو تحقیق اور عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے جو اس میں پوری اترتی اسی پر عمل کرتے۔ تنقید کے متعلق کا [illegible] تھے [illegible] روشنی کے حامی تھے۔ وقار اور متانت اُن پر ختم تھی، مستقل مزاجی میں [illegible] تھے۔ آزاد خیال ایسے تھے کہ [illegible] بات کہنے میں کبھی نہ چوکتے۔ مطالعہ اور تحقیق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔

وہ علم کی قدر کرتے تھے . . . . . . خود بھی طالب علم تھے اور باوجود اس مرتبہ پر پہنچنے کے اُن کے مزاج میں طالب علمانہ سادگی موجود تھی اور روزانہ علمی مشغلہ میں اُن کا [illegible] ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ایک طالب علم سے ہوتا ہے۔ اس وقت وہ فرق مراتب کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

مولوی صاحب کو کتابوں کا حد درجہ شوق تھا۔ ہمیشہ عمدہ اور نادر و نایاب کتابوں کی فکر میں رہتے تھے۔ قلمی کتاب کی دوسری چیزوں کی طرح کوئی خاص قیمت نہیں ہوتی۔ یہ قدر دانی پر ہے بعض وقت سودا کرنے میں انمول کتاب ہاتھ سے جاتی رہتی ہے اور اس کا پچھتاوا عمر بھر رہتا ہے (مولوی عبدالحق) کتابوں کے بڑے قدر دان تھے اور اسی قدر دانی کا نتیجہ تھا کہ جب کوئی ایسی کتاب آ گئی تو بے لیے نہ چھوڑتے اور منہ مانگی قیمت دیتے۔ چنانچہ انھوں نے ایک نہایت عمدہ کتب خانہ چھوڑا ہے جس میں کتابوں کی تعداد [illegible] ہے [illegible] اور نادر و موجود ہے اور تمام ہندوستان میں کہیں دوسری جگہ ایسا [illegible] موجود نہیں اور [illegible] میں بہت ایسی کتابیں ہیں جن پر اُن کے نشان یا نوٹ نہ ہوں ——

(۱) صفحہ [illegible] (۲) صفحہ [illegible] غلام دستگیر (۳) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی
(۴) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی (۵) صفحہ [illegible] سرسید احمد خاں (۶) صفحہ [illegible]
(۷) صفحہ [illegible] نواب [illegible] (۸) صفحہ [illegible] مولوی سید علی بلگرامی (۹) صفحہ [illegible] سید علی بلگرامی
(۱۰) صفحہ [illegible] (۱۱) صفحہ [illegible] (۱۲) صفحہ [illegible]
(۱۳) صفحہ [illegible] مولوی چراغ علی

علم و ادب سے لگاؤ انھیں پہلے سے تھا۔ تحقیق اور تلاش و جستجو کی لگن نے اس ذوق کو بہت پختہ کر دیا تھا۔ طبیعت بہت حساس اور نظر بہت وسیع تھی۔ دُنیا کے ادبی شاہکار بہت کم ایسے ہوں گے جو اُن کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے۔ اس سے اُن کے ذوق میں عجیب لطافت اور وسعت پیدا ہوگئی تھی جو اُن کے مضامین سے صاف ظاہر ہے۔ اس فاضل شخص کی زندگی عجیب و غریب تھی۔ اُنھوں نے تمام عمر علم کے مطالعہ اور علم کی خدمت میں صرف کی۔ گو خود درویشوں کی طرح (زندگی) بسر کی مگر دُوسروں کو ہر طرح فائدہ پہنچایا۔ ہمارے مدارس اور کالج کے اُستادوں اور طالب علموں کو اس بے ریا اور بے نفس شخص کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ سچے عالم ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اُن کی صحبت مغتنمات میں سے تھی۔ اس میں حکیمانہ اور طالب علمانہ دونوں شانیں نظر آتی تھیں۔ اپنے زمانے کے پُرانے حالات (اگلے) بزرگوں کی خودداری، وضع داری اور شجاعت کے کارنامے اور اُن کے توہمات، اسراف اور شیخی کے قصے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ اُن کا تخیل اس قدر بلند تھا کہ فہم وہاں پہنچتے پہنچتے لڑکھڑانے لگتا تھا۔ شعر کا ذوق ایسا پاکیزہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اساتذہ کے کلام پر بہت اچھی نظر تھی اور خاص صحبتوں میں اُن کا منتخب کلام سُناتے اور کبھی کبھی شعر کے محاسن و معائب پر تنقیدی نظر ڈالتے جسے سن کر اُن کے ذوق کی داد دینی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان چیزوں کو قلم بند کر لیتا تو وہ ایک نادر بیاض ہوتی...... (وہ خود ہمیشہ) اپنے پاس ایک بیاض رکھتے تھے جہاں کہیں کوئی اچھا شعر یا کوئی خیال یا کام کی بات نظر پڑی وہ جھٹ اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے۔ غرض (مولوی عبدالحق) کی صحبت میں بعض اوقات ایسے علمی و ادبی نکات مل جاتے تھے جو گہرے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہوتے تھے۔ اُن کے علمی ذوق، علم و ادب کی سرپرستی اور صحبت سے جو فیض لوگوں کو پہنچا وہ (شاید) ان کی تالیفات سے کہیں زیادہ استوار اور دُور رس ہے!

علم کے ساتھ صحیح ذوق بھی ضروری ہے۔ علم کتنا ہی وسیع ہو صحیح ذوق نہ ہو تو علم بے نتیجہ اور بے ثمر ہے۔ آدمی کو علم، دولت، آسائش و آرام، محنت سے مل جاتا ہے لیکن صحیح ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ یہ دولت نہ علم سے ملتی ہے نہ مال و زر سے اور نہ محنت سے۔ صحیح ذوق زندگی کی جان ہے۔ اس سے زندگی کے ہر شغل و شعبہ میں ایک نرم اور سہانی سی روشنی آجاتی ہے اور باوجود نشیب و فراز اور اوگھٹ گھاٹیوں کے سفرِ حیات کے طے کرنے میں بہت کچھ سہولت ہو جاتی ہے۔ (مولوی صاحب) کا ذوق بہت سلیم اور پاکیزہ تھا اور یہ ذوق علم و ادب تک ہی نہ تھا......... زندگی کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں نظر آتا تھا۔

طبیعت میں نفاست پسندی بہت تھی۔ صناعی کے دل دادہ تھے۔ اچھی چیز کو دیکھ کر پھڑک جاتے تھے۔ بڑی صفائی اور سلیقے سے رہتے تھے۔ کھانے کے بڑے شوقین تھے۔ خوب کھانے کھلاتے تھے۔ جب کوئی دعوت میں انگریزی کھانے

---

۱ صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر بجنوری — ۴ صفحہ ۲۰۵ درویش پروفیسری ہٹ سنگ — ۷ صفحہ ۲۴۴ نواب عماد الملک
۲ صفحہ ۱۱۰، ۱۱۶ حکیم امتیاز الدین — ۵ صفحہ ۲۴۴ نواب عماد الملک — ۸ صفحہ ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال
۳ صفحہ ۲۴۲ نواب عماد الملک — ۶ صفحہ ۲۵۵ ڈاکٹر محمد اقبال — ۹ صفحہ ۲۰۳ سر سید راس مسعود

لطف تو بہت ناک بھوں چڑھاتے تھے اور اس کا بہت بُرا مانتے تھے۔ (مولوی) صاحب کھانا تو خیر اچھا کھاتے ہی تھے لیکن کھانے کی خوبی اور اس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے (اور) کھانے کے عیب و ہنر کو بھی خوب پرکھتے تھے .... ان کا باورچی بھی قلیہ بھی (میر بخش) کو تھا ...... خوب کھانا پکاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاص مزہ تھا۔ رہنے، سہنے، کھانے پینے، پوشاک غرض ان کی ہر چیز میں نفاست پائی جاتی تھی۔

سادگی و پُرکاری کمال فن کا نمونہ ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لیے کسی فن یا علم کی ابتدائی یا آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کامل عبور ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے مرغوب طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلکش ہو جاتا ہے۔ جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے۔ تحریر یا تقریر کا مقصد ہوتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کے اثر کو قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی تحریر اسی لیے مقبول ہوئی کہ وہ سادہ، پُر اثر اور پُر خلوص تھی۔ معمولی لکھے پڑھے شخص کی سمجھ میں بھی آتی اور اس کے دل میں گھر کرتی ...... یہ اثر رنگین عبارت، مقفیٰ مسجع جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ پاچ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مطلب کو سادہ لفظوں میں صاف صاف بیان کرنے کا بہت خیال رکھتے تھے اور دوسروں کو بھی اسی کی تاکید کرتے تھے۔

(مولوی عبدالحق) کا یہ کمال تھا کہ کیسا ہی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہو۔ وہ اس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اترتا چلا جاتا تھا۔ ضبط اور اعتدال ان کے بہت بڑے اوصاف تھے۔ یہ دو خوبیاں ان کے ہاں کامل طور پر پائی جاتی ہیں۔ ورنہ جوش میں اکثر آدمی سررشتۂ اعتدال کھو دیتا ہے اور بہک کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے اور بجائے کچھ کہنے کے چیخنے چلانے لگتا ہے۔

اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے کہ جو شخص اردو کا ادیب اور محقق ہونا چاہتا ہے اسے سنسکرت یا کم سے کم بھاشا کا جاننا ضروری ہے۔ ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان سے آیا تو فرمانے لگے کہ "اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلا تکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔" خود اپنی تحریر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لیے وضع ہوئے

۱ے صفحہ ۲۲۲ نواب عماد الملک
۲ے " ۶۶-۹۹ سر سید احمد خاں
۳ے " ۱۹۹ حالی

۴ے صفحہ ۱۹۶ محسن الملک
۵ے " ۶۵-۶۶ سر سید احمد خاں
۶ے " ۱۹۰-۹۶ [illegible]

۷ے صفحہ ۲۰۱ محسن الملک
۸ے " ۱۵۱ حالی

تھے۔ اُنھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اُردو ادب میں داخل کیے جو ہماری نظروں سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اُردو ادیب یا شاعر نے کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اُٹھے کر لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی (مولوی عبدالحق) سے سیکھے! ——— دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے!

ایک بار فرمایا کہ "جو لوگ تذکیر و تانیث اور دِلّی لکھنؤ کی زبان کے متعلق دُور از کار اور فضول بحثوں اور جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ ...... زبان دِلّی اور لکھنؤ کی تابع نہیں بلکہ خیالات کی تابع ہے۔ کسی تحریر یا ادب کی پُشت پر جب کوئی صحیح جذبہ یا خیال نہیں ہوتا تو لفظوں سے کھیلنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے خیالات رکیک ہیں اُن کی زبان کبھی فصیح نہیں ہو سکتی"

حقیقت یہ ہے کہ (مولوی عبدالحق) جیسی طبیعت اور ذہانت اور جدت کے بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ وُہ اعلیٰ درجے کے نثار تھے۔ اُن کی تحریر جامع و مانع اور حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ یہ حال اُن کی تمام تصانیف کا ہے۔ اُن کی تحریر میں بڑا قوت تھی اور حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا۔ بات کی تہ تک خُوب پہنچتے تھے اور زبان کے تو اُستاد تھے۔ ...... وُہ الفاظ کے کینڈوں اور اُن کی فطرت کو خُوب سمجھتے تھے اور لفظوں کی تلاش یا نئے لفظوں کے بنانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور یہ لفظ ایسے موزوں اور جلد بنا لیتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دماغ میں سانچے بنے بنائے رکھے ہیں جن سے الفاظ ڈھلتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ دُوسرے ادیبوں کی طرح الفاظ اور محاورے سوچ سوچ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں لکھتے تھے اور نہ عبارت کے بنانے اور سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وُہ شروع سے آخر تک بلا توقف اپنے خیالات لکھتے چلے جاتے تھے اور پوری تحریر ایک مسلسل خُوب صورت لڑی ہوتی تھی۔ میں اس کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہُوں لیکن طوالت کے خوف سے معذور ہُوں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب اور ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں اور اس میں جو وُسعت اور ادبی صلاحیت پائی جاتی ہے وُہ (اُن ہی) کا طُفیل ہے ...... متین، سادہ اور خوشگوار نثر لکھنا جو علمی اور ادبی مضامین ادا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ (اُنھوں) نے سکھایا۔ اُردو زبان میں ابھی تک وہ توانائی پیدا نہیں ہوئی تھی جو ایک زبان کے ادب کے لیے لازم ہے (مولوی عبدالحق) نے اس کے قالب میں ایک نئی رُوح پھونکی اور اُردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اُنھوں نے زبان کو پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین کا ڈول ڈالا۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دُوسروں سے لکھوائیں۔

؎ صفحہ ۸۷ مولوی سید علی بلگرامی
؎ ؍ ۱۲۲ مولینا وحید الدین سلیم
؎ ؍ ۱۲۲ ؍ ؍
؎ ؍ ۱۰۱ نواب عماد الملک

؎ صفحہ ۲۸۳ سرسید احمد خاں
؎ ؍ ۱۱۸ مولینا وحید الدین سلیم
؎ ؍ ۲۹۳ سرسید احمد خاں
؎ ؍ ۲۸۵ ؍ ؍ ؍

؎ صفحہ ۸۷ مولوی سید علی بلگرامی
؎ ؍ ۲۹ مولوی چراغ علی
؎ ؍ ۲۹۲ سرسید احمد خاں

اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناولوں اور ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ نہیں کیا گیا تاکہ وہ نمونے کا کام دیں۔ بعض وقت جو کوئی اعلیٰ درجے کی کتاب چھپتی تو اس کی تعریف کرتے اور دُوسروں کو بھی پڑھنے کا شوق دلاتے۔

علمی و ادبی اعتبار سے اُردو زبان میں اُن کا بہت بڑا درجہ ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب (بہت) اچھا تھا۔.... اُن کی بے شمار تحریروں میں سے (اگر) ادبی نقطہ نظر سے ایک انتخاب کیا جائے تو یہ انتخاب ہماری زبان و ادب کا بے مثل شاہکار ہوگا۔ یہ ادبی ذوق ہی تو تھا جس نے انہیں اُردو لُغات اور اُردو کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ اُن کی تحریروں میں اکثر جگہ ادبی جواہر ریزے اور حُسنِ بیان سے بھارے بحیثیت زبان کے الفاظ اور محاورے اور مزاح و ظرافت کی پھلجھڑیاں نظر آئیں گی۔ (لیکن اُن) سے یہ توقع کرنا کہ اُن کی ہر تحریر ادب کا اعلیٰ نمونہ ہو، عبث ہے۔ (انہیں) ادائے مطلب میں صفائی اور سادگی کا اس قدر خیال تھا کہ بعض وقت وہ مضمون کو عام فہم بنانے کی خاطر حُسنِ بیان کو قربان کر بیٹھتے تھے۔ اس وجہ سے (کہیں کہیں) اُن کی عبارت سُست اور پھُسپھُسی معلوم ہوتی ہے لیکن جو ادبی یا علمی تحریریں اور مضامین دل لگا کر لکھے ہیں وُہ حُسنِ بیان اور خیالات اور زبان کی سلاست و فصاحت کے اعتبار سے اُردو ادب کے خزانے میں بے نظیر جواہر پارے ہیں۔ ان میں تمام ادبی خوبیاں ہیں۔ تلمیحات بھی ہیں، تشبیہات و استعارات بھی ہیں، محاورات بھی ہیں، لُطفِ زبان بھی ہے، مزاح اور ظرافت کی چاشنی بھی ہے لیکن ہر چیز اپنے محل پر ہے اور تکلف و تصنع سے بری۔

یُوں تو عمر کے ساتھ ساتھ اُن کے کام بھی بڑھتے گئے جو مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں کے تھے لیکن اصل کام جس پر اُن کی پُوری محبت اور توجہ صرف ہوئی وہ (اُردو زبان کے پھیلاؤ) کا تھا۔ اُردو کے عاشق تھے اور اسے برصغیر کی قومی زبان خیال کرتے تھے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ اُردو کی حمایت میں (مولوی عبدالحق) نے کبھی کوتاہی نہیں کی جب کبھی اُردو پر آنچ آتے دیکھی تو اس کی حمایت کے لیے فوراً کمربستہ ہو گئے۔ اُردو کی حمایت کو (وُہ) اپنا بہت بڑا فرض اور ایک اہم قومی خدمت سمجھتے تھے اور اس معاملے میں اُنھوں نے کبھی کوتاہی نہیں کی بلکہ سب سے پہلے قدم آگے بڑھایا۔

(یہ) بات اُن کی سیرت میں ایسی تھی کہ جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔..... (اُردو کو اُنھوں نے) اپنی بیٹی کی طرح پالا پوسا۔... (اس کی) پرورش کی۔....... اور مرتے دم تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا۔ جو کچھ کماتے وُہ اس کے (لیے) لاکر رکھ دیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے پیسے (اُردو) کے لیے سے (زبان و ادب) پر بڑے بڑے پُر زور مضامین خود لکھے اور دُوسروں سے لکھوائے اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ جگہ جگہ جا کر لیکچر دیے اور تقریریں کیں۔ اُنھیں کیا پڑی تھی کہ (اور) جگہ جگہ

۴۱ صفحہ ۱۰۲ حالی
۴۲ ۔ ۴۹۱،۴۹۲ سرسید احمد خان
۴۳ ۔ ۴۹۴ سرسید راس مسعود
۴۴ ۔ ۵۵۵ مرحوم صاحب
۴۵ صفحہ ۵۰۵ سرسید راس مسعود
۴۶ ۔ ۲۴۹ سرسید احمد خان
۴۷ ۔ ۲۰۹
۴۸ ۔ ۲۱۰ خواجہ غلام الثقلین
۴۹ صفحہ ۲۲۲،۲۴ سرسید احمد خان
۵۰ ۔ ۲۵۹ ڈاکٹر محمد اقبال
۵۱ ۔ ۲۲۳ سرسید احمد خان
۵۲ ۔ ۲۲۳،۲۲۲ تیہو صاحب

چھوڑ کر مارے مارے پھرتے لیکن محض (اُردو زبان) کی خاطر وُہ زمین کے گز بنے ہوئے تھے ۔ وہ خود طرح طرح کی تکلیف اُٹھاتے لیکن اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انھیں ہر وقت اس کا فکر رہتا تھا اور اُن کی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا ۔ ۔ ۔ (کہ) جس طرح بن پڑے اس کی خدمت کریں ۔ حق (پدری) شاید کسی نے اس طرح ادا کیا ہو ۔ یہ وضع داری، یہ محبت و شفقت اور ایثار اب کہاں نظر آتا ہے ۔ اپنے کو مٹا کر (مقصد) کی خدمت کرنا یہی جوہر انسانیت ہے ۔

ہر شخص[۱] میں قدرت نے کوئی نہ کوئی صلاحیت رکھی ہے ۔ اس صلاحیت کو درجۂ کمال تک پہنچانے میں ساری نیکی اور بڑائی ہے ۔ درجۂ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے اور پہنچ سکتا ہے ۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے یہ سمجھو کندن ہو جاتا ہے ۔ حساب کے دن جب اعمال کی جانچ پڑتال ہو گی ۔ خدا یہ نہیں پُوچھے گا کہ تُو نے کتنی اور کس کی پُوجا پاٹ یا عبادت کی ۔ وہ کسی کی عبادت کا محتاج نہیں ۔ وُہ پُوچھے گا تو یہ پُوچھے گا کہ میں نے جو استعداد تجھ میں ودیعت کی تھی اُسے کمال تک پہنچانے اور اس سے کام لینے میں تو نے کیا کیا اور خلق اللہ کو اس سے کیا فیض پہنچایا ۔ اگر نیکی اور بڑائی کا یہ معیار ہے تو (عبدالحق) نیک بھی تھے اور بڑے بھی !

افسوس[۲] کہ ان کی زندگی کے آخری ایام انتہا درجے کی تلخی اور کرب و الم میں گزرے ۔ (مرحوم[۳] کا) بڑے بڑے حاذق ڈاکٹروں نے علاج کیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا ۔ حالت بہت ردّی ہو چکی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حکیموں اور ڈاکٹروں کی حذاقت اور چارہ سازی دھری رہ گئی اور حکمت و تدبیر کچھ کارگر نہ ہوئی ۔ وُہ وقت جو ٹلنے والا نہیں ہے اور جس سے کوئی جاندار بچ نہیں سکتا آن پہنچا اور وُہ[۴] (۱۶ر اگست ۱۹۶۱ء کو) ہمیشہ کے لیے اس دُنیا سے رُخصت ہو گئے ۔

قلم[۵] اُن کا آخر دم تک نہ رُکا ۔ موت[۶] سے چند روز پہلے تک جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو گئے ۔ برابر لکھتے رہے ۔

ایسا[۷] جامع صفات اور جامع حیثیت، بے لوث و بے نفس، پُر عزم و استقلال، سراپا خلوص و صداقت نہ اس سے پہلے (ہوا) اور نہ اس کے بعد نصیب (ہوگا) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آخر دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے دُنیا سے چل بسا ۔ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا نہ مرنے کو ۔

ہمارے[۸] مُلک میں خوشامدیوں کی کوئی کمی نہیں وُہ ہر بڑے آدمی پر اس طرح ٹوٹ کر گرتے ہیں جیسے شہد پر مکھیاں لیکن سچ اور جھوٹ کا امتحان جب ہوتا ہے جب وُہ بڑا آدمی اپنے اقتدار سے محروم ہو جاتا ہے ۔ (ان) کی (رحلت) کے وقت کہرام مچ گیا تھا اور ہزارہا آدمی کا ٹھٹھ باہر اور اندر لگا ہوا تھا ۔ سینکڑوں آدمی جن میں امیر، غریب، بیوائیں اور یتیم سب ہی تھے زار و قطار رو رہے تھے ۔ وُہ کیا چیز تھی جس نے چھوٹے بڑے سب کا دل موہ لیا تھا ؟ مرحوم[۹] کی وفات پر تمام اُردو انگریزی اخبارات میں اظہار افسوس و ملال کیا گیا لیکن ہم یہاں بخوف طوالت صرف دو تحریروں کو نقل کرتے ہیں ایک (صدر

۱؎ صفحہ ۳۲-۲۳۱ نام ور ـــ حالی
۲؎ " ۱۵۲ سرسید احمد خاں
۳؎ " ۲۵۲ " " "
۴؎ صفحہ ۱۵۲ سرسید احمد خاں
۵؎ " ۱۱۴ خواجہ غلام الثقلین
۶؎ " ۱۴۳ محسن الملک
۷؎ صفحہ ۱۵ مولوی چراغ علی
۸؎ " ۱۵۲ سرسید احمد خاں
۹؎ " ۵۲ مولوی چراغ علی

لت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں) کا اظہارِ افسوس جو اُنھوں نے (زیارت) سے کیا اور جو (مختلف رسائل و اخبارات میں) طبع
ر شائع ہوا۔ دُوسرا (ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری) کا الم نامہ جو اس دردناک خبر (پر) اُنھوں نے راقم کو) لکھا
ا۔ حقیقت میں دونوں تحریریں سچی اور دل سے لکھی گئی ہیں۔

(از جریدہ "قومی زبان" تعزیتی پیغام فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان: جلد ۱۴ شمارہ ۱۳ تا ۱۴)

"مولوی عبدالحق کی وفات ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ اُن کے انتقال سے ہم علم و ادب کے ایک سچے پرستار سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایک مضبوط اور غیر متزلزل چٹان کی طرح جمے رہے۔ اُن کی ذات برِصغیر پاک و ہند کے گزشتہ ایک سو سال کی اسلامی ثقافت کی مظہر تھی۔ اُن کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ایک عظیم ادارے کے ختم ہو جانے کے جیسا ہے۔

ذاتی طور پر اُن کے انتقال سے میں اپنے ایک قابلِ احترام دوست سے محروم ہو گیا ہوں
اپنے مقصد سے اُنھیں جو لگاؤ تھا میں اس سے ہمیشہ فیض حاصل کرتا رہا ہوں۔
میری دلی دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

(ابو الاثر حضرت حفیظ جالندھری کا اظہارِ غم اور خراجِ عقیدت از مکتوب محررہ یکم اپریل ۱۹۶۲ء)

"اُردو کا ذکر آتے ہی ہمارے دور کے ادب و شعر کی دُنیا میں آج کون ہے جو مولوی عبدالحق مرحوم کے نام پر ادب و احترام کا خراج ادا نہ کرے۔ ہم لوگ میں اور میرے ہم عصر جو اُردو میں شعر و شاعری یا نثر نگاری کے دعویدار ہیں سب کے سب بابائے اُردو مولوی عبدالحق مغفور کے زیرِ بارِ احسان ہیں۔ وہ اوّل سے آخر تک اس زبان کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے سرگرمِ کار اور سربکف رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو کبھی کی نیم مُردہ سی کونوں کھدروں میں پناہ گزیں ہو چکی ہوتی اور ہم سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے نظر آتے۔

برِاعظم ہند کے باشندے، وہ کوئی بھی ہوں، اس قدر جلد اُردو اور ہندی کی وہ معرکہ آرائی نہیں بھول سکتے جو اس صدی کے آغاز سے مسلسل جاری ہے اور میں سمجھتا ہوں ابھی مدتوں جاری رہے گی۔ یہ معرکہ آرائی چند نمایاں پہلو اختیار کر چکی ہے۔ اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اُردو نے کسی محاذ پر شکست نہیں کھائی۔ مولوی عبدالحق صاحب اس یورش کے مقابل اُردو کی حفاظت کرنے والوں کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

آج پاکستان کی دو قومی زبانوں میں اُردو جو ایک زبان تسلیم کر لی گئی ہے یہ مولوی عبدالحق ہی کی مساعیِ جمیلہ اور ایسی کارگزاری کا ثمر ہے جس کے لیے اس مردِ حق پرست نے اپنی جان تک

دے دی، قربان ہوگئے اور کہ

ہم یہاں کام آگئے، آگے تمہارا کام ہے

فرما کر جسمانی طور پر ہم سے رخصت ہوگئے ہیں۔ لیکن الحمدللہ اُردو کا پرچم آگے ہی آگے لہرا رہا ہے۔ مولوی عبدالحق کی رُوح پھول برسا رہی ہے اور ہم سب کو حوصلہ بخش رہی ہے اور آگے بڑھتے جانے کی تلقین فرما رہی ہے۔"

مرحوم[1] کے انتقال پر بہت سی تاریخیں لوگوں نے کہیں۔ ان میں سے چند یہاں لکھی جاتی ہیں۔ سید (ہاشمی فرید آبادی صاحب) نے جو (عربی) صنائع میں تاریخ کی صفت کو بہت پسند کرتے تھے یہ تاریخ نکالی:

"غفرَ اللہُ لہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت[2] رئیس امروہوی) مدظلہٗ العالی نے اسے نظم میں اس طرح موزوں فرمایا ہے ؎

"رحلتِ مولوی محترم عبدالحق
مرگِ تازہ پئے ترویجِ زبانِ اُردو
زندہ شد۔ شیوۂ اسلافِ گرامی از وے
بودہ است از صفِ سرسیدؒ و حالیؔ ہم او
ہاشمی۔ فکر چو فرمود پئے سالِ رئیس
ہاتفِ غیب صدا زد غفر اللہ لہٗ"

۱۳۸۱ھ

(حضرت[3] رئیس امروہوی) نے خود بھی ایک قطعہ (تاریخ) مرحوم کی وفات پر لکھا ہے جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے ؎

"ہزار رنگ یہ دُنیا نے نَو بہ نَو بدلے
مگر کہاں بدلِ مولوی عبدالحق

نقوشِ خدمتِ اُردو کہ ہیں جہاں افروز	نتائجِ عملِ مولوی عبدالحق
رفیقِ سیدؔ و حالیؔ و اکبرؔ و آزادؔ	وجودِ بے بدلِ مولوی عبدالحق
ہر اک محاذ پہ اُردو کا پاسباں ٹھہرا	جہادِ بر محلِ مولوی عبدالحق

---

[1] صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی [2] صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی [3] صفحہ ۷۶ مولوی چراغ علی

اللہ اسے ترقی و خدمت ادب — اساس بے عمل مولوی عبدالحق

فنون نثر میں نظم و نگارش و تحریر — قصیدہ و غزل مولوی عبدالحق

زمیں اہل حمیت بھلا نہیں سکتے — حمیت و عمل مولوی عبدالحق

غم اجل میں بھی سال اجل ہے درپیش

کہو "غنیم اجل مولوی عبدالحق"

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حبیب اللہ صاحب غضنفر امروہوی)[1] نے بھی جو ایک عالم شخص ہیں اور ایک زمانے تک (ناگپور) میں ملازم تھے اب (اُردو کالج، کراچی میں صدر شعبۂ اُردو) ہیں ایک اچھا قطعہ تاریخ لکھا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے —

اے غضنفر وصف کیا بابائے اُردو کے لکھوں — ذات والا فخر پاکستان و صد عظمت نشان

صاحب نقد و نظر بھی صاحب اسلوب بھی — آفتاب نثر اُردو بالیقیں و بے گماں

تلخ و شیریں زندگی کا کس قدر انجام ہے

"شام غم" سے ہے سن ترحیل عبدالحق عیاں

۱۳۸۱ھ

(پروفیسر حامد حسن صاحب قادری)[2] نے بھی مرحوم کی دو تاریخیں ایک سن عیسوی میں اور دوسری ہجری نبوی میں (کہیں) جو یہ ہیں —

جدا ہم سے بابائے اُردو ہوئے — ہم اب فیض سے اُن کے محروم ہیں

اُنھوں نے جو اُردو کی کیں خدمتیں — وہ سب قوم کے دل پہ مرقوم ہیں

بہت اُن کے احساں آئیں گے یاد — کہ اب محسن اُن سے معدوم ہیں

یہ اللہ کے فضل سے ہے اُمید — کہ باغ جناں میں وہ مرحوم ہیں

لکھا قادری نے یہ سال وفات

کہ تھے "خادم قوم مخدوم ہیں"

۱۹۶۱ء

مولوی عبدالحق احساں شعار! — جن سے پاک و ہند دونوں فیض یاب

برگزیدہ محسن علم و ادب — پھر نہ کیوں "بابائے اُردو" ہو خطاب

۱؎ صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی

۲؎ صفحہ ۷۵ مولوی چراغ علی

حضرتِ اُردو میں دی جن کو جاں عزیز ایسی ہستی ہے جہاں میں انتخاب
نام عشاق زباں میں کر گئے بے نظیر و بے مثال و لاجواب!
قادری اُن کی ہے تاریخ وفات
"خادمِ قومی زبان' عشرت مآب!"

۱۳۸۱ھ

بہت سے ایسے ہیں جو ایک چیک پر دستخط کر دینے سے دنیا میں یکایک نامور ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ہیں جنھیں اتفاقاتِ زمانہ نے بڑا آدمی بنا دیا ہے۔ بہت سے ہیں محض نام و نمود کے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں اور شہرت یا نام حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کر گزرتے ہیں اور آخر بڑے آدمی بن جاتے ہیں لیکن کم ہیں جو محض اپنی لیاقت' محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔ مرحوم اسی مظلوم اور چھوٹے گروہ میں سے تھے۔ باوجود اس لیاقت و (عظمت) کے اپنی زندگی درویشانہ بسر کی۔ شہرت' دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے ورنہ چاہتے تو اس قدر شہرت اور دولت حاصل کر سکتے تھے جو دوسروں کی قدرت سے باہر ہے لیکن انھوں نے حقارت سے اس پر نظر ڈالی اور مستانہ وار ٹھکرا کر چلے گئے۔

ملٹن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شہرت انسان کا فطری ضعف ہے" اور حقیقت میں یہ سچ بھی ہے۔ اس سے بچنا قریب قریب محال ہے لیکن بعض خدا کے بندے جنھیں غیر معمولی دماغی قوت عطا ہوئی ہے اور جن کا علم و فضل تبحر کے رتبے کو پہنچ گیا ہے ایسے بھی ہیں کہ شہرت پر لات مار کر کنجِ تنہائی کو غنیمت سمجھتے ہیں اور اپنے فلسفے اور خیالات میں' خواہ یا دہوائی کیوں نہ ہوں مگن ہیں۔ یا تو وہ اس ضعف کی قوت سے واقف نہیں کہ وہ انسان کو کیا سے کیا کر دیتا ہے یا وہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ کر ہستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اپنے تئیں ایک غلام یا بیل گھوڑے کی طرح ناگوار محنت پر مجبور نہیں کرتے اور چند بدمذاقوں کی ؎ یا چند سمجھ داروں کی داد واہ کے لیے کاغذ کو سیاہ اور لب کو واکرنا گوارا نہیں کرتے۔ بعینہٖ یہی حالت اُن کی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے۔ "کیا حاصل ہے شہرت سے؟ یہی نا کہ لوگ ہمارے نام سے واقف ہو جائیں۔ بالفرض اگر یہ ہوا بھی تو اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے اور اگر یہی ہے تو کیوں نہیں ہزاروں لاکھوں کارڈ چھپوا کر اپنا کام اور نام درج کر کے تقسیم کر دیں کہ ایک دنیا اُن دونوں سے واقف ہو جائے اور پھر پیٹ بھر کر خوش ہو لیں؟" . . . . اس پاک نفس' عالی دماغ شخص کی حالت پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک پارسا صفت' درویش منش' صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا۔ وہ خواجہ حافظ کی غزلیں اور قطعات پڑھتے اور مزے لیتے۔ وہ اپنی روزانہ ضروریات کی . . . . . کچھ پروا نہ کرتے اور بے تکلف سادہ زندگی بسر کرتے جس میں نہ نئے فیشن کو دخل

۱؎ صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین ۲؎ صفحہ ۸ – ۲۰۰ سید محمود

تھا اور دنیاوی دولت کو ٹھکرا دیتا تھا۔ مگر جس قدر وہ ان چیزوں سے بے پروا تھے اسی قدر اخلاص میں مستثنیٰ تھے

انسان کی اصلی فضیلت اور برتری اس کے اخلاق ہی میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی اور استواری میں ان کی عظمت و وقعت ہے۔ (مولوی عبدالحق) کی کامیابی کا راز ان کے اخلاقِ حمیدہ میں تھا۔ اخلاق سے صرف یہی مراد نہیں کہ آدمی دوسروں سے خندہ پیشانی سے پیش آئے، خاطر مدارات کرے، وقت پر کسی حاجت مند کی حاجت روا کر دے۔ زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے یا جیسا اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے "مرنجِ و مرنجان" ہو ــــــ اخلاق کی حدود اس سے بہت آگے تک ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت (خصوصاً اخلاقی جرأت) کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے ؎

می توان شد قطبِ عالم می توان شد غوث وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی تپیدن از تبِ ہمسایگاں
وز سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خواندن خویش را از خوردنی اِبنائے جنس
در شبستانِ تنگ دالی از محنت زنداں شدن

اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ورثہ میں ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں لیکن اس جدید دور اور جدید تہذیب میں تعلیم، تعلیم نہیں رہی۔ ہماری تعلیم گاہیں دکانیں ہیں جن میں وساوری مال کی خرید و فروخت ہوتی ہے یا ایک قسم کے کارخانے ہیں جن میں فرمائشی مال تیار ہوتا ہے۔ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے اس کی رسائی زیادہ سے زیادہ حافظے یا ذہن تک ہوتی ہے۔ اخلاق صرف و نحو و منطق یا ریاضیات و تاریخ کی طرح نہیں پڑھائے جا سکتے۔ رہا صالح ماحول اور صحبت ــــــ تو وہ سرے سے ناپید ہیں۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ان بزرگوں اور اولوالعزم ہستیوں کے سوانح حیات اور کارنامے لکھنے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق پیدا کیا جائے جنھوں نے اپنی قوم یا ملک یا بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے طرح طرح کی آفتیں اور مصیبتیں اٹھائیں اور اپنے ایسے نقش چھوڑ گئے جو آنے والوں کے لیے ہمیشہ ہدایت و رہنمائی کا کام دیں گے۔ ان قربانیوں، صبر و استقلال اور بے نفسی کے ذکر اذکار سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں پر کچھ نہ کچھ اثر کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ (عبدالحق) کی ہستی ایسی ہی تھی:

ان کی اخلاقی جرأت، آزادیِ خیال، رواداری، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے ہندو مسلمان سب

---

(۱) صفحہ ۳۹، ۴۵، ۲۲۲ سرسید احمد خاں

(۲) صفحہ ۲۲۲ سرسید احمد خاں

قابل تھے جس کام کو انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُسے کامل خلوص اور تندہی سے انجام دیا۔ ایسے وقت میں جب کہ بے لاگ اور بے ریا کام کرنے والوں کی شدید ضرورت ہے، جب کہ قومی ترقی کے ہر شعبے میں انسانوں کی توش ہے، جب کہ کام بہت ہیں اور کام کرنے والے کم، ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا اُٹھ جانا غضب ہے! ــــ

آدمی کا مرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ موت اٹل ہے اور سب کو آنے والی ہے اور اس لیے کوئی ڈر کی چیز نہیں لیکن ایسی موت جو بے وقت ہو اور خصوصاً جب اس کا وار ایسے شخص پر پڑے جو اپنی خوبیوں اور لیاقت میں عدیم النظیر ہو اور جس کی ذات سے ایسی توقعات ہوں جو اتنی بڑی قوم اور ایسے وسیع ملک میں کسی دوسرے سے پوری ہوتی نظر نہ آتی ہوں۔ اور خاص کر جب کہ یہ سانحہ ایسی قوم میں واقع ہو جو پہلے ہی سے قحط الرجال ہو تو ایسی موت (واقعی) غضب ہے اور قیامت ہے اور اس کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

ہمیشہ جو اس قوم کے اعضا ہیں جس میں آج کل ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی بہت قدر کرنی چاہیئے جن کا ہونا ہمارے لیے فخر ہے اور جن کے سہارے اور مدد سے قوموں کو ایسی مدد ملتی ہے کہ ایک ایک ان میں سے لاکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ دُنیا میں اکثر ہوا ہے کہ ایک سپاہی کی ہمت سے شکست کھاتے کھاتے فوج فتح پا گئی ہے، ڈوبتے ڈوبتے جہاز صرف ایک شخص کی دانشمندی سے پار اُتر گئے ہیں۔ یہ زمانہ ہمارے لیے بڑا کڑا زمانہ ہے ہمیں ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے ان کا ہونا ہمارے لیے نعمتِ عظمٰی اور ان کا مرجانا ہمارے لیے ایک بلائے مبرم ہے ..... اُن کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔

مرحوم میں اس قدر محاسن اور خوبیاں جمع تھیں کہ آج باوجود تلاش کے کوئی اُن کا جانشین نہیں ملتا۔ لوگ اُنھیں زمانہ دراز تک یاد رکھیں گے ــــــ انسان نہیں رہتا لیکن اس کے اعمال رہ جاتے ہیں جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے، یہی اس کی پونجی یہی اس کی آل اولاد اور یہی اس کی کمائی ہے ..... اولاد کس کے نہیں ہوتی اور کون جاندار ہے جو اس پر قادر نہیں، بلکہ جتنے ادنیٰ اور حقیر جانور ہیں اُتنی ہی اُن کے زیادہ اولاد ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کیڑے ایسے ہیں کہ اُن کے چند گھنٹوں میں ہزار در لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن انسان کا نام اُس کے کام سے ہے۔ آج جو ہم مرحوم کو یاد کرتے ہیں تو کیا اُن کی اولاد، اور ملازمات اور جاہ و ثروت کی وجہ سے؟ ــــ ہرگز نہیں یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں بلکہ اُن کے کیرکٹر اور کام کی وجہ سے۔ اُن کا کیرکٹر اور کام خود ہمیں اُن کی یاد دلا رہا ہے۔ اُن کی بھلائیاں، اُن کے کارنامے اور اُن کے احسانات اُن کی یاد کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ بس یہی ایک چیز ہے جو مرحوم کو زندہ رکھے گی اور یہی ایک چیز ہے جو دُنیا میں اللہ کے نیک بندوں کو زندہ رکھتی ہے۔ میں اُس موت کو قومی حادثہ سمجھتا ہوں۔ اُن کے ہونے سے ہمیں بڑا سہارا تھا۔ ہر علمی و ادبی کام میں ہم اُن کا نام سب سے

صفحہ ۱۰۰ خواجہ غلام الثقلین
〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
〃 ۱۴ سید محمود
〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا

صفحہ ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
〃 ۱ سید محمود
〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
〃 ۵۲ مولوی چراغ علی

صفحہ ۱ سید محمود
〃 ۹۵ مولوی محمد عزیز مرزا
〃 ۵۱ مولوی چراغ علی
〃 ۱۲۲ مرزا وحید الدین سلیم

شریک کرتے تھے۔ اب جو وہ نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری قوت کم ہو گئی ہے۔

(مولوی عبدالحق) کی زندگی سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں۔ اُن کا اپنے نصب العین پر آخر دم تک قائم رہنا۔ اس کے لیے ہر جائز ذریعہ کو کام میں لانا۔ مخالف قوتوں کا دلیری سے مقابلہ کرنا۔ محنت و مشقت سے کبھی جی نہ چرانا۔ دن رات کام میں لگے رہنا۔ تساہل اور کاہلی کو پاس نہ پھٹکنے دینا خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنھوں نے مرحوم کی طرح اپنی ساری عمر علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دی ہو۔ اس راہ میں مخدوم بننا آسان ہے مگر خادم ہونا بہت دشوار ہے۔ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے ہاتھ پیروں پر کھڑے ہوئے اور اپنی محنت سے دنیا میں جاہ و ثروت، لیاقت و فضیلت حاصل کی۔ اپنے سہارے آپ کھڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا چاہتا ہے اُس سے زیادہ کھوتا ہے۔ ...... اُن کی زندگی ایک سبق ہے اُن لوگوں کے لیے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اُن کے کارنامے جوانانِ ملک کے لیے دلیل راہ کا کام دیں گے۔

یہ عالی دماغ شخص سرزمین ہندوستان میں ایسے پیدا ہوئے ہیں کہ اُن پر جتنا فخر کریں بجا ہے اور ایسے وقت میں پیدا ہوئے جب کہ موقع بہت نازک ہو چلا تھا۔ غالباً (مولوی عبدالحق) سے بڑھ کر کسی شخص نے کام کو اس طرح بے لوث، بے تعلق اور بے لاگ رہ کر سرانجام نہ دیا ہوگا۔ مرحوم بوجہ اپنی اعلیٰ قابلیت، تجربہ کاری، عالی ظرفی اور راستی و راست بازی کے ہماری قوم کے بے مثل افراد میں سے ہیں۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے (عبدالحق) ہوتے!!

آج اُن کی موت پر ایک بڑے حلقے کو تشویش، رنج اور افسوس ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو علم و ادب کا ایک ستون گر گیا۔ مرحوم ہر اعتبار سے ایک دیو پیکر شخص تھے اُن کے رفقاء اور اُن کے ہم عصر اُن کے سامنے بونے تھے۔ (اُن) کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک ایسی خالی جگہ ہو گئی ہے جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ (اُن) کا غم مدتوں ہمارے لیے تازہ رہے گا۔ اُن کی زندگی صاف بتاتی ہے کہ شوق اور محنت عجیب چیزیں ہیں جسے ہم کمال کہتے ہیں وہ انھیں دونوں کا خانہ زاد ہے ——

وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر بھی اس کی قدر نہیں کرتا اور قدر اُس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنھیں بقا ہو؟ جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں؟ اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں.... انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنھیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو اُن سے فائدہ پہنچے..... مرحوم نے زمانۂ ملازمت اور باقی عمر میں

---

(۱) صفحہ ۲۳۳ سرسید احمد خاں
(۲) " ۲۴ مولوی چراغ علی
(۳) " ۱۰۰ کاروانِ خیال - نور خاں
(۴) " ۱۱ مولینا وحید الدین سلیم
(۵) صفحہ ۲۰ مولینا وحید الدین سلیم
(۶) " ۲۵ مولوی چراغ علی
(۷) " ۱۳۳ مولینا وحید الدین سلیم
(۸) " ۲۱ سید محمود
(۹) " ۱۰۶ مولوی سید علی بلگرامی
(۱۰) صفحہ ۱۳ مولوی چراغ علی
(۱۱) " " "
(۱۲) " ۱۵۵ مولانا محمد علی
(۱۳) " ۱۲۳ مولینا وحید الدین سلیم

بہت سے کام ایسے ہیں جو دنیا میں یادگار رہیں گے جن کا اثر دوسروں کے قلوب اور دماغوں تک پہنچے گا۔ اور یہ اُن کی تحریریں ہیں جو اُن کے قلم سے نکلیں ملک میں پھیلیں اور سورج کی روشنی کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک حیاتِ عالم میں اپنا مفید کام کرتی رہیں گی اور مرحوم کی یاد کو اُن کے قدر دانوں کے دلوں میں تازہ رکھیں گی۔

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں انھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی مثال پیشِ نظر رکھنی چاہیے اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمینِ شور میں قلبہ رانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے کچھ نہیں۔ انھیں مولوی (عبدالحق) مرحوم کی طرح اُس زرخیز زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیے جس کے نتائج اب تک بارور ہیں اور جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا ؎

بارے دُنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو، یاں کہ بہت یاد رہو (میر)

وہ ہم میں نہیں رہے[2] لیکن وہ اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں، جو ہمارے لیے صحیفۂ ہدایت ہے۔ اُن کی رائے میں کہیں کہیں غلطیاں بھی نظر آئیں گی۔ لیکن اُن کے خلوص و صداقت اور راست کرداری میں مطلق شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس میں[3] شبہ نہیں کہ انسان کی اصلی ترقی دماغی قوت پر منحصر ہے۔ دولت اس کی محض معین ہے۔ انسان کی رُوح کو اگر ایک گاڑی تصور کیا جائے تو یہ جوڑی اس کو کھینچنے والی ہے، لیکن اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ میں ہے تو یہ زمین تو کیا فلک الافلاک تک پہنچ جائے گی، لیکن خدانخواستہ اگر اس کی باگ عقل کے ہاتھ سے چھین لی جائے تو وہ پاش پاش ہو جائے گی۔ لیکن ہم اُن کی (آخر) زندگی سے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہیں گے کیونکہ اب وُہ وہاں ہیں جہاں ہماری آواز نہیں پہنچ سکتی اور جو کچھ اُنھوں نے چھوڑا ہے وُہ ایسا کچھ ہے کہ اُس کی نظیر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دُنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی۔ اسی طرح نہ انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب کسی شخص میں ایسی خُوبیاں ہوں جو عام طور پر دُوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور جن کا ہونا عجائبات از نوادر میں سے ہے تو ایک ایسے شخص کا ہم میں سے اُٹھ جانا کیسے کچھ رنج اور کیسے کچھ اَلم کا باعث نہ ہوگا۔ زمانے کی ترقی کبھی رُکتی نہیں اس کا قدم ہمیشہ آگے پڑتا ہے ممکن ہے ہم میں بہت سے لائق اور فاضل لوگ پیدا ہوں یہ سب کچھ ہوگا مگر (مولوی عبدالحق) کہاں! ـــــــ اُن کی باتیں فسانے کے طور پہ رہ جائیں گی اور مدتوں اُن کا ذکر کر کے لوگ اُنھیں یاد کریں گے ؎

دو رہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وُہ ہم میں ایسے تھے جیسے پُر دُونوں میں دیو۔ افسوس ایسی نسلیں ہم میں سے مٹتی جاتی ہیں۔ عظیم الشان چیزیں گو

---

[1] صفحہ ۹۴ مولوی چراغ علی [2] صفحہ ۲۰۳ سر سید احمد خاں [3] صفحہ ۹ تا ۱۱ سید محمود

...ل ملاقات سے کیسی ہی ساکت اور صامت ہوں لیکن صرف اُن کے وجود ہی سے دُنیا پر اس قدر اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے کاموں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وُسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؟ ـــــ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب کیفیت پیدا نہیں ہوتی؟ یہی حال اُن' وسیع النظر عالی دماغ لوگوں کا ہے، گو وہ کچھ نہ کہیں لیکن ان کا اثر نہایت پر زور اور عجیب و غریب ہوتا ہے۔

آخیر زمانے میں (اُن کے بعض بے تکلف دوست انھیں) "ایک شاندار انسانی کھنڈر" کہا کرتے تھے۔ لیکن کیا کھنڈر ہم کو عزیز نہیں ہوتے؟ ـــــ کیا کھنڈروں کی وقعت ہمارے دلوں میں نہیں ہوتی؟ ـــــ کیا ہم گوارا کر سکتے ہیں کہ کسی زمانے کی وہ زندہ یادگاریں جو زندہ ثبوت ہیں ہماری تہذیب و شائستگی کا، دُنیا سے نسیاً منسیاً ہو جائیں ـــــ؟ ایک جدید اور نئی عمارت کے خراب ہو جانے اور اس کے ٹوٹ جانے کا اتنا رنج نہ ہوگا جتنا ایک کھنڈر کے مٹ جانے کا۔ لیکن افسوس کہ وہ عالی شان کھنڈر ہماری نظروں سے غائب ہو گیا اور اردو کی کھیتی کا نہایت لائق فرزند زمین کا پیوند ہو گیا اور وہاں جگہ پائی جو اس بزرگ کی سب سے مستحکم اور زندہ یادگار ہے جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اُسی کی دُھن میں دُنیا سے گزر گیا جہاں اب ہمیشہ اُس کی رُوح پھر رہی ہوگی۔ یہاں سیاح اور مسافر دُور دُور سے آئیں گے اور دو آنسو بہا جائیں گے!

مرحوم ہماری قدیم تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی اُن پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو اُن کی طرف کشش ہوتی تھی۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہم پر اثر کر رہی ہے۔ اُن کی ذہانت، جودتِ طبع، وسیع النظری اور علم و فضل کو دیکھ کر دل میں عزت و احترام پیدا ہوتا تھا اور جب اُن کی شرافتِ نفس، عالی ظرفی، شفقت، دوستی اور خودداری کو دیکھتے تھے تو دل بے اختیار اُن کی طرف کھنچتا تھا اور اُن سے محبت ہونے لگتی تھی۔ ایسے لوگ جن سے ہر شخص حذر کرتا جب اُن سے ملتے تو اُن کے حسنِ سلوک اور محبت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ وہ بڑے رتبے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں اُن کے ڈنک یہاں آ کر گر جاتے تھے۔ اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو وہ ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آ سکتے ہیں ورنہ دُنیا میں پند و نصائح کی کمی نہیں، دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، کیسا ہی بُرا زمانہ کیوں نہ ہو، دُنیا کبھی اچھوں سے خالی نہیں ہوتی۔ اب بھی بہت سے صاحبِ علم و فضل، باکمال، ذی وجاہت، نیک سیرت اور نیک دل لوگ موجود ہیں۔ مگر افسوس کہ کوئی (عبدالحق) نہیں!!

---

۱۹ صفحہ ۱۱ سید محمود ۔ ۲۰ صفحہ ۱۰۳ حالی ۔ ۲۱ ایضاً ۱۰۴، ۱۸۳ ۔ ۲۲ صفحہ ۲۰۹ ڈاکٹر بجنوری

اُردو کا قدیم ترین ادب

ڈاکٹر سہیل بخاری

اُردو ادب کے مورخین اپنی بات کی ابتدا حضرت امیر خسرو دہلوی سے کرتے ہیں اور کہہ مکرنیوں، دوسخنوں اور پہیلیوں کا ذکر کرنے کے بعد ایک غزل بھی اُن کے نام سے منسوب کرتے ہیں جس کا مطلع ہے "ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں"۔ اس کے فوراً بعد وہ دلّی سے سیکڑوں میل دُور دکن پہنچ کر بیجا پوری شعرا کا کلام سُنانے لگتے ہیں۔ لیکن ان کی اس سلسلہ بندی سے ادب کی تاریخ میں جو جھول پیدا ہو جاتا ہے وہ ایسا نہیں ہے جسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکے۔

حضرت امیر خسرو دہلوی کے فارسی کلام سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہندی زبان میں بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن اس بات کی کوئی داخلی یا خارجی شہادت نہیں ملتی کہ وہ جس زبان کو ہندی کہتے ہیں وہ یہی زبان ہے جسے بعد میں زبان اُردو یا زبان اُردوئے معلیٰ کا نام دیا گیا۔ نہ ان کا ہندی کلام ہی کسی مخطوطے یا مطبوعہ کتاب کی صورت میں ہم تک پہنچ سکا ہے جس سے اُن کی زبان کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کیا جا سکے البتہ ان کا وہ ہندی کلام جس کا اُوپر ذکر کیا گیا روایتاً اُن کے نام سے منسوب چلا آرہا ہے جس کی حیثیت ابھی تک محض الحاقی ہے۔ جب سے حافظ محمود شیرانی نے اپنی تحقیق کے بعد یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی نہیں بلکہ عالمگیری عہد کے ایک بزرگ خسرو نامی کی تصنیف ہے اس وقت سے حضرت امیر خسرو کا مندرجہ بالا ہندی کلام بھی مشتبہ ہو گیا ہے۔

اس الحاقی کلام کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہے جو اس شبہے کو تقویت بخشتی ہے۔ چنانچہ ان کی مشہور غزل "ز حال مسکیں" کا اگر لسانی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی زبان اُردو نہیں برج بھاشا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اُردو کو برج بھاشا سے مشتق بتایا تھا لیکن یہ بات حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اُردو" کی تصنیف سے پہلے کی ہے۔ اس لحاظ سے ادب اُردو کی تدریخوں میں اس غزل کے تذکرے کا کوئی جواز نہیں ہے اور کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں پر ابھی تحقیق کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بھی انھیں بزرگ خسرو کی تصنیف نہ ہوں جنھوں نے خالق باری لکھی ہے۔ البتہ تاریخ ادب میں ان کو اس وقت تک جگہ دی جا سکتی ہے جب تک کہ وہ تحقیق سے کسی غیر کی ثابت نہ ہوں۔

ان مورخینِ اُردو کے پاس جو حضرت امیر خسرو کے بعد تاریخ ادب کا سلسلہ بیجا پوری شعرا کے کلام سے ملاتے ہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر اُردو دہلی کی قدیم زبان تھی اور وہاں اس کا اس حد تک چرچا تھا کہ حضرت امیر خسرو جیسے شاعر اس میں پیدا ہوئے تو پھر ان کے بعد اُردو شعر گوئی کی روایت دہلی میں یکا یک ختم کیوں ہو گئی۔ متداول کُتب تاریخ میں ہند شمالی کی باقاعدہ شاعری دبستان دہلی سے شروع ہوتی ہے جس کی صحیح نمائندگی آرزو، آبرو، مظہر جانجاناں وغیرہ کرتے ہیں لیکن یہ لوگ حضرت امیر خسرو کی وفات کے تین سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔ جو مورخین اُردو تاریخ کے اس طویل خلا کو بیجاپوری شعرا کے کلام سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں

یہ نہیں تھا کہ دہلی میں جسے اُردو کی جنم بھوم کہا جاتا ہے حضرت امیر خسرو کے بعد اُردو شاعری کے یکایک سو جانے اور پھر تین سو سال بعد اچانک بیدار ہو جانے کے وجوہ کیا ہیں۔

یہاں اس مسئلے کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ مورخینِ ادب بیجاپوری شعرا کے جس کلام کو تاریخِ ادب میں شامل کر رہے ہیں وہ اُردو میں نہیں بیجاپوری زبان میں ہے۔ یہ بات بعض طبائع پر گراں ضرور گزرے گی اور وہ محض سخن پروری یا دُوسری مصلحتوں کی خاطر اس کو تسلیم کرنے سے انکاری ہوں گی لیکن کیا کیا جائے کہ حقیقت یہی ہے۔ میں نے "اُردو نامہ" کراچی کے اٹھارھویں شمارے میں نہایت تفصیل سے لسانی تجزیہ کر کے اُردو اور دکنی دونوں کے کثیر تعداد اختلافات واضح کر دیے ہیں اور یہ جتا دیا ہے کہ ہم نے تاریخی تسلسل قائم کرنے کی کوشش میں وقت کی خلیج کو جس مواد سے پاٹنا چاہا ہے وہ اتنا کمزور ہے کہ اس پر سے گزرنا تو درکنار اس پر کھڑا ہونا بھی ناممکن ہے اس لیے اہلِ دہلی کی شعر گوئی کے اس طویل تعطل کی تشریح دکنی شعرا کے کلام سے نہیں ہو سکتی۔

اس مقام پر جس عام غلط فہمی کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ بیجاپوری بولی جس زبان کی قدیم شکل ہے ہماری بول چال اس کا جدید روپ ہے یعنی ہماری زبان اور بیجاپوری میں جدید و قدیم کا رشتہ ہے لیکن بیجاپوری کو قدیم کہنے والے شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ بیجاپور میں آج بھی وہی زبان بولی جا رہی ہے جس میں قدیم دکنی شعرا و ادبا نے آج سے چار سو سال پہلے اظہارِ خیال کیا تھا اور جسے ہمارے مورخین اُردوئے قدیم کا نام دے رہے ہیں۔ آج اُسی زبان میں وہاں لوک گیت گائے جا رہے ہیں اور لوگ اپنے اپنے گھروں اور بازاروں میں اسی بولی سے کام چلا رہے ہیں اس لیے یہ زبان جس قدر قدیم کہلانے کی مستحق ہے اسی قدر اسے جدید بھی کہا جا سکتا ہے۔ دُوسری طرف ہماری زبان (اُردو) جس قدر جدید ہے اسی قدر قدیم بھی ہے بلکہ اس زبان کا سراغ جو ہم آج کل بول رہے ہیں آج سے چار سو سال نہیں بلکہ چھ سو سال تک بھی مل جاتا ہے جیسا کہ سطورِ آئندہ میں ظاہر ہوگا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو لوگ امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کو جو قدیم دکنی شاعری سے بھی قدیم تر ہیں اُردو زبان کے اولین نمونے کہتے ہیں اور دُوسری طرف دکنی کو اُردوئے قدیم بھی مانے جا رہے ہیں حالانکہ ہماری بول چال دکنی کے مقابلے میں امیر خسرو کی مذکورہ بالا تخلیقات سے بہت قریب ہے۔ ایسی صورت میں دکنی کے بجائے امیر خسرو کی زبان کو اُردوئے قدیم کہنا زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔

خود دکنی کے بعض شعرا و مصنفین نے بھی اس موقف کی تائید کی ہے کہ دکنی اور اُردو دو مختلف زبانیں ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد باقر آگاہ ویلوری نے اپنے رسالے "من درپن" (سن تصنیف ۱۲۰۰ھ) میں جو معجزاتِ نبی کریمؐ سے متعلق مفصل معلومات فراہم کرتا ہے اس خیال کو یوں واضح کر دیا ہے۔

اگر جا کے میں اُردو کے میں کہتا
کوئی اس کو یہاں کے لوگوں سے پوچھتا

ماہنامہ "قومی زبان" کراچی بابت جنوری ۱۹۹۴ء کے صفحہ ۱۹ پر اس مقام کی عبارت یہ ہے:

"آگاہ نے اسے آسان دکنی زبان میں لکھا ہے جسے وہ اُردو نہیں کہتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں دکنی و اُردو دو جدا جدا زبانیں ہیں۔"

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اُردو ادب کے متعلق ہمارا ایک مخصوص نظریہ قائم ہو گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اُردو صرف اس زبان کو تسلیم کرتے ہیں جو ایرانی لپی میں لکھی جاتی ہے اور ایرانی لپی مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان میں آئی ہے۔ اس لیے اس زبان کا جو ادب مسلمانوں کی آمد سے پہلے دیوناگری لپی میں جمع ہوا اسے ہم اپنے ادب میں شامل نہیں کرتے۔ دوسری طرف ایرانی لپی کا بیجاپوری ادب اُردو ادب کا سب سے زیادہ قدیم اور کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو زبان کو قلم بند کرنے کے لیے ایرانی لپی کا استعمال مسلمانوں کی آمد کے صدہا سال بعد ہوا ہے جبکہ بیجاپور میں مقامی زبان ابتدا ہی سے ایرانی لپی میں منتقل ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان میں فارسی زبان سن ۱۸۳۲ء تک سرکاری اور دفتری کارروائیوں کا واحد ذریعہ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں فارسی زبان کے مقابلے میں جسے سرکاری پشت پناہی حاصل تھی اُردو زبان کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ دی اور یوں اس کا جو تھوڑا بہت سرمایہ جمع بھی ہوا تو وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن دکن میں بیجاپور کی زبان کو ابتدا ہی سے سرکاری منصب مل گیا تھا اس لیے اسے حکومت اور عوام دونوں کی سرپرستی بیک وقت نصیب ہو گئی تھی۔ غرض لپی کے اس اشتراک نے ہمارے ادب میں ایک غلط فہمی کو جنم دیا اور ہم بیجاپوری ادب کو اُردوئے قدیم کہنے لگے۔

اُردو ادب کا یہ نظریہ جس کی بنیاد لپی پر قائم کی گئی ہے لسانی اعتبار سے بالکل باطل ہے کیونکہ زبان روح اور لپی اس کا جسم ہوتی ہے اور جس طرح جسم کی تبدیلی سے رُوح کی ماہیت نہیں بدلتی اسی طرح لپی کے فرق سے زبان کی اصلیت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں خود ہمارے خیالات میں ایک عجیب تضاد ملتا ہے کہ ہم نہ صرف اس ایرانی ادب کو جو عربی لپی میں لکھا جا رہا ہے ایرانی تسلیم کرتے ہیں بلکہ اس سرمائے کو بھی ایرانی مانتے ہیں جو ایران میں مسلمانوں کے ورود سے ہزاروں سال پیشتر جمع ہو چکا تھا لیکن جب اُردو ادب کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو فوراً اپنا موقف تبدیل کر کے دیوناگری لپی میں جمع ہونے والے اُردو زبان کے ادب کو سنسکرت یا ہندی وغیرہ کہہ کر اپنی تاریخ سے خارج کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جس طرح ایران قدیم میں مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے قبل خالص ایرانی ادب کے نمونے ملتے ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد سے پہلے خالص اُردو کے ادب پارے دستیاب ہوتے ہیں جو تاریخ ادب اُردو کی تکمیل کے لیے اسی طرح ضروری ہیں جس طرح قدیم ایرانی نمونے تاریخ ادبیاتِ ایران کا اہم جزو ہیں۔

تاریخ ادب کی اسی کمی کے باعث زبان اُردو کی ابتدا کے بارے میں بھی بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں کیونکہ محققین و مورخین نے تحقیق و تاریخ زبان کی بنیاد اسی ادب پر قائم کی جو ایرانی لپی میں دستیاب ہوتا ہے چنانچہ اُردو کا آغاز بالعموم شاہجہانی عہد سے کیا جاتا ہے جبکہ اُردوئے معلیٰ کے علاقے کی نسبت سے اس کا نام زبان اُردو رکھا گیا اور نمونے تو اس کے بھی بعد کے زمانے سے شروع ہوتے ہیں۔ مورخین نے امیر خسرو کو اُردو کا پہلا شاعر ضرور مانا ہے لیکن وہ امیر خسرو کے بعد کے قدمائے دہلی تک ہند شمالی کی اُردو کے نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس درمیانی عہد کے نمونے دیوناگری لپی میں ملتے ہیں جن تک ان کی نظر نہیں گئی یا اگر ان کی نظر پڑی بھی تو انھوں نے انھیں اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ صرف ایرانی لپی میں ہی لکھی ہوئی زبان کو اُردو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدیم دیوناگری مخطوطات و مطبوعات کی جستجو از حد ضروری ہے کہ تاریخ ادب کی صحیح تکمیل صرف اسی طرح ممکن ہو سکتی ہے۔

(۱) دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ

دونوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل لفظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار لی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کے باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابلِ التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی کا اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے۔ جیسا ہندی زبان کا اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا عربی معاصر بولیوں کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اُردو نے قدیم مانے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے سطور ذیل میں اسی کھڑی بولی کے کچھ قدیم نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے ادب کے اجنبی نہیں ہیں اور صرف ایسے ٹکڑے منتخب کیے ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کم سے کم اور عربی فارسی الفاظ زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہوں۔ اس کے باوجود اگر کہیں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ نظر آئے تو اسے نمونوں کی کمی کے بجائے میری تلاش کی کمی سمجھنا چاہیے کیونکہ میں نے کچھ شعرا کا ذکر اس علم کے باوجود کہ وہ کھڑی بولی کے شاعر تھے محض اس وجہ سے نہیں کیا کہ ان کا کلام میرے سامنے نہیں ہے۔ ان کے علاوہ ابھی ایسے بہت سے شاعروں کے نام بھی رہ گئے ہوں گے جن کی دریافت مزید تحقیق کی محتاج ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام شعرا کا مکمل کلام سامنے نہ ہو نہ نمونوں کا قرار واقعی انتخاب ہو سکتا ہے نہ اس ادب پر صحیح تنقید ہی ہو سکتی ہے۔

میر امن نے مقدمہ "باغ و بہار" میں زبان اُردو کی ابتدا عہد اکبری سے کی ہے لیکن ہم اپنی گفتگو کا آغاز حضرت امیر خسرو کے عہد سے ہی کرنا چاہتے ہیں جن کو ہمارے مورخین اُردو زبان کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ امیر خسرو کے زمانے میں مہاراشٹر دیس کے ایک نامور درویش گیانیشور نامی گزرے ہیں جو موجودہ پیٹھن (دکن) سے چار کوس پر دریائے گوداوری کے جانب شمال اپنے گاؤں میں سن ۱۲۷۵ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے آج کل چار کتابیں ملتی ہیں جن میں بھگوت گیتا کی شرح جو انھوں نے گیانیشوری کے نام سے لکھی تھی بہت مشہور ہوئی۔ ان کے اُردو کلام کا ایک نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

سو ہی گیا کہ جے گیا وے نہیں گرو کا تجا
ڈنیا تج کر کھاک (خاک) لگائی جا کر بیٹھا بن موہن
کھیچر مدرا بجراسن میں دھیان دھرت ہے من موہن
تیرتھ کرے اوہ کھونی جوگ جگت میں ساری
دھن کا من او گھنہ تیاگے جوگ کمایا بھاری
گپت ہوئے کر پرگٹ ہوئے گوکل متھرا کاسی
ستہ ہو جوئے جی پران جو نکلے ستیہ لوک کے باسی
شاستروں میں تو نہیں رہا کچھ پیدا ان گاین مایا
بھید بدھی کا مارگ چلتا تن کا ٹکڑا کایا
کنڈلنی کرن کھوب (خوب) چڑھائے برہم رندھر کو جو وے

چلت ہے پانی کے اُوپر بولت سو ہی ہووے
حکم قدرتی کا گیانیشور کون تن کون اوپر جانا
سدگرو کی جان کرپا بھئی تان آپ ہی آپ پچھانا

اس نمونے میں کچھ الفاظ سنسکرت کے ہیں کیونکہ دیوناگری لپی کے اشتراک کے باعث ہندوستانی زبانوں میں سنسکرت کے دخیل الفاظ کا پایا جانا فطری ہے ان کے علاوہ چند الفاظ برج بھاشا کے بھی بے ساختگی سے نظم ہوگئے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ برج بھاشا اور اردو دونوں زبانوں کے مہاراشٹری گروہ سے تعلق رکھتی ہیں اور اس لیے انھیں مکانی اور زمانی قرب ہمیشہ حاصل رہا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ گیانیشور ایک بھگت تھے اور بھگتوں کا کلام باغ و بہار زبان میں ملتا ہے۔ بہرحال ان تھوڑے سے لفظوں کو چھوڑ کر پوری نظم میں اردو کا ٹھاٹھ قائم ہے بلکہ اس میں کچھ فارسی اور عربی کے لفظ بھی موجود ہیں جو اس ابتدائی زمانے میں ہندوستانی زبانوں پر مسلمانوں کے اثرات ثابت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا شعرائے بیجاپور کے کلام سے موازنہ کر کے دیکھیے جو گیانیشور کے بعد کے زمانے میں گزرے ہیں اور پھر فیصلہ کیجیے کہ ان میں سے کس کی زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے۔

گیانیشور کی ایک بہن کتا بائی بھی مرہٹی زبان کی شاعرہ تھیں جو ان سے عمر میں چار سال چھوٹی تھیں۔ ان کے کلام میں بھی اردو زبان کا دخل ملاحظہ فرمائیے۔ نمونہ یہ ہے۔

واہ واہ صاحب جی سدگرو لال گسائیں جی
لال بیچ میں اولا کالا اوپٹھ پیٹھ سون کالا
پیت امنی بھر مرگمپھا رس جھولنے والا
سہسر دل موں الکھی کھائے آج لون پرمانا
جہاں تہاں سادھو دسوا آپ ہی آپ ٹھکانا
سدگرو چیلے دونوں برابر ایک سامون بھائی
ایک سے ایسے درسن پانے مہاراج کتا بائی

اب یہاں سے بھگتوں اور سنتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں نام دیو کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو گیانیشور کے معاصر اور ذات کے درزی تھے۔ ان کے اردو کلام ملاحظہ کیجیے:

میں اندھلے کی ٹیک تیرا نام کھندکارا (خداوندگار)
میں گریب میں مسکین تیرا نام ہے ادھارا

آج نامے بیٹھل دیکھا مورکھ کو سمجھاؤں رے
پانڈے تری گایتری لودھے کا کھیت کھاتی تھی

لے کر لینا گھری تدری واٹھت جاتی تھی
پانڈے تمرا مادیو دھوے بدھ چڑھا آوت دیکھا تھا
مودی کے گھر کھانا پکا واکا لڑکا مارا تھا
پانڈے تمرا رام چند رسو بھی آوت دیکھا تھا
مادن سینی سر بر ہوئی گھر کی جوئی گنوائی تھی

نام دیو کے بعد ان سادھوؤں میں کبیر داس کا نام بہت مشہور ہوا۔ یہ قوم کے جولاہے تھے۔ بنارس ان کا مولد اور مگہر (ضلع بستی یو۔ پی) ان کی جائے وفات ہے۔ ان کے عہد کے متعلق مورخین میں شدید اختلاف رہا ہے۔ بہر حال ان کا زمانہ سن ۱۳۹۹ء سے ۱۵۱۸ء تک مانا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سکندر لودھی کے معاصر تھے۔ ان کا نمونہ کلام یہ ہے:

برہ کی جو سلگی مرے من میں بید ھ گیا تن سارا
او شدھ مول کچھ نہیں لاگے کیا کرے بید بچارا

ہاڑ جلے جیسے لکڑی کا نڑہ   کیس جلے جیسے گھاس کا پولا

جات نہ پوچھو سادھو کی پوچھ لیجئے گیان   مول کرو تروار کا پڑا رہن دو میان

بید کتیب افترا بھائی دل کا فکر نہ جائے   ٹک دم کراری جو کرو حاضر حضور خدائے

سب آئے اس ایک میں ڈار پات پھل پھول   اب کہو پاچھے کیا رہا گہہ پکڑا جب مول

سم ورشٹی ست گرو کیا میٹا بھرم بکار   جہاں دیکھو تہاں ایک ہی صاحب کا دیدار

رام سمر پچھتائے گا من
پاپی جیئرا لوبھ کرت ہے آج کال اٹھ جائے گا
لالچ لاگے جنم گنوایا مایا بھرم بھلائے گا
دھن جوبن کا گرب نہ کیجے کاگد جیوں گل جائے گا
جو جم آئے کیس گہ پٹکے تا دن کچھ نہ بس آئے گا

سمرن بِھجن دیا نہیں کبھی تو گمر چوٹان کھا سے گا
دھرم رائے جب لیکھا مانگے کیا مکھ لے کے جائے گا
کہت کبیر سنو رے سنتو سادھ سنگت تر جائے گا

رہنا نہیں دیس برانا ہے
یہ سنسار کاگد کی پڑیا بوند پڑے گل جانا ہے
یہ سنسار کانٹ کی باڑی اُلجھ پلجھ مر جانا ہے
یہ سنسار جھاڑ اور جھانکڑ آگ لگے بر جانا ہے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو ست گرو نام ٹھکانا ہے

من پھولا پھولا پھرے جگت میں کیسا ناتا رے
ماتا کہے یہ پُتر ہمارا بہن کہے بر میرا
بھائی کہے یہ بھجا ہماری نار کہے نر میرا
پیٹ پکڑ کے ماتا رووے بانہہ پکڑ کے بھائی
لپٹ جھپٹ کے تریا رووے ہنس اکیلا جائی

ہمن ہیں عشق مستانہ ہمن کو ہوشیاری کیا — رہیں آزاد یا جگ میں ہمن دنیا سے یاری کیا
جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے — ہمارا یار ہے ہم میں ہمن کو انتظاری کیا
خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتا ہے — ہمن گرو نام سانچا ہے ہمن دنیا سے یاری کیا
نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے — انھیں سے نیہہ لاگی ہے ہمن کو بے قراری کیا
کبیرا عشق کا ماتا دُوئی کو دُور کر دل سے — جو چلنا راہ نازک ہے ہمن سر بوجھ بھاری کیا

کبیر کے گرو بھائی رے داس کاشی کے ایک چمار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ نے ان کے سادھو پن سے تنگ آکر گھر سے نکال دیا تھا اس لیے جوتیاں بنا بنا کر اوقات بسر کرتے تھے۔ کبیر داس کے بعد ان کا اتنا اثر ہوا کہ جودھپور کے راٹھور رتن سنگھ کی اکلوتی بیٹی میرا بائی ان کی چیلی ہو گئی تھیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

نرپت ایک سنگھاسن سویا سپنے بھیا بھکاری — اچھت راج بچھرت دکھ پایا سو گت بھئی ہماری

جل کی بھیت پون کا تھمبا رکت بُند کا گارا   ہاڑ ماس ناڑی کا پنجر پنچھی بسے بچارا

پرانی کیا میرا کیا تیرا   جیسے ترورپنکھ بسیرا

دیکھا ددر و ند دے آیا   بہت پیاس جواب نہ پایا

دھرم داس کسوندھن باندھوگڑھ کے بڑے مہاجن تھے۔ ان کے صحیح سن ولادت و وفات کا علم نہیں ہے لیکن کبیر داس کے ہم عصر تھے۔ سن ۱۵۱۸ء میں کبیر کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے اور پندرہ بیس سال بعد وفات پائی۔ اُنھوں نے دُور دُور تک یاترا کی تھی۔ متھرا سے واپسی پر ان کی مُلاقات کبیر داس سے ہوئی جنھوں نے اُنھیں بھگتی کی طرف مائل کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہم ست نام کے بیپاری
کوئی کوئی لادے کانسا پیتل کوئی کوئی لونگ سپاری
ہم تو لادیو نام دھنی کو پورن کھیپ ہماری
پونجی نہ ٹوٹے نفع چوگنا بنج کیا ہم بھاری
ہاٹ جگائی روک نہ سکے نربھے گیل ہماری
موتی بوند گھٹ ہی میں اُپجے سکرت بھرت کٹھاری
پی پدارتھ لاد چلا ہے دھرما داس بیپاری

گرو نانک کا نام سکھ مت کے بانی کی حیثیت سے کافی مشہور ہے۔ یہ ۱۴۶۹ء میں کلیان چند کھتری کے یہاں پیدا ہوئے جو موضع تلونڈی تحصیل شرقپور ضلع لاہور کے ساہوکار رائے بلار بھٹی کے کارکن تھے۔ اُنھوں نے اپنی عمر کے تئیس سال سیر و سیاحت میں گزارے۔ آخر سولہ سال کرتار پور میں گزار کر تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اگرچہ ان کا بیشتر کلام پنجابی زبان میں تھا لیکن کبھی کبھی اُردو میں بھی طبع آزمائی کرلیتے تھے۔ نمونہ یہ ہے:

ٹھاکر کا سیوک آگیا کاری   ٹھاکر کا سیوک سدا پجاری

ورلے مٹھاں بستی گھوڑے پیموڑ روایت دیس گئے   پیر پیکامبر سالک صادق چھوڑی دنیا تھائیں پئے

کوجا بانگ نواج مسلا نیل روپ بنواری   گھر گھر میاں سبھناں جیاں بولی اور تمہاری
بے تو میر مہی پت صاحب قدرت کون ہماری   چارے کنٹ سلام کریندے گھر گھر صفت تمہاری

گھولی گیروہ مٹ چڑھایا دستر بھیس بھیکاری   کاپڑ پھاڑ بنائی کنتھا جھولی مایا دھاری

گھر گھر مانگے جگ پر بستے من اندھے بپاری   بھرم بھلانا سبد نہ چینے جوئے بازی ہاری

انھیں بھگتوں میں پندرھویں صدی عیسوی کے کرشن متی کا بھی نام آتا ہے جو سارنگ گڑھ (پنجاب) کے باشندے تھے اور تجارت کی غرض سے جو دھاڈشٹر پہنچے تو وہیں کے ہو رہے۔ یہ لسان بھاو نیتو کے مبلغ تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

جڑ مول بن دیکھا ایک درخت گولر کا
اس کو انت اپار گولر لاگے شمار نہیں پھولوں کا
زمیں آسماں برابر دیکھے دودو چندا سورج دیکھے نولاکھ تارے۔
چودھا بھون ساتوں دریا و میر و پربت ندی نالے کئی ہزار

بھگتوں کے کلام کے مندرجہ بالا نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قدیم زمانے میں بھی ہماری زبان کا روپ وہی تھا جو ہم آج دیکھ رہے ہیں چنانچہ لوگوں نے جو ایک طلسم باندھا ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں سے صرف اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنے روپ فلمی تصویروں کی طرح جلد جلد بدلتی رہی ہے وہ ان تحریروں کے پیش نظر یک لخت ٹوٹ جاتا ہے۔ بہر حال سولھویں صدی کے نصف اول تک اردو زبان کے نمونے ہمیں بھگتوں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخ ہندوستان میں ایک نیا موڑ آتا ہے اور آگرہ سکندر لودھی کے بعد ایک بار پھر عہد اکبری میں راجدھانی قرار پاتا ہے تو مغل اعظم کے دور کی تمام رعنائیاں ادب و فن کی صورت میں ایک مقام پر جمع ہو جاتی ہیں۔ غالباً آگرے کی اسی چمک دمک کو دیکھ کر میر امن نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اردو زبان کا آغاز اکبر بادشاہ کے زمانے سے ہوا ہے چنانچہ وہ باغ و بہار کے مقدمے میں کہتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔"

حقیقت صرف اتنی ہے کہ عہد اکبری میں اطراف ملک کے اہل کمال آگرے میں سمٹ آئے تھے چنانچہ اس زمانے میں جہاں ادبیات فارسی کو ابوالفضل، فیضی، عرفی وغیرہ سے اور اودھی زبان کو تلسی داس اور ملک محمد جائسی سے اور برج بھاشا کو سور داس جیسے عظیم شاعروں اور انشا پردازوں سے فروغ ہوا وہاں اردو زبان کے پودے کو بھی اس وقت کی آب و ہوا راس آئی اور اس کے بھی کچھ سرپرست پیدا ہو گئے چنانچہ برج بھاشا میں شعر کہنے والے کبھی کبھی کھڑی بولی یعنی اردو میں بھی طبع آزمائی کر لیا کرتے تھے۔ یہی حال نثر میں بھی ہے کہ ایک ہی کتاب یا عبارت میں اردو اور برج بھاشا دونوں شیر و شکر نظر آتی ہیں۔ چونکہ برج بھاشا بعض فرقہ والوں کی مذہبی زبان بن گئی تھی۔ اس لیے ان کی مذہبی کتابوں میں ایسے نمونے ملتے ہیں جن میں برج بھاشا کے ساتھ ساتھ اردو بھی استعمال کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں جن شاعروں اور نثر نگاروں کی تخلیقات ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان کو مذہب کے علاوہ دوسرے موضوعات پر اظہار خیال کیلئے بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن دیوناگری لپی کے باعث بعض نظموں میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہے۔

یہاں میں اس عہد کے جن شعرا کا اردو کلام پیش کرنا چاہتا ہوں ان میں عبدالرحیم خان خاناں کا نام سرفہرست آتا ہے جو عہد اکبری

کے ایک بہت بڑے امیر گزرے ہیں۔ ان کے نام پر آگرے کا ایک محلہ "کٹرہ خانخاناں" آج تک آباد چلا آرہا ہے۔ ان کا سن ولادت ۱۵۵۳ء اور سن وفات ۱۶۲۵ء ہے۔ یہ بیرم خاں کے بیٹے اور اکبر کے دربار کے نورتنوں میں سے ہیں۔ اکبر ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ عربی فارسی سنسکرت برج بھاشا اور اردو کے اچھے عالم تھے۔ ان کی محفل میں علما کا ہجوم رہتا تھا۔ بڑے مخیر۔ شریف النفس اور کرشن جی کے معتقد تھے جو ان کی شاعری کا اصلی موضوع ہیں۔ برج بھاشا کے بہت اچھے شاعر ہونے کے باوجود اردو میں بھی انھوں نے کچھ چھند لکھے ہیں جو ان کی کتاب "مدناشٹک" میں پائے جاتے ہیں۔ ایک چھند پیش کیا جاتا ہے۔

کلت للت مالا وا جواہر جڑا تھا　　چپل چکھن والا چاندنی میں کھڑا تھا
کٹ تٹ بیچ میلا پیت سیلا نویلا　　الی بن البیلا یار میرا اکیلا

پرمانند داس کانیہ کبج برہمن اور قنوج کے باشندے تھے اور ولبھ آچاریہ کے شاگرد تھے۔ ان کا ذکر "چوراسی ویشنوؤں کی وارتا" میں ملتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے۔ کرشن جی کی تعریف میں کہتے ہیں۔

دیکھو ری یہ کیسا بالک رانی جسمت جایا ہے　　سندر بدن کمل دل لوچن دیکھت چند لجایا ہے
پارن برہم الکھ ابناسی پرگٹ نند گھر آیا ہے　　پرمانند کرشن من موہن چرن کمل چت لایا ہے

عالم دربار اکبری کے ایک مسلمان شاعر تھے جنھوں نے ۹۹۱ھ میں "مادھونل کام کندلا" نامی قصہ کو برج بھاشا میں نظم کیا تھا۔ ان کے کلام اردو کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے:

غم کے نصیب سے غنی ہے جیسے راج پائے　　عاشق غریب کو گمان منی ال کیا
ناز تے نواز کے لبک ہی نہال کیا　　جیونے کی جوک میں جدائی کا زوال کیا
وہ اس روز سے خواب جہاں خاک ہی ہیں　　خبر نہیں خونی بیچ تیرا خیال کیا
دل لے جو آئے سودا لاسا بھی پاوے واتو　　یار دلدار ایسے بیدل کا حال کیا

اسی زمانے میں سوامی نپٹ نرنجن نامی ایک اور شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام اردو میں برج بھاشا کا پٹ بھی ملا ہوا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

چھن مد چھکا جا کے چھکے تے اچپک ہوت　　اچپک چھکا ہے گھوم گھومت خماری کا
نس دن نس دن جب سدھ آوت ہے　　تب اپجاوے سدھ صاحب شماری کا
نپٹ نرنجن امر مرنے کا سہیس　　ایک بار مار و نام آوے نا دوباری کا
ہوں تو متوالا او پہچے مد کا نہ لیں والا　　پور کر پیالہ گھرج رہے نا خماری کا

ایک ناتھ سوامی پیٹھن (مہاراشٹر) کے ایک سنت اور جناردھن سوامی کے شاگرد تھے۔ انھوں نے شمالی ہندوستان کا بھی دورہ کیا تھا چنانچہ یہ کچھ دن کاشی میں بھی رہے اور وہیں انھوں نے اپنی کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔ ان کا عہد ۱۵۳۳ء بتایا جاتا ہے۔ ان کی اردو شاعری کا نمونہ یہ ہے:

اللہ رکھے گا ویسا رہنا　　مولا رکھے گا ویسا رہنا
کوئی دن سر پر چھتر اُڑاوے　　کوئی دن سر پر گھٹڑا چڑھاوے
کوئی دن ترکھت اُوپر چڑھاوے　　ماس کھاس چپڑھاوے
کوئی دن شکر دُودھ ملیدا　　کوئی دن اللہ مانگت جیدا
کوئی دن سیوک ہاتھ جوڑ کھڑے　　کوئی دن بھیک نہ آوت ٹکڑے
کوئی دن راجا بڑا ادھکاری　　ایک دن ہوئے کنگال بھکاری
ایکا جنار دن کرت کرتاری　　غافل کیوں کرتا مغروری
دیو چھنال کا چھنال کا　　کھیل کھلاڑی بانیا
چھندڑا سکھر کر بانٹا　　جاکر جھروکے میں بیٹھا
بڑا دُھوم کا داتا　　نہیں جات پات کچھ ناتا
ایک ناتھ کا والی　　یا سے کون دیوے گالی

دِل کی گانٹھ کھولو　　یارو رام نام بولو
کوئی نہیں آوے ساتھ　　بھنڈے کاہے کون کرے بات
جورو لڑکے ماں باپ　　سب پیارے ہاتھ
ہتی گھوڑے پالکھ پینا　　نہیں آوے ساتھ
دو دن کا بزار یارو　　کاہے کون کرتا بات
جھوٹی مایا جھوٹی کایا　　جھوٹا سب دن رات
ایکا جنار دن بولے بھائی　　کوئی نہیں آئے ساتھ

حضرت بھولا مولا　　سب دُنیا پالن والا
سب گھر مون سائیں براجے　　کرت ہے بول بالا
غریب نواز میں غریب تیرا　　تیرے چرنن کون رت والا
اپنا سائیں سمجھ کے لینا　　سلیل وہی اللہ
جن رُوپ سے ہے جگت پیدا　　وہی سلال اتو

جنی جنار دن ایک ناتھ سوامی کے گرو بھائی۔ جنار دن سوامی کے چیلے اور مہاراشٹر کے رہنے والے تھے اور بیجاپور

بالحصیلات۔ ان کی تاریخ وفات سن ۱۶۰۱ء ہے ان کا بھی کچھ کلام اُردو زبان میں ملتا ہے مثلاً

جب تو آیا تب کیا لایا کیا لے جائے گا
کس نے بلایا سمجھو نہ تھا دھندھا پڑیا پھندا دیکھت کیا ہو اندھا
کہت جنار دن سن ارے من نہ چھوڑ اس سائیں کے چرن

اس عہد کے سنتوں میں دادو دیال کا نام سب سے نمایاں ہے۔ یہ سنہ ۱۵۴۴ء میں احمد آباد (بھارت) کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۶۰۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ہندوستان کا دادو پنتھ انہیں سے چلا ہے۔ جے پوری فوج کے ناگا انہیں کے پنتھ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اُردو، برج بھاشا، فارسی، گجراتی، مارواڑی اور مرہٹی کے عالم تھے۔ ان کی زندگی بیشتر راجپوتانے میں گزری ہے اس لیے ان کی زبان پر برج بھاشا اور راجستانی کا زیادہ اثر ہے لیکن کچھ کلام پنجابی اور ریختہ میں بھی موجود ہے۔ ریختے کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

عشق اللہ کی ذات ہے عشق اللہ کا رنگ　　عشق اللہ وجود ہے عشق اللہ کا رنگ
عاشق معشوق ہو گیا عشق کہاوے سوئے　　دادو اس معشوق کا اللہ ہی عاشق ہوئے
سب آیا اس ایک میں ڈال پات پھل پھول　　دادو پیچھے کیا رہا جب نج پکڑا مول
کالا منہ سنسار کا نیلے کیے پاؤ　　دادو تین طلاق دے بھاویں تیدھر جاؤ
جب سائیں کو سجدہ کیا تب سر دھرا اُتار　　یوں دادو جیوت مرے حرص و ہوا کو مار

عہد اکبری کے ایک مشہور شاعر و مصنف گنگ برہم بھٹ نے اُردو نثر میں بھی ایک کتاب "چند چھند ورنن کی مہما" نامی لکھی تھی۔ اس کا نمونہ یہ ہے:

"سدھ شری شری ۱۰۸ شری شری پات ساہ جی شری دل پت جی اکبر ساہ جی آم کاش (عام خاص) میں تخت (تخت) اوپر براجمان ہو رہے اور آم کاش بھرنے لگا ہے جس میں تمام امراؤ آنے آنے کر نش (کورنش) بجائے بجائے جوہار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مسل سے۔ جن کی بیٹھک نہیں سو ریشم کے رسے میں ریسم (ریشم) کی لوں میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہیں۔"

"اتنا سن کے پات ساہ جی شری اکبر ساہ جی آد (آدھ) سیر سونا نربرداس چارن کو دیا۔ ان کے ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس ونچنا پورن بھیا۔ آم کاش (عام خاص) برکاس (برخاست) ہوا جس کا سمبت ۱۶۲۰ کا متی گھر اس سدی ۱۳ گرو وار کے دن پورن بھئے۔"

اکبر کے انتقال پر ہی سولھویں صدی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۶۰۵ء میں سلطنت جہانگیر کو منتقل ہوتی ہے اور پھر سنہ ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں بادشاہ بن جاتا ہے لیکن آگرہ بدستور پایۂ تخت رہتا ہے یہاں تک کہ سنہ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان آگرے سے اُٹھ کر دلی بساتا ہے۔ اس زمانے کی اُردو کا کچھ حال تذکروں اور تاریخوں سے بھی معلوم ہونے لگتا ہے اور پایۂ تخت سے منسلک سمجھنے والوں کے علاوہ اطراف ملک کے بھگتوں کے یہاں سے بھی اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ نور جہاں سے بھی مندرجہ ذیل اشعار منسوب کیے جاتے ہیں:

دیں جگہ زخمِ جفا کو دل صد چاک میں ہم — دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بُت بے باک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق — تیرے قدموں سے جُدا ہو کے ملے خاک میں ہم

جہانگیر کے بیٹے شہریار کے اُردو کلام کا بھی نمونہ دیکھیے۔

چاند سے چکور ٹلے میگھ سے بھی مور ٹلے — چوری سے چور ٹلے دل سے دلدار جو
روگیوں سے روگ ٹلے بھوگیوں سے بھوگ ٹلے — جوگیوں سے جوگ ٹلے کامیوں سے نار جو
پربت سے میرو ٹلے دھن سے کبیر ٹلے — دل کا بھی پھیر ٹلے ہو بڑا ہزار جو
لیکن (اے) شہریار مانو یہ اعتبار — ٹلے نہیں ہونہار ہووے ہونہار جو

سُندر داس ایک ڈھوسر بنیے پرمانند نامی کے گھر ۱۵۹۶ء میں بمقام دوسہ ریاست جے پور پیدا ہوئے۔ جس وقت دادو دیال دوسہ آئے ہیں اُن کی عمر چھ سال کی تھی۔ یہ اسی وقت سے ان کے چیلے ہو کر ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ کاشی میں تیس سال کی عمر تک (۱۹ برس) سنسکرت، ویدانت اور پران پڑھتے رہے۔ سنسکرت کے علاوہ ہندی، فارسی، گجراتی، مارواڑی وغیرہ زبانیں بھی خوب جانتے تھے۔ ۱۶۲۵ء میں ایک اور سادھو کے ساتھ فتح پور (شیخاواٹی) چلے گئے اور وہیں پڑے رہے۔ فتح پور کے نواب الف خان، دولت خان اور طاہر خان سے ان کی اچھی رسم و راہ تھی۔ الف خان بھی بھاشا کے شاعر تھے۔ سندر داس فن شاعری کے ماہر تھے۔ اُنھوں نے ویدانت پر اچھے شعر کہے ہیں۔ ان کی مختصر تصنیفات کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔ ۱۶۸۹ء میں بمقام سانگانیر (جے پور) انتقال کیا۔ ان کے کلام ریختہ کا نمونہ یہ ہے:

سُندر جو غافل ہوا تو وہ سائیں دُور — جو بندہ حاضر ہوا تو حاضر آن حضور

سُندر اندر پیس کر دل میں غوطہ مار — تو دل ہی میں پائیے سائیں سرجن ہار
سُخن ہمارا مانیے مت کھوجے کہوں اور — سائیں سینے بیچ ہے سُندر سدا حضور
سُندر دل کی سیج پر صورت ہے ارواح — اس کو جاگیا چاہیے صاحب بے پرواہ

ملوک داس کڑا ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے ۱۵۷۴ء میں سُندر داس کے یہاں پیدا ہوئے جو ذات کے ککڑ کھتری تھے۔ لڑکپن میں کمبل بیچتے گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ کچھ عرصے کے بعد بھگوت گیتا کا ورد شروع کیا۔ دُور دُور تک شہرت پھیلی اور لوگ زیارت کو آنے لگے۔ یہ دراوڑ دیس کے مہاتما بٹھل داس کے چیلے تھے۔ اُنھوں نے ۱۶۸۲ء میں ۱۰۸ سال کی عمر پاکر انتقال کیا ہے۔ کڑا (الٰہ آباد) جے پور، گجرات، پٹنہ، کلاپور، نیپال، کابل، مُلتان اور جگناتھ پوری میں ان کے پنتھ کی خاص گدیاں رہی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام — داس ملوکا کہہ گئے سب کے داتا رام

تیرا میں دیدار دوانا
گھڑی گھڑی تجھے دیکھا چاہوں سن صاحب رحمانا

چوا الست خبر نہیں تو کی سپیا پریم پیالا
ٹھاڑا ہو دن تو گر گر پڑتا تیرے رنگ متوالا
کہیں تکوک اب قضا نہ کرہوں دل ہی سوں دل لایا
تجے رتج بستے ہیں دیکھیا پورا مرشد پایا
جہاں جہاں بیٹھا پھرے تہاں تہاں پھرسے گلے
کہیں تکوک جہاں سنت جن ہنساں دیبا جائے

شواجی کے معاصر تکارام کے ابھنگ بھی اُردو زبان کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے ابھنگوں کی تعداد پانچ چھ ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔ یہ مہاراشٹر کے باشندے اور ذات کے شودر تھے۔ سن ۱۶۰۸ء میں پونہ کے قریب ایک گاؤں دیہو نامی میں ان کی پیدائش ہوئی۔ تجارت ان کا ذریعۂ معاش تھی۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور ساتھ ساتھ ان کے کاروبار میں بھی خسارہ آیا۔ اسی عالم مفلسی و بے کسی میں ان کی بیوی نے فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دی تو تکارام کا دل دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھگت بن گئے۔ شواجی ان پر بڑا مہربان تھا۔ اس نے ایک بار انھیں برہمنوں کے مظالم سے بھی بچایا تھا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

کیا گاؤں کوئی سُننے والا　　دیکھیں تو سب جگ ہے بھولا
کھیلو اپنے رام ہی ساتھ　　جیسی ویسی کر ہیں مات
کہاں سے لاؤں مدھری بانی　　ریجھے ایسے لوک پرانی
گردھر لال بھاؤ کا بھوکا　　راگ کلا نہیں جانت تکا

سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں تاج نامی کوئی مسلمان خاتون بھی گزری ہیں جو کرشن جی کی عقیدت مند تھیں۔ ان کے خاندان اور وطن کے متعلق علم نہیں ہو سکا ہے۔ ان کا کلام رنگیلا اور رسیلا ہے جس میں اُردو کے ساتھ ساتھ پنجابی کے بھی کچھ الفاظ ملتے ہیں۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہوگا۔ نمونۂ کلام یہ ہے:-

سنو سنو جانی میکے دل کی کہانی　　تم دست ہی بکانی بدنامی بھی سہوں گی میں
دیو پوجا ٹھانی میں نواج ہو بھلانی　　تجے کلمہ کراں سارے گنو گہوں گی میں
سیاہ سلونا سرتاج سر کلے دیے　　تیرے نیہ داگ میں نداگ ہو دھوں گی میں
نند کے کمار کربان تانڈی صورت پے　　تانڈ نال پیارے ہندوانی ہو رہوں گی میں

چھیل جو چھبیلا سب رنگ میں رنگیلا بڑا　　چت کا اڑیلا کہوں دیوتوں سے نیارا ہے
مال گلے سوہے ناک موتی سیت سو ہے　　کان موہن ہے سو کنڈل مکٹ سیس دھارا ہے
دشٹ جن مارے سنت جن رکھوارے تاج　　چت ہت وارے پریم پریت کروارا ہے

سندر جو کا پیارا بن گئیں کرپھیارا   وہ سندر ابن وارا کرشن صاحب ہمالیے

اسی زمانے میں آگرے کے پنڈت چندر بھان برہمن کا نام بھی سامنے آتا ہے جو دارا شکوہ کے منشی تھے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی آنجہانی کی تلاش کے مطابق برہمن کی یہ غزل "خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے۔" اردو کی پہلی غزل شمار کی جاتی ہے۔

۱۶۴۸ء کے آس پاس ایک اور شاعر دنے دبجے نامی بھی گزرے ہیں جو سنسکرت کے بہت اچھے عالم تھے۔ ان سے ایک کتاب "دنے ولاس" یادگار ہے۔ ان کا اردو کلام ملاحظہ کیجیے :

گھوڑا مجھولیہے رے تو مت بھولے اسوارا
توئے مدایہ لاگت پیارا انت ہوئیگا نیارا
چرے چیز اور ڈرے قید سوں وبٹ چلے اُتارا
زین کسے تب سویا چاہے کھانے کو ہشیارا
خوب خزانہ خرچ کھلاو دیو سب نعمت چارا
اسواری کا اوسر آدسے نکلیا ہوئے گنوارا
چھن تاتا چھن پیاسا ہوئے خزمت کرا ون ہارا
دوڑ دُوڑ جنگل میں ڈارے جھورے دھنی بچارا
کرو چوکڑا چاتر چوکس دیو چابک دو چارا
اس گھوڑے کو دنے سکھاؤ جیون پاؤ بھوپارا

کل پتی مسر آگرے کے رہنے والے اور ذات کے برہمن تھے۔ ان کے والد کا نام پرشن رام مسر تھا۔ ان کا سال ولادت ۱۶۲۰ء اور عہد تصنیف ۱۶۷۰ء بتایا جاتا ہے۔ ریاست جے پور کے راجا رام سنگھ کے یہاں رہتے تھے۔ سنسکرت کے اچھے عالم تھے اور فن شعرگوئی میں بڑی بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا چھند ملاحظہ کیجیے :

ہوں میں مشتاق تیری صورت کا نور دیکھ دل بھر پور ہے کہنے جواب سے
مہر کا طالب فقیر ہے مہربان چاتک جیوں جیوتا ہے سوات والے آب سے
تو تو ہے ایانی یہ خوبی کا خزانہ تسے کھول کیوں نہ دیجے سیر کیجے ثواب سے
دیر کی نہ تاب جان ہوتی ہے کباب بول جیاتی کا آب بولو لکھ مہتاب سے

مہاتما گری داس ریاست کشن گڑھ (راجپوتانہ) کے راجا۔ بلبھی فرقے کے گوسوامی رنچھور داس جی کے چیلے اور کرشن جی کے بھگت تھے۔ انھوں نے ۱۷۶۴ء میں برج میں انتقال کیا ہے۔ یہ سنسکرت، فارسی، کھڑی بولی اور ڈنگل کے طالب علم تھے اور گجراتی، پنجابی اور گڑھوالی زبانوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے جیسا کہ ان کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

اس حسن کے مقابل کرنا بیان کیا ہے　　پھر چشم بہ بچاری شاعر زبان کیا ہے

عشق اسی کی جھلک ہے جیوں سورج کی دھوپ　　جہاں عشق تہاں آپ ہے قادر نادر روپ

آیا عشق لپیٹ میں کھائی چشم چپیٹ　　سو ہی آیا خلق میں اور بھریں سب پیٹ

[illegible] کے آس پاس بھانسی (یوپی) میں ایک مسلمان شاعر رس رنگ نامی گزرے ہیں۔ یہ بزرگ برج بھاشا اور کھڑی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی کھڑی بولی کا نمونہ یہ ہے :

تیرے محبوب بانکے نے چشم کی چوٹ ماری ہے　　کھڑا ہے سامنے ہی میں ذرا نہیں پلک ماری ہے

جلایا انھیں نے مجھ کو جنھوں پہ گانس ماری ہے　　تڑاپتا کد ہی نہ جیتا بچھوہا درد بھاری ہے

بھو دھرداس آگرے کے باسی اور ذات کے جینی ایک شاہ ہوئے ہیں جنھوں نے [illegible] میں جین شتک نامی ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ یہ برج بھاشا کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

جو گی تو جنم سے پڑا وہ لال کپڑے پہنتا　　اس رنگ سے کام نہیں کپڑے رنگے سے کیا ہوا

پوتھی کے پڑا پچیا گھر گھر کتھا کہت پھرے　　نج برہم کو چینا نہیں برہمن ہوا تو کیا ہوا

سیتل ایک مشہور مصنف تھے جو مراد آباد کے قریب کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کا عہد [illegible] کے لگ بھگ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ایک پوری کتاب کھڑی بولی میں لکھی ہے جس کے تین حصے ہیں۔ گلزار چمن، آنند چمن اور بہار چمن۔ اس کتاب میں مسدس صورت پر ۵۰۰ چھند ہیں۔ سیتل بھاشا، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ جوتش کے بھی ماہر تھے۔ ان کا کلام جو شیلا اور تشبیہات و استعارات سے مرصع ہے۔ انھوں نے بڑے بڑے قلابے باندھے ہیں اور ندرتِ مضامین کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی دکھائی ہے۔ ان کے کلام سے تین نمونے درج کیے جاتے ہیں :

گھر سرو چند پر بکھر گیا جانی کے بوند پسینے کا
یا کندن کمل کلی اوپر جھمکا ہے رنگ نگینے کا
دیکھے سے ہوش کہاں رہوے جو پیر رگ جل پینے کا
یا لعل بدخشاں پر کھینچا جو کا الماس نگینے کا

ہم خوب طرح سے جان گئے جیسا آنند کا کند کیا
سب رُوپ سیل گن تیج پنج تیرے ہی تن میں بند کیا
تجھ حُسن پر بھا کی باتی لے پھر بدھ نے یہ فرفند کیا
چمپک دل سون جوہی نرگس چامی کر چیلا چند کیا

چندن کی چوکی چارپڑی سوتا تھا سب گن جٹا ہوا
چھکے کی چھپ ادھر بھنس نواب وارم پھٹا ہوا
ایسے میں گرمن سے سیتل اک خیال ٹرا اٹ ٹرا ہوا
بھتل نے نیجہ نیجہ تے اوڈی اٹھ اچھلے نٹ کا ٹبا ہوا

اب ہم قدمائے دہلی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے مزید نمونے پیش کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ اُردو زبان کے اس قدیم ادب پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی چند خصوصیات کو واضح کر دینا ضروری ہے ۔

(۱) یہ تمام سرمایہ دیوناگری لپی میں لکھا ہوا ملتا ہے جس کے گنجلک حصے مزید تحقیق و تلاش سے صاف ہو سکتے ہیں اور غلطیاں بھی تقابل اور موازنے سے دُور کی جا سکتی ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ اس طرح ہمیں مندرجہ بالا نمونوں سے بھی بہتر نمونے مل جائیں گے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ تلاش و جستجو سے ایرانی لپی کے بھی کچھ نمونے دستیاب ہو جائیں لیکن ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہوگی۔

(۲) یہ سرمایہ بیشتر منظومات پر مشتمل ہے جس میں دیسی یعنی پنگل کے عروض سے کام لیا گیا ہے اور اقسام نظم کے نام بھی دیسی ہیں مثلاً دوہا، سوّیا، چوپئی، چھپئی وغیرہ ۔ البتہ کہیں کہیں بعض شعرا نے ایرانی اوزان بھی استعمال کیے ہیں جو یقیناً ایرانی ادب کے بڑھتے ہوئے اثرات کا ثبوت دے رہے ہیں ۔

(۳) چُونکہ شعرائے مذکورہ بالا میں زیادہ تعداد بھگتوں اور سنتوں کی ہے اس لیے نمونوں کا بیشتر حصّہ بھی درویشانہ اور صوفیانہ خیالات سے مملو ہے جس میں طبقاتی امتیاز، رسم پرستی اور نمائشی زہد و اتقا سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے اور دُنیا کی بے ثباتی کے پیش نظر صلح کُل، مساوات اور انسان دوستی کی تعلیم دی گئی ہے لیکن عام شعرا کے یہاں دُوسرے موضوعات بھی ملتے ہیں جن میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے بلکہ کرشن بھگتی کے پردے میں تو شعرا نے حُسن و عشق کی مجلہ واردات کہہ سنائی ہیں اور ہجر و وصال، سراپا نگاری، معاملہ بندی، درد و غم وغیرہ کے تمام مرقعے کھینچ دیے ہیں۔ تحقیق سے ایسے نمونوں میں بھی کافی اضافہ ہو سکتا ہے ۔

(۴) بھگتی ... [illegible]

ہے کہ یہ مصنّفین بھگتی تحریک کے علمبردار تھے جو مختلف علاقوں سے آٹھے اور جنھوں نے اپنے اپنے عقائد و نظریات کے پرچار کے لیے جگہ جگہ کی یاترائیں کیں اور ہر زبان کی بولیوں کے الفاظ اپنی تبلیغی نظموں میں اس لیے شامل کیے کہ ان کا پیغام عوام کی سمجھ میں آجائے لیکن عام شعرا کے یہاں برج بھاشا کا اثر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ دیوناگری لپی میں لکھی جانے والی دُوسری زبانوں کی طرح اس ادب میں بھی سنسکرت کے کافی الفاظ ملتے ہیں جس کا سبب مذہبی وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ عربی، فارسی الفاظ جو اس کے بعض حصّوں میں کم اور بعض شعرا کے یہاں زیادہ نظر آتے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی زبانوں کا اثر یہاں کے عوام پر ابتدا ہی سے پڑ چلا تھا جو بڑھتے بڑھتے ادیبوں اور انشا پردازوں تک جا پہنچا۔

(۵) زبان کی بحث میں ریختے تک سے جاتی ہے۔ "ریختہ" کے لغوی معنی گری پڑی پریشان چیز کے ہیں۔ فن تعمیر کی اصلاح میں ریختہ گچ کو کہتے ہیں جو پسے ہوئے کنکر اور چونے کے ملانے سے تیار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی اور ایرانی سُروں کو ملا کر جو موسیقی تیار ہوتی ہے اسے بھی ریختہ کہتے ہیں۔ ادب میں ریختہ کا لفظ نظم کے لیے استعمال ہوا ہے جس کی مختلف قسمیں میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ مختلف ادوار کے ریختے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ لفظ صرف مسلمانوں کی شاعری ہی سے مخصوص نہ تھا بلکہ ریختے تو بہت سے ہندوؤں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ میں نے کبیر داس، رے داس، داؤد دیال، غریب داس وغیرہ کے ریختوں کے نمونے دیکھے ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ریختے کی تعریف میں نہ پی یا اوزان کی کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ ریختے دیوناگری لپی میں بھی لکھے گئے ہیں اور بنگل کی بحروں میں بھی۔ البتہ ریختہ دُوسری عام نظموں سے صرف زبان کے معاملے میں مختلف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ریختہ اس نظم یا شعر کو کہتے ہیں جس کی زبان اُردو (کھڑی بولی) ہو اور اس میں عربی فارسی کے کچھ الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہوں۔ اب اگر اس ادبی یا لسانی اصطلاح کو فن تعمیر اور فن موسیقی کی اصطلاح سے ملا کر دیکھا جائے تو لفظ ریختہ کے معنی مرکب یا آمیزے کے نکلتے ہیں جس کا فارسی معنی گری پڑی پریشان چیز سے کوئی تعلق نہیں اور اس لیے لفظ ریختہ کو ان معنوں میں خالص دیسی لفظ "ریکھتا" کی تعریب سمجھنا چاہیے۔

اُردو زبان کے مندرجہ بالا نمونوں سے یہ بات بالکل واضح اور صاف ہو جاتی ہے کہ اُردو کا جو قدیم ادب ہماری تاریخوں میں ج ہے اس سے پہلے کا ادب دستیاب ہو سکتا ہے اور ہماری زبان اور ہمارے ادب کی تاریخ میں جو تین سو سال کا خلا ہے اسے باپوری زبان کے ادب سے پُر کرنے کے بجائے خود اُردو زبان کے ادب ہی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کام میں سخت تن دہی ر جانفشانی درکار ہے کیونکہ یہ سرمایہ مخطوطات اور مطبوعات کی صورت میں جا بجا بکھرا پڑا ہے لیکن اسے یکجا کرنا ولدادگانِ ادب کا م فریضہ بھی ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

اس مضمون کی تیاری میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہندی ساہتیہ کا وبھاگ اتہاس مرتبہ سوریہ کانت۔

۲۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ۔ رام چندر شکل
۳۔ مشربندھو ونود حصّہ اوّل مرتبہ مشربندھو
۴۔ ہندی کے مسلمان کوی۔ گنگا پرشاد سنگھ
۵۔ سنت ساہتیہ ۔ بھونیشور ناتھ مسر
۶۔ اشٹ چھاپ ۔ دھیریندر ورما
۷۔ دادو دیال کی بانی مرتبہ پنڈت شری دھرشولال جی
۸۔ مہاتما کبیر۔ ہری نواس دویدی۔
۹۔ گرو گرنتھ صاحب ۔ (گورمکھی)
۱۰۔ تذکرہ جلوۂ خضر حصّہ اوّل۔ صفیر بلگرامی ۔

مشترک الفاظ

رشید حسن خاں

اردو میں مشترک الفاظ خاصی تعداد میں ہیں۔ مشترک الفاظ سے وہ لفظ مراد ہیں، جن کی تذکیر و تانیث میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف کئی طرح کا ہے: کچھ لفظ، دلی لکھنؤ کے دبستانی اختلاف کے تحت آتے ہیں، کہ دلی والے مذکر استعمال کرتے ہیں اور لکھنؤ والے مونث، یا اس کے برعکس۔ کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ ایک ہی دبستان کے کچھ لوگ مذکر کہتے ہیں، کچھ لوگ مونث۔ یہ بھی ہے کہ ایک ہی اُستاد نے ایک لفظ کو کبھی مذکر نظم کیا، کبھی مونث۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک لفظ ایک زمانے میں مذکر تھا بالاتفاق، رفتہ رفتہ اُس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، اور اب وہ بالعموم مونث بولا جاتا ہے۔ لیکن لغات میں یا دوسری متعلقہ کتابوں میں یہ تفصیل موجود نہیں۔

ہمارے یہاں ایک بڑی کمی یہ بھی ہے کہ مختلف لغات میں مختلف قول ملتے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی تو اپنے مکتبۂ خیال کی طرف داری کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور کبھی عدمِ تحقیق کا۔ معائبِ شعر کے قاعدوں اور تلفظ کے مسائل میں بھی سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ عموماً لغات میں نقلِ قول پر بھروسہ کیا گیا ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کی تذکیر و تانیث کا تعین شروع میں نہیں ہو سکا۔ استعمال میں دونوں طرح آتے رہے، کچھ دنوں کے بعد کسی نے ایک صورت کو قبول کر لیا، کسی نے دوسری صورت کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی کتاب میں ایک قول کو ترجیح دی گئی، کسی میں دوسرے قول کو جگہ دی گئی۔ مخدومی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اس طرف نہایت خوبی کے ساتھ اشارہ کیا ہے:

"جنس یا تانیث و تذکیر کا اختلاف ہر دور میں رہا ہے۔ اور یہ اختلاف مکان اور زمان دونوں پر مبنی ہے۔ بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ زمان و مکان کا تفاوت نہیں، پھر بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک ہی شاعر ایک لفظ کو کبھی مونث، کبھی مذکر کر جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اردو نے مختلف اور متعدد زبانوں سے لفظ لیے ہیں۔ جب کوئی نیا لفظ آیا، اگر اُس میں اردو کی رو سے کوئی علامت تانیث یا تذکیر کی نہ تھی، تو ایک مدت تک اُس کی جنس معیّن نہ ہو سکی۔ اور اسی لیے اکثر لفظوں کا فیصلہ آج تک نہ ہو سکا۔ جنس ہی کے معیّن ہونے پر جمع کی صورت کا انحصار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اردو میں جنس اور عدد، دونوں سیال حالت میں ہیں۔" (مقدمہ کلیاتِ ولی۔ طبع دوم۔ ص ۴۴)

ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شاعر نے غلطی سے ایک جگہ کسی لفظ کو رواجِ عام کے خلاف مذکر یا مونث نظم کر دیا۔ اس استعمال کو قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، لیکن بعض لغت نویسوں نے اس کو سند کے طور پر قبول کر کے، اُس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ ایسا بھی ہے کہ جن اشعار کو یا کسی ایک شعر کو، کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث کے لیے بہ طور سند پیش کیا گیا، ان اشعار کو یا اُس شعر کو اصولاً بہ طور سند پیش ہی نہیں کیا جا سکتا تھا، محض غلط فہمی کا کرشمہ تھا۔ لیکن اس سے ایک غلط اندراج کا اضافہ ہو گیا اور بعد والوں کے لیے وہ

ایک اختلافی مسئلہ بن گیا۔ ایسے الفاظ کا جائزہ، ایک نہایت دلچسپ اور مفید کام ہوگا۔ ذیل میں ایسے کچھ الفاظ کو ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کوشش کی جائے گی کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے۔ قسط اوّل میں ۶ لفظوں کو شامل کیا گیا ہے:
آب، ساد، آغوش، الاپ، ایجاد، املا۔

---

(۱) آب :

یہ لفظ حقیقی معنی کے لحاظ سے، پانی کا مرادف ہے اور بالاتفاق مذکر۔ مجازاً، تاب اور آبداری کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور ان معانی میں، مونث ہے۔ اُردو لُغات میں بھی اس کو مونث ہی لکھا گیا ہے۔ لیکن جلاؔل نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث، مفید الشعراؔ میں اِس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کیا ہے (اگرچہ مونث کو مرجح لکھا ہے) اور سند میں آتشؔ کا ایک شعر اور ایک مصرع، اور بحرؔ کا ایک شعر پیش کیا ہے۔ جلاؔل کی تقلید میں، رشحاتِ صفیر اور ارمغانِ احباب میں بھی اس لفظ کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ اور مذکر کی سند میں آتشؔ کا وہی ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو جلاؔل نے درج کیا ہے ——— لیکن جلاؔل کا یہ فیصلہ محلِ نظر ہے۔ جلاؔل نے مذکر کی سند میں درج ذیل شعر پیش کیے ہیں۔ [اُنھوں نے آتشؔ کے دوسرے شعر کا صرف مصرعِ ثانی لکھا ہے۔ مصرعِ اول کا اضافہ کیا گیا ہے] :

۱؎ حکیم سید ضامن علی جلاؔل لکھنوی (متوفی ۱۹۰۹ء تذکرۂ کاملانِ رام پور) کا یہ قابلِ قدر رسالہ پہلی بار ۱۲۹۳ھ میں شائع ہوا تھا۔ اُس وقت اس کا نام کارآمد شعرا تھا۔ جلاؔل نے نظرِ ثانی کے بعد، اس کو مفید الشعرا کے نام سے شائع کیا۔ اس رسالے کے کچھ مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے لیکن اس کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے اور مستند سمجھا گیا ہے۔ جلاؔل کے سب سے بڑے مخالف، مولوی سید ظہیر احسن شوقؔ نیموی نے اس رسالے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے اس کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے مختلف رسائل تذکیر و تانیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے : "ان میں مفید الشعرا، جناب جلاؔل کی تالیفات سے ہے۔ . . . یہ رسالہ بہ اعتبار حجم اگرچہ چھوٹا ہے اور سند کے اشعار بھی بہت کم ہیں۔ مگر الفاظ اس میں سب رسالوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ چونکہ اس کا موٴلف نامی اساتذۂ لکھنؤ سے ہے اور زبانِ حال لکھی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ بمقتضائے بشریت فاحش لغزش بھی ہے، مگر پھر بھی اس کو ترجیح ہے کیونکہ دوسرے رسالوں کی بنا صرف تتبع پر ہے۔ زبان قدیم و جدید و شاذ وغیرہ کی کیفیت ان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ رشحاتِ صفیر میں اس کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر وہ بات جو مفید الشعرا میں ہے، نہیں۔" (حاشیۂ رسالۂ اصلاح ص ۲۱)

۲؎ شیخ امداد علی بحرؔ لکھنوی، تلمیذ ناسخؔ (تذکرۂ نادر)۔ "تحقیقِ الفاظ میں، رشکؔ کے بعد، ناسخؔ کے شاگردوں میں یہی ممتاز تھے" (آبِ بقا ص ۲۴۲)۔ ان کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، جس کا نام ریاض البحر ہے۔ قواعدِ زبان و لُغت پر مشتمل ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس قابلِ قدر رسالے کو، مجلۂ اُردو ادب (علی گڑھ) کے شمارہ ۱ـ ۱۹۶۲ء میں شائع کرا دیا ہے ——— کتابوں میں بحرؔ کا سالِ وفات ۱۲۹۵ھ لکھا ہوا ہے۔ غالباً سب سے پہلے صفیرؔ بلگرامی نے

لٹتے ہی میں یا الٰہی مے کشوں کو موت دے ۔۔۔ کیا گھر کی قدر، جب آب گھر جاتا رہا (آتش)
جب دیکھتا ہے یار تُرے دانت پیستا ۔۔۔ ڈوبوں گا میں ڈبوئے گا آب گہر مجھے (")
جب کہ مجھے زندگی مرنا تہ شمشیر یار ۔۔۔ اپنے حق میں آبِ حیوان آبِ آہن ہو گیا (بحر)

اس سلسلے میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں :

(۱) آب، بمعنی تاب و آبداری، مونث ہے۔ لیکن جب یہ مرکب ہو جیسے آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ وغیرہ، اور اس کو مذکر استعمال کیا جائے، تو وہاں درحقیقت آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ لفظ آب کے مجازی معنی (آبداری) مراد نہیں لیے جاتے۔ ایسے مقامات پر آبِ حقیقی کے لوازم مذکور ہوتے ہیں۔ اس لیے ان مرکبات کو لازماً مذکر استعمال کیا جائے گا۔ اس سے مفرد لفظ آب کی تانیث پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسا کہ امیر مینائی نے لکھا ہے :

"شعرا جب آبِ گہر یا آبِ تیغ کو مذکر باندھتے ہیں، تو وہ آبِ حقیقی سے استعارہ ہوتا ہے۔ اور لوازم آبِ حقیقی کے ثابت کرتے ہیں۔ جیسا کہ بحر کے اس شعر میں، گھٹنوں تک یا گلو تک ہونا آبِ حقیقی کے لوازم سے ہے۔ ؎ ٹوپے کٹواتے ہیں پہلے، یا زرہ پہنے آبِ تیغ ؏ آج گھٹنوں تک ہوا، کل تا گلو ہو جائے گا۔" (امیر اللغات ص ۱۳)

آتش کے شعرِ ثانی اور بحر کے شعر میں آبِ آہن اور آبِ گہر کی یہی صورت ہے کہ معمولِ شعرا کے مطابق، دونوں جگہ آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے اور آبِ حقیقی کے لوازم موجود ہیں۔ اس لیے ان اشعار کو مفرد لفظ آب کی تذکیر کی سند میں کسی طرح نہیں پیش کیا جا سکتا۔

جلوۂ خضر میں اسی سنہ کو لکھا ہے۔ بعد کو اسی کو نقل کیا جاتا رہا۔ امیر مینائی کے ایک شاگرد، مولوی مہدی علی خاں ممتاز رام پوری نے ایک مجموعۂ قطعاتِ تاریخِ وفات مرتب کیا تھا۔ جس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ اس کا نام تاریخ لطیف ہے۔ اس میں اسیر کا کہا ہوا قطعۂ تاریخِ وفاتِ بحر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۲۹۵ھ میں ہوا تھا۔ اس قطعے کا شعرِ آخر یہ ہے ؎ سالِ فکرِ تاریخِ وفاتش چو اسیر ؏ گفت دل "بحر بیک موج بگوہر برسید" (۱۲۹۵)۔ یہ واضح رہے کہ اسیر کا انتقال ۱۲۹۹ھ میں ہوا ہے۔

(۲) سید فرزند احمد صفیر بلگرامی، متوفی ۱۸۹۰ء (تلامذۂ غالب) کی معروف تالیف۔ میرے پیشِ نظر اس کا وہ ایڈیشن ہے، جو صفیر کی نظرِ ثانی کے بعد مطبع احمدی پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ آئندہ اس کتاب کے لیے صرف لفظ رشحات استعمال کیا جائے گا۔

(۳) مؤلفہ منشی قادر علی صفی پوری۔ ملازم ریاست بھوپال، مطبع شاہجہانی بھوپال میں ۱۳۰۱ھ میں چھپا تھا۔ اچھا خاصا رسالہ ہے۔ البتہ تحقیق سے نسبتاً کم کام لیا گیا ہے۔ آئندہ اس کے لیے املا رستاں لکھا جائے گا۔

(۲) آتش کے پہلے شعر میں "آبِ گہر" مذکر اس طرح آیا ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں اُن سے تسامح ہُوا۔ اور اُنھوں نے بے خیالی میں "آبِ گہر" کو اس طرح نظم کر دیا جیسے آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہو۔ حالانکہ یہاں لفظِ آب مجازی معنی میں آیا ہے۔ اس خیال کی تائید کئی طرح ہوتی ہے :

(الف) آتش کے کُلیات میں، زیرِ بحث شعر کے علاوہ، جہاں کہیں یہ لفظ بہ ترکیب آیا ہے، آبِ حقیقی کے لوازم کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً :

کُلیاں آبِ گہر کی بھی جو نوشِ شرو کرتے ۔۔۔ تیرے دانتوں کی نہ دانتوں میں صفائی ہوتی (کلیاتِ نولکشور پریس ص ۳۲۳)

ہمارے اشک کے قطرے ہیں جامِ آبِ گوہر سے ۔۔۔ بھرا چاہے جو پانی وہ صنم چاہِ زنخداں میں (ص ۱۹۱)

رُوح کو تفریح اُن دانتوں کے دیکھے سے ہوئی ۔۔۔ آبِ گوہر سے ہمارا دل کا صنوبر ہو گیا (ص ۹۰)

الٰہی بازوئے قاتل میں زورِ دستِ قدرت دے ۔۔۔ روانی ہے اسی کے دم سے آبِ خشک خنجر میں (ص ۱۸۹)

(ب) آتش نے مُفرد لفظ آب کو (مجازی معنی میں) مذکر نظم نہیں کیا۔ البتہ ایک جگہ مونث ضرور نظم کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے :

جا سے ہر گئے تن اے کاش میں گردن رکھتا ۔۔۔ آب ابرو کے ہر اک بال میں تلوار کی تھی (ص ۲۶۸)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آتش درحقیقت اس کی تانیث کے قائل تھے۔

(ج) آتش اور اُن کے تلامذہ کے یہاں (زیرِ بحث شعر سے قطعِ نظر کرتے ہوئے) آبِ گہر (موتی کی آب کے معنی میں) کہیں مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔ البتہ تانیث کی مثال مل سکتی ہے۔ مثلاً :

چاہیے انسان کو بھی پاسِ حفظِ آبرو ۔۔۔ یاد رکھے، جا کے پھر آبِ گہر ملتی نہیں

رِند (دیوان نولکشور پریس ص ۱۰۴)

(د) آتش کے زیرِ بحث شعر کو، مُفرد لفظ آب کی تانیث کی سند کے طور پر جلال اور اُن کی تقلید میں مولفِ ارمغان کے سوا کسی نے تسلیم نہیں کیا۔ نہ "آبِ گہر" کی تانیث کی سند میں قبول کیا بلکہ سب نے یہ صراحت کی ہے کہ آتش نے یہ خلافِ جمہور کہا ہے۔ صفیر بلگرامی، جنھوں نے جلال کی تقلید میں اس لفظ کو مختلف فیہ لکھ دیا ہے، لکھتے ہیں :

"یا بعض الفاظ جن میں سب شعرا و فصحا متفق ہیں۔ مگر ایک دو شاعروں نے اُن کے خلاف باندھا۔ تو ہم کو جمہور کی تقلید کرنی ہوگی۔ جیسے آبِ گہر، کہ جو قواعد کی رو سے بھی مونث ہے اور فصحا کا برتاؤ بھی یہی ہے؛ اُس کو آتش مذکر باندھ گئے ہیں۔" (رشحات ص ۳۹)

شوق نیموی[۱] نے رسالۂ اصلاح میں "آب بمعنی آبداری کو" مونث لکھ کر، لکھا ہے :

---

[۱] مولوی سید ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی۔ تلمیذ شمشاد لکھنوی۔ اپنے زمانے کے نہایت معروف اہلِ علم میں تھے۔ جلال کے سب سے بڑے حریف تھے۔ کئی رسالے ان کے رد میں لکھے ہیں۔ متوفی ۱۷ رمضان ۱۳۲۲ھ۔ "شوقِ سخنور" مادۂ تاریخ وفات ہے۔ ان کی مثنوی "سوز و گداز" کے آخر میں قطعاتِ تاریخ بھی شامل ہیں۔ ایک قطعہ میں ان کی تصانیف کے نام بھی ہیں۔ (مثنوی سوز و گداز مطبوعہ

مجبوراً جو اس کو مذکر استعمال کیا ہے وہ جمہور شعرا کے خلاف ہے۔" (ص ۲۱)

یہ در حقیقت ایراد ہے جلالؔ کے اس قول پر کہ یہ لفظ "الفاظِ مشترک میں سے ہے" —— اسی ذیل میں شوقؔ نے مزید لکھا ہے: "جہاں جہاں پانی کی رعایت کی گئی ہو، وہاں مذکر بھی استعمال کرنا درست ہے" —— اور مثال میں ناسخؔ کا ایک مصرع اور تجرؔ کا وہی شعر لکھا ہے، جس کو جلالؔ نے آب بمعنی آبداری کی تذکیر کی سند میں پیش کیا ہے —— یہ بھی در حقیقت ایراد ہے اس پر کہ جلالؔ نے سند میں صحیح شعر پیش نہیں کیا اور "لوازمِ آبِ حقیقی" والے نکتے تک اُن کی نظر نہیں پہنچی۔

مؤلفِ معین الشعرا نے "آب بمعنی آبداری" کو مؤنث لکھ کر حاشیے میں لکھا ہے:

"خلافِ جمہور کے ایک جگہ آتشؔ نے مذکر بھی لکھا ہے۔"

اور آتشؔ کے زیرِ بحث شعر کو درج کیا ہے۔

(ل) بحرؔ کا جو شعر جلالؔ نے مذکر کی سند میں درج کیا ہے، جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے، اُس کو لفظ آب کی تذکیر کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا، نہ جلالؔ کے سوا کسی نے اس کو پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کہ بحرؔ نے ہر جگہ آب (بمعنی آبداری) کو مؤنث ہی لکھا ہے۔ اُن کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں یہ لفظ بہ تذکیر آیا ہو۔ مؤنث کی چند اسناد درج کی جاتی ہیں۔

جو آب آئنے کی جانے بہ معنیٔ جوہر | وہ کون ہیں جو کسی کی ہیں آبرو لیتے | (ریاض البحر ص ۲۰۰)
مثالِ موتیوں کی آب اس کے دندان نے | اُڑا دیا ہے تجھیں نے رنگ و روں کا | (ص ۱۴)
گرا ان اشکوں سے پیسے، رزدہ چیو پیاسے | ہر ایک قطرے میں موتی کی آب ہو گا | (ص ۲۰)

نیز اُن کے دیوان میں آب گہر یا اس نوع کا کوئی مرکب، جس میں آبِ حقیقی سے استعارہ نہ ہو بلکہ آبداری کے معنی مراد ہوں، مذکر نظم نہیں ہوا ہے۔

(س) اُردو کے کسی لغت نگار نے لفظِ آب بمعنی آبداری کو مذکر نہیں لکھا، سب نے صرف مؤنث لکھا ہے۔ نیز آبِ گہر، آبِ آہن، آبِ تیغ جیسے مرکبات کو، جن میں آبداری کے معنی ہوں، صرف مؤنث لکھا ہے۔ اسی طرح جن رسائلِ تذکیر و تانیث کا ذکر آ چکا ہے،

ما (بقیہ) انعامی پریس پٹنہ ۔۔ ان کا رسالہ "اصلاح" اس زمانے میں خاصا مقبول ہوا تھا۔ میرے پیش نظر وہ ایڈیشن ہے جس کو مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی پریس علی گڑھ سے شائع کیا تھا۔ یہ دراصل ان کے دو رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ایک فارسی رسالہ "ازاحۃ الاغلاط" جو لغت کے موضوع پر ہے۔ دوسرا "اصلاح" جس میں مختلف قواعدِ زبان درج کیے گئے ہیں۔ کارآمد رسالہ ہے۔

ما مولفہ منشی غلام حسین آفاقؔ بنارسی تلمیذ جلیلؔ مانکپوری۔ متوفی ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء (مقدمہ معین الشعرا) تذکیر و تانیث کے موضوع پر غالباً سب سے ضخیم کتاب ہے۔ بلکہ اچھا خاصا لغت ہے۔ اسناد کے ساتھ ساتھ ہر لفظ کے اعداد بھی لکھ دیے ہیں۔ یہ کتاب مؤلف کے انتقال کے بعد صدیق بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ سال طبع درج نہیں۔ سنہ تکمیل تالیف ۱۳۵۰ھ ہے۔ اہم علمی کتاب ہے۔

علاوہ دُوسرے قابلِ ذکر رسائل میں بھی مفرد لفظ 'آب' یا اس کے مذکورہ مرکبات کو صرف مؤنث لکھا گیا ہے۔ مثلاً رسالۂ بسیط[1]
[2]یں۔

مختصر یہ کہ مفرد لفظ آب بمعنی تاب و آبداری متفق علیہ مؤنث ہے۔ اس کے مرکبات، جن میں آبِ حقیقی سے استعارہ ہو، نے ہیں۔ جن میں آبداری کا مفہوم ہو، وہ مؤنث آتے ہیں۔ آتش کے ایک شعر کی حیثیت شاذ کی ہے یہ آتش کا تسامح ہے۔ اس شعر کی بنا پر، اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ جلال نے آتش و بحر کے جو دو اور شعر اس کی تذکیر کی پیش کیے ہیں، یہ جلال کا تسامح ہے۔ ان اشعار میں ایسے دُوسرے اشعار کی طرح، آبِ حقیقی سے استعارہ کیا گیا ہے، اس لیے ب بمعنی آبداری کی بحث میں پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

:

عربی کے حروفِ تہجی میں چودھواں حرف ہے۔ آنکھوں کو بھی اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ صحیح یا منظور ہونے کی علامت بھی ہے۔ ان معانی میں اس کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ اسنادِ لُغات میں موجود ہیں۔ لیکن ایک غلط فہمی کی بنا پر اس کو بھی مشترک الفاظ میں شامل کر دیا گیا۔ ں اس غلط فہمی کا آغاز کس سے ہوا، البتہ یہ معلوم ہے کہ بیشتر اربابِ لُغات و رسائل اس میں مُبتلا ہوئے۔ ایک ایسے شعر سے اس کی پر استدلال کیا گیا، جس کو تانیث کی سند میں ہرگز نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن "نقلِ قول" کو کیا کہا جائے، کہ رفتہ رفتہ اس کا یہ ہونا مسلّم ہو گیا۔

جلال نے مفید الشعراء میں اس کو صرف مذکر لکھا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے اس کو "اسم مذکر و مؤنث" ثال میں مثنوی گلزارِ نسیم کا یہ شعر لکھا ہے:

صاد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی   بینائی کے چشمے پر نظر کی

شعر کے نیچے مزید صراحت کی ہے کہ "تانیث کی مثال بھی اسی شعر سے ثابت ہے"———— مؤلفین رُشحات و نورُاللغات

---

1. یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔ مؤلفہ آغا محسن علی عرف آغا حجو ہندی لکھنوی، ابن محمد علی خاں ابن نواب شجاع الدولہ (تذکرۂ انتخاب یادگار) یہ دربارِ رام پور سے متعلق تھے، یہ مخطوطہ، فہرستِ کتب خانہ کی صراحت کے بموجب، مؤلف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں الفاظ کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) مذکر (۲) مؤنث (۳) مُشترک۔ مُشترک الفاظ میں اس کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مؤلف کی رائے میں ترجیح کسے ہے۔ رسالے کا سالِ اتمام ۱۲۹۴ھ ہے بعض اعتبارات سے خصوصاً مؤلف کی شخصیت کے لحاظ سے یہ رسالہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کی متعدد تصانیف غیر مطبوعہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ ہیں۔ ۱۳۱۰ھ میں انتقال ہوا (تاریخ لطیف) لکھنؤ میں باغ ان کے امام باڑے میں قبر ہے (آبِ بقا)

2. حافظ جلیل حسن جلیل مانکپوری (تلمیذ و جانشین امیر مینائی) کی تالیف اس کا نام رسالۂ تذکیر و تانیث ہے۔ سالِ ترتیب ۱۳۲۹ھ ہے۔ اختر دکن پریس حیدر آباد میں چھپا تھا۔

وارمنان نے بھی نسیم کے اسی ایک شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا ہے۔ اور اس طرح ان حضرات نے بھی اس لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ نسیم کے شعر سے تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ اثبات تانیث کے لیے ضروری ہے کہ مصرع کو یوں لکھا جائے کہ ساد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی۔ لیکن یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس مصرع میں "آنکھوں کی" کی جگہ "آنکھوں کے" نہیں ہے؟

قواعد تذکیر و تانیث میں یہ ایک مانا ہوا قاعدہ ہے کہ کوئی ایسا شعر جس میں محض "کی" "یا" "کے" سے تذکیر و تانیث ظاہر ہوتی ہو اور اس مقام پر غلط الکتابت کا احتمال پیدا ہو سکتا ہو یا اسی قبیل کی اور کوئی محتمل الوقوع صورت ہو، ایسے شعر کو بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سند کے شعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے وضاحت اور قطعیت کے ساتھ، تذکیر یا تانیث کا اظہار ہوتا ہو۔ چونکہ نسیم کے مذکورہ شعر سے اس قطعیت کا اظہار نہیں ہوتا، اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اس شعر میں میری رائے میں "ساد آنکھوں کے" پڑھنا چاہیے۔ دو وجوہ سے: (۱) "آنکھوں" جمع ہے، تناسب بیان کا تقاضا ہے کہ بیان اس کی مناسبت کامل کے لحاظ سے مشتبہ بھی نہ ہو یعنی مصرع کو یوں پڑھا جائے: ع

ساد آنکھوں کے دیکھ کر پسر کی

(۲) اس وقت تک ساد کی تانیث کی کوئی دوسری سند نہیں پیش کی جا سکی ہے۔ باوصف تلاش، مجھے نظم و نثر میں کہیں بھی یہ لفظ مونث نہیں ملا۔ البتہ تذکیر کی بیسیوں مثالیں ملیں، جن عبارات سے بھی "ساد آنکھوں کے" مرجح ہے۔

اب سے پہلے یائے معروف و مجہول کی کتابت میں کوئی امتیاز ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر اس زمانے کی کسی تحریر میں اگر کوئی لفظ یائے معروف یا یائے مجہول لکھا ہوا یا چھپا ہوا ہو، تو اس کتابت کی بنیاد پر اس کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثنوی گلزار نسیم کا پہلا اڈیشن ١٢٦٠ھ میں مطبع حسینی میر حسن رضوی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اس زمانے کے رواج کے مطابق یائے معروف و مجہول کا امتیاز نہیں ہے۔ یہ مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے: ع

ساد آنکھوں کی دیکھ کر پسر کی

لطیفہ یہ ہے کہ چکبست نے ١٩٠٥ء میں اس مثنوی کا جو اڈیشن شائع کیا (جو اس زمانے میں معرکۂ چکبست و شرر کی بنیاد بنا تھا) اس میں بھی "ساد آنکھوں کی" ہے۔ جن لوگوں نے پہلے اڈیشن کو یا نسخۂ چکبست کو دیکھا اور اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا کہ یہاں "کی" "یا" "کے" میں سے کیا مرجح ہو سکتا ہے۔ یا یہ کہ کچھ ہو یا کے، اس سے نہ تانیث پر استدلال کیا جا سکتا ہے نہ تذکیر پر۔ (اس کے لیے دوسرے اساتذہ کا طرز عمل دیکھنا ہوگا) انھوں نے اسے "ساد آنکھوں کی" پڑھا اور اس کی بنیاد پر یہ فرض کر لیا کہ نسیم نے اس لفظ کو مونث نظم کیا ہے ——— شدہ شدہ یہی ایک مونث نویس نے لکھا، دوسروں کے لیے محض اس لغت نویس کا لکھنا، آیت و حدیث ہو گیا۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ صفیر بلگرامی نے لغات میں اس شعر کو تانیث کی سند میں قبول کر لیا۔ اور اس طرح انھوں نے اس

---

[1] یہ اڈیشن کم یاب ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔

لفظ کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا۔ حالانکہ صفیر نے اس رسالے میں متعدد جگہ یہ صراحت کی ہے کہ جن اشعار میں غلط الکاتب کا احتمال ہو۔ یا محض کی کے، پر سند کا انحصار، ایسی اسناد کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں انھوں نے دُوسروں پر اس سلسلے میں اعتراضات بھی کیے ہیں۔ مثلاً جلاؔل نے مُفید الشعراؔ میں لفظ مُشتری کی تانیث کی سند میں یہ دو شعر لکھے ہیں :

نقد جاں لائی ہے تاکے مول تو اُس ماہ سے ۔۔۔ مشتری رکھا ہے نام اپنے لیے برجیس کا (ناسخ)

تیرا غلام کچھ مرکنعاں فقط نہیں ۔۔۔ کہتی ہے مُشتری بھی میں تیری خریدہ ہوں (")

صفیر نے ان اسناد پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مؤلف کہتا ہے کہ کارآمد شعرا کی ان مثالوں سے مونث ہونا کچھ ضرور نہیں کہ ثابت ہو۔ کیونکہ کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی نقد جاہ لایا ہے، اور کہتا ہے مُشتری بھی کہہ سکتے ہیں۔" (رُشحات ص ۴۷)

جلاؔل نے طوطی کی تانیث کی سند میں رشک کا یہ شعر بھی پیش کیا ہے :

طوطی سبزۂ خط صاف یہی کہتی ہے ۔۔۔ ہیں وُہی عارضِ آئینۂ جاناں اب تک

صفیر نے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے۔ :

"اور رشک کے شعر کی سند جو دی گئی، اس کو ماننا مُشکل ہے۔ کیونکہ، طوطی سبزۂ خط صاف یہی کہتا ہے ابھی ہو سکتا ہے۔ از روئے غلطی کتابت یہ مثال کافی نہیں۔ حضرت جلاؔل ایسی ہی مثالیں دیا کرتے ہیں ۔" (رُشحات ص ۴۸)

ایک طرف تو یہ احتیاط کہ، مثال میں بھی غلطی کتابت کے احتمال کی بنا پر اُن کو بطور سند قبول نہ کرنا۔ دُوسری طرف یہ صُورت کہ جس سند کی بنا محض "ی" اور "ے" کے فرق پر ہے، اُس کو بے تکلف قبول کر لیا !!

بہرحال، صاد مذکر ہے۔ جن لوگوں نے گلزارِ نسیم کے زیر بحث شعر کی بنا پر مونث فرض کر کے، اس کو مختلف فیہ الفاظ میں شامل کر دیا، اُن سے غلطی ہوئی۔ اس شعر میں "صاد آنکھوں" کے "مرجع ہے۔ بالفرض کوئی صاحب مرجع نہ مانیں، تب بھی اصولاً اس شعر کو تانیث کی سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اور جب تک کوئی مثال تانیث کی نہ ملے۔ اُس وقت تک اس کو مختلف فیہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

---

۴ ۔ الاپ :

جلاؔل نے مفید الشعراؔ میں "الاپ" کو مُشترک الفاظ میں شامل کیا ہے۔ اس کی صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ البتہ آغا حجو ہندی نے رسالۂ بسیط میں مذکر کو مرجح لکھا ہے۔ جلاؔل نے مذکر کی سند میں ایک شعر لکھا ہے، اور مونث کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی سند کلام اساتذہ میں نہیں ملی۔ ان کی عبارت یہ ہے :

"الاپ مُختلف فیہ ہے۔ مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قدرت نے مذکر کہا ہے ؎

ایک ہی پڑتے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ ۔۔۔ گر صدا نے بانگ ہے در نغمۂ ناقوس ہے

اور مونث کی کوئی مثال مؤلف کو کلام اساتذہ میں ملی نہیں۔ اتنا یاد پڑتا ہے کہ مونث بھی کہا گیا ہے۔"

جلال نے مذکر کی سند میں جو شعر درج کیا ہے، وہ شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی کا ہے۔ تذکرۂ میر حسن، تذکرۂ ہندی، اور سخن شعرا میں یہ انھیں کے نام سے درج ہے۔ یہ ان کی بہت مشہور غزل کا شعر ہے، جس میں وہ معروف ترین قطعہ بھی شامل ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

کل جو میں اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　کیا ہی ملک روم ہے کیا سرزمین روس ہے

ان تذکروں میں زیر بحث شعر کا متن مختلف ہے، جو درج ذیل ہے:

ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو ہے یہ سب الاپ　　گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے　(تذکرۂ میر حسن)
ایک ہی پردے کے یہ سب سمجھیے تو ہیں الاپ　　گر صدائے بانگ ہے، ور نغمۂ ناقوس ہے　(تذکرۂ ہندی)
ایک ہی پردے کی گر سمجھو تو یہ ہیں سب الاپ　　گر صدائے چنگ ہے یا نغمۂ ناقوس ہے　(سخن شعرا)

تذکرۂ میر حسن کے مطبوعہ نسخے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک قلمی نسخہ (مخزونہ رضا لائبریری رام پور) بھی پیش نظر ہے، دونوں میں ایک متن ہے۔ اور اس سے الاپ کی تذکیر کے بجائے تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ اصولاً اس شعر کو سند میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ قدرت کا دیوان ابھی تک نہیں چھپا ہے۔ سنا ہے پٹنہ میں کوئی صاحب اس کو مرتب کر رہے ہیں۔ ممکن ہے اس سے کوئی قطعی رائے قائم کرنے میں مدد مل سکے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مفید الشعرا، رسالۂ بسیط، اور رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا گیا ہے۔ جلال نے مذکر کی سند میں قدرت کا شعر پیش کیا ہے، رشحات میں بھی وہ منقول ہے؛ گویا مذکر کی سند میں صرف ایک شعر پیش کیا گیا ہے، جس کو اصولاً پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح اس کی تذکیر جو سند ہے، اور اس اعتبار سے بظاہر محل نظر۔

آصفیہ، امیر اللغات، نور اللغات، رسالۂ جلیل اور معین الشعرا میں اس کو صرف مونث لکھا گیا ہے۔ نور اللغات میں تانیث کی سند میں واجد علی شاہ اختر کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

طبلوں پہ تھپکیاں پڑنے تھا میں　　پہنچیں گردوں پہ وہ الاپیں

یہی شعر معین الشعرا میں منقول ہے۔ آصفیہ میں مثنوی میر حسن کا یہ شعر سند تانیث میں پیش کیا گیا ہے:

وہ رقص بتاں اور وہ ستھری الاپ　　وہ گوری کی تانیں، وہ طبلوں کی تھاپ

یہی شعر امیر اللغات میں ہے۔ مولف بہار ہند نے بھی تذکیر و تانیث کی صراحت کے بغیر اسی شعر کو درج کیا ہے۔ لیکن میر حسن کے اس

۱۔ مولفہ مرزا محمد مرتضیٰ عرف محمد بیگ عاشق لکھنوی، اودھ پنچ میں ستم ظریف کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ یہ لغت [illegible] میں مطبع شرکت جعفری لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مرتب کی صراحت کے مطابق اس کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا، لیکن صرف جلد اول چھپ سکا۔ یہ صرف حرف الف پر مشتمل ہے۔ مرتب لکھنؤ کے ارباب اعتبار میں سے تھے۔ اگر یہ لغت مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کا لغت ہوتا۔ بقول چکبست: "لکھنؤ کی زبان اور محاوروں کی جتنی تحقیق مرزا صاحب مرحوم کو تھی، اس کا اندازہ اُن کی مشہور تالیف "بہار ہند" کے دیکھنے سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس لغت کی کافی قدر نہ کی، ورنہ اگر اس کے باقی تین حصے بھی چھپ جاتے تو اردو زبان کی اصطلاحوں اور محاوروں کا ایک لاجواب مجموعہ مرتب ہو جاتا۔" (مضامین چکبست ص ۲۲۵)

شعر سے تانیث حتماً ثابت نہیں ہوتی۔ "سحر سے الاپ" بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کرنا درست نہیں۔ اختر کے شعر سے یقیناً تانیث ظاہر ہوتی ہے۔ میں فی الوقت یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ شعر ان کی کس مثنوی سے ماخوذ ہے اور یہ کہ اصلاً اسی طرح ہے۔ اگر اس شعر کا متن بالکل صحیح ہے اور یہ اختر کا ہے، تو بالیقین اثباتِ تانیث کے لیے کافی ہے ـــــــ لیکن یہ واضح رہے کہ اس سند سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ یہ لفظ صرف مؤنث ہے۔ جیسے رشک کے اس شعر سے:

وصل کی رات بنا نامۂ شوقِ گیسو　　　شام تقطیع ہیں، سپیدی ہی سحر کاغذ کی

(مجموعۂ دواوین رشک، ص ۳۴۴)

یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "لفظ" صرف مؤنث ہے۔

ہندی کے متعدد اساتذہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سنسکرت اور ہندی میں الاپ مذکر ہے۔ لغات میں بھی صرف مذکر لکھا ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہندی شبد ساگر (شائع کردہ ناگری پرچارنی سبھا) بر ہت ہندی کوش (شائع گیان منڈل بنارس) سنسکرت شبد ارتھ کوستبھ (مرتبۂ دوارکا پرشاد شرما)۔

یہ لفظ فنِ موسیقی کی ایک اصطلاح ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس فن سے تعلق رکھنے والے حضرات سے استصواب کیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب شاہد احمد دہلوی سے رجوع کیا۔ موصوف اس فن کے قابلِ ذکر جاننے والوں میں سے ہیں۔ شاہد صاحب نے از راہِ التفاتِ خاص ضروری تفصیل سے مطلع کیا۔ موصوف کے مکتوب کا اقتباس درجِ ذیل ہے:

"پیشہ وروں کی زبان پر "الاپ" مذکر ہے اور کتابوں میں بھی، اس لیے میں بھی مذکر ہی بولتا ہوں۔

(۱) معارف النغمات مصنفۂ ٹھاکر نواب علی خاں، جو اُردو کی واحد مستند کتاب ہے، اس میں ص ۴۰ پر یہ عبارت درج ہے: "آج کل الاپ بھی، دھرپد کی طرح، چار حصوں پر منقسم کر دیا گیا ہے۔"

(۲) "آجکل" کے موسیقی نمبر مطبوعہ اگست ۱۹۵۶ء کے ص ۹۶ کالم ۱ سطر ۲ میں کہا گیا ہے کہ "دھرپد کا الاپ ہی ایک ایسا جادو کا اثر وہ ماحول پیدا کر دیتا ہے جو دوسری گائکیوں یا باج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا ہے" ـــــــ مضمون نگار ہیں استاد رحیم الدین خاں ڈاگر، جن کا کام ہی الاپ کرنا اور دھرپد گانا ہے۔

(۳) کتاب اسرارِ کرامت عرف نغماتِ نعمت، مطبوعہ ۱۸۸۴ء، ص ۸۰، س ۹، "ہر راگ کے الاپ کے واسطے تین سے مقرر کی گئی ہیں" ـــــــ یہ کتاب نعمت اللہ خاں نے لکھی تھی اور اس کی تکمیل ان کے بیٹے کرامت اللہ خاں نے کی تھی۔ نعمت اللہ خاں، دربارِ نیپال کے گائک تھے۔

الاپ مذکر ہی بولا جاتا ہے۔ مگر غیر پیشہ وروں سے مؤنث بھی سنا ہے۔ لغت میں شاید اسی وجہ سے دونوں طرح درج کر دیا گیا ہو۔"

اس عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لفظ دونوں طرح مستعمل رہا ہے۔ فنِ موسیقی سے تعلق رکھنے والے بالعموم اس کو مذکر استعمال کرتے رہے ہیں (یہ غالباً ہندی کا اثر ہے) اور دوسرے لوگ بالعموم مؤنث۔ اسی لیے اکثر اربابِ لغات نے اس

کو صرف مونث لکھا ہے

ارمغان میں الاپ کو مذکر لکھ کر سند میں قدرت کا زیر بحث شعر نقل کیا گیا ہے۔ لیکن پہلا مصرع اس طرح لکھا ہوا ہے:

ایک ہی پڑھے کی تم مجبور ہیں یہ سب الاپ

اس سے تو تانیث ظاہر ہوتی ہے! یہ تو خیر غلطی کتابت ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعی دلچسپ بات یہ ہے کہ جلال نے تو مفید الشعرا میں یہ صراحت نہیں کی تھی کہ قدرت دہلوی ہیں یا لکھنوی۔ مگر مولف ارمغان نے اپنا دبندہ سے کام لے کر انھیں "لکھنوی" بنا دیا۔

مولف آصفیہ نے الاپ کو "غلط العوام" لکھا ہے اور آلاپ (بہ الف ممدودہ) کو صحیح لفظ مانا ہے۔ لیکن اس فیصلے میں وہ منفرد ہیں۔ جملہ ارباب لغت اور اساتذہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مستعمل عام و خاص الاپ (بغیر مد) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صاحب آصفیہ نے بغیر غور کیے ہوئے فیلن کی تقلید کی ہے۔ سنسکرت میں آلاپ ہے (سنسکرت شبد ارتھ کوستبھ) ہندی میں الاپ بھی مستعمل ہے (ہندی شبد ساگر) متعدد مستشرقین نے اپنے لغات میں الاپ کو "آلاپ کی بگڑی ہوئی صورت بتایا ہے" فیلن بھی انھیں میں شامل ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا خیال کیے بغیر کہ اردو میں کس طرح مستعمل ہے، اس کے نوشتے کو حرف آخر مان لیا۔

---

۴ آغوش:

جلال نے مفید الشعرا میں لکھا ہے:

"آغوش، بعضوں کے عندیے میں اردو کے قیاس پر مونث ہے، حالانکہ بہ قید نظم مذکر پایا جاتا ہے۔"

مذکر کی سند میں آتش و رند کا ایک ایک شعر پیش کیا ہے —— جلال کی عبارت مبہم ہے، حقیقت یہ ہے کہ اساتذۂ دہلی نے اس لفظ کو مونث نظم کیا ہے، اور اساتذۂ لکھنؤ نے مذکر۔ صرف میر علی اوسط رشک لکھنوی (تلمیذ ناسخ) کا ایک شعر عام طور سے مونث کی سند میں پیش کیا گیا ہے، وہ شعر یہ ہے:

شب فرقت کی آمد پا کے آغوش لحد پھیلی قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرم احساں ہے

(مجموعۂ دواوین رشک ص ۳۰۲)

رشک کے مجموعۂ دواوین میں اور کہیں یہ لفظ اس طرح نظم نہیں ہوا کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات کہی جا سکے، مثلاً:

منظور اپنی تھی ہم آغوشی جاناں تب تو مری آغوش تمنا کو بنایا (ص ۸۰)

آغوش زمیں تو ہاتھ آتی ہم مردود آسماں ہیں (ص ۲۲۲)

دونوں شعروں میں "مری" اور "آتی" کو "میرے" اور "آتے" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جلال کا یہ لکھنا کہ "بقید نظم مذکر پایا جاتا ہے" صرف اس حد تک صحیح ہے کہ عموماً اساتذۂ لکھنؤ نے اس کو مذکر نظم کیا ہے۔ لیکن اساتذۂ دہلی نے اس کو مونث باندھا ہے اور اس کی مثالیں عام ہیں یہی عدم صراحت امیر اللغات میں ہے۔ مؤلف نے لکھا ہے:

"شعرا نے مذکر بھی لکھا ہے اور مونث بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ شعروں سے پیدا ہے، مگر مؤلف کے

نزدیک اس کی مذکر کو ترجیح ہے۔"

صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ لکھنؤ سے متعلق حضرات میں سے بیشتر نے اس لفظ کو یا تو صرف مذکر لکھا ہے (رسالۂ بسیط) یا مذکر کو مرجح بتایا ہے (امیر اللغات، مفید الشعرا، معین الشعرا، رسالۂ اصلاح)۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے لیکن یہ صراحت نہیں کی کہ ترجیح کسے ہے۔ صرف مؤلفِ نور اللغات نے مونث کو مرجح لکھا ہے۔

دہلی سے متعلق حضرات نے اس کو صرف مونث تسلیم کیا ہے۔ ابتداءً فرہنگِ آصفیہ میں آغوش مذکر چھپا ہوا تھا۔ مؤلفِ اختلاف اللسان نے اس سلسلے میں لکھا تھا:

"آغوش۔ لکھنؤ میں مذکر بولا جاتا ہے ..... منشی سید احمد صاحب دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو مذکر لکھا ہے۔ اس کے متعلق صاحبِ فصیح اللغات نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ یا تو کاتب کی غلطی ہے۔ یا حقیقت میں اہلِ دہلی بھی اس لفظ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ حضرت اُستاد مرحوم (فصیح الملک داغ دہلوی) نے فرہنگِ آصفیہ میں آغوش کو مذکر چھپا دیکھ کر، قافیہ و ردیف کے لحاظ سے یہ لفظ مونث کہا ہے ؎

سُنتا ہی نہیں وُہ بُتِ مے نوش ہماری　　خالی ہے شبِ وصل بھی آغوش ہماری

اہلِ دہلی آغوش کو عموماً مونث ہی بولتے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں جو اس کو مذکر لکھا ہے تو یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے کیونکہ ایسی غلطیاں کتبِ مذکورہ میں اکثر پائی جاتی ہیں۔" (اختلاف اللسان ص ۲)

مؤلفِ اختلاف اللسان کا خیال صحیح تھا۔ یہ کتابت کی غلطی تھی، کیونکہ اس کے بعد جو باضابطہ اڈیشن شائع ہوئے، ان میں یہ مُونث لکھا ہوا ہے لیکن اس تبدیلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مولفِ آصفیہ کی دو اور فروگزاشتوں کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

(۱) مولفِ آصفیہ نے آغوش کی تانیث کی سند میں دو شعر درج کیے ہیں۔ لیکن ان اشعار سے نہ تانیث ثابت ہوتی ہے نہ تذکیر (یہ اشعار اشاعتِ اوّل میں نہیں تھے) شعر یہ ہیں:

ص۱ مرتبہ منشی وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی، تلمیذ داغ، سالِ طباعت ۱۹۰۶ء مطبوعہ رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور۔ مولف کے الفاظ میں اس کتاب میں "دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے الفاظ اور محاورات کا فرق بیان کیا گیا ہے۔" ۴۰ صفحے کا رسالہ ہے۔ بعض الفاظ سے متعلق طولانی بحثیں بھی شامل ہیں جو اس زمانے میں مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ان سے بہت سے اختلافات اور ضروری امور سے متعلق بہت سی کارآمد باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ مؤلف نے سرورق پر زبانِ دہلی کو "اُردوئے معلیٰ" اور زبانِ لکھنؤ کو "اُردوئے

ص۲ ۱۸۷۸ء میں "ارمغانِ دہلی" کے نام سے اس کا ایک حصہ شائع ہوا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں مؤلف نے چھوٹی تقطیع پر ایک رسالہ نکالنا شروع کیا، میں اجزائے لغت شائع ہوتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں فرہنگِ آصفیہ کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ تیسری جلد ۱۸۹۸ء میں چھپ چکی تھی۔ ا وقت مولف نے ان ماہانہ رسالوں کے اجزا کے مجموعے کو جلد اول و دوم قرار دیا۔ پھر ۱۹۰۸ء پہلی جلد بڑی تقطیع پر باضابطہ شائع ہوئی دُوسری بار یہ ۱۹۱۸ء میں چھپی۔

کروٹ بھی نہ لی راحتِ آغوشِ لحد میں ‖ بندہ ہمہ تن جوش تھی ہے بعد ازاں جیسے (تسلیم دہلوی)

مجھ میں اس میں ربط جو گیا بنگ بوسگی ‖ [۱] آغوش میں کیسے گیند ان بن کا رہا (ذوق)

(۲) "آغوش کھول کر دینا" کی سند میں تقی لکھنوی کا یہ شعر لکھا ہے:

ہو گئی ہے فتنہ ار تیشہ مرغ ‖ دوڑی آغوش کھول کر حسرِ مرغ

صاف ظاہر ہے کہ یہ شعر "آغوش کھول کر دینا" کی سند نہیں ہو سکتا۔ امیر اللغات و نور اللغات میں "آغوش کھول کر دینا" درج نہیں ہاں۔ "آغوش کھول کر لپٹنا" ضرور درج ہے اور سند میں ناسخ کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

بسانِ ساحلِ دریا جو مشکل چھوٹنا تا صبح ‖ لپٹ جاؤں اگر میں کھول کر آغوش، جاناں سے

امیر اللغات میں "آغوش سے نکلنا" کی سند میں داغ کا ایک شعر درج کیا گیا ہے، جس میں کاتب صاحب نے "معروف کی جگہ" یائے مجہول لکھ دی ہے۔ جس سے تانیث، تذکیر سے بدل گئی ہے۔ شعر یہ ہے:

جس طرح تو مرے آغوش سے نکلا اے شوخ ‖ یوں ہی ہاتھوں سے نکلتی ہے طبیعت میری

"مری آغوش" ہونا چاہیے۔

۵۔ ایجاد:

لفظ ایجاد کی داستان خاصی دلچسپ ہے۔ اساتذۂ دہلی و لکھنؤ نے بالعموم اس لفظ کو بالاتفاق مذکر استعمال کیا ہے، لیکن متعدد تصریحات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس کی تانیث کے بھی قائل رہے ہیں، اگرچہ تانیث کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں گفتگو میں یہ تانیث رائج ہوگا، چونکہ اساتذہ بالاتفاق اس کو مذکر مانتے رہے ہیں، اس لیے تذکیر نظم کرنے کی جرأت نہیں کی گئی۔ اس سے زیادہ دلچسپ صورتِ حال یہ ہے کہ جس لفظ کو دونوں دبستانوں کے اساتذہ بالاتفاق مذکر مانتے ہیں، رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رجحان بڑھتا گیا، یہاں تک کہ آج کل عام طور سے اس کو مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

مفید الشعرا، آصفیہ، امیر اللغات اور ارمغان میں ایجاد کو صرف مذکر لکھا گیا ہے۔ اختلاف کا مطلق ذکر نہیں۔ صفیر نے رشحات میں اس کو مذکر لکھ کر، مزید صراحت کی ہے: "مولف کہتا ہے کہ ایجاد جو مونث مشہور ہے، اس کی سند مجھے ابھی تک نہیں ملی" (ص ۱۵۱) آگے چل کر مزید لکھا ہے: "عوام میں ایجاد کا لفظ مونث مستعمل ہے، حالانکہ مذکر ہے۔" (ص ۲۲۲) مولفِ نور اللغات نے بھی اس کو مذکر لکھا

۱۔ مولفِ مبین الشعرا نے ایجاد کو مذکر لکھ کر، حاشیے میں یہ صراحت کی ہے کہ منشی امیر اللہ تسلیم نے اسے مونث بھی نظم کیا ہے اور سند میں تسلیم کا یہ شعر لکھا ہے: رشک، عدو سے کیا تسلیم خستہ کو شہید ‖ دیکھیے ایجاد، اس ترک ستم ایجاد کی۔ لیکن مولف کا یہ خیال صحیح نہیں۔ مخدومی مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے مکتوب سے معلوم ہوا کہ اس غزل کی ردیف "کی" "کے بجائے "کا" ہے۔ یعنی دوسرا مصرع در حقیقت اس طرح ہے: دیکھیے ایجاد اس ترک ستم ایجاد کا۔ تسلیم کی یہ غزل اُن کے دیوان موسوم بہ نظمِ دل افروز میں ص ۳۰۹ پر ہے۔

ہ وضاحت یہ صراحت کر دی ہے کہ " بعض عورات کی زبان پر یہ لفظ مونث ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رشحات کی تحریر کے برعکس بعض خواص بھی اس کو گفتگو میں مونث استعمال کرتے تھے۔

امیر مینائی نے امیر اللغات میں تو اختلاف کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا، البتہ ایک خط میں اس کی صراحت کی ہے:

"ایجاد مذکر ہے۔ اس لفظ کی تانیث و تذکیر میں بحث چھڑی ہوئی ہے ..... سُنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں صاحب داغ کا قول ہے کہ دلی میں مونث ہے۔ مگر کلام میں مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا، تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے۔ اور بغیر کلام میں آئے ہوئے، کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں۔" (مکاتیب امیر مینائی ص ۱۴۲)

ان تصریحات سے یہ بطور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تانیث بھی معرض بحث میں رہی ہے۔ یہاں پہلے اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ امیر نے داغ سے جو قول منسوب کیا ہے، وہ صحیح نہیں۔ معلوم نے امیر کو یہ غلط اطلاع کہاں سے ملی، جس کو انھوں نے مان بھی لیا۔ داغ قطعیت کے ساتھ اس کی تذکیر کے قائل تھے۔ انھوں نے اپنے شاگرد مولانا احسن مارہروی کو ایک خط میں لکھا ہے:

"ایک اشتہار اس گلدستے میں آپ چھاپ دیجیے کہ اکثر اُستاد کے شاگرد، بجائے خود استاد بن کر، اپنی غزلیں بے اصلاح چھپوا دیتے ہیں، اس میں غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کسی نے لفظ ایجاد اور ارشاد کو مونث باندھا، حالانکہ اہلِ دہلی کی زبان پر دونوں لفظ مذکر ہیں۔" (انشائے داغ ص ۱۳۳)

مختصر یہ کہ ایجاد کو اساتذۂ دہلی و لکھنؤ بالاتفاق مذکر مانتے آئے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی تانیث کی طرف رُجحان بڑھتا گیا۔ اس سلسلے میں داغ کے شاگرد رشید مولانا احسن مارہروی کے دو اقتباسات قابلِ توجہ ہیں، جن سے اس رُجحان کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے:

احسن صاحب نے، داغ کے خط کے جواب میں لکھا ہے:

"میری غزل میں ایجاد کہیں مونث نہیں ہے اور نہ میں نے لکھا۔ غالباً حضور نے ملاحظہ نہیں فرمایا۔ میاں احسن شاہجہاں پوری نے مونث لکھا ہے، جس کی اگلے پرچے میں تصحیح ہو جائے گی۔ مولوی عبدالحی بیخود نے ایجاد کو مونث لکھا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے کہ ایسے کہنہ مشق بھی، ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں۔"

یہی مولانا احسن، ایک زمانے کے بعد، اپنی کتاب تاریخ نثر اُردو میں لکھتے ہیں:

"لفظ ایجاد، کہ اس کو تمام باکثرت شعرائے دہلی و لکھنؤ نے مذکر استعمال کیا ہے۔ لیکن اب چند شعرا کے سوا، اس کی تذکیر پر ہر شخص کو تامل ہے۔ یہی حال لفظ فہم وغیرہ کا ہے۔" (ص ۳۵۸)

جناب اثر لکھنوی نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا ہے:

"ایجاد اور اپیل میری زبان پر مونث ہیں، مگر اس کے برخلاف بھی سنا ہے۔ تذکیر و تانیث کے لحاظ سے مختلف فیہ کہنا مناسب ہوگا۔" (مکتوب اثر بنام راقم الحروف)

میں نے بالعموم اس کو مونث سنا ہے اور آج کل کی تحریروں میں بھی مونث دیکھا ہے۔ مثلاً: زبانوں کا سیکھنا سکھانا، جدید زمانے کی ایجاد

ہے۔" عبدالحق صاحب (قواعدِ اُردو ص ۳) "امریکہ کی ایک نئی ایجاد" سب کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ "امریکہ کا ایک نیا ایجاد"۔ چونکہ اس کو اساتذہ نے مذکر استعمال کیا ہے اس لحاظ سے اس کو مشترک الفاظ میں شامل سمجھنا چاہیے لیکن اس صراحت کے ساتھ کہ آج کل یہ عام طور سے مونث استعمال کیا جاتا ہے۔

---

۶ - املا :

جلالؔ نے مفید الشعرا میں اس کو مختلف فیہ لکھا ہے :

"املا مختلف فیہ ہے یعنی مذکر و مونث دونوں طرح بولا جاتا ہے، لیکن مذکر بیشتر اور مونث کم تر، جیسا کہ رشکؔ مغفور[1] مونث فرماتے ہیں ؎

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا　　　خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے

اور مونث اس کی تذکیر ہی کا قائل ہے۔"

رشکؔ کے دونوں مطبوعہ دواوین میں یہ لفظ اور کہیں اس طرح نہیں آیا ہے کہ تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی فیصلہ کُن بات کہی جا سکے۔ ارباب فن اس سلسلے میں مختلف الرائے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس کو صرف مذکر لکھا ہے، تانیث کا مطلق ذکر نہیں کیا ——— مولف فصیح اللغات[2]

---

۱ میر علی اوسط رشکؔ لکھنوی تلمیذ ناسخؔ، متوفی ۱۲۸۳ھ (کلیات نیرؔ شکوہ آبادی) صاحب زبان و قواعد شاعری میں یکتا تھے۔ عہد ناسخؔ سے منسوب بہت سی اصلاحات زبان و قواعد کے واضع دراصل رشکؔ تھے (آبحیات ذکر ناسخؔ) رشکؔ کے دو دیوان ایک ہی جلد میں چھپے تھے۔ ایک کا نام "نظم مبارک" ہے، دوسرے کا "نظم گرامی"۔ یہ تاریخی نام ہیں۔ یہ مجموعہ اُن کی زندگی ہی میں ۱۲۶۳ھ میں چھپا تھا۔ ایک دیوان متن میں ہے، دوسرا حاشیے پر۔ تیسرا دیوان جو اُن کی زندگی ہی میں مرتب ہو چکا تھا (دیباچہ نفس اللغتہ) شائع نہیں ہو سکا۔ اس کا ایک نسخہ پاکستان میں ہے اور ایک آزاد لائبریری علی گڑھ میں (حواشی تذکرۂ ابن امین اللہ طوفان ص ۴۴)

۲ داغؔ کے عزیز شاگرد مولوی احسن مارہروی نے اس لغت کی ترتیب کا کام شروع کیا تھا۔ بقول مولوی احسن "اوّل اوّل تو حضرت مرحوم (داغؔ) کو اس کتاب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ جب میرے شوق اور خلوص عقیدت کا اندازہ فرمایا تو اس کتاب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسی توجہ فرمائی کہ اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، احسن ہے اور فصیح اللغات، فصیح اللغات ہے اور احسن کی نابیت (مقدمۂ یادگار داغؔ)، داغؔ کا خیال یہ تھا کہ اس طرح "زبان دہلی" کا ایک صحیح لغت مرتب ہو جائے گا۔ فرہنگ آصفیہ بھی زبانِ دہلی کا گنجینہ ہے، لیکن مولف آصفیہ کے متعلق داغؔ کی جو رائے تھی، وہ مولوی عبدالرزاق کانپوری (مولف البرامکہ) کے اس بیان سے معلوم ہوگی۔ مولوی صاحب نے دہلی دربار کے موقع پر داغؔ سے ملاقات کی تھی، اس کا حال لکھتے ہوئے، انھوں نے لکھا ہے :

"میں نے دریافت کیا کہ مولوی سید احمد دہلوی نے تیس سال کی محنت میں فرہنگ آصفیہ لکھی ہے، تحقیقات لغات اور محاورات اور زبان کی حیثیت سے اس کتاب کی نسبت جناب کی کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ سید احمد عرب سرائے کے باشندے تھے۔ اور یہ کہ

نے بھی اس کو مذکر لکھا ہے، اور جلالؔ کے علی الرغم نے اس کی نفی کی ہے کہ فصحا اس لفظ کو دونوں طرح بولتے ہیں۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

"یہ لفظ ناواقفوں کی بول چال میں بحالت تذکیر و تانیث، دونوں طرح مستعمل ہوتا ہے۔ مگر اب تک شعرائے متقدمین و متاخرین میں، رشکؔ لکھنوی کے سوا، اور کسی کے کلام میں املا کی تانیث نہیں پائی گئی۔" (فصیح الملک۔ مئی ۱۹۰۱ء)

صفیرؔ نے رشحات میں اس کو صرف مختلف فیہ لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ مولفین امیر اللغات و نور اللغات و معین الشعرا نے اس کو مذکر لکھ کر، یہ صراحت کر دی ہے کہ صرف رشکؔ نے اسے مونث لکھا ہے [یہ واقعہ ہے کہ رشکؔ کے مذکورہ شعر کے علاوہ، اور کوئی مثال اس کی تانیث کی نہیں پیش کی جا سکی ہے] یہی بات نفس اللغۃ[۱] کے دیباچہ نگار نے لکھی ہے: "یہ لفظ عموماً زبانوں پر تذکیر کے ساتھ ہے ..... لیکن رشکؔ نے مونث باندھا ہے۔" گویا ان سب حضرات کے نزدیک اس کی تذکیر مرجح ہے، اور یہ کہ رشکؔ کا شعر، از قبیل شاذ ہے۔ ان میں سے کسی نے جلالؔ کی طرح یہ نہیں لکھا کہ یہ لفظ مونث بھی بولا جاتا ہے۔ (کمتر سہی) اس سے واضح طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بھی یہ لفظ بہ تانیث مستعمل نہیں تھا۔

لیکن صاحب رسالۂ بسیط نے اسے مختلف فیہ لکھ کر، مونث کو مرجح لکھا ہے۔ اس کے علاوہ، مرزا غالبؔ کی ایک تصنیف میں بھی یہ لفظ بہ تانیث موجود ہے: "املا، اہلِ ہند کی املا کے موافق رہی۔" (تیغ تیز۔ مطبوعۂ اکمل المطابع۔ ص ۲۴)

صاحب رسالۂ بسیط کے اُس قول، اور مرزا صاحب کے اس جملے سے، جلالؔ کے اس قول کی مکمل تائید ہوتی ہے کہ یہ لفظ دونوں

(بقیہ) کر خاموش ہو گئے۔ مکرر سوال کرا میں نے بھی ادب کے خلاف کہا۔" (یادِ ایام ص ۲۵۴) یہ بات پیش نظر رہنا چاہیے کہ عرب سرائے پرانی دہلی کے باہر ہے۔ اس سے داغؔ کی رنے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مولوی صاحب موصوف کو اہلِ زبان میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ لُغت مکمل نہ ہو سکا۔ حیدر آباد کے ایک پریس میں اس کے کچھ اجزا چھپے بھی تھے، لیکن معلوم نہیں کیا ہوئے۔

مولانا احسنؔ نے مئی ۱۹۰۱ء سے رسالۂ فصیح الملک جاری کیا (مقدمۂ یادگار داغؔ) اس لُغت کے کچھ اجزا اس میں شائع ہوئے تھے۔ اب اس رسالے کے تمام شمارے بھی یکجا بمشکل ملیں گے۔ یہ نہایت افسوس کی بات ہے۔ داغؔ اس لُغت کے لیے سند کے اشعار خاص طور سے کہتے تھے۔ مگر یہ مکمل ہو جاتا تو واقعی کام کی چیز ہوتا۔ صولت پبلک لائبریری رام پور میں اس کے کئی سال کے شمارے محفوظ ہیں۔

[۱] یہ رشکؔ کا لُغت ہے۔ اس کا نام تاریخی ہے۔ اس کا صرف حصۂ اوّل، اُن کی موت کے بعد نیر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ یہ ردیف طے تک ہے۔ باقی حصوں کا پتا نہیں چلتا۔ امیر مینائی نے ایک خط میں لفظ مسالا کے ذیل میں، اس لُغت کی ایک عبارت درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لُغت مکمل ہو چکا تھا اور اس کا مخطوطہ امیر کی نظر سے گزرا تھا۔ امیرؔ کا یہ خط، مکاتیب امیر مینائی (مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقبؔ) میں شامل ہے۔ جلالؔ، رشکؔ کے شاگرد رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے لُغت گلشنِ فیض میں، نفس اللغۃ کی بہت سی عبارتوں کو شامل کر لیا ہے اور کہیں حوالہ نہیں دیا۔ نفس اللغۃ کا دیباچہ نشترؔ لکھنوی نے لکھا ہے، جس میں بہت سی کام کی باتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

طرح مستعمل تھا، البتہ "مذکر بیشتر اور مونث کمتر"۔ رشک کا مذکورہ شعر اگر قابلِ استناد (تانیث کے لیے) نہ مانا جائے (جیسا کہ بحث آگے آئے گی) تب بھی اس کی تانیث ثابت رہے گی اور اس میں دہلی و لکھنؤ کی تخصیص نہیں ہوگی۔

مختصر یہ کہ بیشتر اساتذۂ دہلی و لکھنؤ کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ املا مذکر ہے۔ ارباب لغت نے رشک کے مذکورہ شعر کو از قبیل شاذ مانا ہے۔ لیکن مؤلف فصیح اللغات کی طرح یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہوگا کہ یہ لفظ محض ناواقفوں کی بول چال میں بہ تانیث مستعمل تھا۔ ایک گروہ معتبر اس کی تانیث کا قائل تھا۔ اور یہ لوگ بھی اتنے ہی معتبر تھے جتنے دوسرے گروہ کے لوگ۔ یہ بات جلال کی صراحت سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ البتہ آج کل بالعموم مذکر بولا جاتا ہے شاید ہی کوئی شخص اب اسے بہ تانیث استعمال کرتا ہو۔ کم از کم میری نظر سے ایسی کوئی مثال نہیں گزری۔ نہ مونث بولتے ہوئے سنا۔

اس بحث کے بعد، یہ بات بھی غور طلب ہے کہ کیا رشک کے اس شعر کو تانیث کی سند میں پیش کیا جا سکتا ہے؟

لفظ صاد کے ذیل میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ایسے اشعار جن میں غلط الکاتب کا احتمال ہو سکتا ہو، فائدۂ استناد نہیں دیتے۔ جب ہم کسی شعر میں زیر بحث لفظ اس طرح نظم ہوا ہو کہ قطعیت کے ساتھ اس کو بطور سند پیش کیا جا سکے؛ اس وقت ہم اس شعر کو نہ سند میں پیش کیا جا سکتا ہے نہ قبول کیا جا سکتا ہے ——— رشک کے اس شعر کی یہی صورت ہے۔ اس میں لفظ املا کی تانیث کی "بنیاد" "کی" پر ہے۔ یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا ہے ؏

خدا کی انشا اور ہے لکھنے کا املا اور ہے۔

ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ رشک نے درحقیقت کیا لکھا تھا۔ حقیقی صورت حال کچھ بھی ہو، مسلّمات قواعد اور مختارات ارباب فن کے اعتبار سے اس شعر کو بطور سند نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس شعر سے تانیث املا کی سند لینا، بالکل ایسی بات ہے جیسے ارباب لغت اور بعض دوسرے حضرات نے "مثنوی گلزار نسیم" کے ایک شعر سے (جو صاد کی بحث میں مذکور ہوا ہے) محض اس بنا پر کہ "صاد آنکھوں کی" چھپا ہوا ہے، صاد کی تانیث فرض کر لی۔

مجھے تعجب اس پر ہے کہ جلال نے اس شعر کو کس طرح بطور سند قبول کر لیا؟ جب کہ وہ اس کے قائل تھے کہ ایسے مواقع پر محض "کا" "کی" سے تانیث و تذکیر کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے لفظ رستم کے ذیل میں اس کی صراحت بھی کر دی ہے:

"ہند سے کے معنی پر رقم کو جناب مرزا دولہا جاہ مرحوم نے مذکر فرمایا ہے ؎

ہمارے رزق کا ہے فرد قسمت میں رقم خالی　　ہمیشہ صفر کے مانند رہتا ہے شکم خالی

حالانکہ رقم بمعنی مذکر۔ باتفاق مونث بولا جاتا ہے۔ پس مؤلف ستام کہتا ہے کہ عجب نہیں ہے کہ اصل میں یہاں "کی" ہو۔ اور کاتب نے "کا" لکھ دیا ہو۔"

صفیر کی بھی اس مسئلے میں یہی رائے تھی کہ ایسے مقامات پر محض کا یا کی سے فائدۂ استناد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی عبارت لفظ صاد کے ذیل میں پیش کی جا چکی ہے۔ لیکن دونوں حضرات نے رشک کے اس شعر کو قبول کر لیا کسی اختلاف کے بغیر۔ حالانکہ اس کی بھی بالکل یہی صورت ہے۔

اور متنوں میں ایک دل چسپ صورت ہے : اس میں مفرد لفظ املا درج نہیں۔ البتہ " املا و انشا " درج ہے، گویا یہ مرکب امتزاجی ہے ؛ مؤلف نے اس مرکب کو مونث لکھ کر، سند میں رشک کا زیر بحث شعر درج کیا ہے۔ موصوف نے املا کی مسلہ تذکیر کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ مہذب اللغات میں 'املا' کو مذکر لکھا گیا ہے۔ مؤلف نے اس کے بعد یہ صراحت کر دی ہے کہ " رشک اور اختر (شاہ اودھ) نے مونث بھی نظم کیا ہے، لیکن موجودہ دور میں مذکر ہی ہے "۔ تانیث کی سند میں رشک کا زیر بحث شعر اور واجد علی شاہ کا یہ شعر لکھا ہے:

مگر یہ بھی نکلا سراپا غلط　　　تھی انشا غلط اور املا غلط

مولف مہذب اللغات کا یہ خیال ہرگز صحیح نہیں کہ اختر کے اس شعر سے املا کی تانیث ثابت ہوتی ہے۔ اس شعر سے نہ تانیث ثابت کی جا سکتی ہے نہ تذکیر۔ مصرع ثانی میں یہ لازم نہیں ہے کہ " تھی " کا اطلاق املا پر بھی ہو —— مؤلف نے اسی ذیل میں مزید لکھا ہے: " املے کی کاپی، املے کا قلم وغیرہ رائج ہیں "۔ لفظ املا میں امالہ روا نہیں۔ ورنہ پھر " انشے کی کاپی " بھی لکھا جا سکتا ہے۔

مُنیدالشعرا میں رشک کے مذکورہ شعر کا مصرع اوّل اس طرح ہے ؏

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا مری تقدیر کا

اس رسالے کے جو اڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں، ان میں اسی طرح ہے۔ رشک کے دیوان میں " یا لکھا مری تقدیر کا " ہے۔ (ص ۳۵۵)

ادب اور زندگی کا تعلق

ڈاکٹر گیان چند

ادب اور زندگی کا تعلق اتنا واضح نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ایک عرصہ ہوا فیض چاند نے سودا پر جو کتاب لکھی تھی اس کا پہلا باب تاریخی پس منظر کا تھا کسی ادبی تحقیقی و تنقیدی مقالے میں سیاسی پس منظر دکھانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ 'لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' اور 'دلی کا دبستانِ شاعری' بھی اسی موضوع سے شروع ہوتے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے 'میر۔ حیات اور شاعری' لکھی تو کتاب کا کافی حصہ میر کے زمانے کے تاریخی حالات کی نذر کر دیا۔ پھر کیا تھا ہر مقالہ نگار کو ایک سہل سا نسخہ مل گیا کہ کتاب کی ابتدا میں دلی اور لکھنؤ کی وہ تاریخ دہرا دی گئی جو سو بار پڑھ چکے ہیں۔ وہی غلام قادر روہیلے کا شاہ عالم کی آنکھیں نکالنا۔ وہی نصیر الدین حیدر کی جلسہ دہیان وہی جان عالم پیا کا پری خانہ سجانا۔ اودھ پنچ کے طنز نگاروں نے مسدس حالی پر انکولی بچوں کی زبانی فقرہ چست کیا تھا:

> جناب مصنف نے جغرافیے کا تو خاتمہ کر دیا ہے۔ مسدس یاد کر لو اور انٹرنس کا امتحان پاس۔ کوئی کہتا ہے کہ علم تاریخ میں تو صلا کر دہ مجبور ہے کہ ہسٹری آف گریس اور ہسٹری آف روم ترکیا گھر کی لونڈی ہے۔

ان مقالوں کے پہلے باب پر بھی یہی پھبتی چست ہوتی ہے اب تو یہ عالم ہے کہ تحقیقی مقالہ لکھنے والوں کو تاریخی پس منظر لکھنے کے لیے تاریخوں کی ورق گردانی بھی نہیں کرنی پڑتی۔ اب تک کے شائع شدہ مقالوں ہی سے کافی سامان مل جاتا ہے۔

تنقید کو محض کیمبرج ہسٹری آف انڈیا بنا دینا اس وقت تک بے سود ہے جب تک کہ ان واقعات کا زیرِ بحث صنف یا مصنف سے تعلق روشن نہ کیا جائے۔

آرٹ برائے آرٹ کا رسم اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود آرٹ لیکن ایک نظریے کی صورت میں اسے سب سے پہلے اٹھارویں صدی کی ابتدا میں فرانس کے وکٹر کزن نے L'art pour l'art کے فقرے سے ادا کیا۔ اس کے برعکس انگلستان میں میتھو آرنلڈ نے ادب کو زندگی کی تنقید قرار دیا۔ اردو میں ادب برائے زندگی کا نعرہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بلند ہوا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اعلان کیا:

---

(۱) یہ اعتراض مجھ پر بھی صادق ہوتا ہے کیونکہ میسکر ڈی لٹ کے مقالے 'اردو مثنوی شمالی ہند میں' میں بھی یہ باب ہے۔ ابتداً میں نے اسے منتز لکھا تھا لیکن ایک ممتحن نے اعتراض کیا کہ تاریخی پس منظر کو اور مفصل ہونا چاہیے تھا۔ مجبوراً میں نے بھی اسے بڑھایا لیکن سیاسی واقعات کے بجائے سماجی اور معاشی حالات پر زیادہ زور دیا۔ (۲) ادب اور انقلاب۔ ص۔ ۸۔ دوسرا اڈیشن۔

"تخلیق ادب معاشی زندگی کا ایک شعبہ ہے اور ادب زندگی کا پروردہ اور آئینہ دار ہے۔"
مولوی عبدالحق[1] نے بھی شہادت دی۔
"ادب کی بنا زندگی پر قائم ہے اور اگر یہ نہیں تو وہ ایک پریوں کی کہانی ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ادب زندگی کا ایک آئینہ ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔"

سوال پیدا ہوتا ہے: 'کیا اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کی آئینہ داری کے سوا اس سے بھی بڑھ کر زندگی کی اصلاح کرے؟' اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں دریافت کرنا ہے کہ
زندگی ادب کو کس حد تک متاثر کرتی ہے؟
ادب زندگی کو کس حد تک متاثر کرتا ہے؟

زندگی کے معنی کیا ہیں؟ جتنے ذی روح ہیں ان سب کو ملا کر زندگی کہہ سکتے ہیں۔ ان کے جذبات و خیالات کو بھی زندگی کا جزو قرار دیا جائے گا کیونکہ فکر کا چشمہ زندگی ہی سے ابلتا ہے۔ تو وہ تخلیقیں جن میں کسی جاندار کا بالواسطہ بھی ذکر نہ ہو زندگی سے معرا کہی جائیں گی کہ نہیں مثلاً :

گلابی سا ہو جانا دیوار و در — درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھٹنا وہ بادل کا زور — ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وہ سروِ سہی اور آبِ رواں — وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں

(مثنوی میر حسن)

یا

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

(اقبال ۔ ایک آرزو)

ان اشعار میں زندگی نہیں فطرت ہے لیکن ان کے حسن میں شبہ نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے بغیر بھی ادب پارے میں حسن ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہیں۔ یہ نظموں کے اقتباس ہیں۔ ان کے پہلے اور بعد کے اشعار زندگی سے خالی نہیں۔

اگر زندگی کو محض ذی روحوں کے تذکرے کے مترادف قرار دیا جائے تو وہ کون سا ادب پارہ ہے جو اس وسیع حصار میں نہ سما سکے۔ طلسم ہوش ربا اور مثنوی گلزار نسیم میں بھی زندہ کرداروں کا ذکر ہے لیکن ادب برائے زندگی کے نظریے کا کوئی مبلغ ان سے آسودہ نہیں۔ انھیں زندگی کا آئینہ دار نہیں قرار دیا جاتا۔ شاید ان کے فوقِ فطری کردار ان داستانوں کو زندگی کی بارگاہ

[1] افکار عبدالحق ص ۷۰

سے خارج کر دیتے ہیں انھیں ایسی داستانیں بھی نہیں ملتیں جن میں کوئی ذوقِ نظری عنصر نہیں مثلاً باغ و بہار کے پہلے درویش کی سیر یا الف لیلہ میں سوتے جاگتے کی کہانی یا قصہ مردت مند۔ نئے ادیب انھیں بھی زندگی آمیز اور زندگی آموز نہیں ملتے۔ آخر ان میں کسی نہ کسی زمانے کی زندگی کا تو ذکر ہے ہی۔ غالباً ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ادب ہم عصر زندگی کا آئینہ ہو کسی گئے گزرے ماضی کا نہیں چنانچہ اختر رائے پوری کہتے ہیں:

"ادب زندگی کا ایک شعبہ اور اپنے ماحول کا ترجمان ہے"[1]

اس میں پہلی قباحت تو یہ ہے کہ اپنے ماحول کی ترجمانی کا مطالبہ ادیب سے تاریخی ناول اور نظمیں لکھنے کا حق چھین لیتا ہے۔ اس سے قطع نظر ہم عصر زندگی کی محض ترجمانی سے بھی بات نہیں بنتی۔ داستانِ امانت، مثنوی بہارِ عشق اور دیوانِ جان صاحب اپنے عہد کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں شبہ نہیں پھر بھی انھیں سراہا نہیں جا سکتا۔ مجنوں گورکھپوری نے سوال اٹھایا۔

"کیا ادب کے معنی صرف زندگی کی تکرار یا نقل کے ہیں۔ اگر زندگی کے محض اعادہ یا مثنیٰ کو ادب کہتے ہیں تو پھر اصل اور مثنیٰ میں کیا فرق ہے اور اس کی ہم کو کیا ضرورت ہے۔ ادب یا حسن کاری اگر زندگی کی محض ایک سادہ نقل ہے تو یقیناً ایک فعلِ عبث ہے جو زیادہ سے زیادہ تفریح کا ذریعہ بن سکتا ہے"[2]

احتشام حسین نے اس کا جواب دیا۔

"چونکہ ادب ہوائی قلعہ بنانے کا نام نہیں ہے اس لیے شاعر اور ادیب کا کام یہیں نہیں ختم ہو جاتا کہ وہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا ہے وہی لکھ دے بلکہ وہ جس طرح محسوس کرتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے اس کا اظہار بھی کرے۔"[3]

بھارتیہ ساہتیہ پرشد ناگپور کے تاریخی اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں جو اعلان نامہ پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند، ڈاکٹر عبدالحق اور راقم رائے پوری وغیرہ کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا

"کیا آج جب ترقی اور پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے ادب اپنے کو غیر جانبدار رکھ سکتا ہے؟ .... اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو شاید کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو .... زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے۔"

داستانِ امانت اور بہارِ عشق یہ فریضہ سرانجام نہیں دیتیں۔ انھیں پڑھ کر کسی ذکی الحس قاری کے دل میں جنسی ظلم کے خلاف جذبات ابھر آتے ہیں تو یہ مصنف کے منشا کی وجہ سے نہیں۔ لیکن اس کوتاہی کا الزام صرف انھیں کتابوں پر کیوں رکھا جاتے؟ باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنوی میر حسن، گلزارِ نسیم، قصائدِ ذوق، دواوین میر و غالب چند مستثنیٰ اشعار کے سوا نہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوتے ہیں نہ سماج کو بدلنے کا اشارہ کرتے ہیں لیکن ہم انھیں ٹھکرا نہیں سکتے سو ختنی نہیں قرار دے سکتے۔ ان سے بھی آگے بڑھ کر دیکھا جائے تو عہدِ عتیق اور عہدِ وسطیٰ کے عظیم عالمی شاہکار بھی بیکاری، افلاس اور ظلم کے خلاف تیغ بکف نہیں نظر آتے۔

---

[1] ادب اور انقلاب ص ۱۱ [2] ادب اور زندگی [3] تنقیدی جائزے ص ۵۵ طبع سوم

ایلیڈ، اوڈیسی، شاہنامہ، کالیداس اور شیکسپیر کے ڈراموں میں سماج کو بدلنے کا جذبہ کوئی خاص نمایاں نہیں۔ جاگیرداری دَور کی ان پیداواروں کو پرکھنے کے لیے ہم اپنے معیاروں کو نہیں بدل سکتے چنانچہ اختر رائے پوری نے کالیداس، تلسی داس، ٹیگور اور اقبال سب کو رجعت پرستی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ماضی کے ادب عالیہ نے ترقی پسند نقادوں کو عجیب دُبدھا میں ڈال دیا۔ اُنھوں نے اچھے ادب کے لیے جو اصول و معیار قائم کیے تھے وہ ان شاہکاروں کے سامنے دم توڑ دیتے تھے لیکن اب ان شاہکاروں کی عظمت اتنی مُسلّم ہے، ان کے بقائے دوام پر صدیوں کی ایسی اہمیت مُہر لگ چکی ہے کہ جو نظریۂ ادب ان سے منکر ہو اس نظریے کو ناقص ٹھہرایا جائے گا اس لیے ترقی پسند نقاد ادب عالیہ کو اپنانے پر مجبور ہوئے۔ سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' میں اختر رائے پوری کے اعتراضات سے انحراف کیا اور تسلیم کیا کہ ماضی کا عظیم ورثہ ہمارا قیمتی سرمایہ ہے: اُنھوں نے کالی داس، شیکسپیئر، ٹیگور، میر، غالب، اقبال سب کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کیا۔

اپنا موضوع ترقی پسندی نہیں۔ صرف یہ اشارہ کرنا مقصود تھا کہ ادب کے وہ شاہکار بھی عظیم ہیں جو زندگی اور سماج کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے مدعی نہیں اور اس کا اعتراف ترقی پسندی کے سرکاری ترجمان بھی کرتے ہیں۔

اب تین طرح کی تخلیقات ملاحظہ ہوں۔ اوّل وہ ہیں جن میں زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش بھی ہے اور جمالیاتی پہلو بھی خاطر خواہ ہے مثلاً

شہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی

جہاں بانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اُس نے دُنیا میں کیا دورِ محن پیدا

ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا

نہ ہو چینِ جبیں جب تک جبینِ شہریاری پر
نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا

سُن اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے
نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

(جوش۔ زوالِ جہاں بانی)

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

خُون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب

جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظُلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ

(جوش۔ کسان)

کسی بھی پیمانے سے دیکھا جائے۔ ادب میں ان کا اعلیٰ مقام ہے اور رہے گا۔

دُوسری وہ تحریریں ہیں جن میں زندگی کو سنوارنے کی کوشش نہیں جو بعض نقادوں کے نزدیک رجعت پسندانہ بھی کہی جا سکتی ہیں لیکن جن کی حسن کاری میں کوئی شبہ نہیں مثلاً

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے　　کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار　　اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
(غالب)

یہ نغمے یہ ترانے یہ شباب و شعر کا عالم
یہ آرائش مکانوں کی یہ زیبائش مکینوں کی
یہ رعنائی حسینوں کی یہ صحبت نازنینوں کی
یہ عمریں یہ بہاریں یہ شباب و شعر کا عالم
نہ لے جا خلد میں یارب یہیں رہنے دے تو مجھ کو
یہ دُنیا ہے تو جنت کی نہیں ہے آرزو مجھ کو
(دُنیا کی بہاریں۔ اختر شیرانی)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
(درد)

نہ گُل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز
(غالب)

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
(فانی)

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے　　تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے
(جگر)

ان تخلیقات میں کہیں شکست ہے کہیں فرار، کہیں فقدانِ عمل ہے، کہیں افسردگی لیکن یہ انسان کے بنیادی جذبوں اور آفاقی تجربوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے بعض پر ایک یا ڈیڑھ صدی گزر چکی ہے لیکن وہ ابھی تک تر و تازہ ہیں۔ حافظ و خیام کی شاعری کئی صدیاں دیکھ چکی ہے اگر اس کی بہار ابھی تک جواں ہے تو کیوں نہ ہم اُمید کریں کہ یہ ابھی اور کئی صدیوں تک وقت کے دھارے کی طرح بہہ سکے گی۔ ادبیاتِ ماضی کے بیشتر کارناموں میں زندگی کو بدلنے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہیں۔ نثر میں الف لیلہ، باغ و بہار، نیاز کا افسانہ کیوپڈ و سائکی اسی طرح کی خوش رُبا تخلیقات ہیں جو ذہن پر چھاپہ مار کر قلب کو مسحور کر دیتی ہیں۔

تخلیقات کی تیسری قسم وہ ہے جن میں زندگی کو بہتر بنانے کا سودا ہے لیکن جو شعریت کے حُسن سے عاری ہیں مثلاً
کام اچھا کرنا چاہیے نہ کہ جلد

کام اچھا کوئی ہو آیا اگر انسان سے ۔۔۔ اس میں کی تاخیر اس نے جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں ۔۔۔ بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا، کیسا کیا

حالی

غریبوں کی فاقہ کشوں کی صدا ہے
مرے جا رہے ہیں
امیروں کے عیشوں کا انبار سر پر
لدے ہیں زمانے کے افکار سر پر
زمیندار کاندھوں پہ سرکار سر پر
مرے جا رہے ہیں

(ڈاکٹر تاثیر ۔ غریبوں کی صدا)

اے مئے پندار سے مخمور اے سرمایہ دار ۔۔۔ اے کہ ہے دولت پرستی تیرا بے مایہ شعار
اے کہ دولت ہی تری دنیا ہے اور دولت ہی دیں ۔۔۔ اے کہ تو دولت کو ہے سمجھا ہوا پروردگار
زعم میں سرمایہ داری کے یہ وحشت یہ جنون ۔۔۔ قصۂ مزدور سننا بھی ہے تجھ کو ناگوار
تو کو جوڑی تو نے دولت خون سے مزدور کے ۔۔۔ اور پھر غم خواری مزدور بھی ہے تجھ پہ بار
حق محنت اس کا دینے میں تجھے سو عذر ہیں ۔۔۔ ہیں عرق جس کی جبیں کا تیرے دُر بستا ہوا
اپنی عشرت گاہ میں تو محو خواب عیش ہے ۔۔۔ اور مزدور اک شکستہ جھونپڑی میں بے قرار

(سیماب ۔ اے سرمایہ دار)

یہ تخلیقات گرد آلود کتابوں میں دفن ہیں۔ یہ زندگی آمیز بھلے ہوں لیکن خود ان کی قسمت میں زندگی نہیں۔ ان کی پیدائش کے چند سال بعد ہی ان کا کوئی نام لیوا نہیں۔ زندگی اور سماج کو بہتر بنانے کی خواہش بڑا نیک جذبہ ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ یہ ادب کی حیات ابدی کا ضامن نہیں۔ ہم لاکھ چاہیں کہ بہترین ادب وہی قرار دیا جائے جو ان طاقتوں کا ساتھ دے جو دنیا سے ہر قسم کی بے انصافی کو مٹانا چاہتی ہیں لیکن زمانے کا فیصلہ کچھ اور ہے اور کہا گیا ہے کہ وقت بہترین منصف ہے۔

تلنگانہ میں کسانوں کی شورش ہوئی جھٹ ایک ناول لکھ دیا گیا۔ کوریا کی لڑائی ہوئی یا روما کی شہادت ہوئی ایک افسانہ وجود میں آگیا۔ ہندوستان پر چین کا حملہ ہوا قومی نظموں کا سیلاب آگیا گویا گولہ بارود کی جگہ یہ نظمیں ہی معرکہ سر کریں گی۔ ان ہنگامی موضوعات سے متعلق ہنگامی ادب کو اپنے دور میں مقبول عام داد و تحسین مل جاتی ہے لیکن کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ سو دو سال بعد اس قسم کی تخلیقات یاد رکھی جائیں گی۔ مگر نہیں تو انھیں ادب عالیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مثال سینما کے ان چلتے ہوئے چٹپٹے گانوں کی سی ہے جو کچھ دن کے لیے ہر ریڈیو، ہر لاؤڈ سپیکر، ہر زبان پر شور قیامت مچا دیتے ہیں۔ یہ فلم کری چار چھ ماہ تک رہتا ہے۔ اس کے بعد

ان گیتوں اور انسان کی آمد کے مضمون کو اس طرح طاقِ نسیاں میں ڈال دیا جاتا ہے جیسے وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ ان کے مقابلے میں پکے راگ کبھی اس طرح زبان زدِ عوام نہیں ہوتے لیکن ان کا بیں جلوہ ابد تک رہے گا۔ زندگی کی سب سے بھرپور آئینہ داری روزانہ اخبار کرتا ہے لیکن اخبار ایک دن کے بعد ہی ایسا باسی، بے جان اور مُردہ ہو جاتا ہے کہ ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زندہ جاوید ادب عالیہ زندگی کا اتنا بڑا عکّاس نہ ہوتے ہوئے بھی زندہ و پائندہ رہتا ہے۔

ادب کو زندگی کا آئینہ کہنے والے بیشتر نقاد یہ غلطی کرتے ہیں کہ زندگی کو خارجی ماحول کا ہم معنی سمجھ لیتے ہیں۔ زندگی میں ادبی ماحول کی اہمیت مسلم ہے۔ ہم اکثر مسائل کو (سب کو نہیں) اپنے معاشی طبقے کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ادیب کے ذہن اور جذبات کی تعمیر و تشکیل میں ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوتا ہے لیکن فن کار کی شخصیت کے خد و خال تنہا یہی متعین نہیں کرتا۔ آخر کیا بات ہے کہ میر اور سودا، انشا اور مصحفی، ذوق اور غالب، اصغر اور جگر ایک شہر ایک ماحول میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اتنے ہی مختلف تھے جتنے دو مختلف علاقوں دو مختلف زمانوں کے باشندے ہو سکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اجتماعی ماحول کے ساتھ ساتھ ہر شخص کا انفرادی ماحول بھی اتنا ہی اہم ہے لیکن یہ بھی انسانی ذہنیت کی پوری تاویل نہیں کر سکتا۔

کیا آپ نے ایسی مثالیں نہیں دیکھیں کہ دو حقیقی بھائیوں کے مزاج اور سیرت میں بُعد مشرقین ہے۔ دونوں ایک معاشرے کے جُزو ہیں۔ دونوں کا انفرادی ماحول یکساں ہے لیکن خیالات یکساں نہیں۔ ایک خوش باش مجلس آرا تو دوسرا خلوت پسند فلسفی مزاج ہو سکتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا۔

شیخ جی کے دونوں لڑکے باہنر پیدا ہوئے ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

بہت ممکن ہے دونوں کا ماحول مختلف ہو گیا ہو۔ دونوں مختلف قسم کے حلقوں میں اُٹھتے بیٹھتے ہوں لیکن دونوں کے مزاج اور کردار۔ پسند و ناپسند میں بھی ضرور فرق رہا ہوگا۔

سماجیات میں ایک بحث ہے کہ انسانی ذہن و کردار کی تشکیل میں ماحول زیادہ اہم ہے کہ وراثت۔ سماجیات کا موضوع چونکہ سماج ہے اس لیے وہ وراثت کو نظر انداز کر کے ماحول کے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ اس کے مقابلے میں علم الاجسام (Biology) ماحول پر وراثت کو ترجیح دیتا ہے۔ نسلی خصوصیات پر زور دینا مبالغہ ہے لیکن بالکل بے اصل بھی نہیں۔ شیخ محمد اکرام نے غالب نامے میں غالب کے کلام میں نسلی ذہنیت کے نقوش تلاش کیے۔

انگریزی کی کہاوت [illegible] بادن تو لے پاؤ رتی سچ ہے۔ کسی تخلیق کا اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ انشا منہ پھٹ تھے تو ان کی اکثر تخلیقات میں بھی وہی منہ پھٹ پن مسکراتا منہ چڑاتا دکھائی دیتا ہے۔ حالی نہایت شریف اور منکسر المزاج تھے تو ان کی تحریریں سادہ ہوتی ہیں۔ شبلی کا جمالیاتی ذوق بالیدہ تھا تو ان کا اسلوب بھی جمالی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ انسان کا مزاج ایسی پیچیدہ گتھی ہے کہ اس کے عوامل اور محرکات کا صحیح تجزیہ مشکل ہے۔ بعض انسان خلوت پسند ہوتے ہیں تو بعض گنبدِ افلاک میں غلغلہ پا کر دینا چاہتے ہیں۔ بعض شقی القلب ہوتے ہیں تو دوسرے کا آپکہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند کو اپنا اصولِ حیات بنا لیتے ہیں۔ بعض اشخاص جس سر راہ کو دیکھ کر آنکھ میچ لینے کے قائل ہیں تو بعض ہمیشہ جلا ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر

کاں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ کبھی کوجنس زدہ (Over sexed) بنا دینے کی ذمے داری اس کے خارجی ماحول پر ہی نہیں ہوتی۔ جذباتی شخصیت کی تشکیل کرنے والے عوامل کی تعیین موجودہ مقالے کا مقصد نہیں نہ راقم السطور کو اس کی صلاحیت ہے لیکن یہ طے ہے کہ شخصیت محض ماحول کی زائیدہ نہیں ہوتی اور ادب شخصیت کا انعکاس ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی دماغ میں مختلف جذبوں اور صلاحیتوں کے مختلف خطے ہوتے ہیں۔ اعصابی نظام بعض غدود اور ان کی رطوبتیں انسان کی داخلی شخصیت میں ترمیم کرتی رہتی ہیں۔ انسان کی نفسیاتی دُنیا محض شعور پر مشتمل نہیں اس میں تحت الشعور اور لاشعور بھی محوِ لہو ولعب ہیں۔ جوانی اور ضعیفی میں انسان کے مزاج، پسند و ناپسند اور رُجحانات میں جو تبدیلی ہوتی ہے کیا وہ خارجی ماحول میں تبدیلی کے باعث ہوتی ہے؟ نہیں ماحول اور معاشرے میں اکثر کوئی انقلابی فرق نہیں ہو جاتا ہاں جسم کی ساخت میں ضرور انقلاب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شباب اور شیب کی ادبی تخلیقات کا رنگ جُدا جُدا ہوتا ہے۔ صحت مند اور مریض دُنیا کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔

اب تک کی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

اگر 'ادب زندگی کا آئینہ ہے' کہہ کر زندگی سے خارجی ماحول مُراد لیا جاتا ہے تو یہ مکمل صداقت نہیں۔ 'ادب ماحول کا آئینہ ہے' سے بہتر صداقت ہے "ادب شخصیت کا آئینہ ہے"۔ اور شخصیت کی تعمیر میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن یہ تنہا محرک نہیں۔

بحث کا دُوسرا رُخ یہ ہے کہ ادب زندگی کو کہاں تک متاثر کرتا ہے۔

حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں کچھ واقعات درج کیے ہیں کہ شاعر کی نظموں نے بدصُورت کنواریوں کی خانہ آبادی کرا دی۔ کنبیوں کو انتقام لینے پر اُکسا دیا اور غریب الدیار بادشاہ کے دل میں وطن کی یاد گُدگُدا دی۔ بعض تنقیدی مضامین میں یہ پڑھنے میں آتا ہے کہ نئی نسل شبلی سے (یا کسی اور سے) متاثر ہے تو ذہن میں یہی سوال اُبھرتا ہے کہ الٰہی نئی نسل کے کتنے افراد ہیں جن تک شبلی کی رسائی ہو سکی ہے۔ شخصی حکومتوں کی بات دُوسری تھی بادشاہ یا رئیس جس شاعر کو نوازتے تھے عوام بھی اس کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ رسل و رسائل کے آج جیسے ذرائع تو تھے نہیں نتیجہ یہ تھا کہ نثری کتابوں کی اشاعت کم ہو پاتی تھی چونکہ نظموں کا یاد رکھنا آسان ہے اور وہ دلوں کو گرماتی بھی ہیں اس لیے زبان سے زبان پر گزر کر وہ دُور دُور تک پہنچ جاتی تھیں۔ آج جس کثرت سے کتابیں رسالے اور اخبار جاری ہیں ان میں منظومات کا حصّہ عشرِ عشیر بھی نہیں۔

ہمارے مُلک کی آبادی میں پڑھے لکھوں کا تناسب ۲۰ فی صد سے زیادہ نہ ہوگا۔ ان میں اُردو پڑھے لکھے اور بھی تھوڑے ہوں گے۔ ان میں بھی ادبیات کا مطالعہ کتنے آدمی کرتے ہیں۔ حکومت اور سیاسی پارٹیوں کے پاس پروپیگنڈے کے کتنے وسائل ہیں۔ ریڈیو۔ اخبار دستاویزی فلمیں وغیرہ۔ ہم پر دن رات اس پروپیگنڈے کی بوچھار ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے عقائد اسی سے تشکیل پاتے ہیں۔ اُردو پڑھنے والے بھی کوئی مستثنیٰ مخلوق نہیں ان کی محبت و نفرت کے مورودات کی تشکیل میں اقبال و جوش، نیاز اور کرشن چندر کی تحریروں کا زیادہ اثر ہوگا یا روزانہ اخبار اور ریڈیو کا۔ ہم اخبار میں پڑھتے ہیں کہ امریکہ میں گورے نوجوانوں کی ایک جیپ حبشیوں پر گولیوں کی

بچپاؤ کے تے جیسے گزر گئی یا افریقہ سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجۂ حرارت ایک سو ۱۱ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ ادب اتنا زود اثر کہاں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب ملکہ اپنے مُنہ میاں مٹھو بنیں کہ وہ زندگی کو یوں جنت بنا رہے ہیں اور یوں استعماریت و بربریت کی طاقتوں کے خلاف مورچہ بند ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چیونٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگِ آزادی میں شاعرِ انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھلاہٹیں اور جھنجلاہٹیں دکھائیں تھیں۔ اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ اور ہ نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں ——— وغیرہ۔ ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ حضرت ان کوسنوں سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کیجئے کوئی راہِ عمل بجھائیے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر گلو خلاصی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جد و جہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دُوسرے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ مُلک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مرہونِ منت نہیں بلکہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

مُلک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہوگا یہ نہ ادیبوں کے ناول طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظمیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوانِ قانون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ہے۔ قومی بیسیوں ریشریاں ہیں۔ طرح طرح کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ سمجھاتے ہیں ہم اس پر بنیک سکتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراسلت کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دُنیا کی تقدیر سیاستدانوں اور تکنیکی ماہروں (Technocrat) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دُہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر مسکرا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صُورتِ حال صرف ان ممالک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقاء کا رُخ متعین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افراط سے ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک فنِ لطیف بن گیا ہے۔

اچھی ادبی تخلیقات اثر آفریں ہوتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ
دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفوں کے قلم میں جادو ہوتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز پانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا افسانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تحت الشعور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست دان ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض حرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سردار جعفری[1] نے سچ کہا ہے۔

"ادب حقیقت کو دہراتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔ وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔"

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن ان پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے۔ مستقبل میں جوں جوں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی مزدوروں کے درپیش بجا طور پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجینیری یا ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجینیر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھڑ جائے تو وہ اسے بیکاری کے مشغلے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی ایسا سوچنا خوش فہمی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعۂ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پیچھے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ معنویت کھو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیتا، ماہرین معاشیات، موجدانِ سائنس زیادہ حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جد و جہد سے منہ موڑ لے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلّم کہ ادیب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مضر ہو

---

[1] ترقی پسند ادب بار دوم ص ۲۹

پوچھا کرتے جیسے گزر گئی یا افریقہ سے ہندوستانیوں کو نکالا جا رہا ہے تو ہمارے دماغ کا درجۂ حرارت ایک سو ۱۰ ڈگری پر پہنچ جاتا ہے۔ ادب اتنا زود اثر کہاں۔

آج کی زندگی بڑی پیچیدہ ہے۔ ادیب لاکھ اپنے منہ میاں مٹھو بنیں کہ وہ زندگی کو یوں جنت بنا رہے ہیں اور یوں استعمار و بربریت کی طاقتوں کے خلاف محوِ حرب ہیں لیکن واقعتاً سماجی زندگی کا رُخ متعین کرنے میں ان کی حیثیت پہاڑ پر چیونٹی یا سمندر میں قطرے سے شاید ہی زیادہ ہو۔

جنگ آزادی میں شاعرِ انقلاب نے اپنی نظموں میں غلامی کے خلاف کیا کیا جھلاہٹیں اور جھنجھلاہٹیں دکھائیں ع اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ اور ع نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں ——— وغیرہ۔ ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ حضرت ان کوسنوں سے کہیں آزادی مل سکتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کی بجائے کچھ کیجیے، کوئی راہِ عمل بتلائیے کہ بدیسی حکومت سے کیونکر گلو خلاصی ہو۔ اور کرنے والے کر رہے تھے۔ ان کی جد و جہد اور قربانیوں نے آزادی دلائی۔ جوش اور دوسرے ادیبوں کی تخلیقات سے اس کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق پڑتا نہیں دکھائی دیا۔ ملک کی آزادی اور تقسیم جوش و اقبال کی مرہونِ منت نہیں وہ مختلف سیاسی تحریکوں کی آویزش اور سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔

ملک کا سماجی اور معاشی ارتقا کس جہت میں ہوگا یہ نہ ادیبوں کے ناول طے کرتے ہیں نہ شاعروں کی نظمیں۔ یہ سیاسی پارٹیوں اور تکنیکی ماہروں کا میدان ہے۔

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

سیاسی پارٹیوں کا پروگرام ایوانِ قانون ساز اور حکومت کی معرفت عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ہے۔ قومی بیورو کریسی ہیں۔ طرح طرح کے ماہرین ہیں ہماری زندگی کس طرح گزرے گی اس کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ جو کچھ سمجھاتے ہیں ہم اس پر لبیک کہتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان مراسلت کا وسیلہ روزانہ اخبار ہیں۔

آج دُنیا کی تقدیر سیاستدانوں اور تکنیکی ماہروں (Technocrat) کے ہاتھ میں ہے ادیبوں کے نہیں۔ ادب کی تاثیر اور ہمہ گیری کی بات صرف ادیب کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کے سامنے یہ دعویٰ دہرایا جائے تو وہ اس معصوم دعوے پر مسکرا کر گزر جائیں گے۔ مزدور یا کسان کے سامنے بڑے بڑے ادیبوں کا ذکر کیا جائے تو وہ حیرت سے پوچھیں گے کہ یہ کن مخلوقات کا نام لے رہے ہو۔

ہمارے ذہن اور معتقدات کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے ہمارا پسندیدہ روزنامہ اور ہمارے قومی ریڈیو کی خبریں ہیں۔ تاثیر کی وسعت اور گہرائی کے لحاظ سے ادبی تخلیقات صحافت کے آگے پانی بھرتی ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف ان ممالک میں نہیں جہاں خواندگی کی کمی ہے۔ مغرب میں جہاں تعلیم بہت عام ہے اور ادیبوں کی آواز بہت زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے وہاں بھی ادیب سماجی ارتقاء کا رُخ متعین نہیں کرتے۔ وہاں کی حکومت، سیاسی گروہوں اور سرمایہ داروں کے پاس رائے عامہ کو متاثر کرنے والے وسائل افراط سے ہیں۔ وہاں پروپیگنڈا ایک فنِ لطیف بن گیا ہے۔

اچھی ادبی تخلیقات اثر آفریں ہوتی ہیں اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

بڑے بڑے مصنفوں کے قلم میں جادو ہوتا ہے۔ وہ قاری کو کم از کم وقتی طور پر اپنا ہم خیال بنا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز حکومت نے جوش کی نظم ضبط کی اور روسی حکومت نے نوبل پرائز پانے والے ناول کو اپنی قلم رو میں شائع نہ ہونے دیا۔ ایک اچھے ناول یا افسانے کا اثر کئی روز تک رہتا ہے اور شاید تحت الشعور میں بس کر رہ جاتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے ملکوں کے سیاست دان ادبیات کا مطالعہ نہیں کرتے۔ قانون ساز ایوانوں کے بیشتر اراکین تو محض صرف شناس ہی ہوتے ہیں۔ جو پڑھے لکھے ہیں انھیں بھی ادبیات کے مطالعے کی فرصت نہیں۔

آج ادبیات کے علاوہ دوسرے موضوعات مثلاً تاریخ، معاشیات، سیاسیات، سائنس وغیرہ پر کثرت سے لکھا جا رہا ہے ادبیات کے طلبہ کے علاوہ دوسرے قارئین اپنے اپنے پسندیدہ موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سردار جعفری نے سچ کہا ہے۔

"ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔۔۔ وہ پہلے انسان کے جذبات پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔"[۱]

ادب کا اثر ہوتا ہے لیکن اُن پڑھے لکھوں پر جن تک اس کی رسائی ہو سکے۔ ابھی ملک میں خواندگی بہت کم ہے مستقبل میں جوں جوں خواندگی بڑھے گی ادب کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔ لیکن اب ایک اور خطرہ ہے۔ ملک کی ضرورتوں کے درپیش بجا طور پر یہ زور دیا جا رہا ہے کہ فنون کی تعلیم کے مقابلے میں سائنس اور تکنیکی تعلیم کو زیادہ فروغ دیا جائے۔ ادبیات کا ہر پروفیسر اپنے بچوں کو انجنیری یا ڈاکٹری کی تعلیم دلا رہا ہے اور کسی انجنیئر یا میڈیکل کالج کے پروفیسر یا ماہر معاشیات کے سامنے شعر و ادب کا ذکر چھڑ جائے تو وہ اسے بیکاری کے مشغلے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ آنے والی نسلوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب کی مقبولیت اسی تناسب سے بڑھ جائے گی ایسا سوچنا خوش فہمی ہے۔ تعلیم کے فروغ کے معنی مطالعۂ ادب کا فروغ نہیں۔

جب یہ صاف نظر آتا ہے کہ سماج کے ارتقا میں جو طاقتیں کام کر رہی ہیں ادب ان میں سب سے پیچھے سب سے کم زور ہے تو پھر ادب میں مقصدیت کی بحث اپنی بہت کچھ معنویت کھو دیتی ہے۔

سماج کی بہتری کی کوشش کتنا مستحسن کام ہے لیکن یہ کام ادب کی نسبت صحافت، سیاسی کتابیں، سیاسی نیتا، ماہرینِ معاشیات، موجدانِ سائنس زیادہ حسن و خوبی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ادب کو بھی اس مبارک کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے لیکن ادب اگر کبھی کبھار اس جدّ و جہد سے منہ موڑ لے تو بھی سماجی ترقی کی رفتار میں کوئی نمایاں فرق نہ پڑے گا۔ یہ مسلّم کہ ادیب کو کوئی ایسی چیز پیش نہ کرنی چاہیے جو سماج کو مضر

۱؎ ترقی پسند ادب بار دوم ص ۲۹

انفعال کی طرف لے جانے کا لیکن اگر وہ بعض اوقات ایسی چیزیں پیش کرے جو سوسائٹی کی عادی کا اعتبار سے دنیا میں نہ ملتی ہوں بلکہ جنت کی طرح اور مسرت عطا کریں تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں
بہار و کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سرود و نور کا کوثر چھلک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں

(اختر شیرانی)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم — امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

(اقبال)

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کی تخیلات مفید ہیں کہ نہیں ہیں لیکن انھوں نے انسان کو ہمیشہ آسودگی بخشی ہے اور ہمیشہ آسودگی بخشیں گی مجھے مجنوں کے اس قول سے کامل اتفاق ہے۔

"اخبارات میں سوائے روح عصر کے کچھ نہیں ہوتا اور ادب میں علاوہ روح عصر کے بھی ایک عنصر ہوتا ہے جس کا تعلق ماورائے عصر سے ہوتا ہے اور جس کی بدولت وہ ادب ہر زمانے کی چیز بن جاتا ہے یعنی وہی واقعیت ([illegible]) اور تخیئت ([illegible]) کا شیر و شکر ہونا۔ آج کل کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی۔ پرسٹلی (J. B. [illegible]) کا خیال بہت صحیح ہے کہ حسن کاری یعنی آرٹ کو زندہ رکھنے کے لیے تھوڑی سی افیون کی ضرورت ہمیشہ پڑے گی۔"

زندۂ جاوید ادب میں اس افیون کا شائبہ ضرور رہتا ہے لیکن افیون کی مقدار تھوڑی ہی ہونی چاہیے۔ زیادہ ہوگی تو وہ زندگی کے لیے سم قاتل ہے۔

ل ادب اور زندگی بار دوم ص ۰۰

اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کا ایک جائزہ

نصیر الدین ہاشمی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمان فوجی تزک و احتشام سے آنے سے صدیوں پہلے جہازوں کے ذریعہ پُرامن طریقے پر تجارت اور تبلیغ اسلام کے لیے آپہنچے تھے۔ ان آنے والے مسلمانوں میں اہلِ نوایط کا بڑا حصّہ تھا۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب اور ہند کے تعلقات میں حسب ذیل صراحت فرمائی ہے:۔

"روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور عربوں کا تیسرا مرکز ہندوستان کا وہ آخری کنارہ ہے جس کو ہندوؤں کے پُرانے زمانہ میں کیرالا کہتے تھے اور بعد کو ملیبار کہنے لگے...... ملیبار کے یہی مسلمان عرب تاجر اور سوداگر اور تارکینِ وطن ہیں جو موپلا اور نائت کے ناموں سے ہندوستان میں مشہور ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پرتگیزوں سے پہلے تک سمندر کی باگ تھی....... (صفحہ ۲۶ و ۲۶۹)

ملیبار کے دُوسرے مقابل ساحل کو عرب معبر کہتے تھے اس کا موجودہ مشہور نام کارومنڈل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساحل کا یہ حصّہ بھی چند صدیوں کے بعد عربوں کے استعمال میں آیا ہے۔ چند ہی صدی کے آخر سے اس کا نام سننے میں آتا ہے۔ ساتویں صدی میں یہاں عربوں کا اچھا خاصا عمل دخل معلوم ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱)۔

اگرچہ مولانا سید سلیمان نے صرف کیرالا کے سلسلہ میں اہلِ نوایط کا ذکر کیا ہے اور کارومنڈل کے تذکرہ میں اُن کا نام نہیں پایا گیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کیرالا کی طرح کارومنڈل میں اہلِ نوایط آئے ہیں۔ چنانچہ ندوی صاحب نے ساتویں صدی کا جو تذکرہ کیا ہے وہ ابنِ بطوطہ کے سفرنامہ سے ماخوذ ہے اس کی صراحت بھی ندوی صاحب نے فرمائی ہے۔ ابن بطوطہ کی صراحت خصوصیت سے پڑھنے کے قابل ہے جس کی صراحت آگے آتی ہے۔

یہ امر ہنوز تحقیق طلب ہے کہ اہلِ نوایط کس سنہ میں ہندوستان آئے۔ چونکہ تمام اہلِ نوایط شافعی مذہب کے پیرو ہیں اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بعد آئے ہوں گے۔ لیکن جو دُوسرے تاریخی شواہد ملتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے بہت پہلے ہی ہندوستان میں آگئے تھے۔ بہرحال ان کے ہندوستان آنے کا زمانہ صحیح طور پر ہنوز متعین نہیں کیا جاسکتا۔

اہلِ نوایط کے ہندوستان میں منتقل ہونے کے متعلق جو مواد ملتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اوّلاً سواحل کارومنڈل اور کرناٹک پر اُترے اور جنوبی ہند میں دُور دُور تک پھیل گئے۔ جن مقامات پر اہلِ نوایط نے قیام کیا وہ کوکن، بٹیکل، بمبئی۔

گوہ گلبرگہ ۔ بیدر ۔ بیجاپور ۔ حیدرآباد ۔ ویلور ۔ ارکاٹ ۔ مدراس ۔ بنگلور ۔ میسور ۔ سدھوٹ ۔ کرنول وغیرہ مقامات ہیں ۔ ان میں سے اکثر مقامات پر اب بھی اُن کی خاصی تعداد موجود ہے ۔

اہلِ نوایط کا ذریعۂ معاش تجارت تھا اس کے ساتھ ہی وہ درس و تدریس تبلیغِ اسلام کے کاموں میں پوری توجہ ، مستعدی اور انہماک سے مصروفِ عمل رہے ۔ جب وہ ہندوستان آئے تھے تو ان کی مادری زبان عربی تھی ۔ ہندوستان میں آکر بود باش کرنے لگے ۔ تجارت اور تبلیغِ اسلام میں مصروف ہوئے تو دیسی زبانوں کو حاصل کرنا ہی ان کے لیے ضروری تھا ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنوب میں آپس کے میل جول سے زبان پیدا ہونے لگی یعنی قدیم اردو میں اُن کا بڑا حصہ تھا ۔ مگر سر دست اس کے متعلق کوئی صحیح طور پر رائے پیش نہیں کی جا سکتی ۔

دکن میں جب اسلامی حکومتیں ، بہمنی ، عادل شاہی ، قطب شاہی ۔ نظام شاہی ، مغلیہ اور پھر آصفیہ وغیرہ قائم ہوئیں اور ان میں سے اکثر حکومتوں کی سرکاری زبان فارسی تھی تو اہلِ نوایط نے بھی عربی کے ساتھ فارسی اور پھر اُردو کو اپنا لیا ۔

دکن کی ادبی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہاں عربی فارسی ایک مدتِ دراز تک علماء اور فضلاء اور اصحابِ علم کی تصانیف اور تالیفات کی زبان رہی حتیٰ کہ خطوط بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے ۔ اگرچہ دکن میں سنہ ۸۰۰ ھ کے اوائل سے دکنی (قدیم اردو) کا رواج رہنے کا ثبوت ملتا ہے ۔ اور نہ صرف بول چال بلکہ تحریر میں آجانے کا ذخیرہ وغیرہ ہم دست ہو گیا ہے لیکن اس کے باوجود علماء اور اصحابِ علم میں فارسی کا ہی رواج عرصۂ دراز تک باقی رہا ۔ کیونکہ اکثر علماء اُردو میں تصانیف کرنے کو اپنی سبکی تصور کرتے اور پس و پیش کرتے تھے ۔ اظہارِ خیالات کے لیے اس کو کم مایہ تصور کیا جاتا رہا ۔

میرے مضمون کا عنوان اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کا جائزہ ہے علمی خدمات نہیں ہے اس لیے اہلِ نوایط کے علمی و ادبی کارناموں کو جو عربی فارسی میں ہوئے نظر انداز کر کے صرف اُردو کے متعلق صراحت کی جاتی ہے ۔

اہلِ نوایط کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا اور اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ صدیوں سے اہلِ نوایط نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا اور اس قوم کے کئی مشاہیر اس خصوص میں نام آور ہوئے ہیں ۔ چنانچہ مشہور اسلامی سیاح ابنِ بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں اس قسم کے دو بزرگوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے :

"دوسرے دن صبح کو ہنور میں پہنچے ۔ یہ ایک بہت بڑی کھاڑی پر واقع ہے ۔ اس شہر کے عابدوں میں شیخ محمد ناگوری ہیں اُنھوں نے میری دعوت اپنی خانقاہ میں کی ۔ فقیہ اسمٰعیل جو کلام اللہ پڑھاتے ہیں اس شہر میں رہتے ہیں ۔ وہ نہایت پرہیزگار خوش خلق اور فیاض .... اس شہر میں تیرہ مکتب لڑکیوں کے ہیں اور تئیس مکتب لڑکوں کے ہیں ۔ یہاں کا بادشاہ جمال الدین ہے یہاں کے راجہ کو کچھ معین خراج دیتا ہے ۔ بادشاہ سلطان جمال الدین محمد بن حسن ہر ایک جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے ۔ جب میں اس کے پاس ٹھیرا ہوا تھا تو افطار کے وقت مجھے بلایا ہوا تھا ۔ فقیہ علی اور فقیہ اسمٰعیل بھی موجود ہوتے تھے ۔"

(ہنور کو اب ہونور کہتے ہیں احاطہ بمبئی میں شمالی کنڑا کے ضلع میں ایک تحصیل کا صدر مقام ہے' ملا علی جن کا تذکرہ ہے مخدوم علی ہاشمی تفسیر رحمانی کے مصنف ہیں اور فقہ اسمٰعیل راقم کے اسلاف میں شامل ہیں اس لیے واضح ہے کہ اہلِ نوایط کرالا کے علاوہ کارومنڈل میں بھی آگئے تھے۔ یعنی ملک کوکن کا مرکز بنا ہوا تھا۔)

اس زمانہ کے بعد بھی اس قوم کے مشاہیر نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو جو ان کا آبائی ورثہ تھا متروک نہیں کیا۔ اہلِ نوایط کی عربی اور فارسی تصانیف کا سلسلہ ۱۳۰۰ھ کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر مشاہیر نوایط کی صرف عربی فارسی تصانیف کی فہرست پیش کی جائے تو کئی سو کتابوں کا تذکرہ کرنا ہوگا۔ یہاں اس موقع پر دشوار ہے کیونکہ ہم کو صرف اُردو کا تذکرہ کرنا ہے۔ اوّلاً یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اہلِ نوایط نے اُردو کی خدمت کی ابتدا کب سے کی ہے۔ اور کس نے اُردو کا نامہ پیش کرنے کا آغاز کیا۔

واضح ہو کہ اہلِ نوایط کا بڑا کارنامہ تبلیغ اسلام اور درس و تدریس کے ساتھ تجارت بھی رہا۔ زمانہ سابق میں عام طور سے تمام علماء فضلاء اُردو کے قطع نظر عربی فارسی کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ قرار دیتے تھے چنانچہ ان ہی وجوہ سے سنہ ۱۳۰۰ھ (سنہ ۱۸۸۳م) تک ہی ان کے فارسی یا عربی تصانیف ہمدست ہوئے ہیں حتّٰی کہ خطوط بھی عرصۂ دراز یعنی ۱۳۲۲ھ[1] تک بعض اصحاب فارسی میں لکھا کرتے تھے۔

اگر میں یہ صراحت کروں کہ قاضی محمود بحری وہ پہلے نائطی شاعر اور مصنف ہیں جنھوں نے قدیم اُردو میں طبع آزمائی کی ہے تو شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ اب تک مورخین ادب نے قاضی صاحب کو نائطی نہیں لکھا ہے پھر کس طرح قاضی صاحب کو اہلِ نوایط میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس خصوص میں مصنف تذکرہ گلزارِ اعظم کی صراحت قابلِ ملاحظہ ہے جو حسبِ ذیل ہے:

"مختار تخلص باقر حسین مخاطب بہ خطاب پدر خود حسن علی خان از اولاد قاضی محمود بحری از قوم
نائطہ معززان این شہر است۔" صفحہ (۳۴۷)

یہ تذکرہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶م) میں طبع ہوا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قاضی محمود بحری کی اولاد اس زمانہ میں موجود تھی اور اہلِ نوایط میں ان کو شامل کیا گیا تھا۔

اگر سرِ دست قاضی محمود کے نام کو مزید تحقیق کے لحاظ سے حذف کر دیا جائے تو جس نائطی شخص کو اُردو کا پہلا نائطی شاعر تسلیم کرنا چاہیے وہ سعادت اللہ ہیں۔

یہ وہی سعادت اللہ خان ہیں جن کو عالمگیر نے ذوالفقار خان کے خطاب سے ارکاٹ کا صوبہ دار بنایا تھا۔ آپ کے دربار میں فارسی گو شاعروں کا ایک جمگھٹا ہوتا تھا۔ جن میں قزلباش خان، فضل اللہ خان، آغا محمد مقیم دکھنی، رائے بست رائے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مصنف سعیدنامہ (جو ان کے عہد کی تاریخ ہے) اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ ان کے دربار میں شعرا کے کلام

---

[1] دادا صاحبی امیر نواب شرف الدولہ جو راقم کے دادا تھے ۱۳۲۲ھ تک فارسی میں خط لکھا کرتے تھے۔

پر مباحثہ ہوتا تھا۔ خواص ، شوقی اور نصرتی کی تصانیف کا ذکر رہا کرتا۔ سعادت اللہ خان خود بھی شاعر تھے اور ان کو شعر کا اچھا مذاق تھا۔ فی البدیہہ شعر کہا کرتے۔ ایک مرتبہ بیجاپور کے شاعر عبداللہ ذکی نے اپنی درخواست شعر میں پیش کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محرم میں اکثر اوقات دکنی زبان میں مرثیے کہا کرتے جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوتے افسوس ہے کہ ان کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۲۲۰ھ میں ان کا انتقال محمد پور (ارکاٹ) میں ہوا۔ بہرحال موجودہ معلومات کے لحاظ سے اہلِ نوایط میں ان کو پہلا اردو گو شاعر تسلیم کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔

اب مضمون کو سہولت کی غرض سے چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ہر دور کی اُردو خدمات کا حال واضح ہو سکے ۔ حسب ذیل ادوار قائم کیے جائیں گے۔

پہلا دور	ماقبل سنہ ۱۸۰۰م تا سنہ ۱۸۰۰م
دوسرا دور	سنہ ۱۸۰۱م تا سنہ ۱۸۵۷م
تیسرا دور	سنہ ۱۸۵۸م تا سنہ ۱۹۰۰م
چوتھا دور	سنہ ۱۹۰۱م تا سنہ ۱۹۴۷م
پانچواں دور	سنہ ۱۹۴۷م تا سنہ ۱۹۶۳م

ان ہی ادوار کے تحت یہاں مختصر صراحت کی جاتی ہے۔ امید ہے کہ موجب دلچسپی ہوگی۔

پہلا دور

ماقبل سنہ ۱۸۰۰م تا سنہ ۱۸۰۰م

اس دور میں اہلِ نوایط کی اُردو خدمات کے سلسلہ میں صرف شاعری اور نثر نگاری کی صراحت کی جاتی ہے۔ اس دور کے کئی ایک نوایط کے نظم اور نثر نگاری کے ذخیرے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن شعراء اور نثر نگاروں کو پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہیں :-

مولوی محمد باقر آگاہ ان کے والد بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کے خاتمہ کے بعد ویلور (علاقہ مدراس) آگئے اور باقر آگاہ کی ولادت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت ویلور میں ہوئی۔ آپ ۱۱۵۸ھ میں تولد ہوئے اور مدراس میں ۱۲۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ آگاہ کی عربی فارسی تصانیف کی تعداد (۳۰۳) ہے۔ اس میں سے (۱۶) اُردو میں۔ تمام کتابیں نظم میں ہیں اور مثنوی کی صورت میں ہیں مگر اکثر کتابوں میں کئی صفحوں کا دیباچہ نثر میں ہے۔ ان کتابوں میں اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ مثنویاں بجز ایک کے باقی تمام سوانح سیرۃ مناقب بخشہ کے عنوان پر لکھی ہیں خصوصیت سے عورتوں کے لیے ان کتابوں کو لکھنے کا تذکرہ کیا گیا ہے کیونکہ اصحاب علم عام طور سے عربی فارسی میں تعلیم پاتے اور ان ہی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ عورتوں کے لیے یہ سہولت نہیں تھی اس لیے باقر آگاہ نے خصوصیت سے عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

باقر آگاہ کا کلیات بھی ہے جس میں اصنافِ سخن کے کئی اقسام مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مرثیہ سب کچھ شامل ہیں۔ اگرچہ آگاہ کو خاندان والاجاہی ارکاٹ کے دربار سے زیادہ تعلق رہا مگر ان کا کوئی قصیدہ والیٔ ملک کی مدح اور ستائش میں نہیں ہے بلکہ تمام قصاید نعتیہ ہیں، آگاہ کی بلند کرداری کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔ آگاہ کی مثنویوں، قصیدہ اور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی سخاوت کا تذکرہ

سخاوت میں کوئی اوس کا ثانی نہیں   نہ تھا جود کوں اس کی . . . نہیں
سوال سوں دیا اونٹ روز حسین   عزیباں کوں اوخلق کا نُزرِ عین
بقول ہوازن دیا چھے ہزار   درم اوشہنشاہ عالی تبار
نے یک مسلمان کوں او بے بدل   دیا یک جنگل بھر کو بجری سیگل
کہاں قوم کوں جا کو اسے گمرہان   محمد اوپر لاؤ ایمان جان
سخاوت کوں اوس کی نہیں انتہا   جو ظاہر سخاوت کا ہے مدعا
میں رحمت کا اوس کی کروں کیا بیان   سراپا ہے اوس کوں خدا در قرآن
دکھا رحمۃ العالمین اوس کا نام   روف رحیم بھی اسے شاد کام
شہنشاہ کی رحمت اسے نام ور   ابھی سب پر حتیٰ کہ شیطان و دہر

اُمت میں نبی کی جو ہیں عورات   افضل ہیں سب عورتاں سے سُن بات
لکھتا ہوں میں اس کتاب اندر   احوال نساء کا اے برادر
اس شاہ کی دختران کا احوال   اس شاہ کی عورتاں کا احوال
اُمت میں جو عورتاں تھے کامل   تھا قربِ خدا کا ان کو حاصل

غزل کا نمونہ:۔

فریاد میری تیرے تغافل کو بڑھایا   کیا خوب بلا ثمر مجھے میری فغان کا

کروں سے گلرو کی جلوہ گاہ ہے تاب اندر شراب
یوں جھلکتی ہے جواب میرے گلاب اندر شراب

دل میں میرے ساقی نہیں داستان شوق
کس طرح سے کروں میں پیالے بیان شوق

جب لگائے خنجر دل کو میرے شرار
پانی ہی بھرتے بھرتے سزا اپنی پائے چشم

ہے میری جان و دل پر حکم غمزہ کا تیری نافذ
مگر تقدیر کے نایب ہیں تیری آج کل انکھیا

ہستی سے تنگ دل ہوں اب نیستی کی
پھر کاش اس جہان سے ہو جاؤں بے خبر میں

جو چشم تجلی سے تیرے دور پڑے ہیں
حیرت میں ہوں کہ تو کیسے مجبور پڑے ہیں

عشق میں ہم تو کچھ گفتہ نہ کیا
بے گفت ہوں کہ کیوں ستاتے ہو

جب سے ہم تجھکو یک نظر دیکھے
تجھکو ہر شے میں جلوہ گر دیکھے
تو ہی منظور چشم و دل ہے سدا
کیا ہوا گر ادھر ادھر دیکھے
کب شعلہ زار عشق کا دل تاب لاسکے
ذرہ میں آفتاب کہاں سے سما سکے

رباعی :-

تا دل میں سماتا ہے تیرا عکسِ جلال
نہ آنکھ میں ماتا ہے تیرا نورِ جمال
ہیں ملک و ملک میں جتنے ارباب کمال
تمہید میں تیرے ہو گئے یکسر لال

اس گریہ و زاری و دُعا سے توبہ
اس توبہ پہ عجب دریا سے توبہ
پستی کی علامات ہیں یہ سب چیزیں
یا رب یہ علامت بلا سے توبہ

۲- دیوان

زین العابدین نام دیوان تخلص ۔ علی دوست خان فرزند حسین خان دوست خان چندا صاحب کے داماد تھے ۔ فارسی اور اردو میں شاعری کرتے تھے ۔ صاحب گلدستہ کرناٹک اور تذکرہ گلزار اعظم میں آپ کا حال درج ہے ۔
افسوس ہے کہ ان کے دیوان کے غزلیات وغیرہ دستیاب نہیں ہوتے ۔ صرف مرثیوں کا مواد دستیاب ہوا ہے ۔ نمونہ پیش ہے :

آج سلطان پیمبر پر ہے غم   شاہ مردان شبیر اکبر پر ہے غم
سخت ہے خاتون جنت غم میں   شاہ دین شبیر و شبر پر ہے غم

کیا کربلا میں آل عبا پر ستم ہوا   جب اور امام دوسرا پر الم ہوا
آل رسول حق پہ تظلم کا حال دیکھ   ... کے دل عیش بکام عدم ہوا
مانند گور مرسون بکربلا .... ششدان   عالم پہ ہی جب سنے ایجاد غم ہوا

. . . .

افسوس کیا کہ غم سو ان کیسے وے زار زار
دیوان پہ کیا ہو ماتم جسم ہوا اُٹھ

---

۱۵ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد ۔ رقعات امام اللہ حسینی ۔ ادب نثر فارسی (۱۴۴)

مرثیہ :-

ہوا ختم یار غم سوں سروِ بستانِ نبوت کا
ہوا باد ظلم سوں گل شمع بزم ولایت کا

سدا غم گینی دو عالم کوں کیا ہے چاند ماتم کا
سکایا ہے نہال عیش کوں یا دختران غم کا

دکھلایا تخت امامت جب منے سروں دو عالم کی
گھڑی . . . . رہنی حرف ختم کا

ہوا ختم شہادت قتل خاک کربلا میں جب
خوشی کا نام مجھ سوں کم ہوا ہے جام جیوں جم کا

. . . .

شفاعت . . . . کون کریں گے ساقی کوثر
رکھیا ہوں اسے امید کوں اس شاہ مکرم کا

سدا دیوان رویا حسین کا غم سو شہیداں کی
چھتر ہے سر پہ اس کی گرد اہل بیت اکرم کا

مرثیہ :-

کربلا جب مقتل شہزادۂ اکمل ہوا
خاک اس کا ہر زمین آسمان افضل ہوا

غم کیوں نہ ہو رو دو عالم کوں محیط
آفتاب دین کی مغرب عرصۂ کربل ہوا

(۳) اس دور کے ایک اور شاعر عجز ہیں :-

غلام محی الدین نام تھا۔ ارکاٹ میں سنہ ۱۱۸۰ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۲۹ھ میں مدراس میں انتقال ہوا۔ والا جاہ کے تیسرے فرزند عظیم الدولہ کی تعلیم اور تربیت سے متعلق کئی فارسی کتابوں کے مصنف ہیں اپنے انتقال تک درس و تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی اور اردو میں دیوان مرتب کیے تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جو فارسی اور اردو میں ہیں۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

ہے غم عشق بتاں سے تھا میرا دل افسوس
اس بچارہ پہ بیٹھ نقشہ بچا ئیں آنکھیں

یار کے عشق نے جب سے مجھے سرشار کیا
چشم انگور کو .... خون بار کیا
ہمیں کعبہ و دیر سے نہیں کچھ کام
کہ ہر جا ترا جلوہ ہم دیکھتے ہیں
کیا تیری چشم کا پیمانہ ہے
حسن جس کے سر کا مستانہ ہے
مدت گزر گئی نہ سنی یار کی خبر
اس شوخ دلربا بت غم خوار کی خبر
معجز خیال ہستی موہوم کو وداع
درپیش ہے سفر مجھے دار البقا طرف
ایک دم جلنے پر مت لاف کرے پروانہ
شمع کو دیکھ کہ تا صبح جل جاتی ہے

مختار

باقر حسین نام مختار تخلص۔ قاضی محمود بحری کے پوتے تھے۔ فارسی شاعری میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ مشاعرِ اعظم میں شریک ہوا کرتے۔ اپنے دادا کی طرح اردو سے بھی دلچسپی تھی۔ تصوف سے بھی شغف تھا۔

افسوس ہے کہ اردو کلام اب تک بدست نہیں ہوا ہے۔

ان کے علاوہ کئی اور شعرا کا پتہ چلتا ہے جو اس دور میں اردو کی خدمت کرتے تھے۔ بہر حال اردو کی خدمت شاعری کے لحاظ سے کئی اصحاب نے کی ہے۔

شاعری کی طرح نثر نگاری کی جانب بھی اہل نوایط نے توجہ کی تھی اس دور کی نثر کا نمونہ پیش ہے۔

(۱) مولانا باقر آگاہ کی نثر کا نمونہ یہ ہے:-

اگرچہ باقر آگاہ نے اردو نثر میں اپنی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی ہے مگر اکثر نظم کی کتابوں میں طویل دیباچہ نثر میں قلمبند کرتے رہے ہیں جس میں اردو کی تاریخ اور تنقید بھی آگئی ہے۔ چنانچہ یہاں اس قسم کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو نصرتی کے متعلق گویا تنقید ہے۔

"تعصب کو یک طرف رکھ کر کلیات سودا کو بنظر ملاحظہ کر کر انتخاب کرنے اور ان سبھوں کو یک

داستان گلشن عشق یا علی نامہ سے مقابلہ دیوے تا اندازے اس کی ادراس کی واقفی واقف ہوئے۔ سودا کو چھوڑئے جس شاہ فارسی کرے چاہے خواہ قصاید میں ہوں خواہ مثنوی میں اُسے مقابل کیا جائے۔ بالفعل بھی مہر و ماہ یکتا نے فن طرازی یا قل نشان رازی کتیں نقشہ مہر و ماہ کا ہے گلشن عشق سے مواجہ کر دیکھئے تا معنی مثل دکھنی کے ہاتھ کنگن کو آرسی کیا کا خوب بجے۔"

کہہ نصرتی سُن کے یہ ولولہ — ملا بعد مدت کے مجکو صِلہ
کہا سودا کتیں انصاف سے — کہ منصف کر دیجو کو اُگاہے

---

(۲)

مولوی محمد غوث شرف الملک عربی فارسی کے عالم متبحر تھے۔ چند سال تک ریاست ارکاٹ کی وزارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیئے مگر اپنے علمی مشاغل میں اس ملازمت کو مانع قرار دے کر مستعفی ہوئے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد (۲۱) ہے جو عربی اور فارسی میں ہیں۔ آپ کی ایک کتاب جو فقہ کا ترجمہ ہے اُردو میں ہے۔ آپ سنہ ۱۱۶۶ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۳۸ھ میں انتقال ہوا۔ نمونۂ نثر یہ ہے:-

"جان تو بے شک بندہ جانچا گیا ہے درمیان اس کے کہ فرمانبرداری کرے وہ اللہ برتر کی پس ثواب پاوے اور درمیان اس کے کہ نافرمانی کرے اس کی پھر عذاب کیا جاوے اور جانچ اللہ کی موقوف ہے ساتھ عمل شرع کے اور ساتھ عمل غیر شرع کے۔"

تبصرہ اگرچہ اس پہلے دور کے شعراء اور نثر نگاران کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر شعراء نے اصناف سخن کے تمام شعبوں میں اپنے فکر کی جولانیاں کمائی ہیں۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ غزل۔ رباعی۔ قطعہ اور مرثیہ میں اپنے خیالات کے تخیل کے جوہر پیش کیے ہیں۔ ان کی شاعری اسلوب کی جدت طرز ادا کی ندرت اور تخیل کی بلند پروازی کے لحاظ سے قابل داد ہی ہے۔ انہوں نے اس وقت کی عام اور سلیس زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔

دکن کے دُوسرے شعراء داستانوں میں اپنے افکار کو زیادہ سے زیادہ پیش کرتے رہے مگر ایسی شعراء نے عشقیہ داستانوں کے بجائے۔ سیرت۔ مناقب۔ سوانح، فقہ اور عقاید کے مضمون کو اپنے خیالات کی جولان گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے باوجود تقرب شاہی مدحیہ قصاید پیش کرنے سے اجتناب کیا۔ نعتیہ قصاید پیش کرتے رہے۔

دُوسرا دور

سنہ ۱۸۰۰ء تا سنہ ۱۸۵۷ء

اس دور کے کئی شعراء کا تذکرہ تذکرۂ گلزارِ اعظم میں موجود ہے جن میں سے بعض فارسی کے ساتھ اُردو میں بھی

جمع آزمائی کرتے تھے۔ مگر افسوس ہے ان شعرا کا اُردو کلام سردست ہمدست نہیں ہوا۔ اس دور کے فارسی گو شعرا جن کا تذکرہ گلزار میں ہوا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آگاہ علی رضا خاں (۲) احمد، قاضی احمد (۳) انست، حکیم اشرف الدین (۴) رفیع، حسن علی (۵) احسن، سید محمد اسحٰق (۶) برہان، سید برہان الدین (۷) بیہوش، محمد قادر علی متوفی سنہ ۱۲۲۰ھ (۸) جودت، غلام حسین (۹) حیدری، غلام حسن متوفی سنہ ۱۲۱۳ھ (۱۰) ذہن، علی دوست (۱۱) رسا، محمد رحمت اللہ (۱۲) شایان، محمد اسلم متوفی سنہ ۱۲۲۴ھ (۱۳) صاحب، غلام علی (۱۴) عزت، عبدالقادر (۱۵) عتیق، محمد صبغۃ اللہ (۱۶) فرحت، محمد صبغۃ اللہ (۱۷) لائق، غلام دستگیر (۱۸) مختار، باقر حیدر (۱۹) نگین، اشرف الدین (۲۰) گوہر، محمد باقر خاں (۲۱) نصرتی، افضل خاں (۲۲) وازع، حکیم شاہ زین العابدین (۲۳) افسر

ان میں سے بعض کے اُردو میں شعر کہنے کی صراحت کی گئی ہے مگر افسوس ہے کہ ان کا اُردو کلام تذکرۂ مذکور میں نہیں ہے اور دوسرے ذرائع سے سردست کوئی کلام نہیں ملا ہے۔

جن شعرا کا کلام ہمدست ہوتا ہے ان کی صراحت کی جاتی ہے:۔

(۱) ملک محمود نام جوہر تخلص تھا۔ کرنول کے جاگیردار تھے۔ والیٔ کرنول کے مصاحبوں میں شامل تھے۔ آپ کے فرزند غلام حیدر گوہر اور پوتے غلام حیدر شہوار تخلص بھی شاعر تھے۔ جوہر کا قلمی دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ کلام کا نمونہ پیش ہے۔

چاہ میں اوس مہ کنعان کی جو میں ڈوب رہا
میری آنکھوں کی مدد گریۂ یعقوب رہا

قیامت کا مجھے کیا ڈر ہے اپنے دل کو اے جوہر
بھروسہ ہے پیمبر کا بھروسہ ہے پیمبر کا

بوسہ دے لبوں کا تو کہا چشم کالی ہے
شکر سے بھی شیریں ہے بادام محبت

آج آنے سے تیرے میرا ہوا گھر آباد
تا قیامت رہے تو اور تیرا گھر آباد

تم آذ بیٹھو میرے لال لال آنکھوں میں
رکھوں گا پتلی سا تم کو سنبھال آنکھوں میں

اس چشم پُرخمار میں جوہر نہیں ہے دل
یک سوختہ کباب ہے جام شراب میں

یوں دُرِ اشکِ غمِ شاہ نجف سے نکلے
ایسے موتی نہ کبھو صاف صدف سے نکلے

یاد تیری مجھے اے ساقی کل رات لگی
ہچکی شیشہ کو بھی فی الفور میسر سلامت لگی
جہاں اوس اخترِ روشن کی جلوہ گاہ رہی
بشکلِ قبلہ نما اپنے بھی نگاہ رہی

عجب اپنی بنی ہے شکل اوس کے عشق میں جوہر
نہ طاقت وصل کی ہے مجکو نہ تاب جدائی ہے

۲۔ ناظر غلام عبدالقادر نام اور ناظر تخلص. قادر اعظم خان خطاب' دربارارکاٹ سے ملا تھا. سنہ ۱۲۰۰ھ میں ولادت ہوئی اور سنہ ۱۲۴۴ھ میں انتقال ہوا. ناظر تخلص تھا. ریاست ارکاٹ کے مہر ساماں اور مہتمم کُتب خانہ تھے. فارسی اور اُردو میں طبع آزمائی کرتے تھے.

بہار اعظم. شرح سکندر نامہ. گلستان نسب اُن کی تصانیف ہیں.

۳۔ ذکا حبیب اللہ نام. ذکا تخلص. سنہ ۱۲۴۴ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی. اگرچہ آپ کا انتقال سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا ہے مگر آپ کی شاعری کا آغاز اور اُس کے پُختہ ہونے کا زمانہ سنہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا ہے اس لیے آپ کا تذکرہ قدر کیا گیا ہے.

ذکا نے غالب سے بھی اصلاحِ سخن لی اور غالب کو اپنے شاگردِ رشید پر فخر تھا. ذکا اصنافِ سخن کی ہر شاخ میں طبع آزمائی کرتے تھے قصیدہ، غزل، مثنوی میں ذکا کا مزاحیہ کلام بھی ملتا ہے.

ذکا کے متعلق غالب کی صراحت یہ ہے:-

۱- یہ کلام کسی بادشاہ کا نہیں کسی امیر کا نہیں کسی شیخ و شاب کا نہیں - یہ کلام میرے ایک دوست روحانی کا ہے اور فقیر دوست کے کلام کو معرض اصلاح میں بنظر دشمنی دیکھتا ہے

پس جب . . . . . . بنیں ادا نہیں　　　تو جو مجھ کو نظر آتا ہے بے حیف

میں کہوں کا نثر میں نعمت خان عالی کے طرز کا احیا کیا ہے مگر پیرایہ کچھ اور دیا ہے - قصاید میں انوری کا پیرایہ اٹھایا ہے مگر طبیعت نے اعجازہ دکھایا ہے - غزل میں متاخرین کا انداز عاشقانہ سوز و گداز منشی محمد حبیب اللہ صاحب ذکا سخنور سمہ دان و یکتا نکتہ طراز - آفرین آفرین صد آفرین صد ہزار آفرین -"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ ذکا کا شاعری میں کیا درجہ تھا - نمونہ ملاحظہ ہو -

اے خداوندگار بندہ نواز　　　فی المثل تو طبیب میں بیمار
ہے جگہ رحم کی تیرے آگے　　　کہ میں چلاؤں روؤں زار نزار
شعر و انشا کی قدر ایک طرف　　　ہوں میں چودہ برس کا کارگزار
اتنی مدت ہوئی مگر نہ ہوا　　　کسی صورت سے ملزم سرکار
چاہتا ہی رہا کوئی خدمت　　　جس میں دو ماہ ہوئے بیش قرار
ہے میری ذات میں وہ استعداد　　　کہ نہیں شیوا میرا استعداد
ہے کوئی کام جو نہ دوں انجام　　　کون سا گھاٹ جو نہ اتروں پار
بس ذکا دیکھی تیری لسانی　　　با ادب ہے یہ آصفی دربار

غافل کبھی مجھ سے وہ ستمگر نہ ہوا تھا　　　یعنی کہ میں اندیشۂ محشر نہ ہوا تھا
اچھا کیا پہلی سے جو رخصت کی شادی　　　مرنے کا مرے وقت مقرر نہ ہوا تھا

نازک تم ایسے ہو تو مجھے کیا امید قتل
ایک ہاتھ کی تو ہاتھ میں تلوار چاہیے

تمام ہو گیا کام اپنے روتے رونے میں
بہانا اشک کا پس موت کا بہانا ہوا

جب سے سنا کہ تجھے دیکھتے نہیں
بندوں کو اپنے عجز پہ کتنا غرور ہے

گیسو رُخ کا بوسہ دو
چاند گہن ہے صدقہ دو
بیسٹر لگی ہے اوپر اس کے
آگے سے سر کو رستہ دو

میرا جنازہ اُٹھتا ہے
تم بھی آکر کندھا دو

قابو نہیں جو چاہا ... پر اس کے پاؤں میں
گنگا کو سات گھاٹ کا پانی پلاؤں میں
ہاتھ گرمی سے میرے نفس کے جل جائیگا
موسیٰ بن جاؤ گے یا حضرت عیسیٰ دیکھو

قائل ہوں میں غالب کے ذکا طرز سخن کا
ایسا کوئی دلی میں سخنور نہ ہوا تھا

طاعت کی کس کو سوجھتی ہے حبِ نفس میں
کعبہ کو کون جائے جو گھر میں حرم رہے

زلفیں عینک پہنے کی رہے خط سبزے
کیوں حال کچھ مدک کے بھی چہرے اُتا ... ہیں

اس دور کے نثر کے نمونہ کے لیے ہم ریف قاضی بدر الدولہ کو پیش کرتے ہیں جن کی تصانیف کی آج بھی مانگ ہے۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ[1] مولوی محمد صبغۃ اللہ۔ مولوی محمد غوث شرف الملک کے چھوٹے فرزند تھے۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا۔ مدراس کی جامع مسجد میں مدفون ہیں۔

مولوی محمد صبغۃ اللہ نے اپنے زمانہ کے جید علماء سے تعلیم حاصل کی اور اپنے ذوق و شوق سے بہت جلد فارغ التحصیل ہوگئے۔ حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ، فلسفہ کے علاوہ ریاضی، ہیئت اور طب میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے۔

اعظم جاہ اور غلام غوث خان کے زمانہ میں خدمات صدارت قضات اور مفتی سے سرفراز تھے اوّلاً عمدۃ العلماء بدر الدولہ قاضی الملک معتمد جنگ کا خطاب ملا۔ پھر امام العلماء منصف الدولہ۔ معدلت خان قاضی الاسلام مستعد جنگ کے خطاب سے موسوم ہوئے مگر آپ زیادہ تر قاضی بدر الدولہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

قاضی بدر الدولہ ایک بلند پایہ مصنف تھے۔ عربی، فارسی کے علاوہ آپ اُردو زبان کے بھی مصنف ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں سے قطع نظر اُردو کتابیں (۱۳) ہیں جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

شمار	نام کتاب	فن	کیفیت
(۱)	ریاض النسوان	فقہ	خاص کر عورتوں کے لیے لکھی گئی ہے۔
(۲)	رسالہ در احکام عدت	"	بیوہ عورتوں کے لیے مرتب فرمایا تھا۔
(۳)	فواید بدریہ	سیر	آنحضرت صلعم کی مکمل سیرت ہے۔
(۴)	بہشت گلزار	"	ابوبکر صدیق کے حالات ہیں۔
(۵)	نثر الجواہر	"	شیخ عبدالقادر جیلانی کے حالات
(۶)	خزانہ معدلت	اخلاق	
(۷)	توشہ فلاح	مناسک	حج کے مناسک
(۸)	قوت الارواح	"	توشہ فلاح کی شرح ہے۔ کتاب کی ضخامت بڑے سائز کے ۸۰۰ صفحے ہیں۔ عربی میں بھی کوئی کتاب اس فن میں اتنی ضخیم نہیں ہے۔
(۹)	گلزار ہدایت	عقاید	
(۱۰)	ترجمہ حصن حصین	حدیث	
(۱۱)	حواشی بر مسلم	"	

---

[1] تاریخ احمدی و تاریخ النوایط

(۱۲) فیض الکریم — تفسیر — یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہوگیا۔

باقر آگاہ نے جس کام کو شروع کیا تھا اس کو قاضی بدرالدولہ نے پوری طرح ترقی دی اور نظم کی بجائے نثر میں اپنے خیالات کا اظہار فرمایا چونکہ آپ کی زبان بلحاظ ارتقا قدیم کی زیادہ صاف تھی اس لیے اب آگاہ کی جگہ آپ کی کتابوں نے لے لی۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی میں آپ کی تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

فوائد بدر۔ سیرۃ النبی کی بہترین کتاب ہے۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں اس کی تالیف ہوئی ہے۔ اس کے دو باب ہیں۔ پہلے باب میں پیدائش سے وفات تک کے حالات درج ہیں اور دوسرے باب میں صورت اور سیرت، اخلاق و عادات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں جو واقعات بعثت و ہجرت کے سنین کے لحاظ سے بیان کیے گئے ہیں اور دوسرے باب میں شمائل کا ایسا بے مثل خلاصہ مرتب کیا ہے جس سے زیادہ واضح اور بہتر اور ناممکن ہے۔ عربی الفاظ کے لیے نہایت موزوں و مناسب الفاظ لکھنا اور پھر ایسا کہ پڑھنے والے کو اردو زبان کا لطف آئے اور نامانوس الفاظ نہ معلوم ہوں در حقیقت کامیاب کوشش ہے۔ اس امر کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ فی زمانہ بھی ایسی مستند اور مکمل کتاب معدودے چند ہی ہوں گے۔

اس کتاب کا ایک جدید ایڈیشن حال ہی میں حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ قاضی بدرالدولہ کی دیگر اردو کتابیں بھی اسی طرح قابل قدر ہیں۔ شرح ترشہ فوح مناسک میں ایک ایسی گراں قدر کتاب ہے کہ فارسی تو کجا عربی میں بھی ایسی کوئی کتاب نہیں ہے۔ بہشت گلزار میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مفصل سیرت لکھی گئی ہے جو اپنی حیثیت سے اردو زبان کی تنہا کتاب ہے۔

قاضی بدرالدولہ نے زبان اردو کی جو خدمت انجام دی ہے وہ فراموش نہیں ہو سکتی۔ اب تک ان کی تصانیف کا مروج رہنا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ایک صدی کے بعد بھی وہ اسی طرح قابل قدر ہیں۔ قاضی صاحب کی عبارت کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"آنکھیں حضرتؐ کے بڑے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی اور حلقہ بہت سیاہ تھا۔ جب حضرت دیکھتے تو پورا دیکھتے اور آنکھیں نیچے کرتے۔ پیشانی مبارک کشادہ تھی اور بھویں دونوں ملے ہوئے اور کمان دار تھے اور اس کے سرے پورے تھے۔ بینی مبارک ہموار باریک اور بیچ میں بلند تھی اور دہن شریف بلند تھا۔ دندان مبارک نہایت سفید روشن براق آبداری اور رونق کے ساتھ تھے۔"

آنحضرت صلعم کی بزم کا حال اس طرح قلمبند فرماتے ہیں:۔

"بعد عروج صحابہ کو کوری آنکھ دیکھنے لگا کہ حضرت کے روبرو نہایت ادب سے بیٹھتے ہیں اور کچھ کام فرمائے تو اس کو کرنے دوڑتے اور وضو کیے تو اس پانی کو لینے ایک پر ایک گرتے ہیں اور بات پکار نہیں کرتے اور تعظیم سے حضرت کی طرف نظر جماتے ہیں۔"

ایک جنگ کے واقعات کو یوں تحریر فرمایا ہے:۔

"مسلمانان بھی اپنی فوج آراستہ کر کر ان کے مقابلہ میں گئے اس قدر جنگ ہوا آخر زید بن حارثہ نیزوں کے ماروں سے زخمی ہوئے اور نشان کے تئیں جعفر بن ابی طالب نے لے کے جنگ پر مستعد ہوئے دونوں لشکر جب باہم خلط ہوئے جعفر گھوڑے پر سے اُتر کر اس کے ٹانپے مار کے جنگ شروع کیے۔ سیدھا ہاتھ اُڑ گیا بائیں ہاتھ میں نشان لیے۔ وہ بھی کٹ گیا تو چھاتی سے لگائی آخر شہید ہوئے۔"

مصنف مرحوم کی سب سے پہلی تصنیف ریاض العنوان ہے جس کو آپ نے سنہ ۱۲۲۴ھ میں تصنیف فرمایا جب کہ آپ کی عمر (۱۹) سال کی تھی۔ یہ فقہ شافعی کی بہترین کتاب ہے جس میں عقاید و احکام طہارت و عبادت بشرح بسیط جمع کیے ہیں۔ اس کتاب نے جس قدر عام نفع پہنچایا ہے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تمام ضروری مسائل عام فہم زبان میں بیان کر دیے گئے ہیں کہ سامنے پھر دُوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"کتابان فقہ شافعی کے عربی زبان میں بہت تصنیف ہوئے ہیں لیکن عورتاں اور اکثر عوام الناس کے تئیں زبان عربی سے کچھ آشنائی نہ ہونے کے سبب سے ان کے حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں اس واسطے یہ عاجز چند مسایل فقہ کے زبان ہندی میں جمع کیا تا لوگاں مستفید ہوں۔"

اس کے بعد آپ نے مختلف باب میں اپنی کتاب کو تقسیم کیا ہے اور اس کو کتاب کا نام دیا ہے مثلاً کتاب الایمان، کتاب الطہارت، کتاب الصلوٰۃ وغیرہ اور پھر ان میں فصل مقرر کیے ہیں جن میں مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔ مسائل کے بیان کا طریقہ یوں ہے:-

"اول رُکن اسلام کا بعد از کلمہ توحید کے نماز ہے اور نماز بے طہارت کے درست نہیں اور پانی مستعمل یعنی ٹھنڈا پانی جو ایک بار کسی فرض کام میں آیا ہے اگرچہ پاک ہے لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔ فرض کام کیا مثلاً اس پانی سے غسل فرض یا وضو فرض کیا ہووے یا کوئی نجاست دُور کیا ہووے۔"

آپ کی آخری تصنیف تفسیر فیض الکریم ہے جس کو آپ نے صرف سات پاروں تک ختم فرمایا تھا کہ سنہ ۱۲۸۰ھ[1] میں پیام اجل آپہنچا۔

نفس مضمون کے پہلے آپ نے نزول قرآن اور اُس کے جمع کرنے اور تفسیر و تاویل پر بحث کی ہے اور پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر اور اُس کی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ کی تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کی آیت لکھتے ہیں اور اس کے معنے بیان کرنے کے بعد اس پر بحث کرتے جاتے ہیں۔ سحر کا حکم، کسب مباح۔ ریا، شفاعت، خدا رسول اور اولی الامر کی اطاعت خلق آدم علی سورۃ جہاد کرنے والے کا مرتبہ، اجماع امت تحریف انجیل، ذبح وغیرہ عنوانات پر کافی بحث کی ہے چونکہ مصنف کی یہ آخری تصنیف ہے اس لیے نمونہ اس کا بھی درج کرنا بے جا نہ ہوگا۔

---

[1] تاریخ النوائط

• واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ۔ اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسی سب مل کر۔ اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا دین ہے یعنی دین اسلام کو اختیار کرو اس کو رسی سے تعبیر کیا کیونکہ باریک تنگ راہ میں گرنے کا اور پیر پھسلنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو رسی جس کے دونوں طرف راہ کے دو جانب سے باندھے ہوں پکڑے تو اس کو خوف نہیں رہتا۔ حق کی راہ بھی بہت باریک تنگ ہے اکثر لوگوں کے پیر اس پر لغزش پاتے ہیں جس نے دین اسلام مضبوط پکڑا تو بُرے خوف سے نجات پایا۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ جو اس کے احکام پر چلے گا تو اس کو نجات ہوگی۔ الخ۔

نزول الٰہی کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

• اللہ تعالیٰ اُترتا ہے کر کے جو آیا ہے اس سے اللہ کی رحمت اور بندوں پر متوجہ ہونا اور اُن پر لطف اور مہربانی کرنا مُراد ہے۔

اس مختصر بیان سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ قاضی بدرالدولہ کی وجہ سے زبانِ اُردو نے مذہبی علوم کے دائرہ میں کہاں تک ترقی کی تھی۔

تبصرہ

دُوسرے دور کا تذکرہ ختم ہو چکا اس دور میں سر دست جن شعرا اور نثر نگاروں کا تعارف کیا گیا ہے ان کے کارنامے تاریخ اُردو ادب میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ ہندی والے بھی ان کو اپنی تاریخ میں نمایاں طور سے جگہ دیتے ہیں۔ ان کی خدمات ہر آئندہ قابلِ تحسین ہیں۔ اگرچہ سنہ ۱۸۵۰ء کے قبل صرف شاعری اور نثر نگاری کے سوا دُوسرے اُردو خدمات نہیں ہوئے یعنی کسی علمی اخبار، رسالہ یا انجمن کا تذکرہ نہیں ہوا ہے۔

تیسرے دور میں شاعری اور نثر نگاری کے علاوہ دُوسرے اُردو خدمات کا حال بھی قلم بند کیا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

۱؎ قاضی بدرالدولہ کی تمام کتابیں شایع ہو گئی ہیں اور ریاض الصفوان کے تو کئی کئی اڈیشن شایع ہوئے ہیں۔ ابھی حال میں یہ دونوں کتابیں حیدرآباد سے شائع کی گئی ہیں۔

حضرت آغا شاعر

محمد حبیب اللہ رشدی

حیدرآباد دکن میں ۱۹۳۲ء کا غالباً اکتوبر کا مہینہ تھا۔ ایک روز میں، میرے محترم بزرگ مولانا سید مختار احمد مرحوم، اپنے چھوٹے بھائی جناب سید مرغوب احمد مرحوم کے ہاں گئے۔ اُنھوں نے بڑی مسرت اور مباہات کے ساتھ ہمیں یہ خبر سنائی کہ ——— "میرے استاد حضرت آغا شاعر قزلباش تشریف لائے ہوئے ہیں اور شہید یار جنگ کے ہاں مقیم ہیں ———" میں نے بڑے اشتیاق سے اُن سے درخواست کی کہ ہمیں بھی وہاں لے چلیں۔ اُنھوں نے کہا ——— "وہاں جانے کی ضرورت نہیں، حضرت قبلہ روز صبح ٹہلتے ہوئے یہاں تک آجاتے ہیں۔ آپ کل علی الصبح یہاں آجائیں تو ملاقات ہوجائے گی اور اطمینان سے بات چیت بھی کرسکیں گے۔" ہم نے کہا ——— "بہت اچھا کل صبح ہم ضرور یہیں آجائیں گے۔"

میرے ان دونوں بزرگوں کے والد، عربی کے جید عالم، مولانا سید عبداللہ ٹونکی تھے جنھوں نے انیسویں صدی کے اواسط میں مصر کے جامعہ ازہر میں عربی کی تکمیل کی تھی، اس کے بعد کئی مرتبہ مصر آتے جاتے رہے تھے۔ عربی زبان پر اُنھیں اتنی قدرت حاصل ہوگئی تھی کہ بے تکلف شعر کہتے تھے۔ ان کے ایک بے نقط مدحیہ قصیدہ کو دیکھ کر توفیق پاشا خدیو مصر نے تعجب کا اظہار کیا تھا اور لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے نام ایک سفارشی خط دیا تھا۔ جناب سید مرغوب احمد مرحوم نے اپنے والد کے ورثۂ علم و ادب میں سے اپنا حصہ رسدی بڑے بھائی سے طلب کرنا شاید خلاف ادب سمجھا اس لیے اس سے دست بردار ہو کر اپنے لیے ایک ایسا میدان عمل تلاش کرلیا تھا جو نہ صرف خاندانی روایات کے لحاظ سے نیا تھا بلکہ خود شہر حیدرآباد کے لیے بھی نیا نیا تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانہ میں ——— یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں ——— موٹر کار کی سی نئی نئی ایجاد کی مشینری سے واقفیت حاصل کی تھی اور بیکار موٹروں کو ٹھیک ٹھاک کرنے میں کمال پیدا کیا تھا۔ ان کا کارخانہ جس میں موٹروں کی اور دوسری عام مشینری کی مرمت کی جاتی تھی، حیدرآباد کی ایک بارونق سڑک پر تھا۔ کارخانے سے ملا ہوا اپنے رہنے کا مکان بھی بنوا لیا تھا۔ اُن کی آمدنی ہزاروں روپیہ ماہوار کی تھی۔ وہ ہمارے سامنے کئی مرتبہ اپنے اُستاد حضرت آغا شاعر کا ذکر کرچکے تھے۔ شاگردی کا یہ تعلق تیس سال پہلے کا تھا جبکہ حضرت آغا شاعر اپنے استاد حضرت داغ دہلوی کی زندگی میں حیدرآباد میں قیام فرما تھے۔ میں خیال کرتا تھا کہ جناب مرغوب احمد صاحب کو نوجوانی میں شاعری کا چسکا پڑا ہوگا اور اتفاقات نے حضرت آغا شاعر کے سے خوش گو شاعر کا شاگرد بننے کا موقع فراہم کردیا ہوگا۔

حضرت آغا شاعر نے ریاست جھالرا پاٹن (راجپوتانہ) سے ایک ماہوار رسالہ "آفتاب" جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ میں نے حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں یا کسی کالج میں یا کسی اہل علم کے ہاں نہیں دیکھا۔ صرف جناب مرغوب احمد کے ہاں ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا جبکہ میں فرسٹ ایر میں زیرتعلیم تھا۔ اُس وقت حضرت آغا شاعر کو حیدرآباد سے گئے ہوئے اٹھارہ انیس برس ہوچکے تھے۔ لوگ انھیں

جلا چکے تھے۔ جس انہماک اور اشتیاق سے رسالہ "آفتاب" کا مطالعہ کیا کرتا تھا اس کو دیکھ کر جناب مرغوب احمد صاحب نے اس کے بہت سے پرانے شمارے مجھے دے دیئے تھے جن کو میں نے تقسیم ہند کے وقت تک بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن حیدرآباد سے میری منتقلی کے دوران میں بہت سی کام کی کتابوں کے ساتھ ساتھ "آفتاب" کے سارے پرچے خبر نہیں کہاں ہجرت کر گئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وطن کی محبت نے انھیں میرے ساتھ ہجرت کرنے نہیں دی۔ اس وقت میری کتابوں میں صرف ایک نومبر ۱۹۲۱ء کا پرچہ رہ گیا ہے۔

جناب مرغوب احمد مرحوم کی زبانی حضرت آغا شاعر کی آمد کا میں نے جو ذکر کیا ہے اس زمانے میں حضرت جوش ملیح آبادی ہمارے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک باغ والے بنگلے میں اٹھ آئے تھے۔ ان دنوں ہمارا یہ معمول تھا کہ میں صبح سویرے تیار ہو بیٹھتا تھا کہ حضرت جوش ملیح آبادی تشریف لاتے ہم دونوں تفریح کے لیے "باغ عامہ" جاتے جو قریب ہی تھا۔ گھنٹہ آدھا گھنٹہ گھوم پھر کر سورج نکلنے کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے۔

جس روز حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا ارادہ تھا، اس روز بہت ہی سویرے سے میں اور حضرت مولانا مختار احمد صاحب تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والے تھے کہ جناب جوش کا ڈنڈا دروازے پر برسا۔ میں فوراً باہر نکلا۔ تشویش یہ تھی کہ حضرت جوش غزل کے مخالف ہیں، اس لیے حضرت آغا شاعر کے سے قدیم غزل گو سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ میں نے جناب جوش سے کہا ——— "حضرت آغا شاعر آئے ہوئے ہیں، وہ صبح سویرے مرغوب احمد صاحب کے کارخانہ تک آتے ہیں۔ اس وقت میں مولانا سید مختار احمد صاحب کے ساتھ وہیں جا رہا ہوں، کیا آپ بھی تشریف لے چلیں گے؟" ——— یہ میں نے کچھ ایسے منفعل لہجے میں کہا جس کا جواب میرے نزدیک یقینی انکار تھا۔ لیکن میری توقع کے خلاف جناب جوش نے بھی حضرت آغا شاعر سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حضرت جوش سے پہلے جناب مرغوب احمد کوئی نئے آدمی نہیں تھے۔ حضرت جوش کی موٹر کار کو اکثر بیمار پڑ جانے کی عادت تھی اس کی وجہ سے یہ دونوں مدت سے ایک دوسرے سے متعارف تھے۔

غرض، ہم تینوں جناب مرغوب احمد کے ہاں پہنچے۔ وہ اپنے کارخانے کے پھاٹک کے سامنے کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا ——— "حضرت قبلہ بس اب آتے ہی ہوں گے" ——— پھر یہ کہا ——— "یہاں انتظار کرنے کے بجائے کیوں نہ ہم خود اُدھر چلے چلیں؟" ——— ہم لوگ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ دور سے حضرت آغا شاعر آتے دکھائی دیے۔ جناب مرغوب احمد صاحب نے کہا ——— "دیکھیے وہ تشریف لا رہے ہیں۔" ——— انھوں نے آغا صاحب سے ہمارا تعارف کرایا۔ اب ہم سب آغا صاحب کے ساتھ کارخانے کی طرف پلٹے۔ وہاں پہنچنے سے پہلے جناب مرغوب احمد صاحب نے آغا صاحب سے کہا ——— "حضرت آپ کو حیدرآبادی نہاری کھائے بہت زمانہ ہو گیا ہوگا، یہاں قریب ہی ایک نیا ہوٹل کھلا ہے جس میں نہاری کا بھی انتظام ہے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو نہاری کھائی جائے" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "ہاں، ہاں، چلے چلو" ———

یہ صحبت دیر تک رہی۔ گفتگو میں جناب مرغوب احمد اور جناب جوش ہی زیادہ حصہ لیتے رہے۔ . . . .

. . . . کبھی کبھی حضرت مولانا مختار احمد بھی ایک آدھ فقرہ فرما دیتے تھے۔ میں خاموش تماشائی بن کر

اس افسانوی ہستی کی باتیں سُنتا رہا جس کا برسوں سے ذکر سُن چکا تھا۔ میرے لڑکپن میں حیدر آباد دکن میں ایک غزل بہت گائی جاتی تھی جس کا مطلع ہے:

یہ کیسے بال بکھرے ہیں یہ صورت کیوں بنی غم کی
تمھارے دشمنوں کو کیا پڑی ہے میرے ماتم کی

ادبی شعور پیدا ہونے کے برسوں بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ غزل حضرت آغا شاعر کی تھی۔ میرے لڑکپن میں حیدر آباد میں حضرت داغ کا بڑا چرچا تھا۔ انھیں انتقال کیے چند ہی سال ہوئے تھے۔ شہر میں اُن کے کئی شاگرد موجود تھے جو اُستاد مانے جاتے تھے۔ ایک شاگرد حضرت نادان تھے جو حضرت داغ سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ ایک صاحب ضیاء الدین ضیا گورگانی تھے جن کی بیوی حضرت داغ کی اہلیہ کی قریبی عزیزہ تھیں۔ اس لحاظ سے وہ گویا حضرت داغ کے داماد تھے۔ غالباً حضرت داغ ہی کے تعلق سے حیدر آباد آئے تھے اور سرکاری ملازم ہو گئے تھے۔ یہ مُغلیہ شہزادے تھے۔ "صاحب عالم" پکارے جاتے تھے۔ غزل کے معاملے میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُنھوں نے طویل عمر پائی۔ تقسیم ہند سے سال دو سال پہلے مجھے ایک مرتبہ اُن سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور چند غزلیں اُن کی زبان سے سُنی تھیں۔ اُس وقت اُن کی عمر اسّی پچاسی سال کی تھی) ایک طوائف بھی بقیدِ حیات تھیں جو حضرت داغ کی ملازمت میں رہ چکی تھیں۔ اکثر شاگردانِ داغ اس معمّر خاتون کی بڑی عزت و تعظیم کیا کرتے تھے۔ بعض شاگرد مشاعرے میں جانے سے پہلے اُن کو اپنی غزل سُنانا باعثِ برکت سمجھتے تھے اس لیے اُنھیں غزل سُنائے بغیر مشاعرے میں نہیں جاتے تھے۔ ایک حضرت بارق تھے جن کا اسی زمانے میں انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے ایک عزیز میرے ہم محلہ اور لڑکپن کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ مجھ سے عمر میں بڑے تھے۔ ہم لوگوں کو اپنی غزل سُنا کر بڑا رُعب جماتے تھے۔ بعض واقف کار کہتے تھے کہ ـــــ "اس کے ہاں حضرت بارق کا کلام ہے۔ اُنھیں کی غزلیں ہیں جو یہ اپنے نام سے سُناتا ہے۔ اس کو تو ایک مصرع بھی موزوں کرنا نہیں آتا"

غرض، ۱۹۳۲ء میں حضرت آغا شاعر کے سامنے بیٹھ کر اُن کی باتیں سُنتے ہوئے لڑکپن کی ساری باتیں حافظے میں اُبھر آئیں۔ داغ پرستی کا زمانہ گزر چکا تھا۔ یونیورسٹی سے ہر سال بیسیوں گریجویٹ نکل رہے تھے۔ مولانا سید وحید الدین سلیم پانی پتی اُردو کے پروفیسر تھے۔ غزل دشمنی اُن کی علمیت کا جزوِ ایمان تھی۔ اُن کی تلقین اور تبلیغ سے بہت سے شاگرد غزل اور غزل گوئی کے خلاف ہو کر کالج سے نکلتے تھے جن کے نزدیک داغ اور امیر شاعر ہی نہیں تھے۔ ہاں خوب یاد آیا ـــــ ایک مرتبہ حضرت سلیم کے مکان پر ہم چند طالب علم بیٹھے ہوئے۔ مولانا حسبِ عادت، غزل کے خلاف تشبیہ اور تکنیک کے تیر چلا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ داغ بھی زیرِ بحث آ گئے۔ میرا ادبی شعور داغ پرستی کی فضا میں بیدار ہوا تھا، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اُس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا کہ کچھ ہی ہو داغ کو شاعر نہ ماننا بڑا ظلم ہے۔ اس پر حضرت سلیم بپھر گئے۔ کہنے لگے ـــــ "اچھا داغ کا کوئی ایسا شعر سُناؤ جسے تم واقعی شعر سمجھتے ہو" ـــــ حضرت سلیم نے اس تیقن کے ساتھ یہ فقرہ فرمایا تھا کہ میں جو بھی شعر سُناؤں گا اُس میں وہ تکنیک کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال ہی لیں گے۔ کچھ غور کے بعد مجھے داغ مرحوم کا یہ شعر یاد آیا:

ہم مرمٹے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب   اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

خدا بخشے [illegible] علیم کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حق ناشناس نہیں تھے۔ مجھ سے یہ شعر سُن کر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ تحریک یا تشبیہ کا کوئی پہلو نکل آیا۔ دھیمے لہجے میں یہ فرمایا —— بھئی، کہتے کہتے غزل کہنے ایک آدھ اچھا شعر بھی موزوں ہو جاتا ہے —— یہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا! —— غرض حضرت آغا شاعر کی سحر کن گفتگو کی وجہ سے وہ صحبت دیر تک بھی رہی۔ رخصت ہوتے وقت حضرت آغا سے آئندہ ملاقات کے وقت و قیام کا تعین کر کے ہم لوگ گھر واپس ہوئے۔

اس کے بعد حضرت آغا شاعر سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ رفتہ رفتہ مجھ پر بڑی نظر عنایت فرمانے لگے تھے۔ ان ملاقاتوں میں مجھے جن باتوں کا علم ہوا ان میں ایک یہ تھی کہ انھوں نے تھیٹروں کے لیے کئی ڈرامے بھی لکھے تھے جو تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکوں کو فروخت کر دیے گئے اور کھیلے بھی گئے۔ حضرت آغا شاعر سے جب حشر کاشمیری کا ربط ضبط بڑھا تو ایک مرتبہ آغا حشر نے کہا —— تمہارے نام کے ساتھ یہ آغا کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں بھی اپنے تخلص کے ساتھ یہ لفظ استعمال کروں۔ —— آغا شاعر نے فرمایا —— اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ شوق سے یہ لفظ استعمال کیجیے —— آغا صاحب نے بڑی صاف دلی کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ —— ڈرامے کے معاوضے میں آغا حشر کے ڈراموں کی قدر میرے ڈراموں سے زیادہ تھی۔ انھیں اپنے ڈرامے کے دو ہزار روپیہ ملتے تھے اور مجھے صرف ایک ہزار۔

آغا صاحب کو اپنے منظوم ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کی بڑی فکر تھی۔ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن آنے کا ایک بڑا مقصد یہی تھا۔ منجملہ اور باتوں کے ہماری گفتگو کا موضوع زیادہ تر اسی مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں پیروی اور تدبیر کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلمانوں کے قومی زوال کے اسباب میں اس خاص سبب پر بہت کم غور کیا جاتا ہے کہ حقیقی خادمانِ علم و ادب کے ساتھ ہمارے صاحبانِ اقتدار کس درجہ مجرمانہ تغافل سے کام لیتے ہیں۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں صرف چند والیانِ ریاست اور اُمرا نے ادبی سرپرستی کے فرض کو پہچانا۔ ایسی ریاستوں میں حیدر آباد کی ریاست کو شاید پہلا درجہ حاصل تھا اور ریاست کے امرا میں مہاراجہ کشن پرشاد کا نام سرِفہرست تھا۔ افسوس ہے کہ حیدر آباد میں حضرت آغا شاعر نے جن صاحبانِ اقتدار کی سرپرستی پر بھروسا کیا اُنھوں نے اس فرض کو نہ پہچانا۔ آغا صاحب کی بزرگی، اُن کی زباندانی اور شعر گوئی میں اُن کے وسیع تجربے وغیرہ کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا، ورنہ منظوم ترجمہ قرآن مجید کی طباعت کے اخراجات کی منظوری اور آغا صاحب کو ایک معقول وظیفۂ علمی کا جاری ہونا کچھ مشکل بات نہیں تھی۔ ڈھائی مہینے کی تگ و دو کرنے کے بعد آغا صاحب کو مایوس ہونا پڑا۔

(۲)

مولانا سید ممتاز احمد مرحوم کے کتب خانہ میں ماہوار رسالہ "زبان" کے ایک سال کے پرچے مجلد تھے۔ یہ رسالہ دہلی کے ایک ہندو رئیس[1] نکالتے تھے۔ میں نے حضرت آغا شاعر کا نام اس میں دیکھا تھا۔ میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ مگر اب مجھے یاد نہیں کہ

---

[1] لالہ جیشور پرشاد مائل دہلوی۔

رسالہ "زبان" کی وہ جلد کس سنہ کی تھی البتہ اتنا یاد ہے کہ اس کے ایک شمارے میں حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات کا تذکرہ تھا۔ پرچہ کے مالک نے اپنی والدہ کی علالت کا حال بیان کر کے یہ بتایا تھا کہ حکیم صاحب مرحوم نے کیسا عجیب علاج کیا تھا۔ حکیم محمود خاں دہلوی کی وفات ۱۸۹۱ء میں ہوئی اس لیے رسالہ "زبان" کی وہ جلد بھی اُسی سنہ کی ہوگی۔

حضرت داغ دہلوی ۱۸۸۸ء سے پہلے حیدر آباد دکن آ چکے تھے اور امیدوار ملازمت تھے۔ فروری ۱۸۹۱ء میں مرحوم حضور نظام میر محبوب علی خاں نے اپنی غزلوں کی اصلاح اُن کے ذمہ کی۔ تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار منظور ہوئی۔ بعض لوگ بارہ سو اور بعض پندرہ سو بھی بتلاتے ہیں۔ میرے قدیم کرم فرما مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اُردو" میں دو ہزار بتائی ہے غرض اس سال سے حضرت داغ کو ذریعۂ معاش سے اطمینان حاصل ہوا۔ داغ کی شہرت تمام ہندوستان میں تھی۔ وہ پہلے دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ نواب کلب علی خاں مرحوم کی وفات کے بعد رام پور میں نہ رہ سکے۔

شاہ دکن میر محبوب علی خاں کے اُستاد بن جانے کے بعد حضرت داغ حیدر آباد کے رؤسا اور شرفاء سے بھی روشناس ہوئے اور شعراء سے بھی۔ حیدر آباد میں اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔ ڈاک کی سہولتوں کے عام ہو جانے کی وجہ سے سارے ہندوستان سے اصلاح کے لیے غزلیں آنے لگیں۔ حضرت علامہ اقبال نے بھی چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجی تھیں۔

قیاس یہ ہے کہ حضرت آغا شاعر بھی اپنی غزلیں اصلاح کے لیے بذریعہ ڈاک حیدر آباد بھیجنے لگے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسالہ "زبان" سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہونے کے بعد اُنھوں نے حیدر آباد آنے کا ارادہ کیا ہو اور اُستاد سے مشورہ کر کے حیدر آباد کا رُخ کیا ہو اور دہلی سے اپنی روانگی کی اطلاع بھی کر دی ہو۔ لیکن دُوسرا قیاس یہ ہے کہ آغا صاحب کے کوئی بزرگ جو پہلے سے حیدر آباد میں مقیم تھے اور حضرت داغ سے ربط رکھتے تھے وہی اُستاد شاگرد کے درمیان متوسل رہے ہوں۔ یہ قیاس اس بناء پر قائم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" کے عنوان سے جو سلسلۂ مضامین لکھا ہے اُس میں اپنے خلاف شاگردانِ داغ کی ایک سازش کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ——— "مجھ سے یہ ساری کہانی چچا صاحب مرحوم نے نقل کی تھی" ——— بہرحال "حیدر آباد" میں اُستاد شاگرد کی پہلی ملاقات ایک دلچسپ لطیفہ ہے جو یہاں پیش کرتا ہوں۔

حضور نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے تک حیدر آباد کے امرا قدیم مُغلیہ دربار کے امرا کا نمونہ تھے۔ ایک نواب خان خاناں تھے جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے مشہور سپہ سالار عبد الرحیم خان خاناں کی اولاد سے تھے۔ ایک مہاراجہ کشن پرشاد تھے جن کے خاندان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ راجہ ٹوڈر مل کی نسل سے ہے۔ ایک راجہ شیوراج رائے رایاں تھے جو کایستھ قوم کے تھے اور مشہور تھا کہ ان کے جدِ اعلیٰ، بانیٔ سلطنت آصفیہ نظام الملک آصف جاہ اوّل کے محاسب اعلیٰ یا جدید اصطلاح میں وزیر فینانس تھے اور اُنھیں کے ساتھ دہلی سے دکن آئے تھے۔ ان کے علاوہ امرائے پائیگاہ اور دُوسرے بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے جو سلطنت آصفیہ کے رُکن رکین تھے۔

مہاراجہ کشن پرشاد، حضور نظام میر محبوب علی خاں کے ساتھ کھیلے تھے۔ ریاست کا ایک قدیم عہدہ "پیشکاری" (یعنی پرسنل سیکرٹری کا) تھا جو مہاراجہ کا موروثی عہدہ بن گیا تھا۔ یہ عہدہ اگرچہ نام کا عہدہ رہ گیا تھا اور کوئی فرائض اس سے متعلق نہیں تھے مگر ریاست

سے اس کی تنخواہ برابر جاری تھی۔ حضور نظام مرحوم نے انھیں جدید طرز کی حکومت یعنی مجلسِ وزرا (کیبنٹ) میں پہلے پہل تو وزیر افواج بنایا تھا اور بعد میں "دیوان" یعنی وزیر اعظم بنا دیا تھا۔ وہ اس عہدے پر مرحوم حکمران کی وفات تک کارگزار رہے۔ موجودہ نظام میر عثمان علی خان نے اپنی تخت نشینی کے بعد انھیں وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا اور سر سالار جنگ اوّل کے پوتے نواب یوسف علی خان سالار جنگ ثالث کو وزیر اعظم بنایا تھا۔ علم و ہنر کی قدر دانی اور شرفاء نوازی میں مہاراجہ کشن پرشاد کے برابر کوئی دوسرا امیر نہیں تھا۔

جس زمانے میں حضرت آغا شاعر حیدر آباد گئے ہیں، مہاراجہ کشن پرشاد جوان تھے، شعر و شاعری سے بڑا شغف رکھتے تھے، مشاعروں کی خود صدارت کرتے تھے۔ آغا صاحب کے بیان سے تو یہ اطلاع ملتی ہے کہ اکثر "چندولعل کی بارہ دری" میں بزمِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد دیوان چندولعل شاداں کے پرنواسے اور ان کی جاگیر، املاک اور عہدۂ پیشکاری کے وارث تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ مشاعرے انھیں کے ایما سے ہوتے تھے اور سرکاری مشاعرے سمجھے جاتے تھے۔

آغا صاحب جب حیدر آباد پہنچے تو انھوں نے عقب دار الشفا میں اپنے ایک دوست سید حسن مرزا صاحب دہلوی اوورسیر کے ہاں قیام کیا لیکن یا تو ریل ہی میں بیمار ہو گئے تھے یا شہر میں داخل ہوتے ہی مرض نے حملہ کیا۔ مرض کچھ اس قسم کا تھا کہ معالجہ کے لیے ان کا ہسپتال میں داخل ہونا ضروری ہو گیا۔ چنانچہ حیدر آباد کے صدر ہسپتال میں جو "دواخانۂ افضل گنج" کہلاتا تھا، داخل ہو گئے۔ کئی روز زیرِ علاج رہنے کے بعد ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ شفا خانے سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ آج ہی شام کو سرکاری مشاعرہ ہے۔ مصرعِ طرح پر ایک پھڑکتی ہوئی غزل کہی اور شام کو مشاعرے میں جا پہنچے۔ مہاراجہ کشن پرشاد صدرِ مشاعرہ تھے۔ ان کے قریب حضرت داغ تشریف فرما تھے۔ آس پاس اس عہد کے نامور شعرا اور ادبا جمع تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ جب شمع آغا صاحب کے سامنے آئی تو آغا صاحب نے حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ——— "میرا قاعدہ یہ ہے کہ میں اپنا ناچیز کلام سنانے سے پہلے تبرکاً اپنے استاد کا کچھ کلام سناتا ہوں۔ اس وقت میں اپنے استاد کے دو اشعار پیش کرتا ہوں" ——— یہ کہہ کر آغا صاحب نے اپنے استاد کا نام لیے بغیر دو اشعار سنائے۔ اشعار سن کر شاگردانِ داغ اور خود حضرت داغ سناٹے میں آ گئے کہ یہ کون شخص ہے جو میرے اشعار کو اپنے استاد کے اشعار کہہ کر سنا رہا ہے۔ حضرت داغ نے پوچھا ——— "آپ کے استاد کون ہیں؟ ذرا ان کا نام بتا دیجیے" ——— آغا صاحب نے بلند آواز سے کہا ——— "میرے استاد ہیں حضرت فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی" ——— مہاراجہ بہادر نے چپکے سے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں؟" استاد داغ نے فرمایا ——— "میں نہیں جانتا، آج پہلی مرتبہ یہ صورت دیکھی ہے" ——— پھر استاد داغ نے پوچھا ——— "آپ کون صاحب ہیں، ذرا اپنا نام بتائیے" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "جی میں آغا شاعر ہوں" ——— داغ نے کہا ——— "ارے بھئی آغا تم کب آئے؟ مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ ذرا یہاں آؤ" ——— آغا صاحب قریب گئے۔ استاد نے گلے سے لگا لیا۔ پھر پوچھا ——— "تم مجھ سے ملے کیوں نہیں" ——— آغا صاحب نے کہا ——— "بتائیے؟ آتے ہی بیمار پڑ گیا، ہسپتال میں داخل ہوا۔ اتنے دن ہسپتال میں رہا لیکن آپ نے خبر تک نہ لی۔"

استاد سے مل ملا کر اپنی جگہ جا بیٹھے جو غالباً زمرۂ شعرا میں تھی۔ صدرِ مشاعرہ مہاراجہ کشن پرشاد نے کہا ——— "آغا صاحب ذرا قریب آ جائیے" ——— آغا صاحب کھسک کر کچھ آگے بڑھے۔ مہاراجہ نے کہا ——— "اور آگے آئیے" ——— آغا صاحب

اور آگے بڑھ کر مہاراجہ کے قریب پہنچ گئے۔ مہاراجہ نے کہا ——— "اور آگے آئیے" ——— اس سے آگے بڑھنے میں ادب مانع تھا۔ آغا صاحب نے جھلا کر کہا ——— "تو کیا حضور کی گود میں آ بیٹھوں؟" ——— آغا صاحب کی اس جھلاہٹ پر مہاراجہ زیرِ لب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ آغا صاحب نے غزل سنائی اور خوب خوب داد پائی۔ یہ تھی شاگرد کی اُستاد سے پہلی ملاقات!

۱۹۱۸ء میں آغا صاحب نے اپنے رسالہ "آفتاب" میں ایک نہایت دلچسپ سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا ——— "بزمِ داغ کے چشم دید نقوش" ——— اس سلسلہ کا غالباً پہلا مضمون یہی واقعہ تھا جس کو میں پڑھ چکا تھا۔

۱۹۲۲ء میں آغا صاحب سے جو ملاقاتیں رہیں اُن میں ایک روز میں نے اس واقعہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ آغا صاحب نے تفصیل کے ساتھ سارا واقعہ سُنایا۔ رسالۂ آفتاب میں جو کچھ چھپا تھا وہ بہت مختصر تھا۔ خود آغا صاحب کی زبان سے اس واقعہ کو سُن کر جو مزا آیا وہ چھپے ہوئے مضمون سے کہیں زیادہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں اُن سے یہ نہ پُوچھ سکا کہ وہ پہلی مرتبہ کس سنہ میں حیدرآباد تشریف لائے تھے کچھ تو اُن کی بزرگی کا رعب اور کچھ میری حیثیت' اِن دونوں نے میرے لبوں پر مُہر سی لگا دی تھی۔ وہ جو کچھ فرماتے اُسے سُن لینا ہی اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اپنی طرف سے کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ صرف حضرت جوش ہی ایسے آدمی تھے جو اپنے شوخ ظریفانہ فقروں سے اُن مرحوم کو مُسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب جوش کے ہاں (اسی باغ والی کوٹھی میں) حضرت آغا شاعر تشریف فرما تھے' میں بھی موجود تھا۔ جناب جوش نے نہایت اصرار کے ساتھ کہا ——— "حضرت آپ میرے یہاں قیام فرمائیں" ——— آغا صاحب نے اپنے عادتی حزین لہجہ میں جواب دیا ——— "نہیں جوش' تمھیں بڑی زحمت ہو گی۔ مجھے صبح سویرے ہی وضو کے لیے گرم پانی درکار ہوتا ہے" ——— وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ جناب جوش نے بات کاٹتے ہوئے ڈرامائی لہجہ میں کہا ——— "کیا حضرت آپ وضو طہارت وغیرہ یہ سب حرکتیں کرتے ہیں؟" ——— جناب جوش نے یہ فقرہ کچھ اس انداز سے کہا کہ آغا صاحب ہنس پڑے اور اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا ——— "جوش کبھی میں بھی جوان تھا" ——— میں نے کہا یہ نادر اتفاق ہے کہ "جوانِ جوش" اور "بڑھاپا جوش" دونوں یکجا ہیں۔

(۳)

آغا صاحب پہلی مرتبہ کس سال حیدرآباد دکن گئے؟ کتنی مُدت وہاں قیام کیا؟ ان کا ذریعۂ معاش وہاں کیا رہا؟ ——— یہ تین سوالات ایسے تھے جن کا جواب مجھے حیدرآباد میں کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں مجھے حیدرآباد میں آغا صاحب سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ اب ۱۹۶۲ء میں اُس ملاقات کو بتیس۳۲ سال ہوتے ہیں۔ اتنی مُدت کے بعد یہاں کراچی میں چند ہی روز قبل ان سوالات کا جواب ملا ہے۔ آغا صاحب کے فرزند جناب سرخوش کی عنایت سے مجھے رسالہ "کنول" کا مارچ ۱۹۲۹ء والا نمبر دیکھنے کا موقع ملا جس میں آغا صاحب کا ایک مضمون ——— "فقیر کی پہلی پھیری" ——— شائع ہوا ہے۔ اس مضمون سے نہ صرف ان سوالوں کا جواب ملتا ہے بلکہ حیدرآباد کے دَور کی ایک جھلک بھی نظر آجاتی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے شمع سحری کی طرح جھلملا کر ختم ہو گیا۔

آغا صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد گئے اور محلہ "دارالشفا" میں اپنے ایک دوست سید حسن مرزا صاحب

دہلوی؎ اعلاء حمید کے مکان پر قیام کیا۔ چند ہی روز کے بعد وہ راجہ راۓ رایاں بہادر، امانت دنت؛ آصف جاہی کی بارگاہ میں پہنچا دیے گئے۔ راجہ صاحب کے یہ سب خاندانی خطابات ہیں۔ آغا صاحب نے جس ہستی کا ذکر فرمایا ہے ان کا نام "شیوراج" تھا۔ ان کے صاحبزادے راجہ شام راج بہادر، تقسیم ہند سے پہلے حکومت حیدرآباد کے وزیر رہ چکے ہیں اور غالباً حیات ہیں یہ خاندان حیدرآباد کے امراۓ عظام میں شمار کیا جاتا ہے۔ آغا صاحب شہسوار بھی تھے۔ فرماتے ہیں:-

"شکر گیا جو راجہ راۓ رایاں بہادر کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں صرف قلم ہی کا مرد نہیں ہوں، بلکہ اچھا خاصا شہسوار بھی ہوں، پھر تو راجہ صاحب کے اصطبل سے گزر کر سرمہاراجہ بہادر (کشن پرشاد) کے اصطبل تک رسائی ہوئی۔ نیلی رستم، کیوترس جیسے قیمتی گھوڑے صبح و شام میری سواری کے لیے مخصوص ہو گئے۔"

اُس زمانے میں حیدرآباد کے اُمرا کو شاعری سے کتنی دلچسپی تھی۔ آغا صاحب کے اس بیان سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

"اُسی زمانے میں راجہ راۓ رایاں بہادر کو بھی شاعری سے کچھ ایسی دلچسپی ہوئی کہ ایک خاص، مشاعرہ بھی قائم ہو گیا جس میں سکری میرنادر علی برتر اور مرحوم منشی منتجب الدین تجلیؔ سکرٹری و نائب سیکرٹری ہوئے۔ یہ فقیر بھی ان مشاعروں کا جزو لاینفک بن گیا۔ غرض خوب خوب صحبتیں ہوئیں۔ . . . . القصہ، میں اکثر مشاعروں میں رُوح رواں مشاعرہ قرار دیا جانے لگا۔ خدا غریق رحمت کرے، اس وقت حضرت فصیح الملک بہادر مرزا داغ مرحوم بھی زندہ تھے۔ پھر تو مولانا ضیاء، گرامیؔ، ترکیؔ، حسامیؔ، رسواؔ، اچھے اچھے کہنے والوں سے صحبتیں رہیں۔ اللہ اللہ، اُس وقت کا حیدرآباد کچھ جہان آبادؔ سے کم نہ تھا۔"

میرنادر علی برتر غازی پوری حضرت ظہیر دہلوی کے شاگرد تھے اور حضرت ظہیر غالب کے شاگرد تھے۔ حضرت برتر کی ایک غزل میری طالب علمی کے زمانے میں بچہ بچہ گاتا پھرتا تھا۔ یہ غزل سارے ہندوستان میں مقبول ہوئی۔ حقانی محفلوں میں قوال اس کو برسوں گاتے رہے۔ گراموفون ریکارڈوں میں بھی بھری گئی تھی۔ حضرت برتر کے ایک شاگرد، حیدرآباد کے ایک معزز خاندان کے فرد، جناب عبدالکریم واکانی المتخلص بہ "تہذیب" سے میری ملاقات یہاں کراچی میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ حضرت برتر کے بہت سے حالات مجھے "تہذیب" مرحوم سے معلوم ہوئے جن میں ایک بات یہ تھی کہ حضرت برتر شاعری میں راجہ راۓ رایاں کے اُستاد تھے۔ حضرت خواجہ شمس الدین (مدفون اورنگ آباد، دکن) کے مرید ہوئے۔ بیعت کے بعد اُنھوں نے وہ غزل کہی تھی جو اتنی مقبول عام ہوئی۔ مجھے پوری غزل یاد نہیں تھی۔ "تہذیب" مرحوم نے مجھے اس کے پانچ شعر سنائے تھے جو یہاں درج کرتا

؎ دلی۔ شاہجہان آباد

ہوں :

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارا کر دیا
نذرِ ساغر آج ہم نے زُہد و تقویٰ کر دیا
دل کو آزارِ محبت کے مزے آنے لگے
اُس کے میں قربان جس نے درد پیدا کر دیا
میکدے میں کل تو تھا میں خشک ساحل کی طرح
آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا
کعبہ والوں سے جو پُوچھی میں نے منزل یار کی
بتکدے کی سمت چپکے سے اشارا کر دیا
ہم بُرے سے تھے بُرے برتر خدا کا شکر ہے
اک نگاہِ شمس نے اچھے سے اچھا کر دیا

حضرت نادر علی برتر ۱۹۲۱ء تک بقیدِ حیات تھے۔ آغا صاحب نے اپنے رسالہ "آفتاب" کے نومبر ۱۹۲۱ء کے پرچے میں اُن کی ایک غزل شائع فرمائی ہے جس کا مطلع ہے:

پھر بہار آئی جنونِ فتنہ ساماں بڑھ گیا
تا بدامن پھر مرا چاکِ گریباں بڑھ گیا

مُنشی منتجب الدین تجلی مرحوم کے صاحبزادے تمکین کاظمی میرے قدیم کرم فرما تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ میں گلبرگہ میں تمکین کاظمی صاحب سے ملنے کے لیے اُن کے مکان پر گیا تو حضرت تجلی کی زیارت بھی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے دو تین سال . . . بعد انھوں نے وفات پائی۔ تمکین کاظمی صاحب نے بے شمار مضامین اور دو تین کتابیں لکھیں۔ ۱۹۶۱ء میں رسالہ افکار کراچی کے جوش نمبر کے لیے اُنھوں نے ایک مضمون حیدر آباد دکن سے بھیجا تھا افسوس ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تمکین کاظمی صاحب کی وفات کی خبر آئی۔

ضیا مُفتی نور الضیاء الدین، ضیا یار جنگ، اورنگ آباد کے ایک جاگیردار خاندان کے جانشین تھے۔ حیدر آباد میں کئی سال تک مُفتی عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) رہے اور بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے تھے۔ مولانا گرامی کی طرح فارسی ہی میں شعر کہتے تھے اور استاد مانے جاتے تھے۔ شاعری کے علاوہ شطرنج اور اپنی قانونی بصیرت میں بہت مشہور تھے۔ موجودہ حضور نظام کے دربار میں ایک زمانہ میں بڑا رسوخ اور وقار رکھتے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے گہرے دوست تھے۔ قدیم حیدر آبادی شرافت اور روایات کو قائم رکھنے میں اپنی آپ نظیر تھے۔

اس مضمون میں آغا صاحب نے راجہ رائے رایاں بہادر کو کئی جگہ "آغا" نادر لکھا ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً

وہ راجہ صاحب کی سرکار میں برسلسلہ ملازمت منسلک رہے ہوں گے۔

ایک جگہ سر عبدالقادر مرحوم نے حیدرآباد تشریف لانے اور آغا صاحب کو مولانا شبلی اور عبدالحلیم شرر لکھنوی سے متعارف کرانے کا بھی ذکر فرمایا ہے:

> اسی اثنا میں علامہ شبلی نعمانی اور مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی مرحوم جو حسنِ اتفاق سے حیدرآباد کے کسی علمی ادارے میں کام کر رہے تھے میرے محبوب ترین دوست محبی سر عبدالقادر جی کی وساطت سے ان حضرات کی بھی دید وا دید ہوگئی۔ مولوی شبلی مرحوم تو مجھ ناچیز کے کلام اور طرزِ خواندگی کے اس قدر والہ و شیدا ہوئے کہ بار بار تشریف لائے اور ناچیز کی عزت بڑھائی۔ دو چار دفعہ مولوی صاحب نے مجھے اپنے دولت کدہ پر طلب فرمایا اور اس قدر اصرار سے میرے ناچیز کلام کو پڑھوایا کہ میں پہلے ہی دیوانہ تھا اور رہے سہے حواس کھو بیٹھا۔

آغا صاحب جب حیدرآباد گئے تھے تو پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد وغیرہ بقیدِ حیات تھے۔ جناب سرشار کو غالباً مہاراجہ کشن پرشاد نے خود حیدرآباد بلایا تھا اور اپنے ہاں رکھا تھا۔ ان کی ہر ضرورت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ سرشار ہی کے مشورے اور اصلاح سے مہاراجہ بہادر نے دو تین ناول لکھے تھے جو شائع ہو چکے ہیں۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی سرپرستی میں ایک رسالہ "دبدبۂ آصفی" شائع ہوتا تھا۔ اس کی ادارت مہاراجہ بہادر نے سرشار کے سپرد کر دی تھی۔ میں نے حیدرآباد کے ثقہ لوگوں سے یہ سنا تھا کہ آخری زمانے میں جناب سرشار کا توازن دماغی غالباً کثرتِ مے نوشی سے بگڑ گیا تھا۔ اس حالت میں وہ کاغذ کی پرچیوں پر ناول کے دو ایک مکالمے لکھتے اور کسی شاگرد پیشہ کو دے کر کہتے کہ مہاراجہ بہادر کو دے آؤ۔ وہ حکم کی تعمیل کرتا۔ شروع شروع میں تو مہاراجہ بہادر نے ان پرچیوں کو لے کر دیکھا ہوگا۔ بعد میں جب سب کو یقین ہوگیا کہ ان کا دماغی توازن قائم نہیں ہے تو خود شاگرد پیشہ ان کی ایسی پرچیوں کو ادھر اُدھر کہیں ڈال دیتے تھے مہاراجہ کے ملاحظہ میں پیش نہیں کرتے تھے۔

۱۹۰۲ء میں جناب سرشار نے وفات پائی۔ ان کی وفات کا دردناک واقعہ آغا صاحب نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے جو اُن کے مجموعۂ مضامین "خارستان" میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مشاعرہ کا حال بیان کرتے ہیں جو شہر کے باہر چندولعل کی بارہ دری میں منعقد ہوا تھا:

> .... جب گرامی مرحوم پڑھ چکے تو بارہ بج چکے تھے۔ ان کے بعد صفاتی نے دو تین رباعیاں پڑھی تھیں جو رام زلفی کے متولے ملک کے نامور ادیب پنڈت رتن ناتھ سرشار لڑکھڑاتے ہوئے شمع کے سامنے خود آبیٹھے اور کہا —— اب مگر تمام کے جیتو مری باری آئی۔

مشاعرے کے ختم ہو جانے کے بعد کے حالات لکھتے ہیں:

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے، پنڈت رتن ناتھ سرشار جو آج ضرورت سے زیادہ پُر کیف تھے، وہ آج شہر نہ جاسکے اور اپنے ایک رفیقِ سفر شاید منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کے ہمراہ اسی بارہ دری میں شب باش ہونا پڑا۔ یہ دونوں صاحب چونکہ حضور وزیر صاحب سر مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اس لیے یہاں بارہ دری میں بھی اُن کے لیے ایک خاص کمرہ مخصوص تھا۔ دونوں صاحب وہیں اپنے اپنے بستروں پر جا لیٹے۔ یہ کمرہ بارہا دیکھا بھالا تھا، مگر اس میں ایک طرف کی گھڑونچیوں پر آبدار خانہ تھا جس پر پانی کے مٹکے، گگریں، صراحیاں اور گلاس سجے ہوئے تھے اور دوسری طرف ویسی ہی گھڑونچیاں رکھی ہوئی تھیں جن پر دُھلی ہوئی نواڑ کی پچتیاں تہ بہ تہ دھر اُوپر چھت تک چُنی ہوئی تھیں۔ اب قسمت کی بات اس کا کسی کو دھیان بھی نہیں رہا کہ پانی کی گھڑونچیاں کس طرف ہیں اور نواڑ کی پچتیاں کدھر ہیں۔ اتفاق سے اسی رات پنڈت جی کو پیاس کی شدت اور خمار کی ترنگ نے یکایک چونکا دیا۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ آپ دیوانہ وار بستر سے اُٹھ کر پانی کی تلاش میں چلے۔ اس شدتِ اضطراب میں، اپنی دانست میں یہی سمجھے کہ آبدار خانہ اُوپر ہی ہے۔ آہ، آہ، مگر وہ موت کا دھوکا تھا، قضا اس غریب کو ان گھڑونچیوں کی طرف لے گئی جن پر نواڑ چنی ہوئی تھی اور وہ اُسی گھبراہٹ میں ٹٹولتے ہوئے، اُنھیں گھڑونچیوں پر جا چڑھے۔ ستم یہ ہوا کہ پانی کا وہاں نشان نہ پاکر جو عالمِ بدحواسی میں ہاتھ پاؤں مارے تو ان غریب کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اوندھے مُنہ اس گھڑونچی کے حلقے میں جا گرے۔ ان کے گرتے ہی اُوپر سے اُدھر رکھی ہوئی نواڑ کی پچتیاں دھڑا دھڑ اُنھیں پر آپڑیں جس کے صدمے سے ان کی جان نکل گئی۔

آہ، آہ، دُوسری صبح کو یہ ہولناک خبر مقامی اخباروں میں تھی۔ بس جو پڑھتا تھا سر پکڑ کر رہ جاتا تھا۔

آغا صاحب نے سرشار کی موت پر ایک مرثیہ بھی کہا تھا۔ اس کے متعلق اپنے مضمون "فقیر کی پہلی پھیری" میں لکھتے ہیں:

> اسی زمانے میں مشہور و معروف فسانہ نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کا افسوس ناک حادثہ ہوگیا۔ میں نے بھی متاثر ہو کر ایک نظم کہی جو راجہ رائے رایاں بہادر کو بہت پسند آئی۔ سرشار مرحوم مہاراجہ بہادر کے مہمان تھے اور مجھ پر کرم فرماتے تھے۔ میری نظم ان کا مرثیہ تھی۔ ایک دن راجہ رایاں بہادر نے مجھے اپنے ہم رکاب لیا اور سر مہاراجہ بہادر کے حضور میں لے جا کر وہی نظم مہاراجہ کو سنوائی۔ اس طرح حضرت شاد بالقابہ تک بھی رسائی ہو گئی۔ بس قسمت چمک گئی۔

جنوری ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ کی وفات ہوئی اور ان کے سب سے بڑے لڑکے ایڈورڈ ہفتم جو پرنس آف ویلز تھے تخت نشین ہوئے۔ انگلستان میں ان کا دربار تاج پوشی ۱۹۰۲ء کے غالباً ابتدائی مہینوں میں ہونے والا تھا۔ لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں بھی باہتمام دہلی جشن تاج پوشی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ تمام والیانِ ریاست کو اس دربار میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لارڈ کرزن کے پیش نظر ایک مصلحت یہ تھی کہ تمام والیانِ ریاست کے سامنے انگریزی فوج کی شان و شوکت کا مظاہرہ کرکے اُنھیں اور عام ہندوستانیوں کو مرعوب کیا جائے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب اپنے اُسی مضمون ——— فقیر کی پہلی پھیری ——— میں لکھتے ہیں:

غرض میں انھیں رنگ رلیوں میں تھا کہ یکایک ۱۹۰۳ء کا دلّی دربار زبان زدِ خلائق ہوگیا۔
.... تمام راجہ مہاراجہ طلب ہوئے یہاں تک کہ خود خلد آشیان، نواب میر محبوب علی خان، اعلیٰ اللہ مقامہٗ، آصف سادس بھی مع اپنے تمام خدم و حشم، جاگیرداروں اور اشراف کے دلّی جانے پر تیار ہوگئے۔ اعلیٰحضرت خلد آشیان کا اشارہ پاتے ہی ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے بھی پا تراب کرلیا۔ اُنھیں کے ساتھ ساتھ تمام رؤسائے دکن کی بھی عنانِ توجہ اُدھر ہی تھی۔ مرحوم راجہ رائے رایاں بہادر، امانت ونت، آصف جاہی کا بھی پیش خیمہ برآمد ہوا۔ ان کی طرف سے دلّی کیمپ کا انتظام کرنے کے لیے مولوی علی احمد صاحب سب سے پہلے دلّی جانے کو آمادہ ہوگئے۔ قسمت کی بات ابھی میرے ہمراہ حضرات اپنے اپنے انتظامات میں ہی تھے کہ سب سے پہلے ——— قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند ——— کے موافق، میں بدبخت جو ڈیڑھ سال سے دلّی جانے پر اُدھار کھائے تھا، فوراً ایک بیش قرار رقم لے کر چلنے سے پہلے انتظام کرنے کو چل پڑا۔

یہ خبر شدہ شدہ نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ مرحوم کو بھی پہنچی کہ آغا شاعر انتظام کے لیے دلّی جا رہا ہے۔ آہ! وہ مرگئے ہیں، اور مجھے مرنا ہے، اُنھوں نے مجھے فوراً بلوایا اور ہر چند ڈرایا، دھمکایا کہ یہ کیا حماقت ہے جی ——— بھلا! آغا شاعر اور انتظام! جو لوگ تمھیں وہاں خدمت پر وہاں بھیج رہے ہیں وہ یا تو تمھارے سخت دشمن ہیں یا ان کے حواس بجا نہیں۔ دیکھو آغا شاعر! حیدرآباد نہ چھوڑو۔

مگر میں کب سنتا تھا۔ میں نے ان کی منتیں بھی کیں کہ آپ یہ بھاگی کیوں مانتے

ہیں؟ حضرت! میں خود ڈیڑھ برس سے وطن جانے کو ترس رہا تھا۔ اب قدرت نے
یہ غیب سے سامان پیدا کر دیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اس چلتی گاڑی میں روڑا نہ
اٹکائیں۔

آخر وہ بہشتی بھی مجھے اتنا بضد دیکھ کر خاموش ہو گئے اور میں سنہ ۱۹۰۳ء میں دلّی
واپس آ گیا۔

جہاں تک مجھے یاد ہے حضرت آغا صاحب نے یہ فرمایا تھا کہ کیمپ سنبھالنے کے لیے انھیں مہاراجہ کشن پرشاد نے دس ہزار روپے دے کر بھجوایا تھا۔ حضرت داغ نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ آغا صاحب نے جب اس مخالفت کا گلہ شکوہ کیا تو حضرت داغ نے کہا مجھے یہ یقین ہے کہ تم پھر حیدر آباد نہیں آؤ گے۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لیکن آغا صاحب بضد ہوئے تو خاموش ہو رہے۔ ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کر رہا ہو اس لیے میں نے آغا صاحب ہی کا بیان یہاں نقل کر دیا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ آغا صاحب سنہ ۱۹۰۲ء کے آخری مہینوں میں حیدر آباد سے گئے ہوں گے۔ لندن میں جشن تاج پوشی ایڈورڈ ہفتم کی اچانک بیماری کی وجہ سے کئی ماہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ ان کا اپنڈی سائٹس کا اپریشن ہُوا اور کئی ماہ کی علالت کے بعد اگست سنہ ۱۹۰۲ء کو وہ رسمِ تاج پوشی کے قابل بنے۔ ہندوستان میں یہ دربار جنوری سنہ ۱۹۰۳ء میں منعقد کیا گیا۔ ظاہر ہے کیمپ وغیرہ کے انتظامات کے لیے لوگوں کو کئی ماہ پہلے دلّی جانا پڑا ہو گا۔

میرا خیال ہے کہ سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک آغا صاحب مختلف مقامات میں مختلف مشاغل میں مصروف رہے۔ ڈراما نویسی کا یہی دور ہو گا۔ ممکن ہے کہ آغا حشر کاشمیری سے اسی دور میں مُلاقات ہوئی ہو۔ اُنھیں نے آغا شاعر کو ڈراما لکھنے کی ترغیب دی ہو اور اُنھیں کی کوششوں سے تھیئٹروں کے مالکوں تک رسائی اور ڈراموں کی فروخت کے مراحل طے ہوئے ہوں۔ ڈراما نویسی کے سلسلے میں آغا صاحب نے کلکتہ اور بمبئی کا سفر بھی کیا ہو گا اور ممکن ہے کچھ مُدت ان شہروں میں مقیم بھی رہے ہوں۔

سنہ ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ، آغا صاحب کا ریاست جھالاواڑ سے تعلق قائم ہوا ہو گا۔ یہ قیاس میں نے اس بناء پر قائم کیا ہے کہ میرے ہاں رسالہ "آفتاب" کا جو شمارہ ہے وہ نومبر سنہ ۱۹۲۲ء کا ہے۔ اس پر جلد ۷ اور نمبر ۱۱ درج ہے گویا سنہ ۱۹۲۲ء کے ختم تک رسالہ "آفتاب" کو جاری ہوئے سات برس گزر چکے تھے۔

ریاست جھالاواڑ کے حکمران، رانا سر بھوانی سنگھ، آغا صاحب پر بہت مہربان تھے۔ جھالاواڑ کے دس بارہ سال کے قیام میں آغا صاحب نے بڑے اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کی۔ وہاں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ سنہ ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ جھالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق منقطع ہو گیا ہو گا۔ اپنے اُس خط میں جو جنوری سنہ ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا ہے آغا صاحب فرماتے ہیں:

.... میں کیا اور میرا کلام کیا؟ ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہوں جو اب یقیناً گُل ہو
جائے گا۔ کیونکہ آج ۶-۷ برس سے ۱۶ سو میل کے دھاوے کر رہا ہوں اور کہیں
پاؤں نہیں ٹکتا.......

اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ چھ سات برس پہلے یعنی ۱۹۲۳ء کے لگ بھگ ریاست جالاواڑ سے آغا صاحب کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے اسی وقت سے رسالہ "آفتاب" کی اشاعت بھی بند ہو گئی ہوگی۔ ریاست سے قطع تعلق کی وجہ غالباً مہاراجہ بھوانی سنگھ والی ریاست کی وفات ہوگی۔ نئے والی ریاست نے آغا صاحب سے تغافل برتا ہوگا۔ آغا صاحب وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔

ریاست جالاواڑ کے قیام کے آخری سال دو سال ہیں یا ریاست سے تعلق ختم ہو جانے کے بعد آغا صاحب عشرۂ محرم ریاست خیرپور میں گزارا کرتے تھے۔ وہاں سے انہیں چار سو روپیہ (سالانہ) ملتے تھے۔ ذی قعدہ ۱۳۵۰ھ (مارچ ۱۹۳۲ء) کے آخری دنوں میں آغا صاحب نواب شہید یار جنگ کی طلبی پر حیدرآباد آئے تھے، جمادی الاول ۱۳۵۱ھ (اکتوبر ۱۹۳۲ء) میں شہید صاحب نے پھر آغا صاحب کو حیدرآباد بلایا۔ ڈھائی ماہ کے قیام کے بعد ماہ شعبان ۱۳۵۱ھ (دسمبر ۱۹۳۲ء) میں دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد پھر کبھی حیدرآباد نہیں آئے۔

آغا صاحب کے جاننے والوں میں شاید دو فی صدی کو بھی ان کا اصلی نام معلوم نہ ہوگا۔ مجھے بھی یہاں کراچی میں جناب سرخوش سے معلوم ہوا کہ نام "مظفر علی" ہے جو تاریخی نام ہے اس سے ۱۲۹۰ھ کے اعداد نکلتے ہیں اور ۱۸۷۳ء اس سے مطابقت رکھتا ہے سرسٹھ (۶۷) برس کی عمر پا کر ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء میں آغا صاحب نے رحلت فرمائی۔

الیفرڈ نوبل

ضیاالدین احمد برنی

ڈائنامیٹ جیسی دھماکہ پیدا کرنے والی چیز کی آمدنی سے نوبل انعامات کی بُنیاد ڈالی گئی
تھی اور اب بھی جب جب انعامات کا اعلان ہوتا ہے دُنیا کے علمی طبقوں میں ایک
بہت بڑا دھماکہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج سے ۱۳۱ سال قبل (۱۸۳۲ء میں) ۲۱ اکتوبر کی صبح کو سویڈن کے پایہ تخت اسٹاک ہام (Stock holm) کے ایک امیر گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام الیفرڈ برنارڈ نوبل رکھا گیا۔ یہی وہ بچہ ہے جس نے بڑے ہو کر ڈائنامیٹ ایجاد کیا اور اس کے ذریعے جو کروڑوں روپے کمائے اُس کا بہت بڑا حصّہ مرتے دم ایسے انعامات کے لیے وقف کر دیا جو سب سے بڑے بین الاقوامی علمی اعزازات سمجھے جاتے ہیں اور ان کے پانے والے نہ صرف عالمگیر اور دوامی شہرت حاصل کر لیتے ہیں بلکہ عمر بھر کے لیے مالی مشکلات سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں۔

الیفرڈ نوبل چھوٹے سے قد کا اور معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا۔ اس کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ بڑا محنتی اور جدوجہد کرنے والا انسان تھا۔ مالدار اور مشہور ہونے کے باوجود اُس کی زندگی بڑی سادہ تھی' اس میں غرور اور بڑائی کا احساس نام کو نہ تھا۔ وہ تقریباً اپنا سارا وقت اپنی تجربہ گاہ میں گزارتا' اور اس سے جو وقت بچتا اپنی ماں کی خدمت میں صرف کرتا۔ اُس نے شادی نہیں کی۔ اُس کی ساری محبتوں کا مرکز اُس کی ماں تھی۔

نوبل کا انتقال ۱۰ دسمبر ۱۸۹۶ء کو صبح کے وقت ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ نوبل ایک عجیب وغریب خبط میں مُبتلا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ زندہ نہ دفن ہو جائے اور اس لیے اس نے نصیحت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کی لاش جلا دی جائے۔ چنانچہ یہ وصیت پُوری کی گئی۔ مرنے سے کچھ پہلے اس نے ایک پھٹے ہوئے کاغذ پر اپنی مشہور زمانہ وصیت لکھی جس میں درج تھا کہ

> رشتہ داروں کو تھوڑی سی رقم دینے کے بعد میری ساری دولت (۲۰ لاکھ پونڈ)
> ایک انعامی فنڈ کے قیام میں صرف کی جائے جس کا سالانہ منافع برابر کے ۵ انعاموں میں تقسیم
> کر کے ایک انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے فزیکل سائنس (طبیعات) میں نہایت
> اہم کام کیا ہو' دُوسرا انعام کیمسٹری (علم کیمیا)' تیسرا انعام فزیالوجی (علم الادویہ)
> میں اہم دریافت کرنے والے اشخاص کو دیا جائے۔ چوتھا انعام اس مصنف کو دیا جائے

> جس نے تخلیقی نوعیت کی کوئی کتاب لکھی ہو اور پانچواں انعام اس شخص کو دیا جائے جس نے اقوامِ عالم کے مابین امن پیدا کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔ میں تاکید کرتا ہوں کہ یہ انعامات بلا امتیاز مذہب و قومیت صرف مستحق لوگوں کو دیے جائیں۔"

الفریڈ نوبل بہت مالدار شخص تھا۔ وُہ پندرہ فیکٹریوں اور ۵۳ تیل بردار جہازوں کا مالک تھا۔ ڈائنامیٹ ایجاد کرنے کے علاوہ اس نے ۳۵۵ اور چیزیں بھی پٹینٹ کرائیں جن میں بغیر دھوئیں کا بارود، مصنوعی ربڑ، نقلی پارچہ اور ایک قسم کا راکٹ شامل ہیں۔ یہ انعامات ۱۹۰۱ سے دیے جاتے ہیں۔

نوبل کے انتقال سے لے کر اب تک تقریباً ڈھائی کروڑ روپیہ انعامات کی شکل میں تقسیم ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ نوبل پرائز پانے والے اہلِ جرمنی ہیں۔ اس کے بعد انگلستان کی، پھر فرانس کی، پھر امریکہ کی باری آتی ہے۔ سویڈن اور ناروے کے لوگوں نے بھی ۲۶ انعامات حاصل کیے ہیں۔ برصغیر ہند و پاکستان کے صرف دو آدمیوں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۱۳) اور سر سی۔ وی رامن (۱۹۳۰) کو انعام ملا ہے۔ رُوس کے کسی شخص کو آج تک انعام نہیں دیا گیا حالانکہ نوبل کی وصیت میں یہ چیز خاص طور پر صاف تھی کہ انعامات کی تقسیم میں قومیت و مذہب کا ذرا سا بھی لحاظ نہ رکھا جائے۔ ہند و پاکستان میں اقبال اور گاندھی اور رُوس میں چیخوف اور ٹالسٹائے اس قابل تھے کہ انھیں انعامات دیے جاتے مگر یہ سب نظر انداز ہو گئے۔

ہر سال اسٹاک ہام میں ۱۰ دسمبر کو الفریڈ نوبل کی برسی کے موقع پر بڑی پُرشکوہ تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں سویڈن کے بادشاہ بنفسِ نفیس انعامات تقسیم کرتے ہیں۔ مشہور امریکی مصنفہ پرل بک نے اس تقریب کا حال یُوں بیان کیا ہے:۔

> "میں ۹ دسمبر کو اسٹاک ہام کے ہوائی اڈے پر پہنچی اور مجھے ایک زبردست استقبالیہ کمیٹی نے خوش آمدید کہا جس میں مقیم سویڈن امریکی سفیر کے علاوہ نوبل کمیٹی کے افراد اور سویڈن کے محکمہ خارجہ کے ممبر شامل تھے۔ مجھے فوراً گرانڈ ہوٹل پہنچا دیا گیا جہاں مخصوص شاہی کمرے میں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ دُوسرے دن (۱۰ دسمبر) صبح کو محکمہ خارجہ سے دو ایلچی آئے جنھوں نے شام کی رسومات کے بارے میں ساری تفصیلات بتانے کے بعد یہ درخواست کی کہ بادشاہ کے ہاتھ سے انعام لینے کے بعد میں اُلٹے پاؤں اپنی کرسی تک واپس آنے کی کوشش کروں کیونکہ آپ سے پہلے دو انعام لینے والوں نے بادشاہ کی طرف پیٹھ کر دی تھی جس کا سویڈن کی رعایا نے بہت بُرا مانا تھا۔ چنانچہ شام کو میں وقت پر اُس آراستہ و پیراستہ ہال میں جا پہنچی۔ ٹھیک ۵ بجے ایک سویڈش سپاہی اور ایک سویڈش طلاح نے بگل بجا کر شاہی آمد کا اعلان کیا۔ بادشاہ کے بیٹھ جانے کے بعد نوبل کمیٹی کے ممبر آکر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ ان کی آمد پر بادشاہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ یہی وہ واحد موقع ہے جبکہ بادشاہ اپنی رعایا کے کسی ممبر کی آمد پر کھڑے

ہوتے ہیں۔

میرے برابر کی کرسی پر ایک اور نوبل پرائز جیتنے والے اطالوی ڈاکٹر ایزیکو فرنی بیٹھے ہوئے تھے۔ سویڈش زبان میں تقریریں ہوئیں جن کو نہیں مطلق نہیں سمجھ سکی۔ اس کے بعد میرا تعارف ہوا اور میں انعام لینے کے لیے بادشاہ کے سامنے جا پہنچی۔ بادشاہ نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک سونے کا تمغہ دیا جو چمڑے کے بکس میں رکھا ہوا تھا جس کے ایک طرف نوبل کی تصویر اور دُوسری طرف اس کا نام کندہ تھا۔ ایک لفافہ میں انعام کا وہ حکم نامہ تھا جس کو بعد میں چیک کی صُورت میں بدل دیا جاتا تھا اس رسم کے بعد اُلٹے پیروں لوٹنے کی مصیبت درپیش تھی۔ ایک تو میں اُونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی جن کی ایڑیاں مشرقی بیش قیمت قالینوں میں دھنسی جاتی تھیں۔ دُوسرے میرے زریں فراک کے پیچھے کا حصّہ فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ میں بہت سنبھل سنبھل کر ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میری اس مشکل کو دیکھ کر لوگوں نے ہمدردی میں تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ میں نے قالین کے ڈیزائن کو ذہن نشین کر لیا تھا ورنہ ممکن تھا کہ میں اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے ڈاکٹر کی گود میں جا پڑتی۔ اگلے روز اسٹاک ہام کے اخبارات نے بڑی بڑی سُرخیوں میں یہ خبر چھاپی: "پرل بک بڑی شکست سے پیچھے کو ہٹیں۔"

نوبل پرائز پانے والے کے لیے ضروری ہے کہ چاہے وہ دُنیا کے کسی حصّہ میں ہو خود ایک سال کے اندر اندر اسٹاک ہام پہنچ کر نوبل پرائز حاصل کرے ورنہ انعام ضبط ہو جاتا ہے اور نوبل فنڈ میں جمع کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ میں جرمنی کے مشہور ڈاکٹر Gerhard Domagk کو سلفانا مائڈ معلوم کرنے پر نوبل پرائز ملا لیکن ہٹلر نے اہل جرمنی کو نوبل پرائز لینے سے منع کر لیا تھا اور اس کی جگہ نیشنل اسٹیٹ پرائز نکالا تھا اس لیے جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۷ء میں اس ڈاکٹر نے اپنا انعام طلب کیا۔ اسے رقم تو ملی نہیں، البتہ تمغہ اور سند مل گئی۔

نوبل پرائز کی رقم اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اب تک کسی شخص نے اس کے لینے سے انکار نہیں کیا سوائے جارج برنارڈ شا کے۔ جب شا کو سویڈن کے سفیر نے انعام ملنے کی خوشخبری سُنائی تو بڑے میاں نے زور سے چلّا کر کہا کہ "میں اس روپیہ کا کیا کروں گا؟" سفیر نے بڑی متانت سے جواب دیا کہ "سوچ سمجھ کر تحریری جواب دیجیے گا۔" ایک ہفتہ بعد شا کا غصّہ ٹھنڈا ہو گیا اور اُنھوں نے انعام کی رقم سے کہا کہ اسے ایک ایسی سوسائٹی قائم کرنے میں لگا دیا جو سویڈن اور انگلینڈ کے درمیان ادبی اور ثقافتی تعلقات بڑھانے میں مدد دیتی ہے۔

نوبل پرائز پانے والوں کی کیا عمر ہونی چاہیے؟ کیا نوبل کا مقصد یہ تھا کہ یہ انعام ان لوگوں کو دیے جائیں جو ایک عرصے سے سائنس، طب، ادب اور امن کے بارے میں عظیم شہرت کے مالک بنے ہیں یا ان انعامات سے ایسے ذہین اور جدّت پسند نوجوانوں کو بھی نوازا جائے جو اپنے کارناموں سے دنیا میں اپنے لیے اعلیٰ جگہ حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف

رہتے ہیں ؛ لیکن عموماً انعام پانے والے بہت زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ رُڈیارڈ کپلنگ سب سے زیادہ کم عمر تھا جسے نوبل پرائز ملا۔ انعام پانے کے وقت اس کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ بقول برنارڈ شا :

"نوبل پرائز ایک ایسی بچاؤ پیٹی ہے جو تیراک کی حفاظت کے لیے اس وقت سمندر میں پھینکی جاتی ہے جبکہ وہ تقریباً کنارے پر پہنچ چکا ہے۔"

غالباً نوبل پرائز بانٹنے والوں کو نوبل کی یہ بات یاد ہوگی کہ

"میں کسی آدمی کو ایک پیسہ بھی دینا نہیں چاہتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں جد و جہد کرنے کی رغبت ہی نہ رہے۔"

یہ ہے مختصر سی داستان سویڈن کے ایک باشندے کی جو انسانیت کی تاریخ میں ایک سنگ میل ہے۔

جرمن افسانہ اور اس کا ارتقا

علی ناظم

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے جرمن قوم میں جو شکست و ریخت اور تعمیر و تشکیل کا عمل نظر آتا ہے اس کی خارجی صورت تو دو عالمگیر جنگیں ہیں لیکن اس کے ساتھ پوری تہذیبی و ادبی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان میں بھی جرمن قوم کی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ وثوق سے تجزیہ نہیں کیا جا سکتا کہ جرمنی کو ان منازل تک لانے کے لیے تنہا اس کی جغرافیائی حیثیت، معاشی نظام یا بسمارک کی سیاسی بصیرت کو دخل ہے یا تنہا ان افکار کا نتیجہ ہیں جن میں کانٹ کی انتقادیت، ہیگل کی تصوریت، شوپنہار کی قنوطیت، نطشے کی شدت پسند روحانیت یا اس کی قوم کی سائنسی مادیت شامل ہے، یا پھر اس کے قومی خصائل ہی تنہا اس کے عوامل رہے ہیں۔ اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پچھلے تیس برس میں جرمنی جن سیاسی، سماجی اور شعوری حوادث سے دوچار ہوا ہے اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی۔ یوں تو گزشتہ جنگِ عظیم سے دنیا کے اور بہت سے ممالک بھی شدت سے متاثر ہوئے لیکن ان ممالک میں ابتلا کا دور گزر جانے کے بعد حالات معمول پر آ گئے اور کوئی شے دائمی انقلاب کی محرک نہ بن سکی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد جرمن قوم جس انقلاب آفریں دور میں داخل ہوئی تھی آج بھی منقسم برلن اور مغربی و مشرقی محاذ کی شدید کشمکش کی موجودگی میں وہ دور ختم کر چکی ہے۔ آج کی جرمن قومی زندگی میں جو سیاسی بے یقینی کا ماحول پیدا ہو چکا ہے اس کے اثرات صرف بین الاقوامی سیاست تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس کی صدائے بازگشت زندگی کے ہر شعبہ میں سنی جا سکتی ہے۔ آج کا جرمن ادب اس کی ایک واضح مثال پیش کرتا ہے۔

یہاں ہم اس قوم کے ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں کہ جنگ اور مابعد کے اثرات کی ذہنی کیفیت کا ایک سلسلہ دیکھ سکیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ افسانوی ادب ہمارے پیشِ نظر ہے کہ یہ زندگی کا براہِ راست مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا زمانہ اگرچہ جنگ یا اس کے آس پاس کا زمانہ ہے لیکن آج کے جرمن افسانوی ادب کا جائزہ لینے سے پیشتر ہمیں مجموعی حیثیت سے ان تمام مسائل کو زیرِ بحث لانا ہے جو جدید جرمن افسانہ کی تشکیل، اس کے نشوونما اور اس کے تدریجی ارتقاء کا موجب بنے ہیں۔ ان عوامل کے بغیر آج کے جرمن افسانہ کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس سلسلہ کے بنیادی حقائق مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ جرمن ادب میں افسانہ کی حیثیت کا تعین اور اس کا تاریخی ارتقا۔

۲۔ جنگ سے پہلے کا افسانوی ادب۔

۳۔ انقلابی پس منظر۔

۴۔ موجودہ افسانوی ادب کا جائزہ۔

جرمن فکشن کو بھی دیگر بین الاقوامی زبانوں کی مانند تین بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

جرمن فکشن



Der Roman	Die Novelle	Die Erzählung or Die Kurzgeschichte
(ناول)	نویلے (طویل قصے)	افسانہ (مختصر کہانی)

یہاں ناول اور اس کی تکنیک سے قطع نظر صرف "نویلے" اور "مختصر کہانی" ہی زیر بحث ہیں۔ آج کا جرمن افسانہ اسی نویلے کی ایک ذیلی صنف سمجھا جاتا ہے لہذا افسانہ کا جائزہ لینے سے قبل نویلے کا تفصیلی مطالعہ ناگزیر ہے۔

نویلے کی تعریف کا مسئلہ نزاعی نوعیت رکھتا ہے۔ اس بارے میں نقادوں کی آرا میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ اب تک کئی کتابیں اس مخصوص تکنیک کی تشریح و توضیح میں لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں اختلافات سے بچتے ہوئے صرف انہی تعریفوں کو زیر بحث لانا مقصود ہے جن سے نویلے کا مفہوم بہ آسانی سمجھا جا سکے۔

نویلے (Novelle) دراصل اطالوی زبان کے لفظ ' Novella ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی جرمن زبان میں Neuigkeit یا "خبر" ہوتے ہیں۔ ادب میں یہ لفظ نثر کی اس صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس میں کسی واقعہ یا شخصیت کا بیان مخصوص اور غیر معمولی انداز میں کیا جائے۔ یہاں اس واقعہ یا شخصیت کا اہم یا غیر اہم ہونا چنداں ضروری نہیں البتہ اس کو پیش کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا اور کسی قدر غیر متوقع ہوتا ہے۔ گوئٹے نے نویلے کی ایک مختصر لیکن جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

'Was ist eine Novelle aendera als eine sich ereignote unhorte begebenheit ?

ترجمہ : نویلے کیا ہے ؟ صرف یہی کہ یہ ایک ان سنی لیکن آپ بیتی واردات کا بیان ہے

گویا بیان کا مخصوص انداز میں پیش کیا جانا ہی نویلے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ جدید جرمن نقاد جارج فن لیوکاس[1] نے اپنی انتقادیات کی مشہور کتاب[2] "ذہن اور ہیئت" میں نویلے کی ایک پُرشکوہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے :

"Das Wesen der Novelleform ist kurzgefaast ein Menschenleben durch die unendliche Kraft einer Schicksalsstunde gedruckt"

---

1 George von Lukats.
2 'Die Seele and die Formen'.

ترجمہ : نویلے کی تخلیق وہی ہے جس میں انسانی زندگی قسمت کے کسی ازلی لمحہ کے ہاتھوں ناقابلِ بیان قوت کے ساتھ منضبط ہو جائے۔

نویلے کی ہیئت میں سب سے اہم شے اس کا انوکھا انداز ہے جس کو "نثری آرٹ میں تخلیق اور ہیئت"[1] کے مصنف پیٹش[2] نے بار بار "غیر معمولی" (ungewöhnlich) اور "انوکھا" (neues) کہا ہے۔ اس کے نزدیک نویلے میں یہ غیر معمولی پن موڑ کے نقاط نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بیان کیا جانے والا زندگی کا جز محض اکائی کی حیثیت سے بیان ہوتا ہے جس کی وجہ سے شدت برقرار رہتی ہے۔ یہی شدت اور ارتکاز بیان کو انوکھا، غیر معمولی اور غیر متوقع بنا دیتی ہے چنانچہ انگریزی میں نویلے کی ایک بہت ہی مختصر تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

Novelle —— a description of intense maturity.

ترجمہ : نویلے، کمال شدت کا ایک بھرپور بیان۔

یہاں نویلے کا مفہوم اور اس کی طوالت اس کو دیگر مروجہ اصناف سے ممیز نہیں کرتے بلکہ اس کی پیش کش کا عجیب و غریب انداز جس میں شدت اور تاثر کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اس کو مختلف اصنافِ سخن سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ تھیوڈور اشٹورم[3] کا مشہور نویلے "باسی گلاب"[4] صرف چند صفحات پر مشتمل ہے اس کے برخلاف لڈوگ ٹیک[5] کی تخلیق "جوان بڑھئی"[6] پورے چار سو صفحات پر پھیلے ہونے کے باوجود نویلے ہی ہے۔

نویلے، ناول یا کہانی سے طوالت اور کینویس کے سائز ہی میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ موضوع اور نوع کے اعتبار سے بھی اس کی بالکل جداگانہ حیثیت ہوتی ہے۔ نویلے اور ناول کا ایک بڑا فرق یہ ہے کہ ناول میں پھیلاؤ کی آزادی ہوتی ہے چنانچہ واقعات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے رہتے ہیں جن سے شخصیت کے تمام پہلوؤں کی تعمیر ہوتی رہتی ہے اور آخر کار یہی ارتقا ہیرو کا انجام بن جاتا ہے برخلاف اس کے نویلے کا پورا زور صرف کسی ایک پہلو پر رہتا ہے اور باقی پہلو محض ضمنی نوعیت سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ میں جہاں ایک نقطہ سے دوسرے نقطے تک عموماً براہِ راست رسائی ہوتی ہے ضمنی اجزا بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن نویلے ہمیشہ مرکزی دلچسپی کے نقطہ (Centre of interest) سے وابستہ رہتا ہے۔ وہ اطراف کا تذکرہ ضرور کرتا ہے لیکن ہمیشہ مرکز کے رشتے سے۔ ہولس ہوف[7] کا ایک طویل نویلے "یہودی کی کتاب"[8] اپنے ہیرو فریڈرش میرگل[9]

1. 'Wesen u. Formen der Erzahlkunst
2. R. Petsch
3. Theodor Storm
4. 'Spate Rosen'
5. Ludwig Tieck
6. 'Der junge Tischlermeister'
7. Hulshoff
8. 'Die Judenbuche'
9. Friedrich Mergel

کی پوری زندگی اس کی پیدائش سے لے کر موت تک بیان کرتا ہے لیکن پوری کہانی صرف ایک مرکزی عمل ([illegible]) کے ضمن میں بیان ہوتی ہے جو قصے میں 'ہیرو کا قتل' ہے۔

انگریز نقادوں میں کیمبرج کے پروفیسر بینیٹ[1] نے خصوصیت کے ساتھ نویلے کی صنف پر جو تحقیق کی ہے اس میں انھوں نے نویلے کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔

A Novelle is a narrative in prose, usually shorter than a novel, dealing with one particular situation, conflict, event or an aspect of a personality, it narrates somthing 'new' in the sense of somthing 'striking'.

ترجمہ: نویلے ایک نثری بیان ہے جس کی طوالت عام طور پر ناول سے کم ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کے کسی مخصوص پہلو، تضاد، واقعے سے متعلق ہوتا ہے اور ہمیشہ کسی 'نئی' بات کو بیان کرتا ہے جسے 'نیا' اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قدر چونکا دینے والی ہوتی ہے۔

ان مختلف تعریفوں کی روشنی میں نویلے کا مفہوم بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بین الاقوامی ادب میں یہ یا اسی کے آس پاس کی صنف مختلف ناموں کے ساتھ رائج ہے چنانچہ انگریزی کا طویل مختصر افسانہ (Long short story) یا فرانسیسی کا نویلیت (Novelette) کم و بیش جرمن نویلے ہی کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں۔ پچھلی دو صدیوں میں دنیا کے بہت سے نامور ادیبوں نے اسی صنف کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں روسی ادب سے پشکن، گوگول، تالستائی، ترگنیف، چیخوف، فرانسیسی ادب سے موپساں، ہسپانوی ادب سے الارکون[2] اور اطالوی ادب سے پیرانڈیلو[3] کے نام بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جرمن ادب میں نویلے اٹھارویں صدی کے آخر میں آیا اور بہت جلد ادب کی ایک مقبول صنف بن گیا۔ جرمن مزاج کی شدت پسندی اس صنف کی قبولیت کا سب سے بڑا راز تھی چنانچہ اس کو 'قومی صنفِ ادب' کی حیثیت سے اپنایا گیا۔ کلاسیکی عہد سے لے کر آج تک جرمن نثر کی سب سے مقبول صنف یہی نویلے رہا ہے۔ اگر اس دور میں ہم 'جرمن افسانہ' کی تاریخ اور اس کے ارتقا کا جائزہ لیں تو ہمیں 'افسانہ' کی جگہ 'نویلے' ہی نظر آتا ہے۔ گوئٹے کے عہد سے لے کر موجودہ دور تک جرمن ادب میں لاتعداد نویلے لکھے گئے ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں پر محیط ہیں۔ اسی بنا پر مضامین کے اعتبار سے ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ نویلے کے خاص مجموعے یہ ہیں:

۱۔ کلاسیکی نویلے۔   ۲۔ ابعدالطبیعاتی نویلے۔

---

1. E.K. Bennet
2. Alarcon
3. Pirandello

۳۔ رُومانی نویلے۔　　　　۵۔ شاعرانہ یا حقیقی نویلے

۴۔ بیانیہ نویلے۔　　　　۶۔ نفسیاتی نویلے۔

جرمن ادب میں نویلے نویسی کی تاریخ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں گوئٹے کے "جرمن آوارہ گردوں کی گفتگو"[1] سے شروع ہوتی ہے۔ یہ دور رومانیت پسندی کا تھا جس میں کچھ ہی عرصہ بعد داخلیت کی شدت ہوگئی اور تقریباً پُوری اُنیسویں صدی تک یہی رنگ چھایا رہا۔ اس انداز نے بالآخر اپنی انتہا پر پہونچ کر ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کیا اور کلائسٹ[2] نے مابعد الطبیعاتی مسائل کو بھی نویلے کی صنف میں داخل کر دیا اس کے ساتھ ہی اس نے تاریخی و شخصی نویلے لکھ کر اس ٹیکنک میں بالکل نئے تجربے کیے۔

خالص رومانی مضامین[3] کی فضا لڈوگ ٹیک، آئشن ڈورف، آرنم اور ہوف من نے پیدا کی۔ خاص طور پر ہوف من نے فنی نویلے (Künstlernovelle) لکھ کر اس صنف میں بڑا حُسن پیدا کیا۔ حقیقت پسندانہ اور تخیلی تجربوں کی ابتدا گوٹ ہیلف[4] اور آئر باخ کے ہاتھوں ہوئی اس دور کے نویلے (Dorfnovelle) کہلاتے ہیں۔ اس دور تک جرمن نویلے فنی طور پر انتہائی پختہ اور تخیلی دولت سے مالامال ہو چکا تھا اس کی وسعت بھی بے اندازہ تھی چنانچہ اب عوامی ترجمانی کا کام بھی اسی صنف سے لیا جانے لگا۔ اس عہد نے اشٹورم[5]، کیلر، گوٹ فرِیڈ، موریکے، رابے، اوٹو لڈوگ اور گرل پارسر جیسے فنکار پیدا کیے۔ اس دور کے اختتام پر نفسیاتی تجربوں کا آغاز ہوا چنانچہ پاول ہیزے[6] اور مائر نے نفسیاتی مسائل پر کامیاب نویلے لکھے بعد میں آگے چل کر تھامس من، رلکے اور ہوف من اشتال کی فنی صلاحیتوں نے معراجِ کمال پر پہونچا دیا۔ اس درمیان میں ہیئت کی بے قاعدگی جو ایک عرصہ سے چلی آتی تھی ولیم شیفر[7] اور پاول ارنسٹ[8] کے ہاتھوں دُور ہوئی۔

نویلے نویسی کی ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کی تاریخ یہیں پر ختم ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی یہ مخصوص اور روایتی صنف عہدِ جدید کے تقاضوں کو بھی پُورا کر سکتی ہے یا نہیں؟ تاریخی شہادت کی روشنی میں اس کا جواب نفی میں ملتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے آغاز اور اس کے ابتدائی ایام گزر جانے کے بعد ہمیں نویلے اپنی روایتی عظمت کھوتا نظر آتا ہے۔ اب اس میں وہ شکوہ باقی نہیں جو قدیم زمانہ سے بطور ورثہ چلا آ رہا تھا اور بیسویں صدی کی ایک چوتھائی گزر جانے کے بعد تو نویلے فنی اعتبار سے بالکل بے جان معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی مختصر افسانہ کا آغاز ہوتا ہے۔

نویلے کی اس محدودیت کے نتیجہ میں نثر کی دیگر اصناف کو پنپنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ لیکن مختصر نثر نویسی کے تجربات جاری ضرور رہے چنانچہ Marchen Parabeln, Ankdote, Grotesken کے عنوانات سے اس

---

1. 'Unterhaltungen deutscher Ausgewanderten
2. Kleist
3. Ludwig Tieck, Eichendorff, Arnim, E.T.A. Hoffmann
4. Gotthelf, Aurbach
5. Storm, Keller, Gottfried, Morike, Rabe, Otto Ludwig, Grillparzer
6. Paul Heyse, C. F. Mayer, Thomas Mann, Rilke, Hoffmannstahl
7. Wilhelm Shafer
8. Paul Ernst

دور میں جو کچھ لکھا جاتا رہا وہ بڑی حد تک مختصر افسانہ سے قریب معلوم ہوتا ہے اس درمیان میں لکھی جانے والی بعض کہانیاں تو قطعاً افسانوی انداز رکھتی ہیں چنانچہ یہاں مختصر زمین کے اس دور کا مجموعی حیثیت سے تذکرہ کیا جانا ضروری ہے جو اس پر ہرڈر[1] کی سرپرستی میں گزرا۔

جرمن ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے اس کو تین بڑے تاریخی ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱. گوئٹے کا دور ۱۷۵۰ تا ۱۸۳۲

۲. حقیقت پسندی کا دور ۱۸۳۲ تا ۱۸۸۵

۳. فطرت پسندی سے جدید رومانیت تک ۱۸۸۵ تا موجودہ عہد۔

گوئٹے کا عہد بظاہر افسانوی ادب سے کوئی ربط نہیں رکھتا لیکن اس عہد کا تذکرہ جرمن ادب کی ہر صنف کے تذکرہ کے ساتھ ناگزیر ہے کہ اس دور نے جرمن ادب پر دائمی اثرات چھوڑے ہیں۔ اسی زمانہ میں جرمن ادب کا نشاۃ ثانیہ ہوا جو تاریخ میں "طوفان و ہیجان" (Sturm und Drang) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز اگرچہ ہرڈر ہی کے عہد سے ہو چکا تھا لیکن گوئٹے اور شلر نے اس کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اٹھارویں صدی کی اس انقلابی تحریک نے جرمن ادب میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اس دور میں ادب کو کلاسیکی بندشوں سے آزاد کیا گیا، اس میں داخلیت کی جذبات پرستی اور انفرادیت کے عناصر کو ابھارا گیا اور فرسودہ اخلاقی و تمدنی اقدار سے اعلانیہ بغاوت کی گئی جس کے باعث جرمن قوم زندگی کی ایک نئی حرارت محسوس کرنے لگی اسی حرارت کو 'خالص جرمن رُوح' کا نام دیا جاتا ہے چنانچہ آج تک جرمن ادب میں کسی نہ کسی انداز سے یہی رُوح کارفرما نظر آتی ہے۔ ان خوبیوں سے قطع نظر اس تحریک کی بے انتہا شدت، داخلیت اور انفرادیت کا اپنی حدود سے تجاوز ادب میں عام بے راہ روی، غیر آہنگی اور کسی قدر بے ترتیبی کا بھی موجب بنا چنانچہ بعد کے حقیقت پسند دور میں "طوفان و ہیجان" کے اس خروش کے ساتھ ہی اس کی خوبیاں اور خامیاں بڑے نمایاں طور پر محسوس کی جاتی ہیں۔

نثری ادب میں اس دور کی اہم ترین شخصیت جارج بیوشنر[2] ہے جس کی واحد کہانی "لینس" (Lenz) جرمن مختصر افسانہ کی قدیم مثال کہی جاسکتی ہے۔ یہ کہانی "طوفان و ہیجان" کے آخری دنوں میں لکھی گئی ہے جس میں اس تحریک کے جمالیاتی اصولوں اور شاعرانہ حقائق کو بڑے واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے بیوشنر کے انفرادی خیالات (خصوصاً اس کی فلسفہ میں عینیت اور ادب میں رومانیت سے نفرت) اس کو شہرت نہ دے سکی۔ انگریزی ادب میں کیٹس کی طرح بیوشنر کی جوان موت نے جرمن ادب کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہونچایا۔ اس دور کی ایک اور اہم مختصر کہانی ہے "برجیٹا" (Brigita) ہے

---

1. Johann Gottfried Herder (1744 1803)
2. George Buchner

جس سے اڈلبرٹ اشٹیفٹر[1] کی فنی مہارت کے ساتھ اس کے مشاہدۂ فطرت کا احساس ہوتا ہے۔ "مُوفمن اشتمال" کی کئی مختصر کہانیاں بھی جن میں اس کی فنکاری، شاعرانہ فکر اور انداز کی جدت نمایاں ہے اس دور کے مختصر افسانہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انیسویں صدی کے آخری ایام میں حقیقت پسندی کا دور بھی ختم ہوا اور اس پر تاثریت کا غلبہ ہونے لگا اسی زمانے میں جرمن ادب نے بین الاقوامی تاثرات بھی قبول کیے خاص طور سے فلاؤبر، موپساں، دوستوفسکی، ڈ انیسو[2]، اسکر وائلڈ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی تحریروں نے جرمن لکھنے والوں کو شدت سے متاثر کیا چنانچہ رومانیت کے اس رجحان کو اپنا لینے کے بعد سماجی برائیوں کا برملا اظہار کیا جانے لگا۔ اگرچہ اس تشہیر کا مقصد (خود فطرت پسندوں کے بقول) "بدی" کا استیصال تھا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ۱۹۰۰ء کے آس پاس بدی کی یہ نشر و اشاعت بالآخر ابتذال کی حد تک پہنچ گئی۔ افسانوی ادب میں اس دور کی اہم شخصیت آرتھر شنٹسلر[3] ہے جسے خالص آسٹرین فطرتیت کا نمائندہ کہا جاتا ہے اس کا فن ترقی یافتہ ہونے کے ساتھ زندگی کی توانائی سے بھرپور ہے۔ محبت کے مسائل کو اس نے روایتی انداز کے مقابلہ میں عقل و شعور کی میزان پر جانچنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ جابجا نفسیاتی حقائق بھی بیان کرجاتا ہے اس کی فنکارانہ ذہانت موپساں سے کم نہیں تاہم اظہار کی بے باکی اور مخصوص رنگ کی اشاریت کہیں کہیں اخلاقی حدود سے متجاوز ہو جاتی ہے جہاں وہ ([illegible]) کو بھی محض "ایک بے ضرر کھیل" کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسی تحریک کے دوسرے بڑے علمبردار گیہارٹ ہاؤپٹ من[4] کے یہاں خیالات میں تنوع کے ساتھ زندگی سے ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقات مختلف النوع عناصر کا مرکب ہیں جن میں زندگی کے مسائل کی تشریح کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس کا انداز بڑا پختہ اور بھرپور ہے۔ ہاؤپٹ من کی سب سے بڑی خوبی اس کی ہمہ گیری ہے یہی وجہ ہے کہ فطرتیت کے دور سے اگر اس شخصیت کو نکال دیا جائے تو یہ دور بالکل بے رنگ نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا زمانہ یورپ میں عام نفسیاتی تحریک کا زمانہ ہے۔ اس دور میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل، پراوسٹ اور جوئس کا تجزیاتی اسلوب ہر یورپی فنکار کے ذہن پر مسلط تھا۔ دوسری طرف فرانسیسی اہل قلم موضوع، ہیئت اور اسلوب میں نت نئے تجربے کررہے تھے اس سلسلہ میں فلاؤبر کا انداز خصوصیت کے ساتھ جرمن لکھنے والوں کو متاثر کررہا تھا۔ انہی محرکات نے جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جو آج بھی نہ صرف جرمن بلکہ بین الاقوامی ادب میں پائے کی شخصیت سمجھی جاتی ہے۔ یہ شخصیت ٹامس من[5] ہے جس نے پرانی قدروں کا زوال اور نئی قدروں کا عروج خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور آج بھی وہ ان دونوں کے درمیان ثابت قدمی سے کھڑا نظر آتا ہے اس دور کے ٹامس من کا افسانوی سرمایہ اگرچہ قلیل ہے لیکن اس میں بھی فنکارانہ صلاحیتوں کا غیر معمولی اظہار پایا جاتا ہے۔ "ابتری اور ابتدائی آلام"[6] میں اس نے خیالات و جذبات کو دانشورانہ خطوط پر پیش کرنے کے کامیاب تجربے کیے ہیں۔ بعد کی کہانیاں

---

1. Adelbert Stifter
2. Gabriele d Annunzio
3. Aurther Schnitzler
4. Gehart Hauptmann
5. Thomas Mann
6. 'Disorder & Early Sorows'

ساتھ بڑا مصلح بھی ہے لہٰذا زندگی کی بے قاعدگیوں

ہے اس کے یہاں محاسبہ کا سب سے بڑا معیار نفسیات ہے جس کی

ہے محفظ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی حیثیت سے وہ عوامی قدروں

والے دور میں اس کو انہی خیالات کے جرم میں معتوب کیا گیا۔ نازی غلبہ کے زمانہ میں اس نے

بین الاقوامی شہرت اور امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ برلن یونیورسٹی کے اعزازی گریجویٹوں کی فہرست سے اس کا نام خارج

کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسلت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجیہات دی ہیں افسانوی ادب کے علاوہ فکشن

کے دوسرے شعبوں پر بھی تھومس مین کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ آج کے جرمن ادب میں بھی سرایت کیے

ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت کے ساتھ متاثر ہوا۔ جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام اپنی تمدنی زندگی کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے محروم رہا۔ شکست اور پھر صلح، دونوں سے جرمنی پسماندگی کا شکار ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دستِ نگر رہنا پڑا اس طرح قومی زندگی میں شکست خوردگی اور درماندگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ عوام برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے لگے یہی رجحان تاریخ میں "منکریت" (NIHILISM) کے نام سے موسوم ہے جس میں اشپنگلر[1] نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "زوالِ مغرب" (untergang des Abendlandes) لکھ کر یورپی تمدن کے انہدام کا اعلان کیا۔

اس تھکن، افسردگی اور بیچارگی کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض تاثریت کے مخالف نظریہ کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین عہد کے رومانیت پسندوں کی فنکارانہ روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان کیا کہ محض معلومات صداقت کو پیش کرنا فن ہے؛ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ کم و بیش وائمر جمہوریہ[2] کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہونچکر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک ہنگامہ پرور تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ ماورائیت کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اُس کا اندازہ آج کی تخلیقات سے بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ بیسویں صدی کے فکشن پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جا بجا اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔ یہ

---

1. Oswald Spengler (1880-1886)
2. Weimar Republik

حیثیت فرانس کافکا کی ہے جو جرمن دنیا میں ماورائیت کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتاً اسی تحریک سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ امریکہ کے ممالک تک پہونچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگساں کے وجدانی فلسفے نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثریت اور بعد میں پکاسو کے فن 'مکعبیت' (Cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پُراسرار تہوں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیئر[1] کی شخصیت میں یہی دو عناصر نمایاں نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'ماورائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا عنوان بنا۔ اپولی نیئر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر ماورائی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہیئت کے مروجہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے دادیت (Dadaism) اور بعد میں ماورائیت (Surrealism) کی صورتیں اختیار کیں۔

'دادائیت' کا آغاز ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ میں زرتسیں تسارا[2] اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیئر کے تتبع میں "خالص شاعری" کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریے کے بانیوں کے بیان کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں ہر بے راہ روی کو جائز قرار دے لیا۔

دادائیت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنھوں نے ایک نئے مکتبۂ فکر کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبۂ فکر ماورائیت کہلاتا ہے جس کا بانی آندرے بریتوں[3] تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ عالم محسوسات کے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہونا ضروری ہے چنانچہ ماورائیت میں خارجی اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ ماورائی فنکار حقیقت کو خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر جاتا

1. Guillaume Apollinaire
2. Tristan Tzara
3. Andre Breton

ن کے ترقی یافتہ فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ وہ ایک عظیم فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا [illegible] بھی [illegible] کمیوں
اور بے اعتدالیوں سے چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلاح چاہتا ہے اس کے یہاں محاسبہ کا [illegible] ہے جن کی
صداقتوں سے وہ کبھی روگردانی نہیں کرتا۔ نوعِ انسانی کے تحفظ اور اس کی سلامتی کا خواہاں ہونے کی [illegible] سے وہ [illegible] قدروں
کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔ آنے والے دور میں اس کو انھی خیالات کے جرم میں معتوب کیا گیا [illegible] میں اس نے
وطن کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور امریکہ کی شہریت قبول کر لی۔ بون یونیورسٹی کے اعزازی گریجویٹ [illegible] خارج
کیے جانے پر اس نے یونیورسٹی کے ڈین سے مراسلت میں اپنے نظریات کی فاضلانہ توجیہات [illegible] ادب کے علاوہ فکشن
کے دوسرے شعبوں پر بھی ٹھوس من کی شخصیت چھائی نظر آتی ہے۔ اس کا اثر و نفوذ [illegible] میں بھی سرایت کیے
ہوئے معلوم ہوتا ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جرمنی کی پہلی سیاسی موت واقع ہوئی جس سے ادب شدت سے [illegible] جنگ کے خاتمہ پر فاتح اقوام
اپنی تمدنی زندگی کی از سرِ نو تعمیر میں مصروف ہو گئیں لیکن جرمنی اس سے محروم [illegible] سے جرمنی پسماندگی کا شکار
ہو گیا اور مدت تک اس کو اپنے حریفوں کا دست نگر رہنا پڑا اس طرح قومی [illegible] کی فضا پیدا ہو گئی۔
عوام برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف عام بیزاری کا اظہار کرنے لگے یہی [illegible] (NIHIL[illegible]) کے نام سے موسوم
ہے جس میں اشپنگلر[1] نے اپنی شہرہ آفاق کتاب " زوالِ مغرب " (unte rgang [illegible]) لکھ کر یورپ
تمدن کے انہدام کا اعلان کیا۔

اس تھکن، افسردگی اور بیچارگی کے ماحول نے فنکاروں کو کسی ذہنی پناہ گاہ کی تلاش کے لیے مجبور کیا۔ یہی پناہ گاہ ادب میں
اظہاریت کی تحریک تھی۔ یہ لفظ اگرچہ سنہ ۱۹۱۱ء کے لگ بھگ ہی جرمن ادب میں متعارف ہو چکا تھا تاہم اس وقت تک اس کو محض
"نازیت کے مخالف نظریہ" کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا۔ اظہاریت پسندوں نے نپولین عہد کے روایت پسندوں کی [illegible]
روش اور ان کی رائج کردہ اخلاقی و فلسفیانہ قدروں کو یکسر بدل ڈالا۔ انھوں نے حقیقت پسندوں کے اس نظریہ کا بھی بطلان
کیا کہ "محض معلومات صداقت کو پیش کرنا فن ہے"۔ ایک طویل عرصہ تک یہی اظہاریت کی تحریک جرمن ادب پر چھائی رہی جس کا سلسلہ
کم و بیش وائمر[2] جمہوریہ کے آغاز تک جاری رہا۔ یہاں پہنچ کر اس تحریک نے ایک ایسا موڑ لیا جو آگے چل کر خود ایک مستقل
تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ ماورائیت کی تحریک تھی۔ جرمن ادب اس نئی تحریک سے جس حد تک متاثر ہوا اس کا اندازہ آج کی تخلیقات سے
بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں جرمن ادب میں ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جس نے نہ صرف جرمن بلکہ بیسویں
صدی کے فکشن پر بھی گہرے نقوش چھوڑے ہیں آج کے جرمن افسانے میں جا بجا اسی کی صدائے بازگشت سنی جاتی ہے۔

---

1. Oswald Spengler (1880-1998)
2. [illegible]

ستن

ہیئت فرانس کا کافکا ہے جو جرمن ادب میں ماورائیت کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ کافکا کا فن اور اس کی تخلیقات کلیتہً اسی
ہیئت سے وابستہ ہیں جن کا مطالعہ کرنے کے لیے اس تحریک کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

بیسویں صدی کے ادب کی یہ انقلابی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور بہت جلد یورپ و امریکہ کے ممالک تک
پہنچ گئی۔ ادب کے ساتھ آرٹ کے دیگر شعبوں پر بھی اس سے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہمسایہ ملک ہونے کی حیثیت
سے جرمنی نے ان اثرات کو شدت سے قبول کیا۔

بیسویں صدی کے فرانسیسی ادب پر برگساں کے وجدانی فلسفہ نے گہرا اثر ڈالا جس نے مصوری میں تاثریت اور بعد
ازاں پکاسو کے فن مکعبیت' (cubism) کی صورتیں اختیار کیں۔ اسی زمانہ میں فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل نے لاشعور کی پُر اسرار
...یوں سے آگاہی دے کر یورپی ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا چنانچہ فرانسیسی شاعری میں اپولی نیئر کی شخصیت میں یہی دو عناصر
... نظر آتے ہیں اسی شخص نے سب سے پہلے 'ماورائیت' کا لفظ بھی استعمال کیا جو آنے والے دور میں ایک عظیم ادبی تحریک کا
... بنا۔ اپولی نیئر نے خارجی صداقتوں سے ہٹ کر ماورائی حقیقتوں کو اپنا موضوع بنایا اس کے ساتھ ہی اس نے ہیئت کے
...جہ اصولوں سے انحراف کا آغاز کیا جس نے پہلے دادیت (Dadaism) اور بعد میں ماورائیت (surrealism)
کی صورتیں اختیار کیں۔

'دادایت' کا آغاز ۱۹۱۶ء میں سوئٹزرلینڈ میں ژرتسیں تسارا اور اس کے معاصرین نے کیا۔ یہ لوگ اپولی نیئر کے تتبع میں
خالص شاعری کے قائل تھے جس میں خارجیت ایک بے معنی لفظ تھا۔ اس شاعری کا مقصد (خود اس نظریہ کے بانیوں کے بیان
کے مطابق) محض تحت الشعور سے آنے والے پیغامات کی ترسیل تھا، جس کے لیے اوزان بحور اور ردیف و قافیہ کی پابندی کوئی
... نہ رکھتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس تحریک نے اپنے وقت کے تمام اخلاقی و ذہنی تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر آرٹ میں
... کو جائز قرار دے لیا۔

...یت کے اس منفی رجحان اور اس کی بے اعتدالیوں کے باعث اس کے بہت سے حامی اس سے الگ ہو گئے جنھوں نے
... کی بنیاد ڈالی۔ یہی مکتبہ فکر ماورائیت کہلاتا ہے جس کا بانی آندرے بریتوں تھا۔ اس تحریک کے ماننے والوں کا کہنا تھا کہ
... کے علاوہ ایک اور عالم بھی اپنا وجود رکھتا ہے جو اس ظاہری اور حسی عالم سے بالکل مختلف ہے۔ اس عالم تک رسائی
... کا واحد ذریعہ لاشعور ہے جس کو استعمال کرنے کے لیے انسان کو عقل و منطق سے کنارہ کش ہونا ضروری ہے چنانچہ
... اور معروضی حقیقت کوئی معنی نہیں رکھتی اس کی جگہ لاشعور کی داخلی حقیقت سب پر مقدم ہوتی ہے۔ ماورائی
... خارجی اشیاء میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے وہ لاشعور کی مدد سے خود اپنے وجود کی گہرائیوں میں اترتا

Guillaume Apollinaire

ہے یہ عمل عقل و ارادے کا تابع نہیں چنانچہ اندرے بریتوں نے اس عمل کو 'خالص نفسیاتی خود حرکیت' (Psychic Automatism) کا نام دیا ہے۔ حقیقت کی اس لاشعوری تلاش میں 'مادی انسانیت' کا ادراک سے خود بخود رشتہ قائم ہوتا ہے جس کی کوئی منطقی توضیح نہیں کی جاسکتی۔ ایڈشمڈ کازیمر[1] نے اپنی شاعرانہ 'اظہاریت'[2] میں اس رشتہ کی سب سے بڑی خوبی یہی بتائی ہے کہ یہ ہر قسم کی عقلی و منطقی توجیہات سے بالاتر ہے۔' ادرائیت پسندوں کی دلیل ہمیشہ یہ رہی کہ موضوع اور معروض کے تضاد کی موجودگی میں انسان اپنی حقیقت کو نہیں پاسکتا کہ 'خالص معروض فریب نظر یا خالی خولی بے حقیقت صورت ہے'۔ اس کے لیے انسان کو باطنی وجدان سے کام لینا چاہیے جو لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں موجود اور حقیقت کے اسرار منکشف کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادرائیت میں لاشعور کو 'مطلق حقیقت' (Absolute Reality) کی حیثیت دی جاتی ہے۔

ادرائی فنکاروں نے اظہار کے لیے بالواسطہ (Symbolism) کا طریقہ اختیار کیا ہے جس میں ہیئت اور موضوع کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ رمزیت کا ہر ہر لفظ کسی نہ کسی ذہنی کشمکش کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جس سے لاشعور میں دبی ہوئی یادوں کا ایک سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔ رمزیت کے کسی لفظ کا مفہوم خارجی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر نہیں نکالا جاسکتا کیونکہ یہ تو محض کسی ذہنی کیفیت کی جانب ایک اشارہ کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رمزیت محض الفاظ کا ایک چیستاں معلوم ہوتی ہے۔ ملارمے کہتا ہے 'نظم تو ایک معمہ ہے جس کا حل پڑھنے والوں کو نکالنا چاہیے'۔

جرمنی میں واگنر[3] کی موسیقی رمزیت کی فضا کے لیے بہت سازگار ثابت ہوئی اور فنکاروں نے جا بجا اس سے استفادہ بھی ... کیا۔ اس موسیقی کی مضراب نے یادوں کا ایک طلسمات پیدا کرتی ہے جس کے ذریعہ انسان لاشعور کی پُراسرار اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اس پُراسرار دھندلکے میں بھٹکنے سے انسانی شعور خود بخود منتشر قوتوں سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ رمزیت کا یہی انداز ادرائی فنکاروں میں قبولیت کا باعث بنا۔

کہا جاتا ہے کہ ادرائیت کی تحریک محض دادائیت کے ردعمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جس کا خود اپنا کوئی بڑا محرک نہیں تھا۔ تاریخ کی روشنی میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ بین الاقوامی طور پر ادرائیت کا رجحان اس وقت سے بہت پہلے ہی سے محسوس کیا جارہا تھا جس کے بنیادی عوامل میں فرائڈ کی لاشعور کی بصیرت، ہیگل کے تصوراتی نظریات اور مارکس کے سیاسی افکار شامل تھے جن کا زمانہ دادائیت سے پہلے کا ہے۔ خصوصاً فرائڈ کا پیش کردہ نظریہ لاشعور[4]، انا، فوق الانا اور اصل حقیقت کا نظریہ اس تحریک کا سب سے بڑا محرک کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعہ انسان نے پہلی مرتبہ مافوق الفطرت عناصر سے چھٹکارہ پاکر لاشعور کے ذریعے خود اپنے وجود کی حقیقت اور زندگی کے آلام کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ کہاں تک

---

1. Edschmid Kasimer
2. 'Über den Expressionismus in der Literatur & die neue Dichtung
3. Richard Wagner (1813-1883)
4. Freud 'Unbewusstsein, ich, uberich & Princip der Wirklichkeit

یاب ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے البتہ اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس تجربہ سے انسان نے ایک ایسی حقیقت ضرور پالی جو سرت مادرائی تھی ۔ یہ حقیقت خود اس کی اپنی آگاہی تھی

اسی حقیقت کی تلاش بودلیر، مالارمے اور رین بو کی گہری رمزیت میں پوشیدہ ہے اور اسی منزل تک پہنچنے کے لیے ہُوکو پُراسرار بتی فضا کے جنگلوں سے گزرنا پڑا ہے ۔ کافکا اسی دُنیا کا ایک ہیبت ناک کابوس ہے ۔

جرمن ادب میں نظم میں میرنک[1] اور نثر میں کافکا[2] ماورائیت کے اوّلین علمبردار کہے جاتے ہیں ۔ کافکا کی اہمیت کا سبب اس کا رمزی انداز، اس کے تخیل کی ماورائی اور اس کا عجیب و غریب احساس ہے ۔ اس کا فنی ثنویت اور سائنس کے دور میں بھی پُراسرار عناصر رمزیت کو منواتا ہے ۔ ماورائی فنکار ہونے کی حیثیت اس کے یہاں بھی ہیئت کی عام بے قاعدگیاں پائی جاتی ہیں جہاں وہ خارجیت کے بندھنوں سے آزاد ہو کر محض لاشعور کی دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے اور اس دُنیا کے عجیب و غریب اور منتشر تلازمات کی جانب اشاراتی و علامتی میں اشارے دیتا ہے ۔ وجود اور حقیقت کا انکشاف اس کے فن میں کسی قدر خوف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے ۔ "تغیر[3]" میں انسانی وجود کا مجہول ہو کر ایک ہولناک حشراتی مخلوق میں تبدیل ہو جانا اسی خوف کی علامت ہے جہاں زندگی پر خارجی قوتوں کی یورشیں اسے بے بس کیے دیتی ہیں ۔ تمدن کی پیچیدہ ساخت اور اس کے من مانے اصول و قواعد میں جکڑ جانے کے بعد انسان کرب محسوس کرنے لگتا ہے یہاں کافکا اپنی حسی گرفت میں ان پُراسرار ما فوق طاقتوں کو بھی محسوس کرتا ہے جو غیر مرئی طور پر انسان کا گلا گھونٹ رہی ہیں ۔ یہی احساس "سزا کی بستی[4]" میں شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو جرم و سزا کی ایک پُراسرار لیکن انتہائی ہولناک داستان ہے ۔ اسٹیفن اسپنڈر نے کیا خوب کہا ہے کہ اس منزل پر کافکا آنے والے دور کا پیغمبر نظر آتا ہے کہ 'بے جرم سزا' کا جو میکانی انداز کافکا کے تخیل نے ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ محسوس کر لیا تھا صرف بیس سال کے اندر ہی اندر آؤشوٹس[5] اور دیگر بتیس ۳۲ نازی مقتل گاہوں میں اس کی عملی تشکیل بھی دیکھ لی گئی ۔ اسی طرح "شہری ڈاکٹر[6]" "خواب[7]" اور بعد کے مختصر نثری مجموعہ (Die Erzählungen) کی ایک ایک کہانی اس کے عظیم فن کی نمائندگی کرتی ہے ۔ کافکا کا احساس قاری کو تخیل کی ایک ایسی دُنیا میں پہنچا دیتا ہے جہاں کرب کے ہوتے ہوئے بھی اس کا احساس ختم ہو جاتا ہے ۔ اس جنگ میں وہ جا بجا واہمہ کی مدد لیتا ہے لیکن اس واہمہ پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے اور کبھی کبھی اس اجنبی احساس میں حقیقتیں بھی واہمہ معلوم ہونے لگتی ہیں ۔ اس کی تخلیقات بلاشبہ جاگتے انسان کا خواب ہیں جو خواب ہونے کے باوجود بیدار حقیقتیں نظر آتی ہیں ۔

کافکا کے فن پر اس کی دائم المریض شخصیت، باپ سے اس کے ذہنی تصادم (Father complex) اور "آریائی معاشرے" میں اس کی یہودی نسلیت نے گہرا اثر ڈالا ہے ۔ یہی تمام عناصر اس کو زندگی سے خوف دلانے کا بھی محرک ہوئے یہی وجہ ہے کہ بعض حلقوں میں اس پر شخصیت سے انحراف کا الزام بھی عاید کیا جاتا ہے لیکن کافکا کا فن ایک ایسی دُنیا کی نمائندگی کرتا

---

1. Mernik
2. Franz Kafka
3. 'Die Verwondlung'
4. 'In der Straf Colonie'
5. 'Auschwitz'-the concentration camp.
6. 'Der Landarzt'
7. 'Der Traum'

ہے جو شخصیت کی دار و گیر سے بالاتر ہے۔ ایک نقاد نے اس عظیم فنکار کی شخصیت اور اس کے فن کو "منجمد سمندر" سے تعبیر کیا ہے۔ ایسا سمندر جو اپنے اندر ناقابلِ قیاس وسعت اور بے پناہ عمق کو لیے ہوئے منجمد ہو جائے۔ اس کی بے پایاں وسعت اور گہرائی کے راز تو اسی وقت دیکھے جا سکتے ہیں جب یہ پگھل جائے۔

کافکا کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کا زمانہ جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ ہے جسے ہم "خالص جرمن افسانہ" (Deutsche Erzählung) کہہ سکتے ہیں خواہ وہ فیلیے کے ارتقا سے وجود میں آیا ہو یا قدیم کہانی (Ankdot) کی ترقی یافتہ شکل ہو۔ جیسا کہ مضمون کے ابتدائی حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جرمن ادب میں فیلیے کو اس طرح رواج مل چکا ہے کہ عام طور پر (Short story) کی بجائے غلطی سے فیلیے کا نام دے دیا جاتا ہے حالانکہ تکنیک کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے جس کی وضاحت پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔

اس ضمن میں افسانہ کا نام آتے ہی ہمارے ذہنوں میں فوراً چیخوف، موپساں یا پو کے مثالی افسانوں کا خاکہ ابھرتا ہے جس میں بقول پو "وحدت تاثر" ایک لازمی شرط ہے اور واقعات کی مناسب و موزوں ترتیب محض تاثر کی شدت میں اضافہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ بیان و دیگر پہلوؤں سے عمداً گریز کیا جاتا ہے برخلاف اس کے جرمن افسانوں میں عموماً مضمون کے مطابق کسی جزو کو اکائی مان کر اس کو مکمل حیثیت سے بیان کرنے کے تجربے پائے جاتے ہیں جس سے افسانہ (Short story) کی تکنیک سے ہٹ جاتا ہے اور اس پر پھیلی ہوئی کہانی (Extended Anekdote) کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسے قصے عام طور پر مختصر افسانے کے مقابلہ میں زیادہ طویل ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت کا ہر جرمن افسانہ پر اطلاق ضروری نہیں۔ آج کے جرمن افسانے عام طور پر "وحدتِ تاثر" کی نہج پر ہی لکھے جاتے ہیں جو مختصر افسانہ کا بین الاقوامی معیار ہے۔

جدید جرمن افسانہ کی تشکیل کا زمانہ بدقسمتی سے جرمنی کی تاریخ کا انتہائی ہیجانی زمانہ ہے جسے پکا اور اُبلتا ہوا ([illegible]) زمانہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب جرمنی میں معاشی حالات انتہائی ابتر ہو چکے تھے سارے ملک میں اقتصادی بدحالی، سیاسی عدم استحکام اور سازشوں کا دور دورہ تھا۔ "قومیت" کا دیوانہ وار پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا اور ہٹلر کی پارٹی ہر ممکن طریقے سے پارلیمنٹ (Reichstag) میں اکثریت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ بالآخر یہ افراتفری کا دور ختم ہوا اور جرمنی میں مکمل طور سے ڈکٹیٹرشپ قائم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس ملک کا وہ انقلابی دور شروع ہوتا ہے جس کے سنگین نتائج آج بھی جرمن دنیا بھگت رہی ہے۔ اس انقلاب نے زندگی کے مفہوم کو سرے سے بدل ڈالا جس کا براہ راست اثر ادب پر بھی ہوا۔ اس دور کے بیشتر فنکار اسی ہنگامے سے منسلک رہے ہیں اور ان کی زیادہ تر تخلیقات میں یہی انقلاب سرایت کیے ہوئے ہے لہذا ان مصنفین اور ان کی تخلیقات کو سمجھنے کے لیے اس انقلاب کا پس منظر اور اس کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جرمن ادب پر اس کے اثرات دائمی نوعیت رکھتے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ کا یہ بھی ایک موڑ ہے۔ ۱۹۳۳ء میں نیشنل سوشلسٹ تحریک کی کامیابی سے شروع ہوا اور مسلسل بارہ برس تک انتہائی ڈرامائی انداز میں جاری رہ کر ۱۹۴۵ء میں برلن میں ہٹلر کی خودکشی پر ختم ہو گیا لیکن اس کے دوررس اثرات جرمن زندگی پر آج اور آئندہ بھی محسوس کیے جاتے ہیں جنگ کے خاتمہ پر جرمنی کی سیاسی حیثیت یکسر بدل گئی۔ اس کو بشمول آسٹریا چار فوجی منطقوں میں بانٹ دیا گیا۔ اس وقت ملک کی اقتصادی حالت مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی۔ جنگ کے بعد کے تین سال تک یہی اقتصادی بحران جاری رہا جس کا خاتمہ ۱۹۴۸ء کی کرنسی اصلاحات پر ہوا اور ملک کی معیشت رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امریکی، برطانوی اور فرانسیسی منطقے ملا کر 'وفاقی جمہوریہ جرمنی' (Bundes Republic Deutchland) کی تشکیل کی گئی اور روسی علاقہ میں جداگانہ طور پر ڈیموکریٹک ریپبلک (Deutche Demokratische Republik) کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں اتحادی قوتوں نے باضابطہ طور پر جرمنی سے اپنی سیاسی و فوجی دستبرداری کا اعلان کیا جس کے ساتھ ہی آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کو ان کی روایتی سیاسی غیر جانبداری حاصل ہو گئی۔ جرمنی کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ برلن اتحادیوں اور روس کے درمیان سیاسی اکھاڑہ ثابت ہوا۔ یہ شہر اطراف سے روسی منطقہ سے گھرا ہونے کے باوجود زبردست جنگی اہمیت رکھتا تھا لہذا دونوں حریفوں میں سے کوئی بھی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا۔ اس طرح برلن کی تقسیم عمل میں آئی۔ مشرقی برلن روسی علاقہ تسلیم کیا گیا اور مغربی برلن میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس تینوں طاقتوں کے لیے فوجی منطقے قائم ہو گئے۔ ابتدا میں برلن کی تقسیم محض خاردار تاروں کے ذریعہ عمل میں آئی لیکن بعد میں سیاسی پیچیدگیوں کے باعث پختہ دیوار تعمیر کر دی گئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوار دو علاقوں کے درمیان خطِ فاصل ہے یا خطِ متارکۂ جنگ جبکہ آج بھی اس کے ہر دو طرف موجودہ سیاسی بلاکوں کا زبردست جنگی محاذ قائم ہے۔

جنگ شروع ہوتے ہی ادب میں بھی غیر صحتمندانہ ماحول پیدا ہو گیا۔ جذباتیت کی شدت نے ادب کی اعلیٰ کلاسیکی قدروں کو کمتر اور غیر مفید بنا دیا۔ اس ہیجانی دور کا ادب کس حد تک 'ادبی' کہا جا سکتا ہے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں دشمن سے اندھی نفرت کے مقابلہ میں سچی 'حب الوطنی' کے عناصر کا بھی فقدان ہے۔ ہل یونیورسٹی کے پروفیسر واٹر ہاؤس[1] نے اس جنگی ادبی سرمایہ کی قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ریاضی کا ایک کلیہ دریافت کیا ہے:

Quality of litrature & its moral justification

ان کا کہنا ہے کہ اس دور کے ادبی اوصاف اپنے اخلاقی محاسبہ سے نسبت رکھتے ہیں۔ یعنی اخلاقی محاسبہ جتنا سخت کیا جائے ادب کی قیمت اتنی ہی کمتر دکھائی دے گی۔ اس معیار پر ادب کے اس دور کو بدترین دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے اس عہد کے انتہا پسندانہ نظریات اور خطرناک سیاسی رجحانات نے عام ادب کی ترقی اور اس کے ارتقا کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔

جرمن ادب کی تاریخ میں نازی عہد سے زیادہ سنگین اور مستبد دور آج تک نہیں گزرا۔ اس عہد میں زندگی کے دیگر شعبوں کی مانند ادب پر بھی کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ ہر اس ادبی تخلیق کو "ناپسندیدہ" قرار دیا گیا جس میں "خالص آریائی روح" نہیں

1. Prof. Water House

جاتی تھی اور یہودی مصنف کو "غدار" ٹھہرایا گیا جس کا فن اس جوہر سے خالی تھا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس دور کے لکھنے والوں کی جماعت تھی جن میں سے اکثر یہودی تھے جبکہ یہودی ہونا نازی عہد کا ناقابلِ معافی جرم تھا۔ چنانچہ تمام یہودی ادیب بالتخصیص معتوب کیے گئے ان کے علاوہ وہ تمام ادیب بھی جو غیر یہودی ہونے کے باوجود نیشنل سوشلزم پر یقین نہ رکھتے تھے نازی عتاب کا شکار ہوئے۔ ان میں سے بیشتر کو ملک بدر کر دیا گیا اور وہ ادیب جنہوں نے جرمنی کے حدود میں رہتے ہوئے نازیت کے خلاف آواز اٹھائی زندگی کے بدترین عذاب میں مبتلا کر دیے گئے۔ مئی ۱۹۳۳ء میں نازی حکام نے باضابطہ طور پر ایسی تمام تصانیف نذرِ آتش کر دیں جو ان کے نزدیک "قومی مفاد" کے منافی تھیں اور آئندہ کے لیے ایسی تصانیف کو جرم قرار دے دیا۔

نازی آمریت کے نزدیک صرف وہی ادیب پسندیدہ تھے جو "آریائی فخر" کے ترانے گا سکیں یا پھر "خاک و خون" کے ورد سے قوم کو جنگ کے جہنم میں دھکیل سکیں تاکہ Seig Heil, Seig Heil, Seig (فتح مرحبا، فتح مرحبا) کے فلک شگاف نعروں کی عملی تکمیل کی جا سکے۔ اس قسم کے ادیبوں کو اس دور میں بھی تصنیف و تالیف کی مکمل آزادی رہی ان خوش نصیبوں میں کولبیئر،[1] یوسٹ، بلنک اور گرم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ البتہ بدقسمتوں کی فہرست کا شمار مشکل ہے جنہیں "خاموش" رہنے سے لے کر موت تک کی سزائیں دی گئیں۔ اس سلسلہ میں مشہور ناول نویس جارج ہرمن[2] کی ہولناک موت عبرت ناک واقعہ ہے جسے ۱۹۴۳ء میں آؤشوٹس کے نازی کیمپ میں محض صیہونیت کے مسئلہ پر اظہار خیال کے جرم میں مع تصانیف زندہ جلا دیا گیا۔ یہاں تمام متاثرہ ادیبوں کا تذکرہ ممکن نہیں صرف افسانوی ادب سے متعلق وہ شخصیتیں پیشِ نظر ہیں جن کا تذکرہ مضمون میں شامل ہے۔ یہ وہ ادیب تھے جنہیں بہرحال جرمنی کے حدود میں رہنے کی اجازت حاصل رہی لیکن ان کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

کازمیر،[3] ارنسٹ ینگر، برگن گرین، ہاؤس من اور الزبتھ لینگسر کو "خاموش" رہنے کی سزا دی گئی اور تاحکمِ ثانی تصنیف و تالیف سے روک دیا گیا۔[4] یہی نہیں بلکہ الزبتھ سے جنگ کے دوران فیکٹری میں جبریہ محنت بھی کروائی گئی اور اس کی بڑی لڑکی کو آؤشوٹس کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ الزے آئشنگر[5] کے بہت سے اعزا پولینڈ کے جنگی کیمپوں میں قتل کر دیے گئے۔ اسی طرح وولف گانگ بورشرٹ[6] کو ہٹلر کی حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات رکھنے کے جرم میں دو مرتبہ قید کی سزا بھگتنی پڑی۔ تیسری مرتبہ اسی جرم کے ارتکاب میں اس کو موت کی سزا بھی سنا دی گئی جو بعد میں جبراً روسی محاذ پر بھیجنے کی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔

جبری ترکِ وطن کی سزا پانے والے ادیبوں میں سے کچھ نے پہلے قربِ جوار کے یورپی ممالک مثلاً آسٹریا، سوئٹزرلینڈ، اٹلی،

---

1. Kolbenheyer
   Jost
   Blunk
   Grimm
2. George Hermann
3. Kasimir
   Ernest Junger
   Bergengruen
   Hausmann
   Elisabeth Langgaser
4. Schreib Verbot
5. Ilse Aichinger
6. Wolfgang Borchert

یا فرانس میں پناہ ڈھونڈھنی پڑی لیکن نازی تسلط کے بعد یہ لوگ یہ اقلیم چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان میں تھومس من[1]، برٹولٹ بریشٹ، اسٹیفن سوائیگ، آرنولڈ سوائیگ، اسٹیفن انڈرس، فرانس ویرفل، جورج کائزر، کارل سوگمائر اور ارنسٹ گلیسر جیسے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ ان ادیبوں نے جلاوطنی کے زمانہ میں جو کچھ لکھا وہ تاریخ میں "پناہ گزین ادب" (Emigrantenliteratur) کہلاتا ہے۔ پناہ گزین ادب میں اس دور کے ہنگامی اثرات کے ساتھ ان ممالک کا مقامی رنگ بھی شامل ہو گیا اس کے علاوہ ایک طویل عرصہ تک ملکی اور پناہ گزین ادیبوں کے درمیان کوئی مادی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے اس میں ملکی ماحول سے ہم آہنگی باقی نہ رہ سکی۔ جنگ کے بعد جب ان پناہ گزینوں کو جرمنی واپس آنے کا موقع ملا تو انھیں خود بھی مقامی ماحول بالکل اجنبی محسوس ہونے لگا جس کا اثر ان کی تخلیقات پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اس پس منظر سے اس پُر ہول فضا کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو جرمن ادب پر سراسیمگی، دہشت اور بے یقینی کا باعث بنی۔ جنگ کے بعد بلکہ آج بھی جرمن تخلیقات پر جنگ کا یہی دہشت ناک کابوس مسلط نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے تقریباً تمام بڑے لکھنے والے اسی پُر آشوب عہد کی صدائے بازگشت ہیں۔ میلر فان ڈین بُرک[2] نے اپنی کتاب (Das Dritte Reich) میں اس جابر عہد کو "تیسری حکومت" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کو "پہلی حکومت" اور بسمارک کے جرمنی کو "دوسری حکومت" کہنے کے بعد نیشنل سوشلزم کی عملداری کو "تیسری حکومت" کہتا ہے۔ آج جرمن زبان میں ہٹلر کے جرمنی کے لیے یہی لفظ "تیسری حکومت" طنزیہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے مضمون کا یہ حصّہ بڑی حد تک "تیسری حکومت" ہی سے متعلق ہے۔

یہ افسانوی دور جنگ سے پیشتر کے عہد سے شروع ہو کر موجودہ عہد تک پھیلا ہوا ہے جس میں بے شمار ادبی شخصیتیں شامل ہیں ان تمام کا تذکرہ مضمون کو کتاب بنا دینے کے مترادف ہوگا لہٰذا صرف ان شخصیتوں اور ان کی تخلیقات کے مختصر بیان پر اکتفا کی گئی ہے جو کسی نہ کسی اعتبار سے افسانوی عہد کی ممتاز شخصیتیں ہیں اور جدید جرمن افسانہ کی تشکیل میں ان کے تجربات کا نمایاں حصّہ ہے۔ ان لوگوں کا محض افسانہ نگار ہونا چنداں ضروری نہیں جب کہ بہت سے ادیبوں کے ساتھ یہی معاملہ درپیش ہے۔ یہ لوگ بحیثیت خاص شاعر، ناول نویس یا ڈرامہ نگار ادب میں جانے جاتے ہیں لیکن ان کی افسانوی تخلیقات (خواہ وہ کتنی ہی محدود کیوں نہ ہوں) جرمن افسانہ کی تاریخ میں غیر معمولی اضافہ ہیں۔

یہاں جرمن سے مُراد صرف جرمنی ہی کے اہلِ قلم نہیں بلکہ اس کا دائرہ ان تمام ممالک تک وسیع ہے جہاں جرمن ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی ہے ان میں وسطی اور مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں کے نام آتے ہیں جہاں اور زبانوں کے

---

1. Thomas Mann
Bertolt Brecht.
Stefan Zweig
Arnold Zweig
Stefan Andres
Franz Werfel
George Kaiser
Karl Zuckmeyer
Ernst Glaser

2. Moller van den Bruck

[illegible] لا کی حیثیت سے جرمنی ہی منتقل ہے۔ اس سلسلہ کی سب سے بڑی مثال کافکا ہے جس نے ٹینک ([illegible])
ہونے کے باوجود تمام تصانیف جرمن میں چھوڑی ہیں یا آرتھر کوسٹلر[1] جو ہنگری کا متوطن ہے لیکن ہمیشہ جرمن ہی میں لکھتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ
اور آسٹریا کے ادیب خود جرمن کو اور جرمن حیثیت ہی سے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کی قومی زبان بھی ہے۔

جیسا کہ اب تک بیان کیا جا چکا ہے جنگ سے قبل کے جرمن ادب پر اظہاریت ہی کا رنگ چھایا ہوا تھا فیشل ازم کے رجحان نے اس تحریک کے ماننے والوں میں قومی احساسات کو شدید تر بنا دیا چنانچہ بیر ٹولٹ بریشٹ[2] کے یہاں بھی اجتماعی احساس انقلاب شعور کے ساتھ ظاہر ہوا۔ وائمار جمہوریہ[3] کے آغاز ہی میں اس نے بحیثیت ڈرامہ نگار بڑے جرأت مندانہ تجربات کیے۔ اس کے بیان پسماندگی کا احساس غالب تھا جس کی وجہ سے لہجہ میں تلخی اور جا بجا طنز کے پہلو سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔ کلینڈر کی کہانیاں[4] میں اگرچہ اس کا اسلوب بہت سادہ ہے لیکن اس سادگی میں بھی انقلابی رجحان کی جھلک ملتی ہے اس کا یہی فکری انداز آگے چل کر اشتراکی مسلک سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بریشٹ کی تخلیق " بڑھی عورت[5] " موجودہ جرمن افسانہ کی ایک نمائندہ مثال کہی جا سکتی ہے۔

ہرمن ہیسے[6] سوئٹزرلینڈ کا باشندہ ہے لیکن اس کا انداز خالص جرمن نمونہ کا ہے۔ افسانہ کے علاوہ اس کو ناول نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ادب کا نوبل پرائز حاصل کرنے کے بعد اس کی شہرت بین الاقوامی حلقوں تک پہونچ چکی ہے۔ ہیسے کا اسلوب معنویت سے بھرپور رہنے کے ساتھ ہی بڑا پُر اسرار اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس کے یہاں وقت کا کوئی خاص تعین نہیں۔ وہ جبریت کا قائل ہے اور زندگی کے ناقابل حل مسائل کو انسان کا مقدر جانتا ہے اپنے فن کے بارے میں اس نے ایک جگہ خود بھی کہا ہے

" میں جانتا ہوں، میں کوئی ادیب نہیں۔ ہم آج کے لکھنے والے آرٹ کو کلی کے لیے استعمال کر رہے ہیں جس کی ہمارے سے کوئی ہستی نہیں۔"

ہیسے مسیحیت کے ایک قدیم مسلک پیٹ ازم (Pietism) کا پیرو ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں روحانیت کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔ اسی فرقہ کی ایک خاتون کیتبنرگ[7] اٹھارویں صدی میں گوئٹے کے خیالات پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ مسیحی مبلغ کی حیثیت سے اس کو جوانی میں ہندوستان جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں سے اس نے قدیم ہندو ویدانت اور بدھ فلسفہ کا گہرا اثر قبول کیا جسے اس کی تخلیق سدھارتا[8] میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے اس کی بیشتر تخلیقات میں مشرق و مغرب پہلو بہ پہلو ہی نظر آتے ہیں ابتدائی افسانوی مجموعہ " اس طرف[9] " کا انداز کسی قدر رقت آمیز ہے لیکن بعد کی تخلیقات میں اس کی متنوع شخصیت کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس انداز میں وہ بہت کچھ قدیم جرمن انشا پرداز واسرمن[10] سے ہم آہنگ ہے۔

---

1. Aurther Koestler
2. Bertdt Berecht
3. Weimar Republik
4. 'Kallendergeschichten
5. 'Die Unwurdige Greisen'
6. Hermann Hesse
7. Frau Ketenlerg
8. 'Sidharta'
9. 'Diesseits'
10. Wassermann

جنگ کے بعد کی ناسازگار فضا میں لکھنے والوں میں ایمل اشتراؤس[1]، ویلیم شیفر، ویشرت، فرانس ویرفل، جورج ہیم، اور گوٹ فریڈ بین کے ادیب بھی جانتے ہیں۔ ان کے یہاں فطری حقیقت نگاری میں سماجی شعور بھی نمایاں ہے۔

ایمل اشتراؤس جنوب مغربی خطہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ادب میں اس کا سرمایہ اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن اس نے بدلتی ہوئی قدروں کو نئے زاویوں سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اس کے مقابلہ میں شیفر کا ادبی سرمایہ بہت زیادہ ہے۔ اسلوب میں وہ اگرچہ قدیم اساتذۂ فن کلائسٹ، کیلر اور ہیبل کا تتبع کرتا ہے لیکن اس کا طرزِ انداز اُن سے بالکل مختلف ہے۔ "قصے"[2] "گلوبندکی کہانی"[3] اور "ہولڈرلن کی اقامت گاہ"[4] اس کے جدید اور ترقی یافتہ فن کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں خارجیت نمایاں ہے۔ ویشرت کے یہاں حقائق کا تلخ اظہار ہے۔ وہ انسانیت کا ہمدرد اور اس کی فلاح کا خواہاں ہے چنانچہ آمرانہ عناصر کے خلاف اس کا لہجہ ہمیشہ سخت رہا ہے۔ تیسری حکومت کی علمداری اس کے نزدیک قوت کے عدم توازن کی بدترین مثال ہے۔ ویشرت کا مجموعہ "سفید بیل"[5] شروع سے آخر تک سیاسی شعور کا آئینہ دار ہے۔

ویرفل کے فن میں سچائی اور حقیقت نمایاں ہے۔ غنائی شاعر ہونے کی حیثیت سے نثر میں بھی اس کا لہجہ بہت شیریں اور دل آویز معلوم ہوتا ہے۔ جذبات کی صحیح صحیح ترجمانی کے علاوہ شعوری مسائل کی بھی بہتات نظر آتی ہے۔ نازیت کا ہدف بننے کے بعد وہ ترکِ وطن پر مجبور ہوا۔ چنانچہ پناہ گزیں ادب میں بھی ویرفل کا بڑا حصہ ہے۔

اس عہد کے چند نامور شعرا مثلاً جورج ہیم، ارنسٹ اشٹڈلر اور ٹراکل وغیرہ[6] نے بھی خال خال مختصر نثری تجربے کیے ہیں جو فنی اعتبار سے اتنے اہم نہیں جتنا اُن کا کلام وقیع سمجھا جاتا ہے۔ ہیم اظہاریت پسند شاعر ہے نثر میں بھی اُس کا انداز معتدلانہ خوبیاں رکھتا ہے۔ بین شاعر ہے کی گہرائی بعض اوقات الہام تک پہنچ جاتی ہے۔ گوٹ فریڈ بین ہمعصروں میں سب سے الگ ہے بلکہ منکریت (Nihilism) کے دور میں کسی قدر چونکا دینے والی آواز ہے اس کے یہاں ذہن اور آرٹ دونوں میں نظم و ضبط پایا جاتا ہے اس کی شخصیت میں کسی حد تک رواتی فلسفہ کا پرتو بھی ہے، ایک زمانہ تک اس نے نازیت کی طرفداری بھی کی لیکن اس کی تحریروں میں پروپگنڈائی رنگ نہیں آسکا البتہ فکر کی گہرائی اور فن کی سطح کم ہو گئی۔

رابرٹ والزر[7] کو سوئزر (Swiss) ہونے پر بھی جرمنی کے چوٹی کے لکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ناول نویس ہونے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سی مختصر نیز طویل کہانیاں لکھی ہیں جو اسلوب کی جدت کے ساتھ زبان میں والزر کی مہارت کا نمونہ ہیں۔ زبان میں وہ ہمیشہ اپنی مخصوص جدتوں سے کام لیتا ہے جو مترجمین کے لیے دشواریوں کا سبب بنتی ہیں۔

---

1. Emil Strauss
Wilhelm Shafer
Wiechert
Franz Werfel
George Heym
Gottfried Benn

2. 'Anakdoten'
3. 'Halsbandgeschichte
4. 'Holderlins Einkehr
5. Der Weisse Buffel
6. Ernst Stadler
George Trakl
7. Robert Walser

اسٹیفن سوائیگ[1] ہٹلر کے دور سے متعلق ایک کتاب جدید روایت کے بارے کا حوالہ کرتا ہے اس کی تحریریں چند سیاسی و نفسیاتی حقائق سے علم کی گہرائی دیتی ہیں۔ ایک ماہر فطرت شناس فنکار ہونے کی حیثیت سے اس نے انتہا پسندی کے دور کا تجزیہ کیا تھا اور دونوں کے ابہام سے جو وقت تھا جو حالات کا نتیجہ تھا اس کی طاقت سے باہر تھا اس احساس نے اس کے نفسیاتی سیاست کے عنصر کو نمایاں کر دیا یہی یاسیت اس کی موت کا بھی باعث ہوئی۔ جب [illegible] کے بعد سوائیگ نے برازیل میں عصا [illegible] خودکشی کر لی۔ موجودہ نسل کے لکھنے والوں میں اس کی تخلیقات کو دقیق نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

جنگ کی ہولناک تباہ کاریوں نے ایک مرتبہ جرمن قوم پر جنگ کے بھیانک منظر کو واضح کر دیا اور یہی جنگ دنیا کے [illegible] کی طرح وحشت ناک آسیب کی طرح ذہنوں پر چھا گئی جس کے سائے میں [illegible] 'جنگ'، 'بیاباں'، 'ہنگامہ'، 'قتل و غارتگری'، 'آہ و بکا' اور 'فریاد' سب کچھ دکھائی دینے لگا۔ دوسری جانب ادبیات نے نثر کا انداز بدل ڈالا اور ادبیت کے ساتھ اسلوب پر بھی خصوصی توجہ دی جانے لگی۔ اس کی نمائندگی کامیاب اور ترقی یافتہ صورت میں ایڈشمڈ کاذیمر[2] کے یہاں ملتی ہے۔ اس کا انداز تازہ اور حقیقت آفریں ہے جس میں ذاتی مشاہدات نے اعتماد کی فضا پیدا کی ہے۔ جو عام سے حالات کے نفسیاتی تقاضوں سے دو چار ہو کر بالغ نظر آتا ہے۔

ارنسٹ گلیزر[3] بیان میں خلفشار [illegible] کی ذہنی کیفیت کو [illegible] کا تجزیہ کرتا ہے اس کے برعکس ہرمن کیسٹن[4] کے یہاں اعتماد کی [illegible] نظر نہیں آتی وہ زندگی [illegible] ہو چکا ہے اور ہر شے کو بے یقینی کے عالم میں دیکھتا ہے ایک ستم ظریفی کی فضا آنا سیگرز[5] کی ہے جس کے ہاں بھی شدت [illegible] کے باوجود زندگی کا اثر غالب ہے۔ غیر جمہوری حکومت کے [illegible] نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ بالکل یہی حال ولی بریڈل[6] کے یہاں ملتا ہے اس کا افسانوی سرمایہ کافی ہے جس کا بیشتر حصہ غیر جمہوری حکومت ہی سے متعلق ہے۔

کارل زوکمائر[7] کا انداز کسی قدر شگفتہ ہے وہ اس حرکت فریں دور میں بھی زندگی کے خوش آئند پہلو کو نظر انداز نہیں کرتا۔ طنز کے لطیف حربے سے اس نے جا بجا زندگی کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا احساس دلایا ہے۔ ابتدا میں وہ محض نیم نگار [illegible] کی حیثیت سے جانا جاتا تھا لیکن بعد کی مختصر کہانیوں نے اس کو مختصر افسانہ کی فہرست میں شامل کر دیا۔

اس دور کی ایک منفرد آواز الفریڈ پولگار[8] کی ہے جس کے یہاں حالات کا تجزیہ واضح، مربوط اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ملتا ہے اس کی تخلیقات بلاشبہ اپنے وقت کی انسائیکلوپیڈیا ہیں جن کو دیکھ کر اس دور کے مسائل کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کو زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے جس سے انداز میں شوخی، جدت، طنز اور استعارات کی خوبیاں پیدا کرتا ہے۔ ابتدائی کہانیوں میں [illegible] کو اور کل [illegible]

1. Stefan Zweig
2. Edschmid Kasimir
3. Ernst Glaser — 'Gestern u. Heute'
4. Hermann Kesten — 'Ich bin Zeuge'
5. Anna Segher — 'Schwarz auf weiss'.
6. Willi Bredel
7. Karl Zuckmayer
8. Alfred Polgar

"سفید سیاہ" اور "جوبیکے نقوش میں" "دوسری طرف" اور "شفق میں ملاقات"[1] میں مختصر نثر کے بہترین مجموعے ہیں۔ جوزف ہوفملر[2] نے ان تخلیقات کو آنے والے دور کے کلاسیک سے تعبیر کیا ہے۔

آسٹریا کے کیتھولک حلقوں سے مادیت کی خلاف جو آواز اُٹھائی گئی ہے ان میں ایک آواز میل ماکس[3] کی بھی ہے۔ وہ روحانی قدروں کا علمبردار ہے اور شعور کی تمام کاوشوں کو مذہب کے تابع کر دینا چاہتا ہے۔ اس سے بالکل برعکس آرنولڈ[4] سوائیگ کا ہے جو انسانیت کی ترقی کے لیے یہودی کا احساس پیدا کرنا ——— ضروری سمجھتا ہے۔

ہنگری سے آرتھر کوسٹلر[5] کی شخصیت غیر معمولی صلاحیتوں کی مظہر ہے۔ اس کی بیشتر تخلیقات میں سیاسی عنصر غالب ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی سے لے کر جنگِ عظیم کے بین الاقوامی بحران نے کوسٹلر کو سیاسی بصیرت دی ہے۔ گزشتہ سالوں میں خود ہنگری کے انقلاب سے اس کی تحریریں نمایاں طور پر متاثر معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے ہی تجربات کا دانشورانہ اظہار فان ڈیر ویرنگ[6] کے یہاں ملتا ہے۔ البتہ اُس کے یہاں فرانسیسی انداز کی تقلید موجودہ جرمن روایت کے برعکس نظر آتی ہے۔

ارنسٹ ینگر[7] اس دور کی اہم ترین شخصیتوں میں شامل ہے۔ اس کی شخصیت ادب کے مختلف شعبوں پر حاوی ہے۔ اس عہد کی سیاسی و نفسیاتی اُلجھنوں کو اس نے اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ کہیں کہیں ماحول کا عمیق مشاہدہ اس کو قنوطی بھی بنا دیتا ہے اور یکایک منکریت کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ برتری کا احساس اُس کے یہاں بھی ہے لیکن فسطائی فلسفے کے ساتھ نہیں۔ ینگر کی تخلیقات پر مادیت کا اثر بھی نمایاں ہے خصوصاً جدید اشاریت میں اس کو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔

جنگ سے کچھ سال پیشتر یا اس کے دوران ادب پر سیاست جس انداز سے اثر انداز ہوئی اس کے نتیجے میں انتہا پسند گروہ نے ادب کو بھی سیاسی تحریک بنا دیا۔ ان لوگوں نے اپنا مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نیشنل سوشلزم کو مختلف صورتوں کے ساتھ ذہنوں پر مسلط کرنے کی جدوجہد کی اور بہرا مکالمہ طریقہ سے قومی جذبات کو مشتعل کیا۔ کولبن ہیئر، بلنک، گرم، زیلش[8] وغیرہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نظریات کا محرک خود جرمنی کا اپنا ماضی تھا جس کی تاریخ میں پسماندگی اور بیچارگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے ان خطرات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا جو مستقبل میں اس قوم کا مقدر بننے والے تھے چنانچہ فسطائی فلسفے کے بموجب اپنے آئیڈیل کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنا، خواہ اس کا انجام ہلاکت ہی کیوں نہ ہو، ان کے ذہنوں پر بھی مسلط تھا۔ اس انتہا درجہ کی جذباتیت نے ادب کو خالص پروپیگنڈا بنا دیا۔ بلنک کا مجموعہ "گہر میں آگ"[9] اسی رنگ کی ایک عمدہ مثال ہے۔

---

1. 'Anderseits'
   'Begegnung im Zwie licht.
2. Joseph Hofmiller
3. Mell Max
4. Arnold Zweig
5. Aurther Koestler
6. Von der Viring
7. Ernst Junger
8. Kolbenheyer
   Blunck
   Grimm
   Zellich
9. 'Feuer im Nebel.'

زندگی کے حقائق کو فنیانہ بصیرت سے پرکھنے کا انداز گزشتہ کے عہد سے جرمن ادب میں رائج ہے۔ ہنس کاروسا[1] کے یہاں یہ بصیرت الہامی انداز میں پائی جاتی ہے۔ وہ بظاہر تمدن کی پرانی قدروں کا پابند ہے لیکن حقائق کو ہمیشہ نئے زاویوں سے پیش کرتا ہے حقیقت اور اشاریت کے پردے میں کہنا اس کی سب سے بڑی فنکاری ہے جس میں جا بجا فلسفیانہ تعمق ملتا ہے۔ اس کے برعکس ہرمن کلاڈیس[2] کے یہاں فلسفیانہ باحث کی کوئی اہمیت نہیں وہ روزمرہ کے مسائل ہی کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے۔ ہنس فرانک[3] کی تخلیقات زبان و بیان کی خوبیوں سے مزین ملتی ہیں وہ خیالات کی ترجمانی کے لیے ہمیشہ دلچسپ پیرایہ ڈھونڈتا ہے۔ منفریڈ ہاؤس مین[4] کا انداز ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح قاری کو مختلف دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ بنیادی حیثیت سے وہ روایت پسند ہے اور قدیم المانی زندگی کو دلکش انداز سے پیش کرتا ہے۔

ولہیلم لے من[5] کے یہاں بعض بنی مارواتوں کی ترجمانی ہے اسی طرح زیریں جرمنی کے مقبول افسانہ نگار ارنسٹ پیٹر[6] کے یہاں بھی مسائل کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کارل ہنس اشٹرول[7] نے جدید مختصر افسانہ کی ترقی یافتہ ٹیکنیک استعمال کی ہے جس میں مشاہدے کی شدت کے ساتھ تخیل کی سطح بھی بلند ہے۔ بشوف فریڈرش[8] نے زندگی کے اہم مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ وہ قدیم روایت کا منکر ہے اور اس کو ذہنی ناآسودگی کا سبب بتاتا ہے۔ اس کا موضوع جدید روایت ہے جس میں اس کے خیال کے مطابق تخیل حقیقت سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

آسٹریا سے تعلق رکھنے والی ایک آواز ہائنرش واگریل[9] ہے جس کے اسلوب پر دوستوفسکی کا فنی اثر انداز ہوا ہے۔ اس اضطرابی دور میں اینا زیڈل[10] کا تشفی آمیز لہجہ وقتی تشفی کا موجب ہوتا ہے۔ فن کی انتہائی پختگی کے ساتھ وہ زندگی کے شدائد پر اور انہ شفقت کے ساتھ تسلی دیتی ہے۔ سب کچھ ہو جانے کے باوجود اس کو یقین ہے کہ بھٹکی ہوئی روحیں سکون پا جائیں گی اور اس دن دنیا کے سارے دکھ درد مٹ جائیں گے۔ خود اسی کے الفاظ میں۔

"ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب ماؤں کے آنسو اتنی مقدار میں جمع ہو جائیں گے کہ جنگ کا غضب ناک شعلہ خود بخود بجھ جائے گا۔"

تسلی کا ایک بڑا ذریعہ مذہب بھی ہے چنانچہ گیرٹرڈ فون لے فورٹ[11] کے یہاں خالص روحانی فضا ہے جس میں روایتی اور دیومالائی حکایتیں بھی کیتھولک تصوف میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح اشٹیفن انڈریس[12] کی تخلیقات میں خود اس کی کلیسا کی تربیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی اور گزشتہ جنگ عظیم کے تجربات نے اس کے فن کو بھی شدت سے متاثر کیا ہے۔ اس کی تخلیقات میں جوش و ولولہ کا بھی عنصر غالب ہے۔ زبان کی صحت اور تخیل کی جدت کے لحاظ سے اس کو آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

---

1. Hans Carossa
2. Hermann Cladius
3. Hans Frank
4. Manfried Hausmann
5. Wilhelm Lehmenn
6. Ernst Peter
7. Karl Hans Strobl
8. Bischoff Friedrich
9. Heinrich Waggrel
10. Ina Siedel
11. Gertude von Lefort
12. Stefan Anders

سنجیدہ مزاج کے مضمون کو ارنسٹ پینزولڈ[1] نے بڑی عمدگی سے نبھایا ہے اس کا انداز بہت کچھ ہرمن ہیسے سے ملتا جلتا ہے طنز کے ساتھ نفاست اور حسنِ بیان کی خوبیاں برٹنگ جورج[2] کے یہاں ملتی ہیں وہ حقیقت پسند تحریک کا نمائندہ ہے اور عام انسانی کمزوریوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ مقصدیت سے بھرپور تجربات ولف گانگ ملر[3] نے کیے ہیں۔ البرشٹ گوز[4] کی تحریریں تلخ حقائق سے پُر نظر آتی ہیں۔ وہ تیسری حکومت کی بداعمالیوں پر سفاکانہ انداز میں تبصرہ کرتا ہے اس کے ساتھ ہی آنے والے دور سے پُرامید بھی ہے لیکن والٹر جینس[5] اور ہرمن لینس[6] نے ساری خطاؤں کا سزاوار دوسروں ہی کو گردانا ہے۔ اس دور میں اُن کی یہ قنوطیت بڑی حد تک سیاسی حالات کا تقاضا کہی جا سکتی ہے۔ والٹر کے یہاں سراسیمگی کا احساس بھی غالب ہے لیکن لینس کی تحریروں میں تلخی کے ساتھ ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک ہنگاموں سے زیادہ اہم ان کے اندر پوشیدہ عوامل ہیں جن کو وہ بڑی سنجیدگی سے پرکھتا ہے اس لحاظ سے اس کا اسلوب اوروں سے کچھ مختلف ہے۔

روڈولف بورشارڈ[7] کو ایک عرصہ تک ڈرامہ نویس اور مضمون نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا تھا لیکن بعد کے افسانوی مجموعے نے اس کو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا۔ زندگی کے تمام اور جانے بوجھے مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے وہ زبان کے اعجاز سے عجیب و غریب تاثرات پیدا کرتا ہے۔

پچھلی نصف صدی سے جرمن ادب میں برگنگرین[8] کی کثیر اور مختلف النوع تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس نے جرمن افسانہ کو بھی نئی ٹیکنک سے روشناس کیا ہے اس کا مخصوص فلسفہ بہت وسیع نظر آتا ہے جس میں نفسیات و روحانیت کے مضامین خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ کیتھولک عقیدہ کی پابندی سے وہ عام انسانی قدروں کو سب پر ترجیح دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کو نازی عملداری میں تصنیف و تالیف کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ برگنگرین کے ابتدائی مجموعے "ریوال میں موت"[9] کا رنگ عموماً رومانی ہے لیکن بعد کے مجموعے "آخری شہسوار"[10] اور "آخری شہسوارہ"[11] اس کے فن کی بہترین مثالیں ہیں۔ مختلف حلقوں کی مخالفت کے باوجود اس کو آج کے صفِ اوّل کے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ کے بعد جرمن افسانہ کو نئی ٹیکنک سے پیش کرنے میں پرانے فن کاروں کے ساتھ نئی نسل نے بھی سرگرمی سے حصہ لیا ہے جس کی وجہ سے پچھلے پندرہ برس میں جرمن افسانہ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور آج وہ معیار کے اعتبار سے بین الاقوامی سطح پر نظر آتا ہے۔ اس دور کو جرمن افسانے کی نشاۃ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویڈسن[12] کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "خالص جرمن افسانہ" کا دور یہی زمانہ ہے۔ اس دور کے بیشتر فنکاروں کی تخلیقات جرمن رواج کے مطابق ریڈیو کے ذریعہ سامعین تک پہنچیں اور بعد میں

---

1. Ernst Penzoldt
2. Britting George
3. Wolfgang Muller
4. Abrecht Goes
5. Walter Jens
6. Hermann Lenz
7. Rudolf Borcherdt
8. Bergengruen
9. 'Der Tod von Reval
10. 'Der letzte Rittmeister'
11. 'Die letzte Rittmeisterin
12. Prof. W. Waidson

مستقل تصانیف کی صورت میں آئیں۔

گرڈ گائزر[1] کا نام جنگ کے بعد کی فضا کی عکاسی کے لیے مشہور ہے۔ اس نے جنگ سے واپس ہونے والے فوجیوں کی زندگی پر فنکارانہ انداز میں قلم اٹھایا ہے جس کی تہ میں ایک عظیم ہنگامہ پوشیدہ نظر آتا ہے۔ ہائنس ہوبر[2] کا انداز بڑی حد تک روایتی اسلوب کا کہا جا سکتا ہے۔ افسانے کے مقابلہ میں رپورتاژ میں زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔

ہنس ایرش نوساک[3] بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہے۔ افسانوی ادب میں اس کا سرمایہ جنگ کے بعد کا ہے۔ وہ آج کل کے عام مگر دور رس مسائل پر گہری بصیرت رکھتا ہے۔ روایت سے متعلق نہ ہونے کے باوجود اس کی باریک بینی اور مخصوص اشاریت کہیں کہیں بڑی انداز اختیار کر لیتی ہے۔ "نیکیا"[4]، "موت سے انٹرویو"[5] اور خاص طور پر "سیر سل"[6] اس کی دانشورانہ بصیرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ہلڈے شائمر کی تحریریں دیکھ کر اس ہولناک دور کی یاد تازہ ہوتی ہے جب جرمنی خاک و خون اور کھنڈرات کا ملک ہو گیا تھا۔ جنگ کا خوفناک آسیب اس کی تخلیقات پر بھی چھایا نظر آتا ہے۔ اسی ہنگامے نے اس کو وطن سے دور کر دیا۔ جنگ کے بعد اس کو نورمبرگ کی عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا جہاں اس نے نازی جنگی مجرموں کے مترجم کے فرائض انجام دیے۔ اس کی تحریروں میں انہی حالات کا اثر غالب ہے۔

الزبیتھ لینگسر[7] جنگ سے قبل غنائی شاعرہ اور ناول نویس کی شہرت رکھتی تھی۔ نازی عہد کی "جبری خاموشی" کے بعد ۱۹۴۵ء سے اس نے دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس کی توجہ کا مرکز خصوصیت کے ساتھ مختصر افسانہ رہا۔ چنانچہ اٹھارہ کہانیوں کے مجموعہ "تورنو"[8] سے اس کو افسانہ نگاروں میں بھی صف اوّل کی فن کارہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ تمام کہانیاں جنگ کے دوران یا اس کے فوراً بعد کی لکھی ہوئی ہیں۔ الزبیتھ کی تصانیف بڑی پُر معنی اور اشاراتی انداز کی ہوتی ہیں جن میں جا بجا خود کلامی کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے یہاں خارجی عمل کے مقابلہ میں نفسیاتی تحلیل پر زور ہوتا ہے۔ وہ جرمنی کے متوسط طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ اس کے فن پر بھی جنگ اور صیہونیوں پر نازی آمریت کے اثرات نمایاں ہیں۔

ہرمن کاسک[9] حقیقت کو تخیل سے ماورا جانتا ہے۔ زندگی کے عملی و نظری پہلوؤں پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ وہ ارادے کی استقامت کا قائل ہے۔ تمثیلی افسانوں[10] کے مندرجہ ذیل ہیں میں اس نے اس اندھی تقلید کے خلاف اعلانیہ بغاوت کی جو قومی شعور کو ہلاک کر رہی تھی۔ وہ تمدن کی میکانی ساخت سے بیزار ہے اور تباہ شہروں کے ملبے پر کھڑا ہو کر خواب کی پناہ گاہیں تلاش کرتا ہے۔ اس رمزیت میں جا بجا کافکا کا اثر و نفوذ سرایت کیے نظر آتا ہے۔ اس کا فن حال کی ساری ناامیدیوں اور مایوسیوں کا آئینہ دار ہونے کے باوجود ایک خوش آئند مستقبل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

---

1. Gerd Gaiser
2. Heinz Hober
3. Hans Erich Nossack
4. 'Nekyia'
5. 'Interview mit dem Tode
6. Wolfgang Hildesheimer
7. Elisabeth Langgaesser
8. 'Der Torso'
9. Hermann Kasack
10. 'Der Webstuhl

کرٹ کوزنبرگ[1] اپنے رنگ کا واحد لکھنے والا ہے جس نے معقولات کی ساری حد بندیاں توڑ کر لطائف وتوہم کی فوقیت کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ وہ زندگی کی یکسانیت اور بے کیفی سے اُکتا کر تخیل و مبالغہ کی دُنیا میں جا بستا ہے۔ معقولیت کے خود ساختہ اور مصنوعی ضابطوں پر اس نے نشتر کے حربے استعمال کیے ہیں اس عجیب و غریب انداز میں کہیں کہیں ہوف من کے روایتی انداز کا بھی پرتو نظر آنے لگتا ہے۔ آج کے جرمن افسانہ نگاروں میں کوزنبرگ صفِ اوّل کا فنکار شمار ہوتا ہے۔ اب تک اس کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں "نیلا خواب[2]" "سورج مکھی کے پھول[3]" "زندگی کی شراب[4]" اور "لا بوتیلا[5]" خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

ہائنس ریتسے[6] کے یہاں اخلاقی و مابعد الطبیعاتی اقدار کا پُورا پُورا احترام ہے۔ وہ فرد اور جماعت کے باہمی رشتہ پر فلسفیانہ مباحث سے گریز کرتا ہے لیکن فرد کو معاشرے میں اس کے صحیح مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ معاشرے کی مروجہ قدروں سے مکمل بغاوت نہیں کرتا لیکن اس کے کمزور پہلوؤں پر طنز کے بھرپور حملے کرتا ہے۔ "بے راہ رو[7]" "جنیوا میں سانپ[8]" اور "خود اپنا انعام[9]" اپنے طنزیہ انداز، سادگی اور واقعیت کی بنا پر جدید جرمن افسانوں کے عمدہ مجموعے خیال کیے جاتے ہیں۔

ہائنرش بول[10] موجودہ جرمن افسانہ نگاروں میں چوٹی کا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ جنگ کے باقیات کا اثر اس پر بھی نمایاں ہے لیکن وہ ان مسائل پر مابعد الطبیعاتی بصیرت بھی رکھتا ہے۔ روزمرہ کی جرمن زندگی پر بھی اس کا مشاہدہ بہت عمیق ہے۔ رُوحانیت پر کامل اعتقاد اس کے نزدیک سب مصائب کا مداوا ہے۔ حقیقت کو موثر بنانے کے لیے وہ جا بجا تمثیل کا انداز اختیار کر لیتا ہے۔ "نہ صرف کرسمس کے لیے[11]" "ابتدائی سالوں کی روٹی[12]" "پل پر[13]" یا "چاقو پھینکنے والا[14]" اس ضمن میں اس کی بہترین مختصر کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔

وولف گانگ بورشیرٹ[15] کی شہرت کا سبب اس کی معرکۃ الآرا ڈرامائی تخلیق "دروازے کے باہر[16]" ہے لیکن بعد کے "مکمل مجموعہ" نے اس کو شاعر، افسانہ نگار اور رپورتاژ نویس کی حیثیت سے بھی منوا لیا۔ بورشیرٹ کی افسانوی تخلیقات اگرچہ مروجہ پلاٹ کی پابند نہیں ہوتیں لیکن ان کا دلچسپ اور موثر انداز بیان قاری کو متاثر کرتا ہے۔ اکثر موقعوں پر وہ محض وقتی اور لمحاتی تاثرات کو بھی فنکاری کے ساتھ کینوس پر پھیلا دیتا ہے اس کی تخلیقات اپنے وقت کے ہنگاموں کی جیتی جاگتی داستانیں ہیں جن میں زندگی کی خواہش بھی ہے اور اس سے خوف بھی۔ ان شدائد کے خلاف بورشیرٹ کی آواز ایک واماندہ لیکن شدید احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ نثر میں وہ عظیم جرمن انشا پرداز [illegible] سے متاثر ہوا ہے لیکن ہیئت کی جدید تشکیل میں اس کے تجربے منفرد نوعیت رکھتے ہیں جس کی مثالیں "اس منگل کو[17]" اور "سنگِ گل" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

1. 'Kurt Kusenberg
2. 'Der blaue Traum'
3. 'Die Sonnenblumen'
4. 'Wein auf Lebenzeit'
5. 'La Botella'
6. Heinz Risse
7. 'Irrfahrer'
8. 'Schlangen in Genf
9. 'Belohne dich Selbst'
10. Heinrich Böll
11. 'Nichtnur zur Weinachzeit
12. 'Das brot d. Fruhen Jahre'
13. 'Uber die Brucke'
14. 'Der Man mit dem Messern'
15. Wolfgang Borchert
16. 'Draussen vor der Tur.'
17. 'An diesem Dienstag'

الزے آئشنگر[1] جرمنی کے طبقۂ اناث میں سب سے زیادہ شہرت یافتہ فنکارہ ہے۔ اس کا اسلوب مروجہ انداز سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ روایتی افسانہ کی تشکیل میں الزے کا جوہر بہت نمایاں ہے۔ اس کی تخلیقات میں وقتی جذبات و محسوسات ایک آفاقی گیرا انداز میں پیش ہوتے ہیں۔ ادبیات میں وہ براہ راست کافکا اسکول کا تتبع کرتی ہے چنانچہ اس کے یہاں بھی حقائق، اساطیر، علائم اور اسرار و رموز کی مجہول پہیلیاں قاری کے لیے خواب کی تمثیلوں کا کام کرتی ہیں جن میں تمام ہو کر زمانی و مکانی احساسات ختم ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا تصورات کی دنیا ہی کو حقیقی دنیا سمجھنے لگتا ہے۔ الزے کا ابتدائی افسانوی مجموعہ "بندھا انسان"[2] کے نام سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا تھا جس کا اب تک یورپ کی تمام بڑی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے حال ہی میں فشر لاگ نے اس کی نثری تخلیقات کا ایک اور مجموعہ "معدوم لمحہ"[3] کے نام سے شائع کیا ہے جس میں ادبیات کی جدید ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے۔

الزے کے بیان پر جدید جرمن افسانہ کا جائزہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک کے تمام نامور فنکار شامل ہیں لیکن ان لکھنے والوں کے علاوہ بھی نئی نسل کے اور بہت سے قلم کار ہیں جن کی تخلیقات جرمن اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ لوگ بھی جرمن افسانہ کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں ان کی تخلیقات کا محور آج کی جرمن زندگی ہے جو ناقابل حل مسائل سے دوچار ہے اس ضمن میں جنگ کے باقیات، جرمنی پر یورپ و امریکہ کی یلغار، مختلف معاشروں کا تصادم، سیاسی و نظریاتی کشمکش، برلن کا بحران، ایٹمی خطرات اور سب سے بڑھ کر آنے والی جنگ کا خوف موجودہ لکھنے والوں پر اثر انداز ہے۔ ان فنکاروں میں اندریش الفریڈ[4]، بہائم شوارسباخ[5]، بینڈر ہاؤس، ہربرٹ آئزن رائش، ولی فیرے، ہوگو ہارٹنگ، مائنراڈ انگلن، ولی کرامپ، فرانس ناہل، گیبہارٹ پول، لوئزے رنسر، ارنسٹ شنابل اور ہاؤس شوماخر جیسے قلم کار شامل ہیں ——

۱۷۹۰ء میں گوئٹے نے ادب کی دائمی قدروں کے بارے میں کہا تھا۔
ادب کی دنیا اپنا ایک دوام رکھتی ہے جسے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔ آرٹ کی اس دنیا سے اس جیسی یا اور دوسری نئی دنیائیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ اس دنیا میں ابد کی زندگی سانس لیتی ہے جو ہمیشہ سے بوڑھی، جوان اور

---

1. Ilse Aichinger
2. Der Gefesselte
3. Zu keiner Stunde
4. Andresch Alfred
5. Beheim Schwarzbach
Bender Haus
Herbert Eisenreich
Willi Fehse
Hugo Hartung
Meinrad Inglin
Willi Kramp
Franz Nabl
Gebhart Pohl
Luise Rinser
Ernst Schnabl
Hans Schumacher

بچ رہی ہے۔ آنے والے حوادث اس کی اس ازلی حیثیت کو نہیں بدل سکیں گے اور اس دُنیا میں بسنے والے فن کی سعادتوں سے یوں ہی فیضیاب ہوتے رہیں گے جن کا عام آدمی احساس بھی نہیں کر سکتا۔"

صرف چار سال گزشتہ تھے کہ حالات کے تغیر نے کارولینے[1] شیلگل کے دل میں خدشات پیدا کر دیے۔ ۱۸۰۲ء میں اس نے آنے والے خطرات سے متاثر ہو کر ولیم[2] شیلگل کے نام ایک خط میں لکھا۔

"میرے دوست، مسلسل دوہرائے جا۔ یہ زندگی کس قدر مختصر ہے لیکن پھر بھی کتنی عظیم! بالکل آرٹ کی دُنیا کی مانند۔ نقاد لکھتے رہیں گے، توانا نسلیں پڑھتی رہیں گی، نظام بدل جائیں گے اور جب یہ دُنیا کاغذ کے ایک حقیر پُرزے کی طرح جلے گی تو یاد رکھ آرٹ کا یہ سارا مال و متاع اس بجھتے شعلے کی آخری لپک ثابت ہوگا، اور پھر اندھیرا چھا جائے گا۔"

نہیں کہا جا سکتا آج کی جرمن دُنیا کیا محسوس کر رہی ہے؟ آیا وہ گوئٹے کی اس 'یقینی دہائی' سے مطمئن ہے یا شلیگل والے خطرات سے خائف ——— ؟؟

---

1. Karoline Schlegel
2. Wilhelm Schlegel

۸۰ برس کے بعد

ادارۂ نقوش

مکاتیب نمبر

کی صورت میں

خطوط کا دوسرا غیر مطبوعہ اور نایاب سرمایہ

اردو ادب

کے حوالے کرنے کا اہتمام کر رہا ہے

اگر آپ بھی اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکتے ہوں
تو اس سے دریغ نہ فرمائیں تاکہ ادب کا مکاتیبی باب
ابدیت کی حدوں کو چھوئے

مجلس ترقی اردو لاہور

کی

کلاسیکی اور تحقیقی مطبوعات

(تفصیلی فہرست مفت طلب فرمائیے)

مکتوباتِ سرسید	سرسید احمد خاں	۱۰/--
موعظۂ حسنہ	از ڈپٹی نذیر احمد	۴/۰۰
سوانح مولانا روم	از شبلی نعمانی	۲/۵۰
قصص ہند	از مولانا محمد حسین آزاد	۲/۰۰
آرائشِ محفل	از شیر علی افسوس	۸/۰۰
یادگارِ غالب	از خواجہ الطاف حسین حالی	۹/۰۰
امراؤ جان ادا	از مرزا رسوا لکھنوی	۵/۰۰
فسانۂ مبتلا	از ڈپٹی نذیر احمد دہلوی	۴/۵۰
فردوسِ بریں	از عبدالحلیم شرر	۲/۰۰
مرقعِ لیلیٰ مجنوں	از مرزا رسوا لکھنوی	۲/۵۰
نو رتن	از محمد بخش مہجور	۶/۰۰
سروشِ سخن	از سخن دہلوی	۵/۰۰
خرد افروز	از شیخ حفیظ الدین احمد	۴/۵۰
جوہرِ اخلاق	از جیمز کارکرن	۱/۵۰
جامع الحکایات ہندی		۳/۰۰
اخلاقِ ہندی	از میر بہادر علی حسینی	۳/۰۰
گلِ مغفرت	از حیدر بخش حیدری	۴/۵۰
عجائب القصص	از شاہ عالم ثانی	۹/۰۰
مہتابِ داغ	از داغ دہلوی	۷/۵۰
دیوانِ درد	از خواجہ میر درد	۳/۵۰
رسالۂ گلکرسٹ (قواعد زبان اردو)	از گلکرسٹ	۲/۵۰
بہارِ دانش	از مرزا جان طپش	۳/۰۰
بیتال پچیسی	از مظہر علی خاں ولا	۴/۰۰
بہارستانِ ناز	از حکیم فصیح الدین رنج	۴/۵۰
ملک العزیز ورجنا	از عبدالحلیم شرر	۵/۵۰
واسوختِ امانت		۲/۷۵
مقالاتِ سرسید احمد خاں	چودہ جلدیں	۶۳/۰۰
طوطا کہانی	از حیدر بخش حیدری	۳/۵۰
سکنتلا	از کاظم علی جوان	۲/۲۵
موازنۂ انیس و دبیر	از شبلی نعمانی	۸/۰۰
نشتر	از سجاد حسین انجم	۴/۰۰
باغِ اردو	از میر شیر علی افسوس	۵/۰۰
کلیاتِ مومن	(دو جلدیں)	۱۴/۰۰
توبۃ النصوح	از ڈپٹی نذیر احمد	۷/۷۵
ذوق — سوانح اور انتقاد	از ڈاکٹر تنویر احمد علوی	۸/۰۰
مومن — حالاتِ زندگی	از فائق رام پوری	۵/۵۰
ڈراما نگاری کا فن	از ڈاکٹر محمد اسلم قریشی	۶/۵۰
مرزا محمد ہادی مرزا رسوا	از ڈاکٹر میمونہ بیگم انصاری	۶/۰
اصولِ انتقادِ ادبیات	از سید عابد علی عابد	۹/۰۰
مباحث	از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۱۳/۰
میر امن سے عبدالحق تک	از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	زیرِ طبع
مقالاتِ حافظ محمود شیرانی		زیرِ طبع

سول ایجنٹ

مکتبۂ ادبِ جدید

۱۵ پٹیالہ گراؤنڈ - میکلوڈ روڈ - لاہور

ترقی میں دوش بدوش



تیل کیا ہے؟ روشنی اور توانائی۔ روشنی اور توانائی ترقی اور خوشحالی کا منبع ہیں
توانائی کو عظیم قوت میں تبدیل کرنے اور دور دور تک روشنی پھیلانے کے لئے
بند تعمیر کئے جاتے ہیں۔ وارسک بند پاکستان کی زبردست ترقی کا مظہر ہے اسے
وجود میں لانے کے لئے برماشیل کے تیل سے چلنے والی بیسیوں مشینیں رات
دن مصروف رہیں۔ اور اب وارسک کے بعد منگلا بند کی تعمیر شروع ہو گئی ہے
اس عظیم بند کی تعمیر کے لئے بھی برماشیل ہی تیل فراہم کر رہی ہے
برماشیل کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ ترقی و خوشحالی کے ان عظیم
منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش ہے۔

بھروسے کے قابل — برماشیل



ریب اور دیدہ زیب پارچہ جات

خوش رنگ
اور
خوش وضع



ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ

اسماعیل آباد (ملتان)

کالونی سیلز ڈپو

۴۴، بی ایڈورڈ روڈ صدر راولپنڈی

۴۸، دی مال - لاہور۔

L.A.A. 5/10.

اکیڈمی لائبریری سیریز

پہلا سیٹ

مثنوی گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم، مقدمہ سید وقار عظیم 1/25

فسانۂ مبتلا (ناول) ڈپٹی نذیر احمد مع فرہنگ 2/50

انتخاب مضامین سرسید، مع سوانح تنقید تعارف و فرہنگ 1/25

انتخاب مقالات مہدی، مع تذکرہ و تنقید بابائے اردو 0/75

انتخاب مقالات شبلی، مع تذکرہ و تبصرہ علاء الدین خالد 1/25

دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، فرحت اللہ بیگ 2/-

نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی، فرحت اللہ بیگ 1/25

آزادی و تہذیب، مترجمہ ڈاکٹر عبادت بریلوی 2/50

اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، علامہ شبلی 1/25

الفوز الکبیر، حضرت شاہ ولی اللہ 2/25

الحق الذین، منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ 1/25

خطبات اقبال، مرتبہ رضیہ فرحت بانو 1/25

دوسرا سیٹ

شاہد رعنا (ناول)، قاضی سرفراز حسین 2/-

توبۃ النصوح (ناول)، ڈپٹی نذیر احمد تبصرہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی 2/-

ضدی (ناول) مصنفہ عصمت چغتائی 1/25

چوٹیں (افسانے) مصنفہ عصمت چغتائی 1/70

باغ و بہار، مصنفہ میر امن دہلوی مقدمہ و تذکرہ سید ابوالخیر کشفی 2/-

شریف زادہ (ناول)، مرزا محمد ہادی رسوا مقدمہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی 1/50

مریم مجدلانی (ناولٹ)، مصنفہ مارس ماترلنک ترجمہ جوش ملیح آبادی 1/25

دیوان غالب (مطابق طاہر ایڈیشن) 1/25

امراؤ جان ادا (ناول)، مرزا محمد ہادی رسوا تنقید و تبصرہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی 3/-

اختری بیگم (ناول)، مرزا محمد ہادی رسوا 2/50

بوڑھا اور سمندر (ناول)، مصنفہ ارنسٹ ہیمنگ وے (نوبل انعام یافتہ) ترجمہ تعارف ابن سلیم 2/-

حالی اور نیا تنقیدی شعور، مصنفہ اختر انصاری 1/50

تیسرا سیٹ

دیوان خواجہ میر درد، مرتبہ عبدالباری آسی 1/50

مقدمہ شعر و شاعری، مصنفہ الطاف حسین حالی 1/75

نیرنگ خیال (مضامین) محمد حسین آزاد تبصرہ اعظم کریوی مع فرہنگ 1/75

یادگار غالب (سوانح و شرح) مولانا حالی (جلد اول) مقدمہ سید ابوالخیر کشفی 1/75

یادگار غالب (جلد دوم) مولانا حالی (غالب کی نظم و نثر کا انتخاب) 2/25

زادِ راہ (افسانے)، منشی پریم چند 2/70

موازنہ انیس و دبیر، علامہ شبلی نعمانی (تنقیدی جائزہ) 3/-

ایک لشکر ایک محبوبہ، ترجمہ عسکر عامر (نپولین اور اس کی محبوبہ کے خطوط) 1/25

چھوٹی موٹی (افسانے)، عصمت چغتائی 2/-

قصص ہند (تاریخ) محمد حسین آزاد 2/-

عود ہندی (انشاء) مرزا غالب 2/-

کلیات آتش، مرتبہ و مقدمہ سید وقار عظیم 8/50

چوتھا پانچواں سیٹ

امریکی انتخابات، پروفیسر ولیم آر پینی مین (ایک سیاسی جائزہ) مترجمہ ڈاکٹر احمد عبدالقدیر وغیرہ 1/50

مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین 5/-

ترکی حور (ڈرامہ) آغا حشر کاشمیری 1/50

مسدس حالی (صدی ایڈیشن) مولانا حالی 2/25

مثنوی سحر البیان، میر حسن دہلوی 1/60

شریف بیوی (ناول) حکیم بیگ چغتائی

گلستار (ناول) حکیم بیگ چغتائی

اقتصادی ترقی کے تجرباتی سانچے، جیمز ڈی کالڈ روڈ ترجمہ پروفیسر صوفی گلزار احمد 2/50

اردو اکیڈمی سندھ — بہادر شاہ مارکیٹ، کراچی

پنجاب آفس

اردو مرکز — گنپت روڈ، لاہور

برقِ جہندہ

جوش ملیح آبادی

چرخ ملک شورِ لن ترانی ہے ہائے کیا مدھ بھری جوانی ہے
شوخ ، بے باک ، چلبلی ، مضطر نتھ میں طوفاں، انیٹوں میں بھنور
انکھڑیوں میں غزل سرا کاجل گرمیٔ تن سے کھولتی ہیکل ،
انکھڑیوں میں نہیں یہ نیند کا بھاؤ جوئے صہبا میں چل رہی ہے ناؤ
یوں جوانی کی زد پہ بالک پن جوں ہوا میں حریر کا دامن
کم سنی و شباب کا سنگم رُخ پر اک جھٹپٹے کا ہے عالم
موجِ گل نے ، بدن کو ڈھالا ہے سایۂ شاخِ گل نے پالا ہے
شوخیوں سے ہیں خال و خد روشن موتیوں پر دمک رہی ہے کرن
"جوگیا" کی لٹک تکلم میں بھیرویں کی رکھب تبسم میں
چال میں گھومتا ہے یوں کولا جیسے جھولے دھنا سری جھولا
روئے تاباں پہ ولولے ایسے قصرِ مرمر پہ چاندنی جیسے
یوں اُبلتا ہے جسم سے کندن موجِ زر ہے تمام پیراہن
زیرِ پوشاک شعلۂ دل جُو جیسے پتوں میں پرفشاں جگنو
زلف کی چھاؤں میں طرب گاہیں تار زر کی بنی ہوئی بانہیں

الاماں ! تابِ رخ میں لاکھوں طور
وَقِنا ربّنا عذابَ النور

الھڑ

جوش ملیح آبادی

الھڑ، چنچل، شوخ، دِوانی
بات ہلال، لہجہ کتانی
اپنے سے خود جھینپا تانی
لٹ میں لرزاں پیت کہانی
جیسے کھلتی بال کمانی
آہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

گاہ سراب و گاہے جیحوں
گاہے لیلیٰ، گاہے مجنوں
دن کو "آہا" شب کو "اوں ہوں"
وقتِ ایفا، رشکِ قاروں
وقتِ پیماں، حاتم ثانی
آہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

تن میں بجتا رم جھم ساون
من میں چلتی پُروا سَن سَن
چھنکتا پنڈا، تپتا جوبن
گاہے چھُلیں، گاہے اَن بَن
پل میں شوُم، اور پل میں دانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہوہو، گھن گھور جوانی

دور رہو تو یار خنداں
پاس جو آؤ تیغِ عریاں
خلوتِ کفر و جلوتِ ایماں
پاؤں پڑو تو شاداں فرحاں
ہاتھ بڑھے تو آناکانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہوہو، گھن گھور جوانی

دیکھا مجھ کو ندیا نارے
پلّو ڈھلکا، مچلے دھارے
پلکیں جھپکیں، ٹوٹے تارے
آنکھ جھکا لی، ڈر کے مارے
بھُولی ساری آنی بانی
آہاہا، چت چور جوانی
اوہوہو، گھن گھور جوانی

ایک ٹھمک میں سو ہلکورے
نیناں جیسے پھول کٹورے
کہتے ہیں یہ پاپی ڈورے
گال نہ چھونا سیاں مورے
نہیں تو ہوں گی اور دِوانی
آہا! چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

بائیں چمپا، دہنے بیلا
جوبن لونڈی، گیسند اچھیلا
رنگوں کا وہ مکھ پر ریلا
سندر بن میں جیسے میلا
میلا، جیسے بھور سہانی
آہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

ارل گھسی، اقصر، اچپل
بھٹکتی پلکیں، چبھتا کاجل
گھور بھنور کی تن پہ ہلچل
گھٹ میں آندھی، لٹ میں بادل
جیسے برسیں رات کی رانی
آہا، چت چور جوانی
او ہو ہو، گھنگھور جوانی

تال کے بریں، جھل جھل زیور
لے ہیں، ترچھی موج کوثر
سر کے سر پہ آڑا جھومر
چمکی ہے دھنک کا دہن کے اوپر

بول گلابی، تانیں دھانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

آبی آنچل، سرخ شلوکا
نیناں بھرسے، مکھڑا لوکا
رنگ سنہرا، انگ بھبھوکا
بال کھلے تو جنگل کوکا

بات جو کی تو برسا پانی
آہا ہا، چت چور جوانی
اوہو ہو، گھنگھور جوانی

—



فراق گورکھپوری

فرزانگی بڑھی تو سراسر خوشی گھٹی
اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

میری خطاؤں پر بھی نہیں لطف میں کمی
یعنی تمہاری اب وہ محبت نہیں رہی

تھی تیری چشمِ ناز میں یا میرے دل میں تھی
وہ مے کہ جام ہی میں رہی اور چھلک گئی

اس بزمِ ناز میں جو سنی تھی نہ ان سنی
عشقِ زباں دراز نے وہ اَن کہی کہی

روداد غم وہ میری زباں پر رکی رکی
ہونٹوں پہ تیرے موجِ تبسم تھمی تھمی

شاعر سے کہہ رہی ہے یہ ہونٹوں کی پنکھڑی
سو خوش بیانیوں کا جواب ایک خامشی

فر مر مرے وہ ضبطِ تبسم نہ ہو کہیں
ہونٹوں کی اوٹ میں وہ کرن سی دبی دبی

آزردگیٔ حسن کے صدقے کہ ہونٹ پر
اک مسکراہٹ اور یہ آنکھیں بھری بھری

اے طالبِ بقائے محبت یہ جان لے
ہر چیز آنی جانی ہے ہر شے ہے رفتنی

یہ تو نہیں کہ عشق پہ دائم رہے عتاب
تو مہرباں نہ ہو ور ہو لیکن کبھی کبھی

ساقی ترے نثار دیا ارغوانِ نشاط
لیکن لہو بھی کچھ رگِ پیمانہ دے گئی

یہ سحر کاریاں تری آنکھوں کو وقف ہیں
موسیٰ کے معجزے ہیں نہ جادوئے سامری

بیداریاں بھی منتظر انگڑائیوں کی ہیں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

ہم دیکھتے ہی رہ گئے اندازِ چشمِ ناز
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی

میری فسردگی کو مٹاتے تو میں کہوں
یوں تو تری نگاہ ہے پیغامِ زندگی

ہم شاعروں کو پھونک کے تھی جن کی صبح و شام
دنیا کو یاد آ نہ سکے ان کے نام بھی

میں نے سکونِ حسن کو دیکھا جو غور سے
وہ درد تھا کہ روحِ محبت تڑپ گئی

آئی تھی شاعری سے گلے ملنے روحِ عصر
کہہ کر تجھے فراق کو سونپا گزر گئی



سید عابد علی عابد

بے سبب آپ کا وہ برسرِ احساں ہونا
ناگہاں عقدۂ دشوار کا آساں ہونا

دوستو! دولتِ کونین کہاں ملتی ہے؟
دربدر خاک بسر چاک گریباں ہونا

دلدہی میں تری جانب سے کمی کوئی نہ تھی
میری قسمت میں ہے درماندہ و حیراں ہونا

قفسِ باغ میں وہ شورشِ آہنگِ طیور
وہ مرا فصلِ بہاراں میں غزل خواں ہونا

ناصحا! تجھ کو بہ ایں دشمنیٔ اہلِ نیاز
زیب دیتا تھا درِ ناز کا درباں ہونا

ہمدمو! وقت یہ کہتا ہے کہ اب لازم ہے
رہروِ قتل گہ کوچۂ جاناں ہونا

اے حیا! انجمنِ ناز میں بیٹھا کوئی آڑ
لبِ لعلیں کی جگہ چشم سخن داں ہونا

غمِ دنیا مجھے رکھتا ہے پریشاں خاطر
کاش دیکھوں ترے گیسو کا پریشاں ہونا

مرے جانے کی تمنا میں جیے جاتے ہیں
چارہ گر! دیکھ بیمار کا درماں ہونا

کیا تماشا ہے کہ شہروں کو جلائے عابد
آتشِ لالہ کا صحرا میں فروزاں ہونا

صدائے بے صدا

احمد ندیم قاسمی

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اِس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

جب مل گیا مجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کُنجِ لحد میں بھی میرے لب
یوں بولنے کو بول تو دوں آج بھی، مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹوٹا سکوتِ شب



احمد ندیم قاسمی

آج کی شب تم نہ آپائے، مگر اچھا ہوا
چاندنی روئی ہوئی ہے، چاند ہے ٹوٹا ہوا

شام کا جادو تھا یا شدت تمھاری یاد کی
وقت کیا، مجھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہوا

جان و تن جلتے ہیں لیکن ایک کیفیت کے ساتھ
حسن اک شعلہ تو ہوتا ہے، مگر پگھلا ہوا

ہجر کا احساس تنہائی ہے بے قید مقام
مجھ کو تو صحنِ چمن بھی دامنِ صحرا ہوا

جذبۂ تخلیق نے ماتم کی مہلت ہی نہ دی
ہر لٹے منظر سے اک منظر نیا پیدا ہوا

وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
زندگی پر چھا گیا ہے ایک پل گزرا ہوا

آدمی اک تھا، مگر اس کے ہزاروں روپ تھے
وہ کبھی بندہ، کبھی آقا، کبھی مولا ہوا

کیا سوائے موت، کچھ بھی دستِ قدرت میں نہیں؟
یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مرا دیکھا ہوا

دشمن

قتیل شفائی

میں اور وہ جب ملتے ہیں تنہائی میں
بند کواڑوں پر لہرانے والے کچھ پردوں کے سوا
کوئی اور نہیں ہوتا

میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام سا مچنے لگتا ہے
میں سوچتا ہوں
سب کچھ کہہ دوں
وہ چاہتی ہے
سب کچھ سن لے
ہر بار مگر
کچھ کہنے سننے سے پہلے
اک انجانا سا شخص کوئی
معلوم نہیں کس رستے سے
ان بند کواڑوں کے اندر آجاتا ہے
تب میرے ہونٹوں کے پیچھے
اور اس کے دل کی دھڑکن میں
کہرام مچاتی باتوں کا
اک مدفن سا بن جاتا ہے
تھراتے لب سل جاتے ہیں
گاتی دھڑکن رک جاتی ہے
اس بار مگر
جی چاہتا ہے
اک سازش کرلیں ہم دونوں
جب بند کواڑوں کے اندر

مجبور پرانی عادت سے
وہ شخص اگر پھر آجائے
اس شخص کی روشن آنکھوں کو
ہم داغیں گرم سلاخوں سے
اس شخص کے سنتے کانوں میں

ہم پگھلا ہوا سیسہ بھر دیں
پھر کھول کے بند کواڑوں کو
اور نوچ کے بوجھل پردوں کو
میں بے کھٹکے
سب کچھ کہہ دوں
وہ بن سمجھے
سب کچھ سن لے



قتیل شفائی

نیند کے گہرے سمندر میں جہاں غرقاب تھا ۔۔۔ ایک میں ساحل پہ تھا سو ماہیٔ بے آب تھا

کیا بتاؤں دوستو! ان کے خیال آنے کا حال ۔۔۔ جھلملاتی جھیل میں لرزاں کوئی مہتاب تھا

بہہ گئے آنکھوں سے جب آنسو تو یاد آیا مجھے ۔۔۔ اک جہانِ آرزو آباد زیرِ آب تھا

اب بھی ہے میرے گریباں پر کسی ہاتھوں کی تاب ۔۔۔ کون کہتا ہے خلوصِ دوستاں نایاب تھا

دور مجھ سے ہو گئیں کچھ اس لیے بھی منزلیں ۔۔۔ ہمسفر میرا غلامِ ریشم و کمخواب تھا

بر سرِ محفل سبھی کو مل گیا اعزازِ جام ۔۔۔ ایک دیوانہ ترا بیگانۂ آداب تھا

دل منور ہو گیا اک جلوۂ خورشید سے ۔۔۔ ورنہ میں اب تک فدائے کرمکِ شب تاب تھا

سوچتا رہتا ہوں آنکھیں بند کر کے رات دن ۔۔۔ میں نے دیکھا جو کھلی آنکھوں وہ کیسا خواب تھا

میری کشتی کے لیے آغوش پھیلائے قتیل
یا خدا کی ذات تھی یا حلقۂ گرداب تھا

ایکٹرس کا کنٹریکٹ

مجید امجد

مرا وجود، مری زندگی کا بھید ہے، دیکھ
یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز
یہ ایک روح بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر

ذرا قریب تو آ، دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب جن کی اک جھلک کے لیے
بھی تھیلیوں کے ان جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں

قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم، اَسریا، آنچل
یہی نقاب، مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ادا، مری انگڑائیوں سے ٹسکی ہوئی
یہ آبشار، غلافوں سے گر بھی سکتی ہے
بس ایک شرط! یہ گوہر سطور دستاویز
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
الاؤں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے
ادھر بھی اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے



میکش اکبرآبادی

جنگ میں بھی اک صلح کا پہلو، صلح میں بھی اک جنگ کی آن
اِن گھاتوں کے نام ہیں کیا کیا ان باتوں کو کیا کہتے ہیں

بات ہوائی جیسے بادل، آنکھ جھپکتی جیسے بجلی
جسم مہکتا جیسے گلشن چال لچکتی جیسے لہریں

جسم پہ یوں پوشاک سجی ہے جیسے شبنم پھولوں پر
رنگ سنہری گل گالوں پر جیسے مانک کندن میں

اُس کی زلفیں جیسے ناگن بل کھائے بجلی لہرائے
اور نہ جانے کیسی ہیں وہ چھو کر کس نے دیکھی ہیں

اُس کی آنکھیں؟ اُس کی آنکھیں! کیسی ہیں کیا بتلاؤں
ٹھہریے مجھ کو سوچنے دیجئے اُس کی آنکھیں، اُس کی آنکھیں



شاد عارفی

قدم سنبھل کے بڑھاؤ کہ روشنی کم ہے
اگر یہ بھول نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

گھروں کو آگ لگاؤ کہ روشنی کم ہے
یہیں سے بات بناؤ کہ روشنی کم ہے

جواب یہ کہ کوئی رہنمائے قوم ہیں آپ
اگر کسی کو بتاؤ کہ روشنی کم ہے

سحر کو شام سمجھنا جو بس کی بات نہیں
یہی سوال اُٹھاؤ کہ روشنی کم ہے

شریکِ بزمِ سیاست "ہیں کچھ بجھے چہرے"
ذرا قریب تو آؤ کہ روشنی کم ہے

صدا لگاؤ کہ "آنکھیں عجیب نعمت ہیں"
انھیں یقین دلاؤ کہ روشنی کم ہے

جھپٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لے کر
عوام کو نہ سمجھاؤ کہ روشنی کم ہے

روا نہیں کہ کسی ڈوبتے ستارے کو
چراغِ راہ بناؤ کہ روشنی کم ہے

ذرا پہنچ کے تو دیکھو سوادِ منزل تک
تم اس خبر پہ نہ جاؤ کہ روشنی کم ہے

یہ شاعرانِ غلط ہیں" کہیں گے اک دن شادؔ
ہمیں چراغ دکھاؤ کہ روشنی کم ہے



صوفی تبسم

جن پہ ہیں تیری نظر کے سائے
اُن بہاروں پہ خزاں کیوں آئے

دُور ہیں اہلِ وفا کے مسکن
دل کی آواز کہاں تک جائے

تیری یادوں کی کڑی دیواریں
کون اس شہر سے باہر جائے

آج ہر بات سے جی گھبرایا!
آج ہر بات پہ وہ یاد آئے

کل تھی جس بات سے دل کو تسکین
آج اس بات سے جی گھبرائے

دلِ غمگیں میں امیدوں کا ہجوم
ڈوبتی شام کے لمبے سائے

کھو کے دنیا کو تجھے پایا ہے
تجھ کو کھو دے تو کوئی کیا پائے

ایسے تیور نہ بدلنا اے دوست
دیکھ کر تجھ کو نظر پچھتائے

کتنی شیریں ہے ترے غم کی کسک
لب پہ آئے تو تبسم بن جائے



احسان دانش

تھی کس کو خبر آج یہ قسمت نہ رہے گی
راتوں کو خوشی دن کو مسرت نہ رہے گی

یہ علم کہاں تھا ہمیں پندارِ جنوں کو
آنکھیں بھی اٹھانے کی جسارت نہ رہے گی

پابندِ وفا عشق بھی ملتا ہے بمشکل
اس دین میں یہ شرطِ عبادت نہ رہے گی

شکوہ تو محبت کے بھروسے پہ کیا تھا
یہ کس کو خبر تھی کہ محبت نہ رہے گی

تقدیر تھی یہ عرضِ تمنا کا نتیجہ
معروضِ تمنا کی اجازت نہ رہے گی

بارِ غمِ دنیا تو میسر ہی کسے ہے
بارِ غمِ ہستی کی بھی ہمت نہ رہے گی

آجاؤ کہ آثارِ زمانہ سے ہے ظاہر
اب بھی جو ہے ملنے میں سہولت نہ رہے گی

یہ دن تھا خیالات و تصور سے بھی باہر
ہم سے تمہیں ملنے کی بھی فرصت نہ رہے گی

چل دوگے کہیں چھوڑ کے تنہا مجھے اک دن
تم سے بھی کبھی خط و کتابت نہ رہے گی

درپیش ہیں کچھ میرے جنوں کو وہ مراحل
اب تم کو نہیں پھر مجھے فرصت نہ رہے گی

راتوں کی کہیں گرد سے وہ نکلیں گے تارے
صبحوں کی جبیں پر یہ صباحت نہ رہے گی

دانش یہ زمانے کے رویّے سے ہے ظاہر
باقی کوئی اب قدرِ شرافت نہ رہے گی

ذاتیات

خلیل الرحمٰن اعظمی

جو مجھ پہ بیتی ہے
اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دُکھ اٹھائے ہیں
جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
اُن کو کہنے کا مجھ میں یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگذشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے



ناصر کاظمی

کہاں گئے وہ سخنور جو میرِ محفل تھے
ہمارا کیا ہے بھلا ہم کہاں کے کامل تھے

بھلا ہوا کہ ہمیں یوں بھی کوئی کام نہ تھا
جو ہاتھ ٹوٹ گئے ٹوٹنے کے قابل تھے

حرام ہے جو صراحی کو منہ لگایا ہو
یہ اور بات کہ ہم بھی شریکِ محفل تھے

اب اُن سے آنکھ ملانے کو جی ترستا ہے
کبھی جو لوگ مرے رتجگوں میں شامل تھے

شناوروں کو ترے ڈوبنا ہی تھا منظور
قدم قدم پہ وگرنہ ہزار ساحل تھے



فضا ابن فیضی

ہم تو خیر ہیں جیون بیری خوار ہوئے معتوب ہوئے
ان سے پوچھے کوئی آخر کیوں اتنے محبوب ہوئے

تیرے گیسو کی موجوں سے خوشبو خوشبو راہ گزر
تیرے عارض کے افسانے پھولوں سے منسوب ہوئے

حسن و عشق کی یہ تعریفیں اپنی سمجھ سے باہر ہیں
ہم خود اپنے طالب ٹھہرے خود اپنے مطلوب ہوئے

حد سے زیادہ معصومی بھی وجہِ سزا بن جاتی ہے
کانٹوں سے دامن کو بچایا، پھولوں کے معتوب ہوئے

مصلحتِ ایام نہ تھی، یہ مجبوری حالات کی تھی
ہم ہاتھوں میں پتھر لے کر شیشے سے مرعوب ہوئے

ایک طرح کی شہرت ٹھہری عشق میں یہ رسوائی بھی
جس کی تم نے بات نہ پوچھی اس کے چرچے خوب ہوئے

جب آتا ہے موسمِ گل تو اس کی خبر لے آتا ہے
گویا ہنستے پھول چمن کے سب اس کے مکتوب ہوئے

یہ بھی ہے اک رسمِ زمانہ کیسی ہار وہ کیسی جیت
طوفاں کا رخ پھیرنے والے تنکوں سے مغلوب ہوئے

لوگ نہ جانے عشق میں کیسے دکھ کا رونا روتے ہیں
وہ غم کتنے شیریں نکلے جو تجھ سے منسوب ہوئے

اب جو کچھ ہو، موسمِ گل کے پہلے یہ تیور تو نہ تھے
کتنے نازک غنچے اپنی شاخوں پر مصلوب ہوئے

لے کر دانش و فن کی پونجی ہاتھ سے ہاتھ چھوٹ گیا
ہم فن کار کہاں بن بیٹھے کیوں نہ کوئی مجذوب ہوئے

تیری راہ گزر سے ہٹ کر چلنا اب مشکل ہے فضا
تو نے جو اسلوب نکالے وہ سب کے اسلوب ہوئے



جمیل ملک

نہ زیرِ زمیں ملا ، نہ تہِ آسماں ملا
ہم جس پہ مر مٹے ہیں وہ پیکر کہاں ملا

تم ڈھونڈنے چلے ہو کسے چاند رات میں
کب چاند کو بھی منزلِ شب کا نشاں ملا

ہر اک سے پوچھتا ہوں سرِ رہگزارِ شوق
کیا تم کو راستے میں کوئی ہم زباں ملا

جب زندگی پہ ختم ہوئی شامِ زندگی
وہ مہرباں ملا بھی ہمیں تو کہاں ملا!

پھر اُس کے بعد دل پہ جو گزری گزر گئی
اک شخص زندگی میں ہمیں ناگہاں ملا

ہم آئینہ بھی جس کے مقابل نہ لائے تھے
وہ جب ملا تو ہم سے بہت بدگماں ملا

مرنے کا مرحلہ ہو کہ جینے کی قید ہو
جو غم ملا جمیل غمِ جاوداں ملا



شاعر لکھنوی

پیار کی خوشبو پھیل گئی تو ہوتی ہے رسوائی بھی
محفل سے گھبرانے والے مہکے گی تنہائی بھی

جن آنکھوں کو خشک سمجھ کر تم نے نظر انداز کیا
اُن آنکھوں میں ڈوب گئی ہے دریا کی گہرائی بھی

آئی تھی کیا کیا ارماں لے کر مل نہ سکی دیوانے سے
خالی در پر دستک دے کر لوٹ گئی تنہائی بھی

عشق کی راہ میں چلنے والے اپنے کو تنہا نہ سمجھ
شہرت بن کر ساتھ چلے گی صدیوں کی رسوائی بھی

کس گل کو سینے سے لگائیں کس گل کا دیدار کریں
راہِ بہاراں تکتے تکتے خون ہوئی بینائی بھی

زخم تھا کتنا حسن بیاں پر اُن سے مگر کچھ کہہ نہ سکے
اپنی طلب کی آگ میں جل کر خاک ہوئی گویائی بھی



شاعر لکھنوی

اک اک پل اک ایک برس ہے، روٹھ کے اُن کے جانے سے
ہم لمحوں کو ناپ رہے ہیں صدیوں کے پیمانے سے

الجھے الجھے بکھرے بکھرے، بیگانے بیگانے سے
پاس کھڑے ہو سوچ رہے ہیں کیا پوچھیں دیوانے سے

رخ پہ پسینہ، تیز تنفس، نادم سا احساسِ وفا
ہم پہ سب کچھ بیت گئی ہے ایک ترے شرمانے سے

دل ہے جیسے کھویا کھویا آنکھیں جیسے خواب میں ہیں
کتنی دوری بڑھ جاتی ہے اُس کے قریب آ جانے سے

کارِ جنوں پہ رسوائی کی تہمت رکھنا سہل نہیں
جرأت ہو تو آنکھ ملا کر بات کرو دیوانے سے

دل میں جو تھی اک بوند لہو کی اشکوں میں تبدیل ہوئی
آج حقیقت بھیس بدل کر گزری ہے افسانے سے

پھول بھی غم دیدہ ہیں شاعر، کلیوں کی بھی آنکھ ہے نم
گلشن پر بھی اوس پڑی ہے موسمِ گل کے آنے سے



مظہر امام

اپنے رِستے ہوئے زخموں کی قبا لایا ہوں
زندگی! میری طرف دیکھ! کہ "میں" آیا ہوں

تشنگی حد سے سوا تو نہ تھی مے خواروں کی
جانے کیوں جام اُٹھاتے ہوئے تھرّایا ہوں

کام آئی ہے وہی زلف، جو میری نہ ہوئی
وقت کی دھوپ میں جس وقت میں کمھلایا ہوں

خیریت پوچھنے والے ہیں بہت سنجیدہ
جرم اتنا ہے کہ اک شوخ کا ہمسایہ ہوں

صبح ہو جائے تو اُس پھول کو دیکھوں کہ جسے
میں شبستانِ بہاراں سے اُٹھا لایا ہوں

عصرِ نو! مجھ کو نگاہوں میں چھپا کر رکھ لے
ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا سرمایہ ہوں

نکہتِ آسودہ

شاذ تمکنت

لمس کی آنچ سے ہر پور میں مہکار سی ہے
گردشِ خوں ہے کہ شریانوں میں جھنکار سی ہے

آنکھیں جھکتی ہیں بہ اندازِ حجابِ دوشیں
شب کے ہارے ہوئے کاجل کی چمک مدھم ہے
سخن زیرِ لب و قوسِ تبسم موہوم
احتیاط اتنی کہ کنگن کی کھنک مدھم ہے
چمپئی چھوٹ سی چھنتی ہوئی گھونگھٹ کے تلے
تیز ہے شعلۂ رخ، دل کی کسک مدھم ہے
کھلتی ہوئی انگڑائی کی محرابِ دونیم
شاخِ ہر عضو کے غنچوں کی چٹک مدھم ہے

کون مہکا ہے دمِ صبح سرِ بالشِ ناز
تنِ پُرپیچ و بہ بستر شکنِ آسودہ لیے
موجِ انفاس میں اک نکہتِ آسودہ لیے

فارغ بخاری

بازگشت

سالہا سال پکارا ہے تجھے
زندگی نے کئی گوشوں سے
میری آواز کا جادو لیکن
تیری بے رحم سماعت پہ کبھی چل نہ سکا
اور میں سنتا رہا
اپنی ہی غمزدہ آواز کی گونج

ہمہ اوست

سحر سے لہرا اٹھی
شوخ، نشیلی، چنچل
لہرا اٹھی — تڑپی، اڑی
اڑ کے بنی — سطحِ فلک پر بادل
جھانک کر منزلِ گردوں سے زمیں کو دیکھا
اپنی ہم جنسوں سے جب آنکھ ملی
شرم سے ہو گئی پانی پانی

ناخلف

پیڑ کا خون پی کے شاخیں
پھیلتی بڑھتی ہیں
پھولتی پھلتی ہیں
رفعتوں کے بار کو چھوتی ہیں
بارور ہو کر بھی
سارے جہاں کو فیض یاب
کیوں اپنے پیڑ سے ہیں بے نیاز

نفرت

فارغ بخاری

یہ مسجد یہ مندر یہ دیر و حرم
ہمیشہ ہمیشہ نمایاں رہے جن کی چتون کے خم
یہ اندھی محبت کی قربان گاہیں
حسیں زندگی کی حرارت نگلتی ہوئی سرد راہیں
کھلی کفر و ایماں کی یہ منڈیاں
وفا و محبت کا نیلام ہوتا رہا ہے جہاں
اور ان میں یہ پھیلی ہوئی دور تک
ایک کالی سڑک
خلوص آزماؤں کو بھٹکا رہی ہے
اُفق تا اُفق پھیلتی جا رہی ہے
حرم کے جواں نور کی بے پناہی
سے بھی چھٹ نہ پائی یہ ظالم سیاہی
ہزاروں طرحدار ابھرے مہ و مہر کا خونِ ناحق
بھی لایا نہ سیلِ تباہی
ہمیشہ اسی طور قائم رہا
اس کا سرمایۂ کجکلاہی
اور اب تو ازل سے ابد تک
یہ کالی سڑک
دلوں کے بیاباں میں پھیلی ہوئی دور تک
بھیانک لہو کا سمندر بنی ہے

گناہوں کی ندی

شاد امرتسری

آبنوسی رنگ تیکھے خال و خط
جسم کے اندر کہیں پوشیدہ روحِ بے سکوں
روح اسے پیتی ہوئی آلودگی
آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے

سنگِ اسود کی چٹانوں کے قریں
ریشم و اطلس کی ڈھلوانوں کے خم کے وسط میں
ملگجی کیفیتوں کی لہلہاتی جوئے بار
تیز اور بدمست آنکھوں میں گنہ کی چاشنی
جیسے کوئی دیو داسی خواہشوں کی راہ میں
دیوتاؤں کے بھجن کو تیاگ کر
مندروں کے پروہتوں سے بھاگ کر
اک منش کے جسم کی چاہت کرے کرتی رہے
اور گناہوں کی ندی بہتی رہے .....

آبنوسی رنگ اب تک یاد ہے



شکیب جلالی

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا　　کاش میں پیڑوں کا سایا ہوتا

تو جو اس راہ سے گزرا ہوتا　　تیرا ملبوس بھی کالا ہوتا

میں ہوا ہوں نہ پون ہوں نہ چراغ　　ہمنشیں میرا کوئی کیا ہوتا

زخم پنہاں تو نہ دیکھے گا کوئی　　میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا

کیوں سفینے میں چھپاتا دریا　　گر مجھے پار اترنا ہوتا

بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے　　میں کسی جا تو اکیلا ہوتا

مجھ سے شفاف ہے سینہ کس کا　　چاند اس جھیل میں اترا ہوتا

اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد　　میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا

راکھ کر دیتے جلا کر شعلے　　یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا

کچھ تو آتا مری باتوں کا جواب　　یہ کنواں اور جو گہرا ہوتا

نہ نکلتا جو فضا میں نغمہ　　سینۂ نے میں تڑپتا ہوتا

تھی مقدر میں خزاں ہی تو شکیبؔ
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

پاداش

شکیب جلالی

کبھی اس سبک رَو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو
تمھیں کیا خبر ہے
وہاں ان گنت کھردرے پتھروں کو
سجل پانیوں نے
ملائم، رسیلے، مدھر گیت گا کر
امٹ چکنی گولائیوں کو، ادا سونپ دی ہے

وہ پتھر نہیں تھا
جسے تم نے بے ڈول، اَن گھڑ سمجھ کر
پرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا
اب اس کے سلگتے تراشے
اگر پاؤں میں چبھ گئے ہیں
تو کیوں چیختے ہو؟!



شفقت کاظمی

شکوہ تو کوئی تیرے جہاں سے نہ تھا مجھے
یہ اور بات ہے کہ نہ راس آسکا مجھے

اس طرح میں کسی کی جفا سے ہوں مطمئن
جیسے نہ ہو کسی کی شکایت روا مجھے

قسمت سے وہ نگاہ بھی تیور بدل گئی
لے دے کے جس نگاہ کا تھا آسرا مجھے

منزل پہ آگیا ہوں مگر کچھ نہ پوچھیے
کن سخت مرحلوں سے گذرنا پڑا مجھے

آباد کس دیار میں ہیں اب خبر نہیں
یارانِ رفتہ دے نہ گئے کچھ پتا مجھے

شفقت پھر اُس دیار کی جانب چلا ہوں میں
آئی تھی جس کی خاک سے بُوئے وفا مجھے



بشیر بدر

کتاب دل ہے دکانوں پر بکے گی
زمانے کی نظر تجھ پر پڑے گی

بتاؤ کون ہے جو روک لے گا
محبت جب ہمیں آواز دے گی

ہمارے پاؤں تھک جائیں گے لیکن
گلی تیری سدا چلتی رہے گی

جگاتا ہے مجھے یہ وہم شب بھر
یہ دنیا اب نہ سو کر اٹھ سکے گی

ذرا ٹھہرے ہوئے پانی میں دیکھو
کوئی تصویر ہے جو بول دے گی

شب تاریک کے کاندھے سلامت
ستاروں کی یونہی ڈولی اٹھے گی

بنیں ہم لاکھ مہر و ماہ لیکن
یہ مٹی، مٹی میں آخر ملے گی

یہی ہے دل کی بستی کا طریقہ
ابھی سوئی، ابھی پھر جاگ اٹھے گی

کہیں جاؤں، زمیں کہ آسماں ہو
یہ تنہائی مرا پیچھا کرے گی

نہ جانے دل پہ کس کی بد دعا ہے
یہ بستی ہر برس اجڑا کرے گی



رفعت سلطان

بہار آئی ہے اُس شوخ گلبدن کی طرح
مہک اُٹھا ہے چمن جس کے پیرہن کی طرح

ہمیں بھی ہے کسی شیریں ادا سے عشق، مگر
ہمیں پسند نہیں موت کوہکن کی طرح

اُسی نے کی ہے عطا روشنی زمانے کو
وہ اک نظر کہ ہے تاروں کے بانکپن کی طرح

طلوعِ صبح کی مانند یہ حقیقت ہے
کہ لازوال ہے وہ حسن میرے فن کی طرح

نہ پوچھ مجھ سے کہ میں کیوں ہوں مضطرب زمانہ میں
اُلجھ گیا ہوں تری زلفِ پُرشکن کی طرح

ہزار بار سرِ شام وقتِ غربت میں
وہ یاد آئے ہیں بے ساختہ وطن کی طرح

نہ بے رخی سے مجھے اس طرح مخاطب کر
کہ میرا دل بھی ہے نازک ترے بدن کی طرح

ہوائے دہر سے سینہ ہے مثلِ برگِ خزاں
وہ دیکھ وہ جو کبھی شاداب تھا چمن کی طرح

کہیں سے آئے وہ آوازِ بیت بار کہ دل
خموش ہے کسی ویران انجمن کی طرح

غرورِ اہلِ وطن کو یہ کیا ہوا کہ مجھے
وطن بھی اب نظر آتا نہیں وطن کی طرح

وہ جس کا اسم زبانی بھی ہم نہ پوچھ سکے
چلا گیا ہے کہیں بوئے یاسمن کی طرح

اُسے نہ چاند کہوں میں تو کیا کہوں رفعت
اُتر گیا ہے مرے دل میں جو کرن کی طرح

وقت کا دھارا

صدیق کلیم

روشنی تیز کرو
درد کی لَے تیز کرو
کس کے ہاتھوں میں ہے تقدیر کا ساز ؟

آؤ گاؤ کوئی نغمہ
کہ اب اظہار کا وقت آیا ہے
جل اُٹھے ساز کے تار
پھر کوئی رقص کرو
صبح جب خواب سے اُٹھو تو ہنسی رُخ پہ نمایاں ہو جائے

صبح جب دھوپ کی چھاؤں میں چلو
کبھی اس جسم سے لپٹی ہوئی زنجیر
کبھی افکار کی بوجھل حرکت
آپ ہی آپ سبک ہو جائے

صبح کی پہلی کرن دولت ہے
کس لیے وقت کی مقدار کو کم کرتے ہو ؟
وقت کو دھیان کی لہروں میں بہہ جانے دو
آج پھر وقت کی میزان کو مٹ جانے دو

شہر میں اجنبی

صدیق کلیم

ترا سواگت نہیں کریں گے
جو سارے احباب مل کے بیٹھیں
وہ دل لگی سی - وہ قہقہے سے
جو دو جہاں میں سرخ لہو بن کے بکھرے
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

جو فرق ہو اُن میں ہم ہی کہہ دیں :
وہ خود سے باہر ہیں جب سے شامل ہوا ہوں میں بھی
لہو کی رنگت مہک کا ساماں بنی ہوئی ہے
سفید چاندی حسین لہروں پہ محمل بنی ہے
بہار کا یہ سماں ہے گویا :
یہ ساری چیزیں ہیں اُن کا تحفہ — گراں بہا ہیں !!
یہ جیسے منہ میں زبان ترے ہاتھ میں قلم ہے
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے

یہ کیسی باتیں سنا رہا ہے ؟
یہ بیتے دن کے سرور میں ہیں
یہ چڑھتے دن کا مزاج پرکھیں
کہ تجھ کو جانیں کہ خود کو جانیں
یہ ساز کیا ہے : ارے او مورکھ ! جو آج شب بھی بجا رہا ہے
الگ الگ ہے سبھی کی دُنیا .
یہ دائروں کی طرح ہے اُن کا بس ایک مرکز
جہاں سے چل کر
سمندروں کی طرح بڑھی ہیں - مہیب صورت

ترا جہاں بھی ہے ایک نقطہ
فقط وہ ہے تری رگوں کا
تجھے وہ لیکن بتا تو دیں گے
ترا سواگت نہیں کریں گے



اختر ہوشیارپوری

دولتِ قرار آئے نکہتِ نگار آئے
آنا ہے تو یوں اب کے موسمِ بہار آئے

زندگی کے صحرا میں گونجتا تھا سناٹا
کیسی کیسی منزل تھی ہم جہاں پکار آئے

پھول کھلتے جاتے ہیں کانٹے پھیلتے جاتے ہیں
کیا خبر کسے اب کے وقت سازگار آئے

مینہ کے بعد دھرتی کی کیا بھڑاس نکلی ہے
کاش میری بستی میں ابر بار بار آئے

کارواں میں گُل بھی ہیں گرد بھی ہے کنکر بھی
دیکھیے کہ منزل سے کون کامگار آئے

باغ کے ہوا خواہو جنگلوں میں آ بیٹھو
شاید اس طرف سے ہی دولتِ بہار آئے

کھڑکیاں کھُلی رکھیے شب کو جاگتے رہیے
جانے کب ہواؤں سے لُٹنے زلفِ یار آئے

آندھیوں سے دل نے ساری رات بجتے ہیں
کوئی چارہ ساز آئے کوئی غمگسار آئے

یہ ہے بات اور اختر کوئی بھی نہ کچھ بولے
ورنہ اُن کی محفل سے سب ہی شرمسار آئے



انوار انجم

جہاں بھر سے نہ یوں میرا تذکرہ کیجے
میں دل کا راز ہوں دل سے مرا گلہ کیجے

یہ کیا یقیں کہ سمجھ لے گا ہر اشارہ وہ
لبوں کا فرض نگاہوں سے کیوں ادا کیجے

نصیب میں جو کبھی صبح کا اجالا ہوا
تو مل ہی جائے گا ہر رات کیا دعا کیجے

خلوص کو بھی یہاں مصلحت کہیں گے لوگ
بھلا یہی ہے کسی سے نہ کچھ بھلا کیجے

درِ ہوس پہ ہے ہر لحظہ اک نئی دستک
جو خود سے چھپتے نہ پھریے تو اور کیا کیجے

یہ جی میں ہے کہ ترا بت تراش کر پہروں
ترے حضور کھڑے عرضِ مدعا کیجے

تمہارے حال سے ہو بے خبر نہیں انجم
پر اب بتاؤ کہ کیا رنج کے سوا کیجے

شاعرِ ابہام سے

آغا صادق

اے شاعرِ ابہام یہ ہے طرزِ ادا کیا
لاشے کا ترا شعر، تاثر کی فضا کیا

ہر بات جب اسرار کے پردوں میں چھپی ہو
حاصل ہو اک موہوم سی جدت کے سوا کیا

تبلیغِ حقائق کا ذریعہ ہے تکلم
ہو خونِ حقائق تو تکلم کی ادا کیا

تدبیر کے ڈانڈے جو خموشی سے ملے ہوں
اظہار سے انسان ہو پھر عہدہ برا کیا

یہ جنبشِ لب بھی تو عجب جنبشِ لب ہے
معلوم کسی کو نہ ہوا تو نے کہا کیا

سمجھے وہ مخاطب کہ کہی بات انوکھی
حیران مخاطب کہ مگر اس نے کہا کیا

جب بولنا گویا بھی نہ کہنے کے برابر
کہیے کہ اس انداز میں کہنے کا مزا کیا

جب نطق خموشی کی طرح مہر بلب ہو
پھر نطق کو سمجھے کوئی انعامِ خدا کیا

یہ شعر ہے یا لُغز، سخن ہے کہ معمّا
سمجھیں نہ اگر قاری و سامع کی خطا کیا

الفاظ میں تو ہے معانی کا ذخیرہ
معنی نہ رہے ان میں تو پھر ان میں رہا کیا

مانا کہ اشارات میں بھی لطفِ سخن ہے
جب حد سے بڑھے رمز تو پھر لطفِ ادا کیا

جب شعر کا مطلب نہ ہو شاعر کے شعور میں
ارشاد ہو ارشاد سے محفل کو ملا کیا

کیا شمع کہ جو بن نہ سکے کوئی مشعل
جو راہ نہ دکھلائے وہ نقشِ کفِ پا کیا

لب پر کبھی آئیں تو دلوں میں بھی اتر جائیں
سینے میں رہے گھٹ کے تو وہ آہِ رسا کیا

غالب کی طرح خوش ہے کہ سمجھے نہ کوئی بات
منظور ہوئی تجھ کو سماعت پہ جفا کیا

مقصودِ سخن یہ ہے کہ دل تک ہو رسائی
پہنچے نہ دلوں تک وہ صدا کیا وہ نوا کیا



ضمیر اظہر

کوئی چارہ گر جو ملتا دل و جاں لہو نہ کرتے
سبھی درد بھول جاتے کبھی آہ و ہُو نہ کرتے

گریبانِ چاک ہی ہے ہم وحشیوں کا درماں
ہمیں گر خبر یہ ہوتی گریباں رفو نہ کرتے

غمِ زندگی سے بڑھ کر غمِ آرزو نے مارا
غمِ آرزو نہ ہوتا تو غمِ نمو نہ کرتے

تری بے رخی سے اکثر یہ خیال دل میں گذرا
تری آرزو نہ ہوتی، تری آرزو نہ کرتے

ہمیں یار تھے سبھی کے کوئی یار تھا نہ اپنا
رہ و رسم ہم سے کیسے بھلا پھر عدو نہ کرتے

کھُلا کاوشِ طلب سے یہی راز ہم پہ ظاہر
کوئی جستجو نہ ہوتی، کوئی جستجو نہ کرتے



کسریٰ منہاس

خاک ہونا دلیلِ ہستی ہے — کس بلندی پر اپنی پستی ہے
کاوشِ عشق دل کی ہستی ہے — جان دے کر ملے تو سستی ہے
میری ہستی بھی کوئی ہستی ہے — زندگی موت کو ترستی ہے
کوئی سمجھا نہ آج تک یہ راز — ہر نفس اک فریبِ ہستی ہے
پھر بھی ساحل پہ جا کے دم لیں گے — گو تلاطم میں بحرِ ہستی ہے
یاد آتا ہے کوئی مستِ شباب — جب گھٹا جھوم کر برستی ہے
ہوش آیا تو ہم بھی دیکھیں گے — ان کی آنکھوں میں کتنی مستی ہے
کوچۂ عشق میں یہ راز کھلا — زندگی کیا ہے؟ غم پرستی ہے
حسن مغرور عشق محوِ نیاز — اک بلندی ہے ایک پستی ہے
شعر کہتا ہے ہر کس و ناکس — ہائے یہ جنس کتنی سستی ہے

جس کو کہتے ہیں زندگی کسریٰ !
رنج و غم کی وہ ایک بستی ہے



رضا زیدی

پھیکا ہے کائنات کا ہر نقش رنگ و بو
تم کس قدر حسین ہو تم کتنے خوب رُو

با وصفِ پاسداریِ خاطر نہ کچھ ملا
رسوا ہے اس دیار میں چاہت کی آبرو

اس پیکرِ حسیں کی شعاعیں تھیں الاماں!
ہم اس کو دیکھ بھی نہ سکے اس کے روبرو

گو ہم کبھی یقیں کی حدوں تک نہ جا سکے
لیکن تمام عمر رہی تیری جستجو!

حسن ایک معجزہ ہے، مگر دیرپا نہیں
ادراکِ عشق میں ہے بڑی قوتِ نمو

یہ وحشتِ جنوں ہے کہ تہذیبِ عشق ہے
اٹھی جدھر نگہ نظر آیا ہے تو ہی تو

میں کس طرح بدل کے چلوں جادۂ وفا
تم مقصدِ حیات ہو تم جانِ آرزو

دیکھی ہے ہم نے چہرۂ مہتاب میں رضا
اپنے تخیلات کی تصویر ہو بہو

حُسنِ گریزاں

شاعر ندیم

کہنا بھی جو چاہوں تو نہ کہہ پاؤں کہ کیا ہے
وہ حسنِ گریزاں کہ بہت ہوش رُبا ہے

ہنگامِ حیا ہاتھوں سے آنکھوں کو چھپانا
کچھ شوخی سی ہے شوخیِ ادا سی کچھ ادا ہے

اس ڈر سے پکڑ لینا ڈھلکتا ہوا آنچل
اُبھرے نہ کہیں راز جو سینے میں چھپا ہے

بیٹھی ہو اگر سامنے اُٹھنے میں تکلف
اُٹھ جائے اگر بیٹھنا پھر مرحلہ سا ہے

دو گام بھی چلتی ہے تو بہکی سی روش سے
شاید مری نظروں ہی سے وہ لغزش پا ہے

ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لبوں پر ہے شکایت
نظروں کا مری اس کو بھی احساس رہا ہے

اقرار میں پوشیدہ ہیں انکار کے انداز
انکار میں اقرار کا پہلو بھی چھپا ہے

میرے لیے ہنگامے ہیں اُس دل میں بھی روشن
وہ لاکھ چھپائے مجھے اس کا بھی پتا ہے

وابستہ خوشی سے مری ہے اُس کی خوشی بھی
میں روٹھ گیا ہوں تو اُسے دکھ بھی ہوا ہے

اُٹھنے جو لگوں میں تو ہیں رکنے کے تقاضے
رخصت پر اُن آنکھوں نے مرا پیچھا کیا ہے

وہ میری نگاہوں سے کہیں پردہ نہ کر لے
ڈرتا ہوں یہ کہتے ہوئے تُو میری خدا ہے



شمیم حنفی

ہم ہیں پریت نگر کے باسی ہم سے رسمِ وفا نکلی
ایک ہمارے دم سے یارو دنیا سی دنیا نکلی

ہم کو گماں تھا چاند کے پیالے میں ہوگی صہبائے خلوص
پی جو چکے تو اپنے منہ سے بجھنے جور و جفا نکلی

دنیا والو اوپر دیکھو عرش تلک آ پہنچے ہم
ایک کرن سوزِ الفت کی اپنی راہ نما نکلی

قسمیں دوری کا عالم تھا ہم کس درجہ پریشاں تھے
جس کو ہم دیوار سمجھتے تھے وہ تیری حیا نکلی

اے دل روپ نگر کی گلیوں میں کیا سناٹا ہے
کل جو بستی صحنِ چمن تھی آج اک ویرانہ نکلی

رات نے اپنے بال سمیٹے سورج نے انگڑائی لی
ننھی ننھی کلیوں کا دل خوں کرنے کو صبا نکلی

دونوں عالم تجھ پہ قرباں جذبِ دل، وہ آ بیٹھے یوں
دل نے اس کو یاد کیا ہی تھا کہ وہ پگلی آ نکلی

ہم نے وفا کے راگ الاپے کوئی نہ ان سے مست ہوا
اپنی صدا بھی اس بستی میں آوازِ صحرا نکلی

اے غمِ جاناں اے غمِ جاناں تجھ سے بچ کے کہاں جاتے
دنیا بھی اپنی نظروں میں تیری ایک ادا نکلی

ہائے اسی جنبشِ لب پر چیخ اٹھی ساری دنیا
ہونٹوں تک جو بات نہ آئی جانے کیا سے کیا نکلی

کاسۂ چاند کا لے کر فطرت مانگ رہی حسن کی بھیک
وہ بھولی بھالی سی لڑکی بھی دل کی دریا نکلی



ظہیر صدیقی

شورشِ دہر سے ہے ارض و سما کی قیمت
خندۂ گل سے ہے جس طرح صبا کی قیمت

وہ تو ہم ہی تھے کہ جس نے اسے برتر سمجھا
ورنہ کیا ہوتی خدا جانے خدا کی قیمت

اس کے رگ رگ میں مچلتے ہیں ہزاروں شعلے
ورنہ پھر کیا ہے اس اک برگِ حنا کی قیمت

خون باقی ہے ابھی قلب و جگر میں میرے
دے تو سکتا ہوں ترے ناز و ادا کی قیمت

دل کا ہر قطرۂ خوں وقف تری مژگاں کو
میں تو ہوں مشتاقِ جفا، دوں کیا جفا کی قیمت

چاکِ دامانی و رسوائی و شکستہ کامی!
اور کیا چاہیے اب اپنی وفا کی قیمت

رشکِ فرزانہ ہیں یوں حال پریشاں ہوں میں
دے سکا کون مری چاک قبا کی قیمت

اے ظہیر! آج طلب میری ہوئی مقبول ہے
ہاں ملی آج مری آہِ رسا کی قیمت



حزیں لدھیانوی

وقت ایسا اے حزیں کبھی ہم پر پڑا نہ تھا
سب آشنا تھے، پھر بھی کوئی آشنا نہ تھا

بارِ الم سے اپنے ہی زانو پہ جھک گیا
جو سر کبھی کسی کے بھی آگے جھکا نہ تھا

وہ جس کو حادثات کی صرصر بجھا گئی
دیر و حرم کی شمع تھی دل کا دیا نہ تھا

ہم ہی نے جاگ جاگ کے کاٹی شبِ حیات
ہر شخص کے نصیب میں یہ رتجگا نہ تھا

جینے کو جی لیے مگر اس بے کسی کے ساتھ
جیسے بھرے جہاں میں ہمارا خدا نہ تھا

میں گلشنِ حیات میں نغمہ سرا رہا
گو بجلیوں کی زد میں مرا آشیانہ تھا

رسوائیوں کی آگ میں جلتے نہ کس طرح
دن کو بھی تیرے درد کا سورج چھپا نہ تھا

گونجے گی اب صدائے شکستِ قفس ضرور
قفلِ قفس، قفس کا فقط آب و دانہ تھا

میری نگاہ اُٹھی تو پاتال تک گئی
ہر ذرہ اے حزیں مجھے آئینہ خانہ تھا



شارق میرٹھی

ان کو جب دیکھا ہوا اپنا یہ حال
جیسے دل سے مٹ گیا ہر اک ملال

تبصرے کرتی رہی دنیا مگر
کس نے جانا کون سمجھا دل کا حال

پھر بھی دنیا ہے خراب آرزو
جانتی ہے آرزوؤں کا مآل

ہر نظر اس کی اٹھی کہتی ہوئی
دیکھنے والے ذرا خود کو سنبھال

یوں کہیں ہر ایک کو ملتا ہے یہ
مل گیا جس کو ملا اس کا ملال

آہ شارق حال اس دل کا نہ پوچھ
ماورائے حال ہے اب اس کا سال

سوئمبر

شاہد شیدائی

جب مجھے کوئی جواں جسم نظر آتا ہے
میری ہر سانس تری یاد میں ڈھل جاتی ہے
لمحہ بھر کے لیے رُک جاتی ہے نبضِ ہجراں
لمحہ بھر کے لیے تو پاس چلی آتی ہے!

اس کے ماتھے میں دمکتا ہوا سورج ایسے
تیری بھولی ہوئی صورت کا پتہ دیتا ہے
جیسے عاشق کو جدائی میں چمکتا ہوا چاند
اپنے محبوب کی تصویر دکھا دیتا ہے!

اور پھر نئی مارنس کے شرارے یکسر
میرے جذبات میں یوں آگ لگا دیتے ہیں
جیسے انبار کی جلتی ہوئی سرخی کے ہونٹ
آتشِ وقت کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

زخم کتنے تھے جو کبھی - آج وہ غم پھر چھلکے
مل گئی سردِ تمنا کو حرارت، پھر سے!
اور مے زیست کی تلخی میں گھڑی بھر کیلئے
گھل گئی شہد سے ہونٹوں کی حلاوت، پھر سے!

آج پھر ایک حسینہ کے لبِ خنداں نے
مونالیزا کے تبسم کو بھی شرمایا ہے
سیلِ خواہش پہ دکھا کر مجھے پھر آس کی چھب
چند روز اور مجھے جینے پہ [illegible]

یوں مرا ذہن ترے جسم کی موجوں میں گھرا
جیسے طوفان کی زد میں ہو سمندر کوئی!
اور گردابِ حوادث سے اچانک بچ کر
میری خوش بختی نے جیتا ہو سوئمبر کوئی



نجیب اسلم

اِدھر کچھ اُجالے، اُدھر چند سائے
کوئی سوچتا ہے کہاں بیٹھ جائے

وہ انسان ہے یا کہ رستے کا پتھر
جسے جو بھی گزرے وہ ٹھوکر لگائے

جنھیں خونِ دل دے کے سینچا تھا میں نے
وہی پھول میری نظر تک نہ آئے

غمِ زیست کی تند آندھی میں کوئی
کہاں تک چراغِ تمنا جلائے

سرِ شام کس موڑ پر آ گیا ہوں!
جہاں سب نظر آ رہے ہیں پرائے

یہ دل پر پھر دستکیں دے رہی ہے
کوئی یاد دامن میں آنسو چھپائے

سرِ منزلِ آرزو تیرگی ہے
کسی سے کہو، دل کی شمع جلائے

مجھے یوں دل سے مٹا دینے والے
تجھے بھی اگر کوئی دل سے مٹائے

نجیب اس مسافر کی حالت نہ پوچھو
جسے چاندنی بھی نہ رستہ دکھائے



مظفر حنفی

چونکہ میں "مسخرہ خاصا ہوں میخانہ" نہیں
اس لیے پہچان کر بھی اُس نے پہچانا نہیں

آدمی "اونچی اڑانیں" لے رہا ہے آج کل
آدمیت ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں

مسکرا کر جب شگوفوں نے کہی "خوش آمدید"
ہاتھ پھولوں نے ہلائے "اس طرف آنا نہیں"

بدظنی پھیلا رہا ہے میرے اس کے دل کا چور
میں بھی دیوانہ نہیں ہوں وہ بھی دیوانہ نہیں

بزم میں "پروانہ ہائے رواداری" شرط ہیں
شمع اس غم میں سلگتی ہے کہ پروانہ نہیں

مجھ کو یہ اصرار "پھولوں کی جھلک" دکھلائیے
آپ کو یہ ضد کہ "گلشن ہے یہ ویرانہ نہیں"

اے مظفرؔ طنزیہ غزلوں کے دشمن ہیں بہت
اور میرا رشتہ میں غزلوں سے یارانہ نہیں!

سندباد جہازی کا سفرِ آخرت

(صوتی تمثیل)

ابو سعید قریشی

(ملاحوں کا نغمہ اور سمندر کا شور آہستہ آہستہ ابھریں
اور پھر عقب میں چلے جائیں)

د: یہ کیسا نغمہ ہے؟
کیسے سانے ہیں؟
یہ سفینے؟

(ہوا کا شور)

یہ بادبانوں سے اُڑتے بادل
دریدہ دامن

(ہوا کا شور اور ساحل سے ٹکراتی لہریں)

ری رگوں میں
ہو کی لہریں
ہجومِ سینہ زناں کی مانند
گونجتی ہیں
سیہ چٹانوں پہ جیسے کشتی
ہجومِ موجِ بلا کے آگے
کر جھکائے
سکونِ ساحل کی آرزو میں سفینہ کوئی ۔ فگار سینہ
صدائے گریہ پہ ڈولتا ہو

(طوفان اور چیخ و پکار)

یہ کیسا ہنگامۂ ہاؤ ہو ہے؟

(طوفان تھم جائے اور پھر چند ساعت کی مکمل
خاموشی کے بعد

مری نگاہوں میں دھند کے یہ دبیز پردے
کبھی اُجالے کبھی اندھیرے کی چلمنوں پر مچل رہے ہیں
یہ پگھلے سیسے پہ سرمئی سا مہیب گنبد
افق افق سمت و سُو سے عاری
نشانِ منزل کہیں نہ ساحل
نہ رونقِ روشن نہ جلوۂ شب
نگارِ شمس و قمر کہیں پر —
نہ رقصِ زہرہ!
عجیب صحرائے بے کراں ہے
رمِ غزالاں کہیں نہ محمل
عروسِ لالہ کہیں نہ شبنم
سراب ہے نے صبا و صرصر
رباطِ راہگزاں نہ صوتِ نفیر و شہنا
عجیب دریائے چیستاں ہے
فسوں زدہ
گنگ

مہیب طوفاں
نوید بادہ وہ ہے نے کہیں نوائے پیامِ طوفاں
گریہ آواز غرقِ دریا
فغانِ غولِ ہیولیٰ برپا
صدائے صور و ہجومِ حشر آشیاں

یہ کیا ہے؟
میرے سفینے پہ شور و شیون
یہ التجا ہیں؟
(طوفان اور تیز و تند ہو جاتا ہے۔ ناخدا کی دعا
میں خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے)

ناخدا: خدائے آدم و داؤد و یونس و یعقوب
ترے اشارے سے گلزار نارِ ابراہیم
عصائے موسیٰ و ہارون معجزے تیرے
روانی نیل بنی راہِ بنی اسرائیل:
ترے ارادے سے صحرا میں چشمۂ زمزم
خدائے برتر و قدوس و ربِّ اسمٰعیل
خدائے رحمتِ کونین
خدائے احمدِ مرسل ﷺ
ترا نفس تنِ مردہ میں زندگی کا لہو
ترے اشارے سے شق القمر۔ شہادتِ حق
ترے کرم سے سفینے کئی کنارے لگے
ترا کرم ہو تو یہ کشتی جنہیں بھی آج
بچا لے حلقۂ گرداب سے نکل جائے

(طوفان!)

سندباد: میرے اللہ
یہ موجِ جنوں خیز و فلک بوس و زمیں دوز
یہ دیدۂ گرداب
منزل ہے کہ انجام کا آغاز
(طوفان تھم جاتا ہے)

یہ ساحلِ صد پارہ و کف زا
یہ خواب ہے یا خواب کی تعبیر

صدف!
کنارا!
قطار نخیل و دشت و جبل
عروسِ تاک و خمار ہوائے توبہ شکن
ہجومِ لالہ و گل
دورِ عشق و عہدِ شباب
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کی شادابی
فسانۂ شبِ رفتہ
فسونِ زہد گداز
(دور سے قوالی کی آواز میں ہے)
خیز و در کاسۂ زر آبِ طربناک انداز
پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز

سندباد: ایک آواز کی لہر جانے کیا کیا خوش خاطرے
لیے آتی ہے
دلِ خوں گشتہ کے دکھوں ارماں
مے دیرینہ و معشوقِ جواں
طلبِ لالہ رخاں
نغمۂ ناہید گلو
لیلیٰ زلفِ محبوب
ہوسِ عشرتِ نایاب

لذتِ لمسِ لبِ ماہوشاں
عقدۂ بندِ قبا
گرمیِ آغوشِ بتاں
ساقِ سیمیں کا فسوں
رنگِ جنوں
ساز و نیاز
نغمہ و سازِ صدائے صدفِ گوہر تاب

یہ کون سا ساحل ہے
میں کہاں ہوں
مرا سفینہ
ابھی یہاں تھا
ابھی نہیں ہے
مرے سفر کا یہی تھا حاصل
سوال بن کر مری نگاہوں میں زندگی پھر ابھر رہی ہے
نئے جزیرے
نئے نشیمن
نئی نئی امتحاں کی راہیں
(لہریں ابھر کر ڈوب سی جاتی ہیں)
سند باد: اے مردِ پیر کون ہے تو
پیرِ تسمہ پا: ملک التجار
میرا نام
مگر میری کہانی
اک قصۂ طولانی ہے
الف لیلیٰ کی طرح
بات سے بات نکل آئے
یوں
شمعوں کی لہرائیں
بھڑک کر بجھ جائیں
مگر قصہ میرا ختم نہ ہو
امتحاں ایک سے ایک
حسرت و شوقِ سفر کے عنواں
بحرِ زخار
سفینے
طوفان
شہرِ بغداد کی گلیوں میں سنانے کے لیے
شاہزادی کے شبستاں کے طلسم
مگر ... میری نقاہت
میری آواز
حلق میں کانٹا ہوئی جاتی ہے
مجھ کو اس چشمے پہ لے چل میرے دوست
میرے پاؤں
سنگریزوں کی چبھن سے میرے زخمی پاؤں
مجھ میں اب چلنے کی طاقت بھی نہیں
آہ!
ایسے نہیں
جس طرح
شہرِ بغداد کے حمال
اپنے کاندھے پہ اٹھاتے ہیں کوئی بوجھ
اٹھا
سند باد: شہرِ بغداد کے حمال
تو انھیں جانتا ہے

میرے قدموں کے وہ رسیا ہیں
شرِ مغل
وہ مجھے جانتے ہیں
پیرِ تسمہ پا : ایک قاتل ہی کیا تو بھی مجھے جانتا ہے
تو کون ہے
میں کون
کیا ہے یہ کہانی
یہ سحر ہے
عقدہ ہے
طلسمات ہے
احساس ہے یا سایۂ احساس
یہ کردہ گناہوں کی سزا ہے
کہ ستم
ناکام تمناؤں کا
احساس زیاں کا
تو کون ہے
میں کون ہوں
اس چشمے کے آئینے میں پہچان
(سندباد کی چیخ پر پیرِ تسمہ پا کے قہقہے)
سندباد : اُف یہ عفریت
میرا ہی عکس نظر آتا ہے
میری ہی مسخ شدہ صورت ہے
میرے کندھوں سے اُتر
میرے سینے پہ تیرے پاؤں کی قینچی
مری شہ رگ پہ ترا ہاتھ
اُف میرا سانس — میرا سانس (ہانپتا ہے)

پیرِ تسمہ پا : (قہقہہ) میں کون ہوں
تو کون ہے
اے جان گیا اب (قہقہہ)
سندباد : (ہانپتے ہوئے) شیطان ! (بوڑھے کا قہقہہ)
پیرِ تسمہ پا : شیطان کہ فرشتہ ہوں کہ انساں
میں تجھ سے ہوں
تو مجھ سے ہے

نادان
غمِ ہستی کا نہیں کوئی بجز مرگ علاج
سندباد : بادۂ تاک مگر
ذلتِ زیست

ستم رانیٔ احساس کا ہے یہ بھی علاج
آگہی ایک اذیت ہے مگر
مگر

زہر ہی زہر کا تریاق ہوا کرتا ہے
بے خودی بادہ انگور میں ڈھل جائے گی
میرے عفریت کو آج
سایۂ تاک نگل جائے گا

(چیختا ہے — ہنستا ہے)
پیرِ تسمہ پا : اے — تو یہ کیا پیتا ہے
سندباد : یہ بھی ایک راز ہے
سربستہ و محفوظ
پیرِ تسمہ پا : بتا
سندباد : آہ
مگر میرا گلا
میری شہ رگ پہ تیرا ہاتھ ہے

بولیں کیسے

پیرِتسمہ پا: لے
چھوڑ دیا
اب بول
تو یہ کیا چیتا ہے

سندباد: نسخۂ عمرِ جواں
آبِ بقا
مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب

پیرِتسمہ پا: مرگِ پیری کا علاج
نسخۂ عہدِ شباب
راحت و عیشِ دوام

سندباد: خضر و الیاس کا سربستہ و محفوظ طلسم

پیرِتسمہ پا: آہ یہ آتشِ سیال
میری رگ رگ میں جوانی کی اُمنگ
بادباں بن کے مجھے
کسی انجانے جزیرے میں لیے جاتی ہے

سندباد: ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
یہ گرمیِ جذبات سے گدرائے ہوئے جسم
ہے کاشی کا مندر کہ یہ جمنا کا کنارا
ہے شامِ سراندیپ کہ یہ صبحِ بنارس
یہ لعبتِ بغداد ہے یا دخترِ بابل
رقاصۂ افلاک کی پازیب سے اُڑتے ہوئے جگنو

(رقص کی موسیقی جس میں ذیل کی غزل تحلیل ہو جائے
نسوانی آوازیں)

غزل

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
رونقِ شہرِ غزالاں ہے قریب آجاؤ
میری بانہوں میں امیدوں کے کنول کھلتے ہیں
دعوتِ موجِ بہاراں ہے قریب آجاؤ
آرزو صاعقہ ساماں ہے قریب آجاؤ
جنتِ پہلوئے جاناں ہے قریب آجاؤ
قریب آجاؤ
قریب — اور قریب

(موسیقی ڈوب کر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

سندباد: مگر پاس آکر بھی تم دور کیوں ہو
تمہارے تنفس کی آواز
اک سرد شعلہ ہے
حدت سے عاری
جلاتے نہیں ہیں شرارے تمہارے لبوں کو
تمہیں پاس پاکر بھی آغوش خالی ہے میری
تمہارے بدن کی تمازت کہاں کھو گئی ہے
بتاؤ
بتاؤ
تمہاری گھٹاؤں سی زلفوں میں آسودگی کیوں نہیں
تمہاری نگاہوں میں یہ فاصلے
دور سے دور تر کیوں چلے جا رہے ہیں
کنارے پہ ملاح کو چھوڑ کر جیسے کشتی رواں ہو

عورت: نہیں تو
تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جا رہی ہوں
یہیں ہوں

نہیں تھی
قفس کی سرگوشیوں کی طرح
بوسۂ گل کی طرح

سندباد : ان کہی جیسے کوئی
ادھوری کہانی
مگر کون ہو تم؟

عورت : تیرا خواب
تصویر
تخیل، جھونکا ہوا کا
کرشمہ، تصور کی تخلیق
تیری تمنا کا
خواہش کی جادوگری کا ہیولیٰ

(بجلی، طوفان)

سندباد : جانے اب کونسا ساحل مری تقدیر میں ہے
کونسا تیرا ابھی حلقۂ تقدیر میں ہے
جانے کس کشورِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
مجھ کو یہ موجِ بلا
سفر کب میرا ختم بھی ہوگا کبھی

(آوازیں)

آواز ۱ : یہ محل کیسا ہے
کیسا گنبد ہے
بلبلا سا درونِ صحرا
نہ در، نہ دربان

م ۲ : نہیں نہیں
یہ نہیں ہے گنبد
تو پھر یہ کیا ہے

ش : کسی کے عجب حسن کا [illegible]
جہاں دشتِ جفا
وفا کا نشان روشن

م ۱ : نہیں نہیں
یہ کسی جفا جو جہاں گزیدہ کی خانقہ ہے

ش : نہ محل ہے یہ
نہ خانقہ ہے
نہ مقبرہ ہے

م ۱ : تو پھر یہ کیا ہے

ش : سبا کے آثار
یہ خزانہ ہے
شہِ بلقیس و سلیمان کا
ایک صحرا نے جس کو صدیوں سے ڈھانپ رکھا تھا
جستجو میں ہزاروں سیاح جس کی نذرِ اجل ہوئے ہیں

م ۱ : ہماری قسمت چمک اٹھی ہے
تو آؤ اب اس کو مل کے ڈھائیں (ہما ہمی)

سندباد : ٹھہر جاؤ
جس کو دفینہ سمجھتے ہو تم
وہ دفینہ نہیں ہے
یہ پتھر نہیں ہے
یہ چونا نہیں ہے
نہیں ہے کوئی سنگ و خشت کی کوئی تعمیر
کہ جس پہ گماں ہو عمارت کا تم کو

م ۲ : مگر کچھ تو ہے یا فقط واہمہ ہے
تمہارے فسانوں کی مانند (قہقہے)

سندباد : سنا ہے سوداگروں کی زبانی
کہ صحرا میں رخ نام
اک طائرِ دیو پیکر بھی ہوتا ہے
مجھے یوں نظر آرہا ہے کہ
یہ بیضۂ رخ ہے
اس کو نہ چھیڑو
مبادا کوئی ابتلا ہم پہ نازل ہو اس سے
ع : ہٹاؤ میاں ایسے قصے
ہزاروں سنے ہیں
حکایت تمھارے سفر کی تو صد داستاں ہے
مگر اس کو جاہل ہی مان سکتا ہے
ہم نام تیرا (قہقہہ)
سندباد : مگر جلد بازی کا انجام اچھا نہ ہوگا۔
ش ہٹاؤ میاں
ہم تو آج اس بیضے کو حاصل کریں گے
رہے تم
سو تم
اس کے سائے میں سستاؤ
آہیں بھرو (قہقہے)
اور اگر
کوئی خطرہ ہو
(قہقہے - بیضۂ رخ کو توڑنے کی کوشش - ہاہا ہی)
ارے یہ
یہ اندھیرا سا کیوں چھا گیا ہے
یہ بادل سے کیا ہیں
(رخ کے پروں کا شور)

سندباد : یہ رُخ ہیں بھائی۔
بچاؤ جانیں
وگرنہ آج ایک ایک ہم سے
اجل رسیدہ ہے
چند لمحوں کا مہمان ہے
(بھگدڑ - خوفزدہ - ہجوم - پرندوں کی چیخیں
- پرندوں کی سرسراہٹ جیسے آندھی)
مقدر میں میرے خرابی لکھی ہے
مجھے چھوڑ کر چل دیے میرے ساتھی
گناہوں کا ان کے نتیجہ
مجھی کو بھگتنا پڑے گا
عجب قاعدہ ہے
عجب کھیل ہے یہ سزا و جزا کا
مگر یہ پرندے
چٹانیں لیے اپنے پنجوں میں
کشتی کی جانب
کہاں جا رہے ہیں
(دو سے چیخ پکار اور سمندر میں چٹانیں گرنے کی آواز)
سفینہ ٹوٹ گیا
اور سب میرے ساتھی!
قضا و قدر کے راز آدمی کو کیا معلوم
رہائی کا اس دشتِ بے در سے امکان کیا ہے
نہیں، کچھ نہیں سوجھتا
مجھے سایۂ موت میں زندگی دینے والے
وسیلہ رہائی کا میری
سوائے تیرے

سدکوئی نہیں ہے
مگر یہ صنوبر سا کیا ہے
ستون سا

یہی تو نہیں ہے
نکلنے کا اس دشت بے در سے زینہ
خدا کے پیڑوں پہ چڑھتے ہیں طفل جیسے
اسی طور

میں بھی
چمٹ جاؤں گا پائے زینہ سے
پہنچ جاؤں گا میں میاں شہ پہ
رہائی کا اس دشت بے در سے رستہ

آدمی حسرت پرواز پہ دم دیتا ہے
آج وہ طاقت پرواز میسر ہے مجھے
گوشے گوشے کو جو نظر آتا ہے یہ کرۂ ارض
اس کے سب کوہ و دمن
دشت و جبل
بحر پرشور، نہیں جن سے سفینوں کو مفر
کسی سائل کی ہتھیلی کی طرح
خط تقدیر کی مانند نظر آتے ہیں
کائنات کو اس کے بھی ، سوچتا ہوں
برف کے گالوں کے مانند بچھ جائیں گے
سوچتا ہوں کہ خلاؤں سے خلاؤں سے پرے
کتنی دنیائیں ابھی ابن آدم کی نگاہوں سے
تصور سے نہاں
نیلگوں گنبد افلاک میں پوشیدہ ہیں

کتنے پیکر ابھی اس پردۂ تصویر میں نادیدہ ہیں
سوچتا ہوں کہ مہ و مہر کی روشن قندیل
کونسے منبع انوار کی شرمندہ ہے
کہکشاں کون سے افلاک کی ہے راہگزر
کون ہے ، کس کے ارادے سے ہیں قائم دائم
یہ ستاروں کے مدار
گردش شمس و قمر کون سی پرکار پہ ہے
حیرتی کس کے ہیں یہ لیل و نہار
سوچتا ہوں
کہ نہاں خانۂ ادراک کی بے راہ روی
شوق بے حد کا جنوں
زیست اور زیست کی دریوزہ گری
فکر فردا و غم دوش و ستم رانی امروز
سوچتا ہوں کہ مرے عشق کا انجام یہی ہے تو نہ
مجھ سے پہلے مرے اندیشۂ بیباک سے پہنچا
میری تخلیق سے
تخریب سے پہلے کیا تھا
اس کے انکار
مری لغزش پا سے پہلے
آدم و حوا کی تشہیر سے رسوائی سے پہلے
شجر ممنوعہ تھا کیا ، سوچتا ہوں
کیا کوئی راز تھا ، سربستہ و محفوظ
جس کو وا کرنے کی پاداش میں آج
عیش امروز ہوا مجھ پہ حرام
یہ مری سوچ مگر
مجھ سے کہتی ہے کہ ہے

مری افتادِ زباں کاریٔ ایام کا راز
اک وہی راز کہ سربستہ بھی ہے عام بھی ہے
وائے بے مہریٔ ایام و ستم رانیٔ تدبیر مری
کس خرابے میں مجھے لے گئی تقدیر مری
پیکرِ خاک تھا میں
کرۂ خاک ہوا مجھ کو نصیب
مری پرواز مگر ٹوٹ رہی ہے شاید
قعرِ دریا میں اترتی ہوئی کشتی کی طرح
دل مرا ڈوب رہا ہے سرِ آن
جانے وہ کون سے افلاک تھے روزن تھے
دریچے تھے مرے پیشِ نظر
کون سے خواب کی سوغات تھے
وہ لولوئے انجم [illegible]
[illegible] سے وا سے
[illegible] غبار اب تو ہے تا حدِ نظر
پھر وہی دشت و جبل
[illegible]
[illegible]
سوچتا ہوں شہپرِ خیرہ کی پرواز کا انجام یہی ہونا تھا

پھر وہی میں ہوں
وہی گردشِ ایام بھی ہے
پھر وہی دانہ، وہی دام بھی ہے
[illegible] کب مجھے اک وادیٔ آوارگی میں لے آیا ہے
ایسی وادی کہ نہیں جس میں گزرگاہِ خیال
جس کے غاروں میں نہاں مارِ سیاہ
جس کے سایوں میں پڑے سوتے ہیں
شعلہ فگن
اژدھے
نیشِ عقرب سے سوا جس کی چٹانوں کی چبھن
ایسی وادی کہ جیسے
سحر و افسون و طلسمات کی وادی کیسے
دیو آسا ہیں کھڑے جس کے پہاڑ
حاتم طے کے فسانوں کی فضا ہو جیسے
اک طلسمات کا عالم ہے مرے پیشِ نظر
ان گنت لعل و گہر، نیلم و یاقوت کئی
چاند کا جن پہ گماں ہو وہ زمرد کے شجر
وہ جواہر کہ اندھیروں میں اجالا ہو جائے
رقصِ طاؤس کا ہر سمت گماں ہوتا ہے
ایک اک لعلِ بدخشان و یمن
دُرِ ناسفتہ و نایاب [illegible] کئی
مضطرب ہیں کہ انھیں زینتِ دستار کروں
اس نہاں خانۂ کوہسار کے اسرار
مگر مثلِ کہسار
واہمے بن کے مری راہ میں حائل ہیں
نہیں بن [illegible]
سوچتا ہوں
یہ جواہر نہیں انگارے ہیں
ان طلسمات کی دنیا کے شرارے ہیں جنھیں
کسی جادو نے افسوں کے سلا رکھا ہے
ان کے چھوتے ہی کئی مارِ سیاہ
اژدرِ خوابیدہ کئی
جاگ اٹھیں گے جلا دیں گے مجھے

یا [illegible] سے پھیل جائیں گے یہ نخل دگر
وہ گیا ہے کدھر، وہ بھی غار کے پاس
پھر مری گھات میں شاید ہے وہی مارِ حسیں
مری رسوائی کا ساماں جو بنا
آج پھر دشمنِ دیرینہ مرا
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اس طور
جیسے کتا ہو

شیطان : مقتدر کے وصی

دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں - میرے جنت کے رفیق
تجھ کو بھی یاد ہے وہ باغِ جناں
جس کے سایوں کا خمار
آج بھی تجھ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک بسر
بحر و بر جس کے لیے
ایک ہیچ ہیں تو نے
تجھ کو تو یاد ہی ہوگا لیکن
باغِ جنت میں بھی یہ نخل دگر
تو نے دیکھے تھے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ وہاں اور بھی کیا رکھا تھا
بس شب و روز ثنا خوانی و تسبیح و درود
ایسی یکسانیِ اوقات کہ جی جل جائے
کوئی ہنگامہ نہ شورش
نہ تگاپوئے جہانِ گذراں
دردِ ہجراں نہ کہیں راحتِ وصل
کہیں طوفاں نہ کنارا نہ امیدِ ساحل
آرزو کوئی نہ خواہش نہ خیال
تیری حالت پہ اگر رحم نہ آتا مجھ کو
نسلِ انساں کا نشاں بھی کہیں پیدا ہوتا
ایک تو اُس کے سوا
تیرا ہم جنس بھی واں کوئی نہ تھا
تھا بھی کوئی؟
وہی بے عزم ملائکہ
وہی بے جان حوریں
ان سے نبھتی بھی تو کیسے نبھتی

خیر — اس ذکر کو اب جانے دو
آج ان ساکن و بے کیف فضاؤں کی جگہ
ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
آج تدبیر تری تابعِ تقدیر نہیں
کسی مشاقِ صنم گر کی طرح
خود ترا ہاتھ ہے خلاق ترا
ایک ہی سل میں ہزاروں پیکر
منتظر ہیں تری صناعی کے
میں تو کیا
میں تو خادم ہوں ترا
روزِ ازل کا مداح
خود خداوند بھی قائل ہے ترا
تری ایجاد کا فن کاری کا مداح ہے وہ
تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
پھر بھی زیبا ہے تجھے
اور یہ نخل دگر
یہ ترا بختِ رسا ہے کہ تجھے
آج وہ دولتِ نایاب ملی ہے کہ
سلاطینِ زمن

ہوں ترے در کے غلام
اور حسینانِ جہاں
فرودیتی و قلو پطرہ تائیس و سلومی اک ایک
خلوتِ خاص کی ہوں تیری رفیق
سندباد : ملکۂ حسن فرودیتی و قتالۂ مصر
نازشِ شہرِ سکندر ۔۔ تائیس
اور وہ زنگولۂ بابل ۔۔ سلمے
ابلیس : عشرتِ شمعِ شبستانِ خیال
لذتِ شہرِ تمنائے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے تصدق تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
رعبِ شہی
جاہ و جلال
عظمت و شہرتِ جاوید
کنیزیں ہیں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
ہیچ اندیشۂ فردا ہے
عبث فکرِ زیاں
گر حقیقت ہے تو بس ایک ۔۔ یہی ساعتِ امروز
سندباد : مگر یہ کیا ہے ۔
یہ کون گذرا ہے اس گلی سے
یہ کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پہ جم گیا ہے
مرا گریبان چٹک رہا ہے
مرے لبوں پہ لہو کی بوندیں
مری بہیمانہ آرزوؤں پہ ہنس رہی ہیں

پکس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سلگ رہی ہے
مرے رگ و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیسا کرگس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بگولا سا
میرے لاشے کو لے کے لعل و گہر کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(ڈھول اور لوگوں کا شور جیسے ہانکا ۔ ہرن)
نہ جانے کس سمت "جا رہا ہے مرا سفینہ
کوئی بتاؤ
مرے سفینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے
تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ہے
مرد سایوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے
بتاؤ
بولو
یہ بات کیا ہے
عجب معمہ ہے

یہ مرے ہاتھ کی [illegible] پھل جائیں گے یہ لعل و گہر
وہ جو گیا ہے [illegible] وہ وہیں غار کے پاس
پھر مری گھات میں شاید ہے وہی مارِ حسین
مری رسوائی کا ساماں جو بنا
آج پھر دشمنِ دیرینہ مرا
ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا ہے اس طور
جیسے کہتا ہو

شیطان : مقدر کے دھنی
دیکھ میں تجھ کو کہاں لایا ہوں۔ میرے جنت کے رفیق
تجھ کو بھی یاد ہے وہ باغِ جناں
جس کے سایوں کا خمار
آج بھی تجھ کو لیے پھرتا ہے یوں خاک بسر
تو وہ جس کے لیے
یک بیک ہیں تو نے
تجھ کو تو یاد ہی ہو گا لیکن
باغِ جنت میں بھی یہ لعل و گہر
تو نے دیکھے تھے کبھی
سچ تو یہ ہے کہ وہاں اور بھی کیا رکھا تھا
بس شب و روز ثنا خوانی و تسبیح و درود
ایک ہی یکسانیِ اوقات کہ بس جی ہو سے
کوئی ہنگامہ نہ شورش
نہ کشاکش سے جہانِ گذراں
دردِ ہجراں نہ کبھی راحتِ وصل
کہیں طوفاں نہ کنارا نہ امیدِ ساحل
آرزو کوئی نہ خواہش نہ خیال
تیری حالت پہ اگر رحم نہ آتا مجھ کو

نسلِ انساں کا نشاں بھی کہیں پر ہوتا
ایک حوا کے سوا
تیرا ہم جنس بھی واں کوئی نہ تھا
تھا بھی کوئی؟
وہی بے عزم ملائکہ
وہی بے جان حوریں
ان سے بنتی بھی تو کیسے بنتی
خیر — اس ذکر کو اب جانے دو
آج ان ساکن و بے کیف فضاؤں کی جگہ
ایک دنیا ہے تری تجربہ گاہ
آج تدبیر تری تابعِ تقدیر نہیں
کسی مشتاق صنم گر کی طرح
خود ترا ہاتھ ہے خلاق ترا
ایک تن کل میں ہزاروں پیکر
منتظر ہیں تری صناعی کے
میں تو کیا
میں تو خادم ہوں ترا
روزِ ازل کا مداح
خود خداوند بھی قائل ہے ترا
تری ایجاد کا فن کاری کا مداح ہے وہ
تو اگر خود کو خدا بھی کہہ دے
پھر بھی زیبا ہے تجھے
اور یہ لعل و گہر
یہ ترا بختِ رسا ہے کہ تجھے
آج وہ دولتِ نایاب ملی ہے کہ
سلاطینِ زمن

ہوں ترے در کے غلام
اور حسینانِ جہاں
زرد دیتی و قلوپطرہ تائیس و سلومی اک ایک
خلوتِ خاص کی ہوں تیری رفیق

سندباد : ملکۂ حسن فروتینی و قتالۂ مصر
نازشِ شہرِ سکندر — تائیس
اور وہ رنگولۂ بابل — سلمے

ابلیس : عشرتِ شمعِ شبستانِ خیال
لذتِ شہرِ تمنائے وصال
ایک سے ایک حسین
ان جواہر کے تصدق تیرے مقدور میں ہے
ہیں تصرف میں ترے
رعب شہی
جاہ و جلال
عظمت و شہرتِ جاوید
کنیزیں ہیں تری
بے خطر ہاتھ بڑھا
ہیچ اندیشۂ فردا ہے
عبث فکرِ زیاں
گر حقیقت ہے تو بس ایک — یہی ساعتِ امروز

سندباد : مگر یہ کیا ہے۔
یہ کون گذرا ہے اس گلی سے
یہ کس کے پاؤں کا خون رس رس کے سنگریزوں
پہ جم گیا ہے
مرا گریباں چٹک رہا ہے
مرے لبوں پہ لہو کی بوندیں
مری بہیمانہ آرزوؤں پہ ہنس رہی ہیں
پیاس بن کر مرے گلے میں
ہزار خواہش سلگ رہی ہے
مرے رگ و پے میں پھانس بن کر سرک رہی ہے
میرے سینے پہ بوجھ کیسا ہے
یہ کیسا کرگس ہے
جس کا سایہ
سیہ تعفن کا اک بگولا سا
میرے لاشے کو لے کے دشت و گہر کی وادی سے
جانے کس سمت جا رہا ہے
(ڈھول اور نوگروں کا شور جیسے ہانکا۔ لہریں)
نہ جانے کس سمت "جا رہا ہے مرا سفینہ
کوئی بتاؤ
مرے سفینے کے ناخداؤ
مگر یہ کیا ہے
تمہارے چہروں پہ خوف کیوں ہے
تمہارے ہونٹوں پہ کپکپی بن کے بات کوئی
صدا کو جیسے ترس رہی ہو
تمہارے ہونٹوں پہ پپڑیاں بن کے جم رہی ہیں
تمہاری آہیں
تمہارے سانسوں میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ ہے
سرد سایوں کی سنسنی سی
تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہے
بتاؤ
بولو
یہ بات کیا ہے
عجب تماشا ہے

کچھ تو کہو
تمھارے ہمنفسو
تمھاری زندہ دلی کو کیا ہو گیا ہے ــــ دیکھو
اسے کوئی بات بھی ہو آخر
ہوا موافق ہے
ناؤ سالم ہے
دن کا سورج ہے
شب کو تارے
تو پھر یہ اُکتائے ہوئے سے چہرے
یہ خوف و وحشت
اگر ہمارا نہیں تو کیا ہے
کوئی فسوں ہے کہ جس نے آخر
تمھاری عقل و خرد کو [illegible] کر دیا ہے گویا
اگر نہیں تو تمھاری یادوں نے تم کو دیوانہ کر دیا ہے
مجھے تو سب [illegible]
مجھے بھی یادوں نے ساتھ [illegible]
مگر [illegible] ہے ان کا حاصل
جو یوں نہ ہوتا تو یہ نہ ہوتا
[illegible] ہے یادوں کا تانا بانا
مگر کہاں تک [illegible] میں پوچھتا ہوں
[illegible] ہوا ہے
[illegible] دوران ہے
[illegible] بخشش
[illegible]
[illegible] ہے
تو پھر کہاں تک

غمِ زمانہ کو بھول جاؤ
ہنسو کہ ہر سانس موجِ دریا ہے جو پلٹ کر کبھی نہ آئی
کسے خبر ہے وہ صبح تھی بھی
اگر یہی ہے مآلِ ہستی
تو پھر یہ غم کیوں
مری کنیزیں کہاں ہیں ــــ جاؤ
انھیں بلاؤ
بلاؤ زہرہ جبین و مشتری کو
ہماری محفل میں یادِ ماضی و فکرِ فردا کا ذکر کیا
[illegible] و ربط
ہمارا سفینہ رواں دواں ہے
نہ کوئی صبح تھی نہ کوئی ہوگی
جو سانس جاتی ہے پھر نہ آئے گی
کہ جشنِ طرب مناؤ
(رقص [illegible])
وہ دیکھو کیا ہے!
اُفق کی جانب وہ سوئے مغرب!
میانِ دریا سیاہ جنگل
سراب ہے یا کوئی جزیرہ ہے جس کی تم کو خبر نہیں تھی
مرے سفینے کے ناخدا
ناخدا: یہی وہ ساحل ہے جس کا سایہ
ہمارے چہروں پر خوف بن کر ابھر رہا تھا
اسی کے قصے ہمارے ہونٹوں پہ منجمد تھے
اسی کی وحشت سے سوکھے پتوں کی سرسراہٹ
ہمارے سانسوں میں
بس رہی تھی

یہی وہ جنگل ہے جس کے سایوں میں وہ کشش ہے
کہ اس سے بچ کے کوئی نہ اب تک نکل سکا ہے
یہی ذخیرہ ہے جس کی شاخوں میں ابنِ آدم کے
اب وجد

عروجِ انساں پہ ہنس رہے ہیں
(بندروں کے خوخیانے کی آوازیں۔ عورتوں کی
چیخیں —— دہشت زدہ لوگوں کا شور)

سندباد: اُف خدایا یہ وحوش
مری تہذیب و تمدن کے یہ آئینہ صنعت۔ چہرہ نما
اُف یہ ہمزاد میرے
جانے کشتی کو مری لے کے کہاں جائیں گے
مرا سامانِ سفر
میری تاسیس و سلوی
میرے آلاتِ حرب
میرے تیر
میرے سبو
سب کے سب
اب مرے ہمزاد لیے جاتے ہیں
اے وائے
(چیخ و پکار۔ مردوں کا شور)

سندباد: آج پھر عزمِ سفر دل میں مرے
شکلِ امواج بدلتا پہلو
کسی انجانے جزیرے کی خبر دیتا ہے
آج پھر موجِ ہوا
پردۂ محملِ لیلیٰ سے اڑا لائی ہے
نشۂ سحر وطن

گوشۂ چشمِ آہو!
مجھ کو اب میرا جنوں
جانے کس قلزمِ بے جادہ پہ لے جائے گا؟
ہر سبک رو پہ مجھے خضر و الیاس کا گزرا ہے گماں
مجھ کو ہر راہ سے منزل کی ہوا آئی ہے
میں نے فرعون کو موسیٰ سمجھا
میری کوتاہ نگاہی کے سبب
یدِ بیضا لیے آیا ہے نظر
مجھ کو ہر شعبدہ گر
میں نے ہر بت کو خدا مانا ہے
ہر صنم خانے کے ناقوس کی دلکش صدا
پاؤں کو بن کے لیے
حلقۂ زنجیر بنی
نقش ہر پا پہ مرا ذوقِ سجود
قصۂ زیست کا عنوان بنا
ہر قدم دوریِ منزل کی خبر لایا۔ مگر
آبِ حیواں کے بہانے ہر بار
ظلمات میں ہر خضر نے مجھے چھوڑ دیا
جادہ پیمائی مری پھر بھی کبھی کم نہ ہوئی
قلزم آشام مرا شوقِ سفر
آج پھر مجھ کو بلاتا ہے کہ آؤ!
پھر کسی نادیدہ سے آوازِ جرس
پھر کوئی منزلِ موعود بلاتی ہے مجھے
مجھ کو ہر موج پہ محمل کا گماں ہوتا ہے
ناخدا ان کو نظر آتی ہے ہر موج سراب
فرو عصیاں کے سوا ۔۔۔ پہنچا ہوں

نامۂ اعمال مرا
کچھ بھی نہیں
ہے یہی رختِ سفر — دامنِ صد چاک مرا
اور یہ تختۂ غسّال کی مانند نرالی ناؤ
بادباں جس کے ہیں
پتوار
نہ مستول کوئی
جانے کس ساحلِ گم گشتہ پہ لے جائے گی
کون جانے مری منزل ہے کہاں!
ویسے ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک"



اگر تمباکو کو ایک خوشگوار آب و ہوا کے انتخاب کا اختیار ہوتا تو یقیناً وہ مغل فیکٹری کے بہترین ماحول کو منتخب کرتا۔ بالکل اسی طرح جیسے تمباکو کی خوبیاں مغل کی کڑی احتیاط اور نگرانی میں اجاگر ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی ڈائمنڈ سگریٹ سے اور زیادہ فرحت و تسکین حاصل کریں گے۔ مغل کا لاجواب سگریٹ "ڈائمنڈ" ایئر کنڈیشنڈ پلانٹ میں تیار کیا جاتا ہے۔

* یہ ڈائمنڈ سگریٹ کے پیکٹ پر پیچھے کی طرف ایک نیلی مہر بطور نشانی فراہم کی گئی ہے جو کہ ایئر کنڈیشنڈ پلانٹ میں تیار تمباکو کو ظاہر کرتی ہے

ڈائمنڈ

لاجواب سگریٹ

مغل ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ



صبر کا انعام

اور بے صبری کا انجام

ایک صاحب نے اپنا انعامی بونڈ بیچنے بھنانے بھنا ڈالا اور یہ صاحب اسے خرید لائے۔ اتفاق کی بات کہ اس پر ایک قرعہ اندازی میں انعام نکل آیا! اب گھر بھر کی خوشی کا کیا پوچھنا۔

کاغذ کا ذرا سا ایک پرزہ کس قدر قیمتی ہو سکتا ہے۔ یہ ہے انعامی بونڈ کا کرشمہ۔ دس روپے کے انعامی بونڈ پر سال میں چار بار ۵۰ ہزار روپے کی مالیت کے ۱۳۶ انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔ پہلا انعام ۲۰،۰۰۰ روپے۔

قرعہ اندازی میں شامل ہونے کے لئے اس سے کم از کم ایک ماہ پہلے انعامی بونڈ خرید لیں۔ انعامی بونڈ کو جب چاہیں بھنایا بھی جا سکتا ہے اور بھنائے ہوئے بونڈ دوبارہ فروخت کر دیئے جاتے ہیں تاکہ ان پر بھی انعام پانے کا موقع حاصل رہے۔ آپ اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں

دس روپے والے انعامی بونڈ بنکوں اور ڈاک خانوں سے خریدیے

ملک کے لئے بچائیے — کنبے کے لئے بچائیے

PIA

پی آئی اے کا ہر پانچواں مسافر — نیا مسافر

پاکستان
انٹرنیشنل
ائیرلائنز

باکمال لوگ
لاجواب پرواز

PIA

قدیم روایات

اور

جدید وضع کی

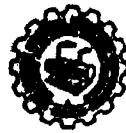
آئینہ دار

ڈبلیو۔پی۔آئی۔ڈی۔سی۔کی

گھریلو مصنوعات

خریدیئے

ڈبلیو۔پی۔آئی۔ڈی۔سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت [illegible]
کھلونے۔ آرائشی پارچہ جات۔ تحائف یا دوسری زیب وزینت کی
چیزیں آپ کے گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں۔ یہ مصنوعات
اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا
انتخاب کیجئے۔



مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

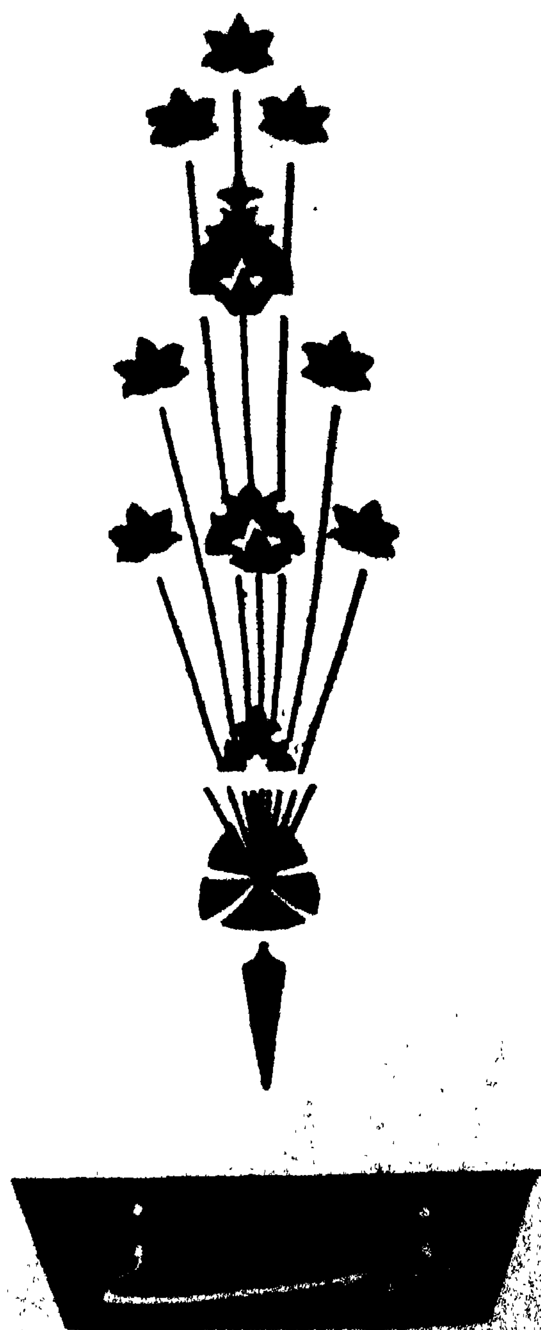
مرکز

پاکستانی

گھریلو مصنوعات

پریڈی اسٹریٹ اور کچہری روڈ۔ کراچی۔ دی مال لاہور۔ دی مال [illegible] روڈ۔ ملتان

دی مال پشاور۔ تلک چاڑی حیدرآباد۔ جناح [illegible]



پیاسا

کرشن چندر

نواب ہمارا نوکر تھا اور زنانہ سا لونڈا تھا۔ زرینہ کو اس لیے پسند تھا کہ وہ زرینہ کے ہاتھوں سے پٹ کر اور رو دھو کر صبر کر لیتا تھا۔ دوسرے نوکروں کی طرح لبدیہ بستر باندھ کر رخصت نہیں ہو جاتا تھا۔

اس کے گندمی رنگ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ بہت دبلا تھا اور بہت کھاتا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو وہ کھاتا ہے وہ کہاں جاتا ہے۔ اس کی آواز میں ایک ہلکی سی تتلاہٹ تھی۔ جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو کبھی سیدھا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی دیوار یا کسی دروازے سے ٹیک لگا کر نیم دراز حالت میں یوں کھڑا ہوتا تھا کہ پاؤں فرش پر گھسٹ رہے ہیں سر بائیں طرف کو لٹکا ہوا ہے کولہا دائیں طرف کو نکلا ہوا ہے ایک ہاتھ مٹکتے پر ہے تو دوسرے سے پیٹ کھجا رہے ہیں۔ نواب کو عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہی کی طرح وہ فقروں کو چبا کے یا چپا کر کے یا بڑی طرح کھینچ کھینچ کے بولتا تھا۔ مگر باہر کے کام میں بہت ہوشیار تھا۔ اس لیے اپنی تمام مضحکہ خیز اداؤں اور نخروں کے باوجود قابل برداشت تھا۔ گھر کا باورچی تین دن سے غائب تھا اور نواب کو کچن میں کام کرنا پڑ رہا تھا حالانکہ اسے صرف اوپر کے کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ زرینہ لڑکیوں کے کالج میں پڑھانے جاتی تھی، میں اپنے دفتر جاتا تھا اس لیے اگر نواب کھانا نہ پکائے تو کون پکائے اور اس سے مشکل مسئلہ یہ تھا کہ باورچی کون ڈھونڈے اور کب؟ یہاں کسی کو فرصت ہی میسر نہ تھی۔

نواب کو جب تین دن کچن میں بیگن بگھارنا پڑے اور لہسن کی چٹنی پیس کر قصے مصالے کا قورمہ تیار کرنا پڑا تو اس کی ساری تتلاہٹ اور نسائیت ختم ہو گئی۔ مردوں کی طرح بڑے کرخت اور جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بول پڑا۔ صاحب ہم سے نہیں ہوتا ہم کو ایک دن کی چھٹی دو تو آپ کے لیے ایک باورچی ڈھونڈ کے لائے گا۔

"کوئی باورچی ہے تمہاری نظر میں؟" زرینہ نے اس کی جھنجھلاہٹ پر مسکرا کے پوچھا۔

کچن سے باہر آ کر نواب کو جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو اس کے مزاج کی نسائیت پھر ابھرنے لگی۔ اس پر اسے زرینہ مالکن کی مسکراہٹ جو ملی تو اور بھی پھیل گئے۔ آپ نے ایک کندھا اوپر اچکایا، دوسرا نیچے کیا، بائیں کولھے کو اندر کی طرف جھکایا دائیں کو ذرا سا باہر نکالا اور اپنے دونوں ہاتھ بڑی ادا سے ملتے ہوئے بولے۔

"اب لائیں گے کہیں نہ کہیں سے اچھا سا باورچی۔" نواب نے اپنے دیدے گھماتے ہوئے باورچی کے مسئلے کو ایک پراسرار سا حل ہمارے سامنے کچھ اس طرح پیش کیا کہ جی جل کے کباب ہو گیا۔ جی چاہا سالے کو دو دو جھانپڑ دوں اور اس کی ساری اتراہٹ نکال دوں۔ مگر ضرورت باورچی کی تھی اور باورچی ڈھونڈنے کی فرصت مجھے تھی نہ زرینہ کو۔ اس لیے نواب کو ایک دن کی چھٹی دینا پڑی۔

ایک دن کے بعد اتوار تھا میں اپنے کمرہ میں بیزار بیٹھا ہوا کھڑکی سے صبح کی نیلی نیلی روشنی میں اپنا سر خود ہی ہولے ہولے دبا رہا تھا۔ کبھی

کہ مجھے اپنا سر لٹو [illegible] کی طرح [illegible] معلوم ہوتا تھا جب تک [illegible] نہیں کچھ نکلتا نہیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نواب دونوں ہاتھوں سے دروازہ کی چق اٹھائے گردن ایک طرف کو ڈھلکائے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔

"میں [illegible] .... وہ جنتر ہے [illegible] ہم ادھر پوچھتے آئے۔"

"کیا ہے؟" میں نے [illegible] چونک کر پوچھا۔

نواب صاحب [illegible] سے [illegible] اپنے دونوں بازو دروازہ کی چق سے اُتار کر اپنی کمر پر رکھ لیے پھر ذرا پیچھے ہٹ [illegible] اور [illegible] کر [illegible]

[illegible] چلے آؤ۔

[illegible] آنکھوں والا [illegible] کوئی پینتیس برس کی بھولی بھولی پھولے پھولے گالے کالے ہونٹ، چھوٹی چھوٹی [illegible] ہاتھوں کی رگوں میں پانی کا ابھار [illegible] نمایاں [illegible] باوجود [illegible]

[illegible] تھے [illegible]

[illegible] میں نے [illegible] پوچھا۔

[illegible]

[illegible] تمھارا [illegible]

[illegible]

میں نے [illegible] نواب [illegible] بیگم صاحب کے پاس لے جاؤ وہ دیکھیں اور چاہیں تو رکھیں۔

[illegible] کے [illegible] میں [illegible] ہوا [illegible] تھا اور دم کے [illegible] تھے [illegible] اور [illegible]

[illegible] والی۔

میں نے [illegible] ہو کر [illegible] تو [illegible] چاہیے ہو۔"

"[illegible] سے دیکھ کر [illegible]۔ مگر اس کا [illegible] اشتیاق ہے؟"

[illegible] دونوں ہاتھ [illegible] پر [illegible] تھا اور مجھے دیکھنے کی بجائے [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے بادِلِ [illegible] سے پوچھا۔

[illegible] صاحب [illegible] آپ کو دیکھا تو [illegible] لگا کہ شاید آپ [illegible] میں نے آپ کو اپنا نام اور [illegible]

[illegible] پھر میں بیگم صاحب کے [illegible] گیا تو [illegible] ایسا لگا جیسے [illegible] میں نے ان کو اپنا [illegible] اشتیاق بتا دیا۔"

"[illegible] میں [illegible] اشتیاق کیسے ہو سکتے ہو؟"

"دلی میں ایسا کرنا پڑتا ہے صاحب۔ ایک گھر میں اوم پرکاش تو دوسرے گھر میں اشتیاق بتانا پڑتا ہے...... پیٹ روٹی [illegible] ہے صاحب!" اُس نے کسی قدر شکایت کے لہجے میں کہا اور اس کے لہجے سے یہ بھی معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو شکایت اس امر کی [illegible] ہے کہ اسے اپنا نام غلط کیوں بتانا پڑا بلکہ اس بات کی ہے کہ پیٹ روٹی کیوں مانگتا ہے؟

گرمیوں کے دن تھے۔ دوپہر میں جب جس بڑھنے لگا تو میں گھبرا کر دوبارہ نہانے کے لیے باتھ روم میں گیا۔ ٹونٹی کھولا تو معلوم کیا [illegible] خراب ہو چکا ہے۔ خاب کو آواز دی تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں تیل چڑھا رہا ہے۔ اشتیاق [illegible] آیا۔ میں نے اُس سے کہا۔

"چوک میں جا کر منشی شکور مستری کو بلا دو۔ شاور خراب ہے۔"

"میں ٹھیک کیے دیتا ہوں" اشتیاق بولا۔

"تم؟"

وہ سر جھکا کر بڑی عاجزی سے بولا۔ "جی میں پلمبنگ کا کام بھی جانتا ہوں۔"

پانچ منٹ میں اُس نے شاور ٹھیک کر دیا۔

[illegible] کو بجلی کا پنکھا جو صحن میں چلتا تھا خراب ہو گیا۔ [illegible] خاب کو آواز دی تو معلوم ہوا [illegible] [illegible] نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا اشتیاق کو بلا لیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ وہ [illegible] پنکھے والے کے پاس چلا جائے اور اپنے ساتھ [illegible] درست کرا کے لائے۔ بہت گرمی ہے آج تو رات کو صحن میں پنکھا چلے گا۔ اشتیاق [illegible] [illegible] نے بعد اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی ناف پر رکھ لیے۔ [illegible]

"کیا تم پنکھے کا کام بھی جانتے ہو؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

سر جھکا کر بولا "جی! بجلی کا کام بھی جانتا ہوں [illegible]"

ڈیڑھ گھنٹے میں پنکھا [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] رات کے کھانے میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کا جواب نہ دوں۔ پھر لگے جیسی دوز میں معلوم ہوا کہ صورت یہیں ایسی قسم کے فٹ سے پیشے بھی چلتے ہیں۔ کرسیاں بیٹھتیں ہیں ٹوٹے ٹھیک کر دیتے ہیں لڑکوں کا ڈھانچا سا ٹھیک کر دیتے ہیں کیونکہ بڑھئی کا کام بھی ہلکا ہے۔ سینما کے لیے کیمرہ بھی رکھے ہیں گھنٹہ پیمانہ بھی بھی چھوڑی کے ہاں کام آیا ہے۔ علیحدہ کیبنٹ، کمروں کی فیکٹری میں کام آیا ہے۔ تمام پیسہ رہ چکے ہیں۔ سالوں سے سلک کپڑوں کی دکان چک کے سب مال کو پیشہ ور حیثیت سے پرکھ چکے ہیں۔ جیسے منہ دیکھتے ہیں۔ سرکس کمپنی کے استاد ہیں کھیلتے بھی ہیں۔ چاٹ بنانا آتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انتہائی کم خوراک ہے۔ ذرا سوچیں ان کی یہ عادت بہت بھا گئی۔ کیونکہ وہ نواب کی اشتہا سے عاجز رہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے دھیرے دھیرے گویا سارا کام اشتیاق کو سونپ دیا۔

دو ماہ میں اشتیاق کا منہ سامنے کر پڑ گیا۔ اس طرح بھاگ بھاگ کے کام کرتا تھا کہ نواب اور بھی کاہل اور نکارہ ہو گیا۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ اشتیاق بھی کچھ چاہتا ہے۔ وہ یہ نواب اشتیاق سے سترہ اٹھارہ برس چھوٹا ہوگا۔ مگر تھوڑے دنوں میں نواب اشتیاق سے پیار سلوک کرنے لگا جیسے وہ کوئی بچہ ہو اور اشتیاق اس کا فادر ہو۔ پہلے تو میں نے یہ کہا کہ یہ سب کچھ جذبۂ احسان مندی میں ہو رہا ہے۔ بعد میں خیال آیا کہیں یہ اشتیاق نواب پر عاشق ہو گیا ہو حالانکہ نواب پر عاشق ہونا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عاشق کی آنکھوں کی بینائی سے مدد نہ ہو یعنی عادت تو یا نہ ہو اور کوئی عیب جذبہ دل میں نہ ہو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرا یہ خیال بھی صحیح نہ تھا۔ اشتیاق نواب کو اپنا استاد سمجھتا تھا۔ اس پر فریفتہ تھا۔ بس اسے دوسروں کو کھلانے کا شوق تھا اور دوسروں کو کھلا کے بلا ہی ایسی ہی خوشی محسوس کرتا تھا چونکہ وہ خود کم کھاتا تھا اس لیے وہ اپنے حصے کی خوراک بھی نواب کو منتقل کر دیتا۔ ہمارے جیسا اس کے لیے سالم [illegible] پیشہ کھلاتا پھر خود کھاتا۔ رفتہ رفتہ نواب نے کام میں دلچسپی لینا بالکل ختم کر دیا۔ کسی بڑی بی کی طرح [illegible] اشتیاق اس کی خدمت [illegible] بیان کرنے میں بڑا مزا لیتا اور اسے کھانا پر منتقل [illegible] کبھی کبھی ایک آدھ قمیض شرٹ [illegible] اشتیاق کی تنخواہ [illegible] اور نواب اپنی تنخواہ کی کل رقم بچا کے اپنی ماں کو علی گڑھ بھیجنے لگا۔

نواب نے کئی بار اشتیاق کو کہا [illegible] اپنی تنخواہ [illegible] مگر اشتیاق پر اس کے سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا [illegible]۔

"مگر صاحب، [illegible]"

"ارے تو اپنے پیٹ بھی تو کچھ کرے [illegible] دوسروں کے پیٹ کیوں مرتا ہے۔"

"میری ماں کے بچے کون ہے بیگم صاحب"۔ اشتیاق [illegible] جواب دیتا۔ "بھائی نہیں، بہن نہیں، ماں نہیں، باپ نہیں، سب [illegible] مارے گئے [illegible]"

کچھ دنوں کے بعد نواب کی ماں [illegible] نے نواب کے لیے ایک لڑکی ٹھیک کر لی تھی۔ دو ماہ بعد شادی تھی۔ اسے واپس علی گڑھ جانا تھا۔ [illegible] سائیکل [illegible] نواب [illegible] وہ اب پھر اسے کام دینے کے لیے تیار تھا

...لیے نواب واپس ——— جانے کے لیے تیار ہو گیا ہم بھی اندر سے بہت خوش تھے کیونکہ نواب اب تو تقریباً مفت کی کھاتا تھا۔ ور... سارا کام تو اشتیاق نے سنبھال لیا تھا۔ زرینہ نے بھی طے کر لیا تھا کہ نواب کے جانے کے بعد دوپہر کے کام کے لیے کسی کو نہ رکھے ...ی۔ اشتیاق کی موجودگی میں کسی دوسرے نوکر کی ضرورت نہ تھی۔

زرینہ بولی۔ "دیکھ نواب کی شادی ہو رہی ہے اب تو بھی شادی کر لے اشتیاق میں تیری بیوی کو رکھ لوں گی مجھے ایک ملازمہ کی ضرورت ہے۔"

شادی کے نام پر میں نے دیکھا کہ اشتیاق کچھ چڑ سا گیا ہے۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ تنگ ماتھے پر بالوں کی لٹیں ڈھلنے لگیں اور ...کے پھولنے سے ہونٹ پھڑکنے لگے مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ سر جھکا کر کھانے کے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد نواب ...چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی کھانے کی میز کے قریب آ کر بڑی رازداری سے بولا۔

"اسے صاحب۔ یہ کیا شادی کرے گا اس کی بیوی تو شادی کے دوسرے دن ہی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں بیگم صاحب۔" نواب بولا۔ "یہ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔"

چند منٹ کے بعد جب ہم لوگ کھانا کھا کے صحن میں ہاتھ دھونے کے لیے آئے تو دیکھا کہ اشتیاق کچن میں میلے برتن اور راکھ کا ڈھیر اپنے سامنے رکھے خلا میں گھور رہا ہے اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کسی نامعلوم جذبہ سے جھلک کر تاروں سی چمک رہی ہیں۔ مجھے پہلی بار اشتیاق میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

آٹھ دس روز کے بعد نواب نے علی گڑھ واپس جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے جاتے ہی اشتیاق چپکے چپکے بہت رویا اس کی ...میں سرخ تھیں اور ہونٹوں کے کونے بے طرح پھڑکتے تھے مگر زبان سے اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے نواب کے لیے سفر کا ناشتہ تیار ...یا حالانکہ صرف آٹھ گھنٹے کا سفر تھا مگر قیمے کے پراٹھے اور سرخ مرچوں کا اچار، اور آلو کا بھرتہ اور میٹھی روٹی اور مکھن الگ رکھ دیا۔ وہ ...س کی خوراک سے واقف تھا۔ خود اپنے خرچ سے اس نے نواب کا ناشتہ تیار کیا تھا اس سے ہم شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے وہ خود نواب ...کے سکوٹر پر اس کا سامان سکوٹر میں رکھا اور اسے پرانی دلی کے سٹیشن پر گاڑی میں سوار کرا کے واپس آیا۔

دو دن تک اس کی حالت مضطرب اور بے چین پھرتا رہا جیسے اس کا کوئی ... دو دن ... جیسے ... کا ... مر گیا تھا۔ ... اس کے جذبہ کی حرکت تھا اور ... پتا چلتا جیسے ... اس کے ... پر ... چھپا ... سے ... اور بے ڈھنگی اور ان پر ... کی ... ہوتی۔ ... تو ہم نے کسی ... کو صبر کر کے ... کیا اور یہ سوچا ...اگر معاملہ یونہی چلتا رہا تو اشتیاق کو جواب دینا پڑے گا۔

مگر دو دن کے بعد اشتیاق سنبھل گیا۔ کہیں سے وہ ایک بلی کا بچہ نکال لایا اور اب وہ بلی کا بچہ اشتیاق کی توجہ کا مرکز بن گیا ...وہ کام کرنے کے بعد وہ اپنا سارا وقت جو اس سے پہلے وہ نواب کو دیتا تھا اب بلی کے بچے پر صرف کرنے لگا۔ اور اپنی تنخواہ کا کافی حصہ بلی کے لیے دودھ اور گوشت پر خرچ کرنے لگا اور یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ترقی کا یہ نواب سے کچھ کم نہیں کھاتا تھا۔ اس نے مشو...

اور غزلے بھی ڈھب سے کم نہ تھے وہ اتنا ہی ترپایا تھا اور ویسی ہی ادائیں دکھاتا تھا۔ دو ہی دنوں میں اشتیاق سنبھل گیا اور کلاس کا معیار بھی ٹھیک ہوتے ہوتے پھر اپنی پہلی اور اصلی حالت پر آ گیا اور ہم لڑکوں نے چین کا سانس لیا۔

اشتیاق کسی کام کو ناں نہ کرتا تھا۔ پھر کر دو اپنی دانست میں سب کچھ جانتا تھا۔ یہ کسی قدر اس کی عادت دی تھی اور بات [illegible] بھی تھی۔ یہ احساس کہ مجھے یہ کام بھی کر کے دکھا دینا چاہیے۔ اُسے اپنے ذاتی وقار کے تحفظ کا بہت خیال تھا اور ایک عیب یہ بھی تھی کہ ہر دل میں جو اُسے ہر کام کر دکھانے کے لئے اکساتی تھی۔ چاہے وہ اسے جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ کئی دنوں سے ریڈیو خراب تھا اور میں چونکہ ریڈیو کا کام بھی جانتا تھا اس لیے ریڈیو ٹھیک کرنے کے لیے کہا۔ مگر دفتری طور پر بہت جلد کے بعد بھی [illegible] ہم دونوں اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ریڈیو کو کھولنے اور ٹھیک کرنے کی ہمت کہاں سے لائیں؟ میں اس کام کو آج اور کل پر ٹال رہا تھا۔

[illegible] اشتیاق عجیب گھبرائی ہوئی حالت میں [illegible] میں نے آنکھوں کے اشارے [illegible]

[illegible] اشتیاق [illegible] ریڈیو [illegible] اس لیے میں نے اشتیاق [illegible]

[illegible] ریڈیو [illegible]

[illegible] معلوم ہوتا تھا [illegible] ریڈیو [illegible] اور خود اشتیاق [illegible]

[illegible] اشتیاق [illegible]

[illegible] ریڈیو ٹھیک [illegible] اشتیاق [illegible] مگر چند دنوں کے بعد پھر اشتیاق کی شامت آئی [illegible] پوچھا۔ "کیا تم [illegible] سکتے ہو؟"

کہا۔ "[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

[illegible] اشتیاق [illegible]

[illegible]

[illegible]

"جی۔ یہی خاکسار نے" اشتیاق دروازہ سے لگ کر نظریں جھکا کر پاؤں سے فرش کو کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"بالکل بازار کے سے معلوم ہوتے ہیں!" زرینہ تعریف کرتے ہوئے بولی۔

"یہی تو ان کی خوبی ہے۔ میں نے کہا" سیدھے بازار سے لائے گئے ہیں"

"جی نہیں" اشتیاق نے زور سے احتجاج کیا۔

اس کے احتجاج کی شدت دیکھ کر زرینہ کا شبہ اور بڑھ گیا۔ بولی۔ "تو آج رات کو میرے سامنے رس گلے بناؤ۔ میں خود دیکھوں [illegible]"

"جی بہت اچھا۔"

اشتیاق نے رس گلوں کے سلسلے میں چند چیزوں کی فہرست پیش کی جو منظور کر دی گئی۔ دوپہر میں بہت دیر تک اشتیاق بازار [illegible] سرِ شام زرینہ نے اُن کے کمرے کی تلاشی لی کہ کہیں وہ رس گلے بازار سے نہ لے آئے ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد [illegible] نے بڑے اہتمام سے رس گلے بنانے کا کام باورچی خانے میں پھیلا دیا۔ زرینہ نے گھر کو اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا تھا اور ہر چند رہ [illegible] کے بعد کچن میں جھانک لیتی تھی۔ کوئی دو بجے کے قریب جب نیند کا غلبہ شدید ہونے لگا تو رس گلے تیار ہو گئے۔ اشتیاق ایک [illegible] میں رس گلے رکھ آئے۔ کھانڈ کے مقطر شیرے میں فٹبال کی گولیوں سے بھی دو تہائی کم کے گم کی سفید سفید گولیاں تیر رہی [illegible]

[illegible] زرینہ چیخی!

"[illegible] یہ رس گلے ہیں، بکری کی مینگنی کے برابر؟"

"[illegible] ابھی چھوٹے ہیں! دیکھیے بیگم صاحب۔ یہ رس گلے ابھی چھوٹے ہیں مگر رات بھر شیرا پی پی کے صبح کو پھول کر پورا [illegible] ہو جائیں گے۔"

اشتیاق نے کہا!

زرینہ کو یقین آیا نہ مجھے مگر نیند کا غلبہ شدید تھا اس لیے ہم سو گئے۔ صبح اٹھے تو ناشتے پر پورے بھرے بڑی گولائی کے سفید [illegible] رس گلے کوٹھے۔ کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ رات کو کرنجی کی گولیوں کے برابر والے رس گلے پھول کر اس قدر بڑے ہو گئے [illegible] رات بھر کون جاگے، اور کون چوکیداری کرے۔ اشتیاق ضرور صبح صبح بازار سے رس گلے خرید لائے ہوں گے اور رات کی [illegible] گولیوں نے نالی میں بہا دیا ہوگا مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو شخص اپنے ذاتی وقار کی خاطر رات بھر جاگ سکتا ہے اور اپنی جیب [illegible] طرح کرے وہ سیدھی طرح رس گلے کھلا سکتا ہے محض اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے۔ اُس سے اُلجھنا بے کار ہے۔

[illegible] کا بچہ بڑا ہوتا گیا اشتیاق کا جذبہ درود بڑھتا گیا جب وہ ہمارے سامنے ایک خوبصورت بلی صحن میں گھوم رہی تھی [illegible] صحن کی طرح وہ یہم تھے جو انسانی میٹھی سرگوشی میں خرخر کرتی تھی اور جب گردن موڑ جاتی تو آنکھیں جھپکا کے اشتیاق کی طرف [illegible] تو وہ بے چارہ دل تھام کے رہ جاتا۔ تھی بھی قیامت کی حرافہ ۔ موٹی گول تو تھی ہی کبھی دھیرے دھیرے مٹک مٹک کر چلتی [illegible] ریشمی ہو کر چھوٹی ٹکاتی اور اشتیاق کے کندھے پر جا کے بیٹھ جاتی اور پیار سے اُس کی گردن چاٹنے لگتی۔ کبھی اُون

کا رو بنے ہوئی پائنتی پر بیٹھ کر دھوپ کا مزہ لیتی کبھی اس کی بانہوں میں پڑے پڑے چپل کر لیٹ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے سارے انداز میں کچھ فطری تغافل اور سے کیفیت ست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اسے پکڑنا چاہتا تو وہ پھڑ کر بھاگ نکلتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت اور مسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی حالت میں اسے صرف گلو کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن بیری غیر حاضری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈروم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن چلے تھے اس لیے زرینہ سبق ختم ہونے کے باوجود اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس ایک سویٹر بن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق"

"اندر آجاؤ" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لئے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مودب انداز میں دروازہ سے لگ کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے پیچھے سے کاغذ اور پنسل اسے پکڑا دیا اور بولا جیسے :

زرینہ بولی کیا ہے کاغذ، اب ہے، ابھی نہیں جب میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ لکھیے تو" اشتیاق اس بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"لکھوں کیا؟"

"آپ غزل کے معنی سمجھتی ہیں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے چپ ہو گئی۔ لیکن پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی مسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو؟" زرینہ نے فقرہ مکمل کیا۔

"جی ہاں بالکل کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھیے میں بولتا ہوں"

"لکھیے" زرینہ نے زچ ہو کر کہا

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک عجب کیفیت کے عالم میں بولا۔

تمنا نہیں میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو

ہم مرتے ہیں تجھ پر تو زندگی ہے گل ہے۔ جو ہو سو ہو۔

"مگر اس کا مطلب کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"بحر؟" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ "بہرحال غزل تو غزل ہے۔"

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی عمدہ غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ پڑھیے تو" اشتیاق نے کمال دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی: "آگے پڑھیے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور گہرے مراقبے میں جاکر بولے۔

تیری جدائی میں ہوئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو۔
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی؟ مگر تنہائی تو مونث ہے!"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں۔" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو: "اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست فگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب؟" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں۔" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ پنسل بیڈروم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی: "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے ایسا کوئی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکایا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجرم اور شرمندہ دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آگیا۔ نرم لہجے میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

ذرا سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"وائف اینڈ کک۔" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم ...کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے ہو۔ اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک میلے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

ماہرو بنی ہوئی پانی پر بیٹھ کر مصوّر کا مزہ لیتی کبھی اس کی باہوں میں پوری کی پوری گر بیٹھ جاتی۔ عورت کی مکمل سپردگی کے سوا وہ نظر نہیں آتی کبھی شریر تنافل ادا سے کیسی مست انگڑائی لیتی اور جب اشتیاق اسے پکڑنا چاہتا تو ہاتھ چھڑا کر بھاگ نکلتی اور اشتیاق ایک عجب مسرت اور حسرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اشتیاق نے اس کا نام گلشن رکھا تھا مگر پیار کی حیرت میں اسے صرف گل کہہ کر پکارتا تھا۔

ایک دن بڑی بے قراری میں اشتیاق نے زرینہ کے بیڈ روم پر دستک دی۔

سردیوں کے دن تھے، اس لیے زرینہ کام ختم ہونے کے بعد اپنے نائٹ گاؤن میں ملبوس ایک سویٹر بُن رہی تھی۔

"کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"میں ہوں اشتیاق"

"اندر آجاؤ" زرینہ بولی۔

کاغذ پنسل لئے ہوئے اشتیاق جھجکتے جھجکتے انتہائی مؤدب انداز میں دروازے سے لگ کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے چپکے سے کاغذ اور پنسل آگے بڑھا دیا اور بولا:

زرینہ بولی۔ "کیا کل کا حساب ہے، ابھی نہیں صبح میں دیکھ لوں گی۔"

"حساب نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"آپ پڑھیے تو۔" اشتیاق بار بار کاغذ اور پنسل آگے بڑھا رہا تھا۔ زرینہ نے کاغذ اور پنسل تھام کر ذرا سختی سے پوچھا۔

"آخر ہے کیا؟"

"ایک غزل ہے، میں شعر موزوں کرتا ہوں۔"

زرینہ چند لمحوں کے لیے چونک گئی، دوسرے لمحے پھر اس کے دل میں ہنسی پھوٹنے لگی، مسکرا کر بولی۔

"تم خود نہیں لکھ سکتے؟"

"جی نہیں۔ میں نہ لکھ سکتا ہوں نہ پڑھ سکتا ہوں۔"

"مگر شعر کہہ سکتے ہو؟" زرینہ نے فقرہ کسا۔

"جی ہاں بالکل کہہ سکتا ہوں۔ آپ لکھیے میں بولتا ہوں۔"

"کہیے۔" زرینہ نے زچ ہو کر کہا

اشتیاق نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ایک عجب کیفیت کے عالم میں بولا۔

تنہائی میرا کام ہے گلشن تیرا نام ہے جو ہو سو ہو۔

ہم مرتے ہیں تجھ پر تو ڈرتی ہے مجھ سے، جو ہو سو ہو۔

"مگر اس کا کیا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"برہ" اشتیاق نے حیرت سے آنکھیں گھما کر پوچھا۔ "بہرحال غزل تو غزل ہے۔"

"مگر اس کا وزن؟" زرینہ نے پھر توجہ دلائی۔

"بڑی وزنی غزل ہے بیگم صاحب۔ آپ سنیے تو" اشتیاق نے کمال دلجمعی سے کہا۔

بڑی مشکل سے زرینہ نے اپنی ہنسی روکی۔ بولی: "آگے چلیے۔"

اشتیاق نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور گہرے مراقبے میں جاکر بولے

تیری جدائی میں ہوئے ہم مست فگار جو ہو سو ہو۔
کہتا ہے تنہائی اب گلشن میں کون آیا جو ہو سو ہو۔

زرینہ نے پوچھا۔ "کہتا ہے تنہائی؟ مگر تنہائی تو مونث ہے؟"

"مگر تنہائی تو میرا تخلص ہے اور میں مونث نہیں ہوں" اشتیاق نے سمجھایا۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کہنا چاہتا ہو "اجی بیگم صاحب۔ یہ شعر و شاعری ہے آپ کیا جانیں۔"

"اور یہ مست فگار۔ کہاں کی ترکیب ہے تنہائی صاحب۔" زرینہ نے پھر پوچھا۔

"ہمارے مراد آباد میں ایسا ہی بولتے ہیں!" اشتیاق نے جواب دیا۔

زرینہ نے ایک دم کاغذ پنسل بیڈروم کی کھڑکی سے باہر پھینک دیے۔ گرج کر بولی۔ "اشتیاق اگر آج کے بعد تو نے کبھی مجھے بناوٹی شعر سنایا تو کھڑے کھڑے گھر سے باہر نکال دوں گی۔" اشتیاق نے کھسیا کر سر جھکایا، پھر سر کھجانے لگے۔ بے حد مجرم اور سہمے سے دکھائی دے رہے تھے۔ زرینہ کو اس پر رحم آگیا نرم لہجہ میں مسکرا کر کہنے لگی۔

"میرے خیال میں اگر آپ شعر و شاعری چھوڑ کر ناول نگاری کی طرف توجہ کریں تو بہتر ہوگا۔"

ذرا سر اٹھا کر بولے۔ "ایک ناول بھی تیار کر رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس ناول کا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"وائف اینڈ مک" اشتیاق انگریزی میں بولے۔

اشتیاق کی انگریزی ایسی تھی جیسے پرانے زمانے میں ان باورچیوں کی ہوا کرتی تھی جو انگریزوں کے پاس کام کرتے تھے یا آج کے ان مزدوروں کی جو ان پڑھ ہونے کے باوجود ٹیکنیکل دھندوں میں پڑ جاتے ہیں۔ یہ انگریزی بڑی مختصر اور جامع ہوتی ہے اور بالعموم گرامر کی محتاج نہیں ہوتی مگر اپنا مفہوم ادا کرنے میں اس انگریزی سے کہیں بہتر ہوتی ہے جسے آج کل کے طالب علم میٹرک تک پڑھتے ہیں۔

ایک دن جب اشتیاق میرے سر کی چمپی سے فارغ ہو چکا تو میں نے اس سے کہا۔ "تم اتنے ڈھیر سارے دھندے جانتے ہو۔ اگر تم کسی ایک دھندے کو پکڑ کر بیٹھ جاتے تو غالباً بہت ترقی کر جاتے۔"

"صاحب! میرا کسی کام میں زیادہ دیر تک جی نہیں لگتا۔" اشتیاق ایک پھٹے سے تولیے سے اپنے ہاتھ صاف کرتے

ہوتے ہوا۔ شاید ایک مہینہ پہلے ہم نے دوسرے میں پڑھا کہ اس قسم کے مریض بھی بری طرح مبتلا ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی کمزور ہو جاتی ہیں:

"تو تم کسی ایک دن سے بھی چل نہیں پاتے۔" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں ملتا۔" اشتیاق سر جھکا کر کسی قابل مجرم کی طرح شرمندہ ہو کے کہا۔

"میرا سینہ ہر وقت خالی خالی سا رہتا ہے۔"

"میاؤں۔"

دروازہ پر ٹومی تشریف لائی اور وہ منہ اُٹھا کے بڑی بڑی آنکھوں سے اشتیاق کی طرف دیکھنے لگی۔ اشتیاق نے اسے گود میں اُٹھایا اور اس کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ٹومی تجھ کو بھلا دودھ لے آؤں؟"

"میاؤں۔"

اشتیاق پر کبھی کبھی ذہنی غشی کے لمبے لمبے دورے پڑتے تھے، جب وہ گھنٹوں اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا کچھ ہی غائب ہو جاتا تھا۔ جانے کیا سوچتا ہے۔ اور کبھی مسکراتا ہے۔ خود ہی گھورتا ہے خود ہی ہنسنے لگتا ہے، کبھی کبھی منہ میں بڑبڑانے لگتا ہے۔ لب تھرتھراتے ہیں پر وہ کون سا رب ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جاتا ہے۔ کون جانے۔ کچھ بتاتا تو ہے نہیں۔ کبھی کبھی نشہ بھی کرتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ جب دل کی گھٹن اور سینے کا سناٹا پھیلنے لگتا ہے تو کوئی نشہ ضرور کرتا ہے۔ کیونکہ مہینے میں ایک دو دن ایسے آتے ہیں جب اشتیاق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ سارا دن تقریباً نیم غشی کی حالت میں اپنی چارپائی پر پڑا رہتا ہے اور اس کا سینہ دھونکنی بنا رہتا ہے اور دو دن کے بعد جب وہ ہوش میں آتا ہے تو اصرار کرتا ہے کہ دو دن پر اب نہ کہو کہ بلا ہے۔ نہ اس نے کوئی نشہ کیا ہے اور ہم بھی اسی لیے چپ رہتے ہیں کہ اپنا کام بہت اچھا کرتا ہے۔ ایسا کہیں اور نہیں ہے۔ اپنے کام کا ماہر اور فنکاروں کے مزاج کی ایک کل تو ڈھیلی ہوتی ہی ہے۔ یہ سب جانتے ہیں۔

اس لیے کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ اس سے کہا حیدرآبادی بیگن بنا کے لاؤ اور وہ لے آیا کچھ عجیب سی ڈش — جس میں شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا اور اس کے اندر بیگن کے کالے کالے ٹکڑے سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیر رہے تھے۔

"یہ حیدرآبادی بیگن ہیں؟" زرینہ چیخ کر پوچھتی ہے۔

"جی نہیں یہ چاند ماری ہے۔" اشتیاق کہتا ہے۔ "بالکل نئی ڈش ہے کھا کے دیکھیے۔ بیگم صاحبہ! بالکل نیا مزہ ہے۔"

"اُٹھا کے لے جا ابھی ابھی یہاں سے ورنہ تیرے سر پہ مار دوں گی!" میں گلہ کرتا ہوں کیونکہ مجھے تو اس ڈش کو دیکھ کر ہی متلی ہونے لگی تھی۔

اس وقت تو اشتیاق ڈش اُٹھا کے لے گیا لیکن بعد میں اس نے زرینہ سے کہا۔ "صاحب بھی کیسا انصاف کرتے ہیں، چکھے بغیر ہی پاس کر دیتے ہیں کھانے کو۔"

اشتیاق مرغ قیمہ بہت عمدہ پکاتا ہے۔ ایک دفعہ گھر پر خصوصی مہمانوں کی دعوت تھی۔ اشتیاق سے مرغ قیمہ پکانے کو کہا

جب دسترخوان بچھا تو دوسری چیزوں کے ساتھ ایک نہایت بدبودار اور سڑی ہوئی ڈش سامنے آئی۔

"یہ مرغی قیمہ ہے؟" زرینہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں" اشتیاق ذرا بولے۔ "یہ پیسٹ ہے۔"

"پیسٹ کیا؟ تمہیں تو مرغی قیمہ تیار کرنے کو کہا تھا، کہا تھا کہ نہیں؟" زرینہ خفا ہو کے بولی۔

"جی۔ مرغی قیمہ جل گیا۔ اس لیے میں نے نئی ڈش تیار کر دی۔" اشتیاق کی یہ عادت اب ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ جب کوئی سالن بگڑ جاتا ہے وہ فوراً اسے کوئی نیا نام دے کر دسترخوان پر پیش کر دیتے ہیں اور ڈش کے بگڑنے کا یوں تذکرہ کرتے ہیں جیسے کبھی خدا ان کا ذائقہ خود بخود بگڑ گیا ہے اور اس کے بگاڑنے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ ہو۔

ابھی کیا کہیں۔ چند ایسے مہمانوں کی دعوت تھی جن کے سامنے میں بے تکلف نہ ہو سکتا تھا ورنہ آج میرا ارادہ اشتیاق سے بے تکلف ہونے کا تھا۔ مگر مہمان موجود تھے اور دوسرے سالن بے حد عمدہ تھے اس لیے خاموش رہ جانا پڑا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم اپنے مہمانوں کے ساتھ کرسمس شو دیکھنے چلے گئے اور چلتے چلتے زرینہ نے اشتیاق کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایات دے دیں۔ سنیما شو دیکھ کر جب ہم شام کو واپس آئے تو دیکھا کہ گھر کے باہر فائر بریگیڈ کھڑا ہے۔ بہت سے لوگ جمع ہیں اور کچن کی چمنی اور چھت اور کھڑکیوں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے ہیں۔

"آگ۔ آگ میرا گھر بچاؤ۔" لینڈ لارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا معلوم؟" لینڈ لارڈ اپنے سر کے بال نوچتے ہوئے بولا۔ "ایک گھنٹے سے چیخ رہا ہوں دروازہ ہی نہیں کھلتا اندر کچن میں شاید نشہ کر کے بے ہوش پڑا ہے۔"

میں نے اور زرینہ نے۔ دونوں نے چلا چلا کر اشتیاق سے دروازہ کھلوایا۔

اشتیاق بے حد حیرت زدہ کچن سے نکلے اور دھواں دیکھ کر چولہے اور کچن کی دونوں انگیٹھیوں پر پانی ڈال کر بجھانے لگے۔ دونوں انگیٹھیوں کے سالن جل چکے تھے۔ مگر خدا جانے ان میں اس نے کونسا مسالہ ڈالا تھا کہ دھوئیں کے گہرے سیاہ بادل اب تک ان پتیلیوں سے اٹھ رہے تھے۔

"آگ آگ" لینڈ لارڈ غصے سے چیخ رہا تھا۔

"کدھر ہے آگ؟" اشتیاق حیرت سے پوچھنے لگے۔

زرینہ بولی۔ "یہ بے چارے ایک گھنٹے سے چیخ رہے ہیں دروازہ پیٹ رہے ہیں اور تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ فائر بریگیڈ تک آ گیا اور تم کچن کا دروازہ بند کیے غافل بیٹھے ہو۔"

اشتیاق سب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر کچھ چونکے۔ شرمندہ ہو کر سر کھجانے لگے۔ ایک انگلی اپنی کھوپڑی پر رکھ کر بولے۔

"بحث چل رہی تھی۔"

"کیسی بحث؟" ثمینہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ "تم تو یہاں بیٹھے بیٹھے تھے۔"

"مگر شیعہ مقدمہ تھا۔"

"کیسا مقدمہ؟"

"ابّی میاں کا مقدمہ تھا میرے اور چچا زاد بھائی لطیف کے درمیان۔ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی میں بحث ہو رہی تھی۔"

"کون تھے وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی؟" زرینہ کے غصے کا پارہ چڑھنے لگا۔ "میں خود دونوں طرف سے وکیل تھا۔ خود ہی گواہ بنا ہوا، خود ہی مدعی، خود ہی مدعا علیہ، خود ہی بحث کرتا تھا، خود ہی جواب دیتا تھا۔" اشتیاق نے بتایا۔

"مگر کہاں بحث چل رہی تھی؟" زرینہ نے دانت پیس کر پوچھا۔

"یہاں۔" اشتیاق نے اپنی کھوپڑی پر انگلی رکھ کر بتایا اور سر جھکا لیا۔

زرینہ کا دل اشتیاق سے ہٹنے لگا۔ میری بھی! مجھ پر جو گزرنے لگا، وہ اس کی خامیاں سب جاننا ثابت ہونے لگیں۔ ادھر اشتیاق سے زیادہ اس کی بلی گلشن نے مجھے عاجز کر دیا۔ میں دراصل اشتیاق کی وجہ سے اس سے بے التفاتی تو برتتا تھا کیونکہ اشتیاق نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سوا کوئی دوسرا اس کی بلی پر توجہ دے۔ مگر غالباً گلشن کو یہ بات پسند نہ تھی وہ مجھے بھی اپنے چاہنے والوں کی فہرست میں شامل کرنے پر مصر تھی۔ وہ ایک بار وہ میرے کمرے میں شوق سے آئیں مگر میں نے کوشش کر کے بھگا دیا۔ پھر میری غیر حاضری میں ایک بار وہ میرے بستر پر چڑھ کے سو گئیں۔ دراصل سوئی نہیں تھیں سونے کا بہانہ کر رہی تھیں۔ وقت بھی بلی گلشن نے وہ چنا تھا جب میں دفتر سے آنے والا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دیکھو ہم تو تمہارے بستر پر چڑھ کے سوئیں گے اور اگر تم اسے برداشت کر گئے تو دوسری بار تمہارے پہلو میں پڑ کے سوئیں گے۔ یعنی میں جس قدر بے التفاتی دکھاتا تھا اسی قدر وہ مجھے اپنے قریب لانے پر مصر تھیں۔ اسی وقت میں نے جو انہیں بستر پر سوتے ہوئے دیکھا تو غصے میں آکر انہیں دم سے پکڑا اور بستر سے نیچے پھینک دیا۔ بے حد خفا ہو کر غرائیں اور جھپٹ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ مگر اس کا بدلہ گلشن نے یوں لیا کہ دوسرے دن دفتر سے جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں کمبل کی ریشمی روئی کے دونوں تکیے ادھڑے پڑے ہیں اور گلشن انہیں پنجے مار مار کر نوچ رہی ہے اور کمبل کی دھجیاں اڑا رہی ہے۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ پچھاڑنے کے لیے ان کی طرف بڑھا تو گلشن چھلانگ لگا کر دروازے سے باہر۔ اور بلی چیخنے لگی: میاؤں میاؤں! "مگر آج میں نے بھی قسم کھائی تھی۔ آج میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے صحن کا دروازہ بند کر دیا اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم اور ڈائننگ روم سے ہوتے ہوئے باتھ روم تک گلشن کے پیچھے پیچھے بھاگ کر آخر میں نے اسے پکڑ لیا اور دونوں ہاتھوں سے دبا کر اسے گھر سے باہر لے چلا۔ اشتیاق سہما ہوا میرے پیچھے پیچھے آنے لگا مگر میرے غصے کو دیکھ کر منہ سے کچھ بول نہیں رہا تھا۔ صرف اس کے ہونٹوں کے کونے پھڑک رہے تھے۔

بڑی سڑک پر آ کر میں ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ اس سڑک پر کئی کوڑے اور گڑھے تھے اور اس پر ان گنت موٹر ٹرک گھوں گھوں کرتے ہوئے گزرتے تھے۔ میں نے ایک ٹرک کو قریب آتے ہوئے دیکھ کر بلی گلشن کو زور سے گھمایا اور نشانہ باندھ کر گزرتے ہوئے ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔ اشتیاق کے گلے سے ایک گھٹی ہوئی چیخ نکلی۔

اک سڑک پہ سے گزر گئی چند لمحوں تک ایسا محسوس ہوا جیسے گلشن سڑک پر پس کر بیٹھی ہے۔ پھر یکایک وہ چونک کر کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سرعت سے چھلانگ لگا کر سڑک کو پار کرتی ہوئی مخالف سمت چلی گئیں۔ وہ ایک بار اُس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا مگر ادھر ہمارے گھر کی طرف آنے کی بجائے وہ مخالف سمت ہی دوڑتی چلی گئی اور پھر کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔

تین دن تک اشتیاق نے انتظار کیا مگر گلشن کہیں نظر نہیں آئی۔ چوتھے دن اُس نے سامان باندھ لیا اور بولا "صاحب میرا حساب کر دیجیے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں۔ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟" زرینہ نے پوچھا!

اشتیاق نے مجھ سے آنکھیں چرا کے زرینہ سے کہا "بیگم صاحب جس طرح صاحب نے میری بلی کے ساتھ سلوک کیا ہے وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"اور وہ جو تمہاری بلی نے میرے چالیس روپے کے دو قیمتی تکیے پھاڑ ڈالے ہیں اس کا ہرجانہ کون دے گا؟" میں نے غصے سے تند آواز میں کہا۔

زرینہ معاملے کو سلجھانے کے خیال سے بولی۔ "ارے ایک بلی کی وجہ سے لگی لگائی نوکری چھوڑتا ہے۔ میں تجھے ایسی ایسی دس بلیاں لا دوں گی۔"

"نہیں۔ وہ تو میری گلشن تھی۔" اشتیاق کی آواز کمزور ہو کر لرزنے لگی جیسے وہ ابھی رو دے گا۔

"ارے گلشن تھی کو زخمی کر کے ہیں جو نام چاہے رکھ لینا۔" میں نے بھی اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "سینکڑوں بلیاں گھومتی ہیں اس علاقہ میں۔"

اشتیاق نے پھر نظریں چرا کر مجھ سے رُخ موڑ کر زرینہ کی طرف دیکھا۔ بولا!

"مجھے صاحب سے بڑا ڈر لگتا ہے اب تو۔"

"کیوں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"جب صاحب نے گلشن کو اُٹھا کر سڑک پر پھینک دیا تو مجھے ان کا چہرہ بالکل اپنے باپ کی طرح نظر آیا۔"

"اپنے باپ کی طرح! کیا بکتے ہو؟" زرینہ غصے سے بولی۔

اشتیاق نے ایک دو لمحے توقف کیا پھر گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ "اسی طرح میرے باپ نے ایک دن نشے کی حالت میں مجھے گھر سے باہر سڑک پر پھینک دیا تھا۔ اس وقت میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ میں یقیناً مر جاتا مگر سڑک پر جہاں میں گرا اس پر ایک بڑا سا گڑھا تھا اور میں اُس گڑھے سے باہر نہیں نکل سکا اور رات کا وقت تھا اور دو ایک ٹرک پرے سے پرے گزر گئے پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا۔ میری ماں دوہتڑ مار کر چیخنے لگی۔ یکایک میرے باپ کو ہوش آ گیا اور وہ بھاگا بھاگا آیا اور سڑک کے گڑھے سے مجھے اُٹھا کے اپنے سینے سے لگا کے گھر لے گیا اور وہ میرا منہ چومتا تھا اور زور زور سے روتا تھا اور کبھی میری ماں مجھے اُس سے چھین کر اپنے سینے سے لگا لیتی تھی اور کبھی میرا باپ مجھے میری ماں سے لے کر اپنی چھاتی سے لگا لیتا تھا۔ مگر میں اس کا وہ چہرہ کبھی نہیں بھول سکا جب

اس نے بھی غصے میں اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر شرٹ پر پھینک دیا تھا۔ اصل میں ایسا ہی ہوتا اس وقت مناسب تھا۔ اس لیے میرا مطلب کچھ میں بیان نہیں ہو گا۔

اشتیاق میرے پاس کر ہاتھ ملانے لگا۔ جیسے اپنی گستاخی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہو۔

زرینہ نے اس کا حساب کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہمارا تبادلہ بمبئی میں ہو گیا تو وہ ہمیں بمبئی میں ملا۔ ہمیں ایک نوکر کی تلاش تھی اور اشتیاق ایک ہاؤس ایجنٹ تھا اور اس کا اسباب وہ کرایا تھا۔ اور وہ سندھی تھا اور سندھی زبان وہ بڑے مزے سے بولتا تھا۔ وہ کھدر کا پاجامہ اور کھدر کا ایک لمبا کرتہ پہنتا تھا۔ اور پہلی نظر میں کسی نیتر کمپنی کا کارکن نیتا معلوم ہوتا تھا۔

"یہ کیا ڈھونگ ہے تمہارے یہاں پر؟" زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"ادھر — بس — بڑے ٹھگ کا اڈا ہے اور سندھی لوگ کے پاس ہے اس لیے ہم بھی سندھی ہو گیا ہے بیگم صاحب! کیا کریں پیٹ روٹی اٹھاتا ہے۔"

"کوئی نیلی پیلی بات بھی ہے ادھر بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ شرمندہ سا ہو گیا آنکھیں جھپکاتے جھپکاتے بولا۔ "صاحب ادھر بمبئی میں جینا رہنا بھی مشکل ہے — ایک ایرانی ہوٹل کے مالک نے ترس کھا کر میرا ٹرنک اور بستر اپنے باورچی خانہ میں رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ رات کو اس کی دکان کے سامنے پڑ رہتا ہوں۔ صبح گیارہ بجے تک اس کی دکان میں سر سے بناتا ہوں۔ پھر بام داس ہاکی جانی کے دفتر میں جاتا ہوں۔"

"یہ ہاکی جانی کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"اصل میں ہاؤس ایجنٹ تو وہی ہے۔ میں اس کا دوسرا اسسٹنٹ ہوں۔"

"تم کو کیا ملتا ہے؟"

"کمیشن ملتا ہے۔"

"کتنا؟"

"ہاکی جانی کو ٹوٹل فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔ پہلے اسسٹنٹ کو فائیو پرسنٹ ملتا ہے۔" اشتیاق انگریزی بگھارنے لگے: "ہم کو ون پرسنٹ!"

"ون پرسنٹ؟" زرینہ نے پوچھا۔ "ون پرسنٹ آف واٹ! One percent of what"

اشتیاق بولے۔ "ون پرسنٹ آف دی فائیو پرسنٹ آف دی ٹوٹل فائیو پرسنٹ آف دی ہنڈریڈ پرسنٹ!"

زرینہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اشتیاق خود بھی بے حد محظوظ ہوئے۔ آخر جب زرینہ نے کسی طرح سے اپنی ہنسی پر قابو پایا تو بولے۔

"آپ کو ایک فلیٹ دے سکتا ہوں۔"

"کیسا ہے وہ فلیٹ؟"

اشتیاق انگلی پر گنواتے ہوئے بولے: "وَن بیڈ رُوم، وَن باتھ رُوم، وَن بیٹھک رُوم مور، وَن کچن، وَن ہال اینڈ سپریٹس۔"

"یہ and Separates کیا بلا ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"یس اینڈ سپریٹس!" اشتیاق نے اس طرح حیرت سے زرینہ کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو۔ ایم اے کرنے کے باوجود اتنی معمولی سی انگریزی نہیں سمجھ سکتیں آپ؟

"اینڈ سپریٹس؟ بیگم صاحب" اشتیاق نے پھر سمجھایا۔

زرینہ نے یکایک سمجھ کر کہا۔ "اچھا تمہارا مطلب ہے آل separate یعنی ہر کمرہ دُوسرے سے الگ الگ ہے۔"

"یس اینڈ سپریٹس۔" اشتیاق کے چہرے پر احساس برتری کی ایسی جھلک آئی گویا کہہ رہا ہو۔ اوہ کتنی دیر سے بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔

زرینہ پھر ہنسنے لگی۔ میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا "اور بھی کچھ کام کرتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ایک ٹرتھ پیسٹ تیار کیا ہے۔ میری ٹرتھ پیسٹ۔"

"یہ میری کون ہے؟" زرینہ نے چونک کر پوچھا۔

شرما کر بولے۔ "ایک چھوکری ہے!"

"تمہاری منگیتر؟"

"جی نہیں۔" سر جھکا کر بولے۔ "ہمارے ہوٹل میں ایک عیسائی بڑھیا کام کرتی ہے اُس کی چھوکری ہے۔ کوکن کے گاؤں میں بڑھیا کی چھوکری کی شادی بنانا ہے۔"

"تمہارے سنگ؟" زرینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں کسی عیسائی چھوکرے کے سنگ۔ ایلفرڈ اس کا نام ہے وہ بھی اُدھر کوکن کے گاؤں میں رہتا ہے مگر بڑھیا بہت غریب ہے اس کے پاس پیسہ نہیں ہے اسی لیے ہم نے میری ٹرتھ پیسٹ نکالا ہے اور اس کو شام کے ٹائم میں بیچتا ہے اور اس کا پیسہ اُس بڑھیا کو دیتا ہے۔"

"اور اپنی چھوکری کی شادی تمہارے سنگ کیوں نہیں کرتے؟" زرینہ نے بے ساختہ ہو کر پوچھا۔

یکایک اشتیاق سٹپٹا گیا اس کی آنکھوں کی پتلیاں جلدی جلدی گھومنے لگیں اس کے ہونٹوں کے کونے تیزی سے پھڑکنے لگے اور کان اور بھی اندر کو دھنس گئے اور اس کا چہرہ ایک سیاہ کالی مکڑی کی طرح نظر آنے لگا جیسے پھر سے کھال کھینچ لی گئی ہو۔

مجھے اس کو دیکھ کر بہت رحم آیا وہ اس وقت زرینہ سے نظریں چرا کر یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے چاروں طرف سے بند پنجرے میں یہاں پر کوئی چوہا ہو جس کے بچ نکلنے کا کہیں کوئی راستہ نہ ہو۔

میں نے جلدی سے بات کا رُخ پھیرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"شعر و شاعری جاری ہے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو ایک فلمی کہانی لکھ رہا ہوں۔" اشتیاق نے ہنس کر اس طرح کہا جیسے وہ اب اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکا تھا۔

"ہیرو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق!" اپنا نام لے کر بولے۔ "ڈبل رول ہے اشتیاق کا اس پکچر میں۔"

"اور ولن کون ہے؟" زرینہ نے پوچھا۔

"شاید دلیپ کمار نبھا جائے!" اشتیاق سوچ سوچ کر بولے۔ "ولن کا رول بہت مشکل ہے۔"

زرینہ نے ہنسی روکنے کے لیے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا۔

"اور ہیروئن؟" میں نے پوچھا۔

"فلم انڈسٹری میں تو کوئی ہے نہیں۔" اشتیاق سنجیدہ ہو کر بولے۔ "باہر دیکھ رہا ہوں۔"

"فلم انڈسٹری میں کوئی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا جیسے، اس کا انگریزی کا فقرہ میں نے دہرا کر پوچھا۔

"not even one percent of the five percent of the twenty five percent of the hundred percent. ؟"

"نو سر۔" اشتیاق نے سر ہلا کر کہا۔

"تو اس فلم کے گانے کون لکھے گا؟ تم نے تو شاعری ترک کر دی ہے۔"

"ہاں!" اشتیاق اپنے ہاتھ کے ایک ناخن کو دوسرے ناخن سے کریدتے ہوئے بولے۔ "شاعری تو چھوڑ دی ہے مگر اس فلم کے گانے تو میں ہی لکھوں گا۔ ایک گانا لکھا ہے۔۔۔"

"کیا؟"

ناہیں نیچے کیے آنکھوں کے کونوں سے ڈرتے ڈرتے چونکتا ہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "صاحب بات یہ ہے کہ غزل سے فلم صاحب نے ہم کو بہت ڈرا دیا تھا کہ اس کا وزن بہت بڑا ہو گیا ہے اس لیے ہم نے غزل کو چھوڑ دیا مگر گیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا وزن کچھ نہ ہوتا ہے۔ کیا سب کو پہلے ہم نے گائے ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں میوزک ہوتا ہے۔ اس ہم نے ایک فلم گیت شروع کیا ہے۔ اس طرح پہلے ہم نے گانے والا۔

"تو سنو!" میں نے بے چین ہو کر کہا۔

اشتیاق نے کھنکار کے گلا صاف کیا۔

"اوصنم! اوصنم!

میں نے کہا۔

اُلو کا جنم۔

اوصنم۔

تیرے لیے۔"

زرینہ کی بُری حالت تھی مُنہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے اس کا چہرہ لال ہوتا جا رہا تھا۔ بڑی مُشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی اور اس سے پوچھا۔

"مگر اُلو کا جنم کیوں اشتیاق؟" روکنے کے باوجود میری ہنسی میرے سوال سے باہر چھلکی پڑ رہی تھی۔

"اُلو کا جنم اس لیے صاحب۔" اشتیاق نے گہری سنجیدگی سے کہا کہ "اشتیاق کو فلم کے ہیرو کو رات میں نیند نہیں آتی ہے ہیروئن کی یاد میں..... ہیروئن کے فراق میں رات رات بھر جاگتا ہے اور اُلو بھی رات کو جاگتا ہے اس لیے..... بات کو کیسے ذرا سوچیے۔ کیا گہری حقیقت بیان کیا ہوں۔"

"ارے اُلو کے پٹھے!" زرینہ نے دوپٹہ مُنہ سے نکال کر ایکا ایک چیخ کر کہا۔ "بھاگ جا یہاں سے ورنہ اپنی چپل اُتار کر اتنے ماروں گی کہ....."

زرینہ چپل اُٹھانے لگی۔

اشتیاق بھاگ کھڑا ہوا۔

اشتیاق کا کاروبار ایرانی ہوٹل والے کے ہاں خُوب چمک گیا پہلے وہ صرف سموسے بناتا تھا پھر اُس نے ایرانی ہوٹل کے مالک کو خوب پٹا کر اُسے شاہی ٹکڑے بیچنے کی ترغیب دی۔

"بہت سستے میں بن جائے گا سیٹھ تمہارے اِدھر ڈبل روٹی کا کتنا ٹکڑا بے کار میں پھینکتا ہے۔ ہم اس کو کام میں لائے گا۔ شکر کا خرچ ہے اور تھوڑی سی بالائی۔" اشتیاق نے اُسے سمجھایا "اور تمہارے پاس تین تین ریفریجریٹر ہے۔ ایک ریفریجریٹر میں شاہی ٹکڑے رکھے گا۔ گاہک کو ٹھنڈا ٹھنڈا سرو (serve) کرے گا۔" ایرانی مان گیا کیونکہ خرچ بہت کم تھا اس مٹھائی کا۔ جب اشتیاق نے جو شاہی ٹکڑا بنایا تو وہ دو آنے فی ٹکڑے کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ایسی عمدہ ڈش جس سے پیٹ بھی بھرے اور مٹھائی کی مٹھاس بھی معلوم ہو ایرانی ہوٹل میں بیٹھنے والوں نے آج تک کاہے کو کھائی تھی۔ اب تو یہ حالت ہو گئی کہ اشتیاق کو روز ہی دو بار شاہی ٹکڑے تیار کرنے پڑتے اور بکری کو بڑھتے دیکھ کر ایرانی ہوٹل کے مالک نے اشتیاق کو اپنے کچن کا ہیڈ کک مقرر

کر دیا۔ مجھے یہی کام کرنے والے لڑکے سب اشتیاق کو استاد جی کہہ کے پکارتے تھے اور ہوٹل کا مالک اشتیاق کو شاہی ٹکڑوں کی مناسبت سے
بیکر دن کا ٹکڑا کہتا تھا۔

مگر میں نے کبھی اشتیاق کے جسم اور روح پر پھوڑے پھنسے دیکھے ہیں تو وہ یہی دن تھے ...... اُس کے ٹھیک سامنے
اور کالے نوخیزوں پر سٹاک وائبر لگے تھے۔ اور وہ کشتیاں جن کی تیلیوں کی بو اس کے کمروں میں ہر وقت بسی رہتی اور سمندر
جو کبھی تیرتی ہی رہتی تھیں اب بمبئی کے ساحل پر لنگر ڈالتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں جہاں اشتیاق نے ہمیں مکان دلوایا تھا اس کے قریب کی بلڈنگ
ڈھنگ کے فاصلے پر وہ ایرانی کا ہوٹل تھا۔ چوک کے نکڑ پر سامنے ٹیکسیوں کا اڈہ تھا اور قریب ہی ملیشیا ریسٹورنٹ کھل گئی تھی اس لیے
صبح سے شام تک اس ایرانی ہوٹل میں بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ بوٹ پالش کرنے والے اور پان بیچنے والے اور بھیل پوری کی چاٹ بیچنے والے
اور آس پاس کے گھروں اور بنگلوں کے ڈرائیور اور ماہیوں کے شیدی لہراتے اور کام کی تلاش میں گھومنے والے بے کار اور آوارہ لڑ
ونشے ہوٹلوں کے لڑکوں سے زیادہ شیدی معلوم ہوتے تھے ان سب کا جمگھٹا اس ہوٹل کے اندر اور باہر رہتا تھا۔ اور اس ہوٹل میں اشتیاق
بہت پاپولر ہو گیا تھا۔ آتے جاتے میں اسے دیکھتا تھا۔ سہ پہر تک تو وہ اپنے میلے کپڑوں میں ہی کام کرتا کھانا کھلانے کے ابریز کی ستھری سے کا
ستا دکھائی دیتا۔ کوئی چار بجے کے قریب وہ نہا دھو کر گہرے رنگ کا بنگالی کرتا اور اس کے نیچے کھلے پائنچوں والا پاجامہ اور چپل پہن کر
ہوٹل کے باہر آکھڑا ہوتا۔ اس وقت اسے کسی کی تلاش ہوتی۔ آتے جاتے ادھر ادھر سے بہت سے لڑکے پیتے وہ ادھر ادھر کے بنگلوں ا
علیحدہ میں ان لڑکوں کو نوکر کرا دیتا کیونکہ وہ اس بلڈنگ کا اسسٹنٹ ہونے کی وجہ سے اس پاس کی بلڈنگوں میں اس کی خاصی جان پہچان
ہو گئی تھی۔ جن لڑکوں کو وہ نوکری دلوا سکتا انھیں نوکری دلوانے کا شوق رکھتا تھا کر لیکر بیڑی سلگا کر ٹیک لگ کے
اٹکی کرتا جو اس کا ہم وطن تھا یعنی مراد آباد کا رہنے والا تھا اور جس کے پیسے وہ ایک نہایت ہی عمدہ اور نہایت ہی سستی
صابن بنا لیا بنا تھا جس پر خرچ بہت کم ہوا اور کپڑے بھی بہت عمدہ دھل جائیں مگر اشتیاق ابھی اپنی ایجاد میں کامیاب نہ ہوا تھا۔

ٹیسلا نوکری سے فارغ ہو کر وہ اپنے اس ایجنٹ کے ہاں چلا جاتا یا نئے گاہکوں کی تلاش کرکے مکان دکھانے کے لیے چلا
رات کو دس بجے فارغ ہو کر ایرانی ہوٹل میں کھانا کھاتا پھر ایک کپ چائے پی کر اور پھر بیڑی سلگا کر اور پان کھا کر وہ سنتو باورچی
بھرنڈے میں جا کر سو رہتا کیونکہ اب وہ بڑا آدمی ہو گیا تھا۔ وہ اب ایرانی ہوٹل کے باہر نہیں سو سکتا تھا۔ سنتو باورچی کا جھو
بارھویں نمبر کی سڑک کے پیچھے بنے ہوئے خالی پلاٹ پر تھا اور اس کی بیوی چونکہ اپنے میکے گڑھوال کے کسی گاؤں میں گئی
تھی اور کہیں چار ماہ کے بعد واپس آنے والی تھی، تب تک اشتیاق سنتو کے جھونپڑے میں رہ سکتا ہے سنتو نے اشتیاق سے

شاہی ٹکڑوں کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر میں نے اندازہ کیا تھا کہ اب اشتیاق کے قدم یہاں جم جائیں گے۔ اس لیے
کے بعد مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایرانی ہوٹل کے مالک نے مجھے بتایا کہ اس نے اشتیاق کو نکال دیا ہے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی غبن کیا؟"

"نہیں۔ آج تک ایک پیسے کا غبن نہیں کیا۔" ایرانی ہوٹل کا مالک بولا۔

"پھر کیا کام میں گڑبڑ کرتا تھا؟"

"نہیں۔ کام تو اشتیاق بہت اچھا کرتا تھا۔"

"پھر؟"

ایرانی ہوٹل کے مالک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر جلدی سے بند کر لیا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولا۔ "اس کا بھیجا پھر گیا ہے ہم اس کو تیس روپیہ پگار دیتا تھا وہ پگار بھی اس نے ختم کر دیا اوپر سے پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائیس کا بل ہو گیا۔"

"پانسو کپ چائے اور دو سو سلائیس؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اشتیاق تو اتنا پیٹو کبھی نہ تھا وہ تو بہت ہی کم خوراک کھاتا تھا۔"

"ہم جانتا ہے اس لیے تو ہم بولتا ہے۔" ایرانی ہوٹل کا مالک خفا ہو کے بولا "وہ خود پانسو کیا سات سو کپ چائے پیتا تو ہم اس سے نہیں کہتا تھا مگر وہ خود نہیں پیتا تھا ادھر اُدھر کے سب بے کار اور نکمے لونڈا لوگ کو جو ادھر آجو باجو کی بلڈنگوں میں نوکری بنانے کے واسطے آتے وہ اُن کو بھوکے پیٹ دیکھ کر چائے پلاتا تھا۔ جب ہم منع کرتا تھا تو بولتا تھا میرے حساب میں لکھ لو۔ اب پانچ سو کپ چائے اور دو سو سلائیس کا بل ہو گیا۔ اس کو کس کے حساب میں لکھے گا؟ اس لیے ہم نے اس کو نکال دیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" میں نے ایرانی سے کہا اور پیسے کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک ڈبیہ کیونڈر کی دو!"

"عجب مغز پھرا ہے اس کا۔" ایرانی نے میرے پیسے گنتے ہوئے کہا: "دو پیسہ کم ہے۔"

"ساری" کہہ کر میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اُسے دو پیسے اور دیے اور کیونڈر کی ڈبیا لے کر اس سے پوچھا۔ "تو آج کل اشتیاق کہاں پر ہے؟"

"جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟" میں حیرت سے ایرانی کی طرف دیکھنے لگا: "تم نے اس بے چارے کو جیل بھجوا دیا؟"

"ہم نے کہاں پہنچایا ہے صاحب۔ وہ تو اپنی کرنی سے گیا ہے۔ شراب کی سمگلنگ کے دھندے میں۔"

"اچھا۔ یہ دھندا بھی اُس نے شروع کر دیا تھا۔"

"وہ تو یہ دھندا نہیں کرتا صاحب۔ مگر ہمارا باورچی سنتو اپنے کھالی ٹائم میں یہ دھندا کرتا تھا اور ادھر اُدھر کی بلڈنگوں میں دارو پہنچاتا تھا۔" ایرانی بولا۔ "پھر ایک رات پولیس نے اُس کے جھونپڑا پر چھاپہ مارا۔ چھ بوتل پکڑا گیا تو اشتیاق بولا کہ سنتو بے گناہ ہے۔ میں نے یہ چھ بوتل شراب کا ادھر لا کے رکھا تھا اس واسطے اشتیاق کو تین مہینے کی سزا ہو گئی ہے۔"

"اُس نے ایسا کیوں بولا؟"

"وہ بولا۔ ہمارا کیا ہے ہم اکیلا آدمی ہے تین مہینے کی سزا چٹکی بجاتے کاٹ لے گا۔ مگر جب سنتو کی گھر والی اپنے بچے سنگ کر کے پھر شہر میں آئے گی تو جھونپڑا خالی دیکھ کر روئے گی!"

ایرانی ہوٹل کا مالک اپنے سر پر انگلی رکھ کے بولا: "بھیجا پھر گیا ہے اس کا۔"

• •

زرینہ کو خیال آیا کہ ہمیں سے راستے ہی اشتیاق ہمارے گھر آنے لگا۔ لیکن جب تین ماہ سے اُوپر کئی دن گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو اُسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ مایوسی مجھے بھی ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ اشتیاق اگر ہمارے گھر نہیں آتا تو ٹھیک ہے۔ ادھر ادھر ایرانی ہوٹل کے باہر ضرور دکھائی دے گا۔ پر اُدھر بھی نہیں۔ سنتو باورچی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اُس کے ہاں بھی نہیں آیا۔ پھر ہم دونوں نے سوچا ممکن ہے اشتیاق شرم کے مارے یہ علاقہ ہی چھوڑ گیا ہو یا بمبئی سے کہیں باہر چلا گیا ہو۔ جب ڈھائی ماہ اور گزر گئے اور اشتیاق نہ آیا تو ہمارا یہ خیال پکا ہو گیا۔

پھر ایک روز۔ ہم نے یکایک اُسے ایک دعوت میں دیکھا۔ سردار زور آور خان کے ہاں ہماری دعوت تھی جن کی بیوی نصرت خانم میری بیوی کی خاص سہیلی تھی۔ ہم تو کھانے کے شروع کے دو لقمے کھاتے ہی بھانپ گئے کہ یہ کس کا شاہکار ہے۔ پہلا لقمہ چکھتے ہی میں نے زرینہ کی طرف اور زرینہ نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر ہم دونوں چپ رہے۔ کھانے کے بعد جب دعوت کی تعریفیں ہونے لگیں تو کچن سے خراماں خراماں اشتیاق برآمد ہوئے۔ کالی پتلون کے اُوپر لال بش شرٹ اور لال بش شرٹ کے اُوپر بھورے رنگ کا ایک میلا اپرن پہنے ہوئے اور سر جھکا کر کورنش بجا لاتے ہوئے شاہوں کے انداز میں داد وصول کرنے لگے۔
میں نے اور زرینہ نے اُس وقت اُنھیں پہچاننا مناسب سمجھا۔ اشتیاق نے بھی اس وقت ہمارا رویہ بھانپ کر مکمل اجنبیت اختیار کی۔

بعد میں نصرت نے زرینہ کو الگ لے جا کے بتایا "بہت اچھا کُک مل گیا ہے مجھے۔ اشتیاق احمد خان نام ہے اس کا۔ اپنی طرف سے قاضی خیل کا پشتو بہت اچھی بول لیتا ہے حالانکہ بچپن ہی سے ادھر رہا ہے پھر کھانا تو غضب کا پکاتا ہے۔ کچن میں بڑی بچت سے کام لیتا ہے۔ جب سے یہ آیا ہے ہمارے کچن کا خرچ ڈھائی سو روپے کم ہو گیا ہے۔ پورے ڈھائی سو روپے۔ سنتی ہو، میں اس کو صرف ستر دیتی ہوں حالانکہ سو بھی دوں تو سستا رہے گا۔"
زرینہ انجان ہو کر بولی۔ "آدمی تو شریف معلوم ہوتا ہے۔"
"اسے شریف ایسا شریف" نصرت اشتیاق کی تعریف کرتے ہوئے بولیں۔ "میرے بچوں پر تو جان چھڑکتا ہے اور میرے بچے بھی اُسے ٹوٹ کر دل و جان سے چاہتے ہیں۔ کوئی سگی ماں اُن کی کیا خدمت کرے گی جیسی وہ بچوں کی کرتا ہے۔ ابھی چار دن کی بات ہے بچوں کو موٹر مانگتے ہی تھا۔ میں نے کہا لا دوں گی۔ میں ٹال رہی تھی کیونکہ گھر میں دو کھلونے موٹروں کے پہلے سے پڑے ہیں۔ پرانے ہو گئے ہیں ذرا تو کیا ہوا۔" نصرت زرینہ کا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے بولی۔ "یہ مرا اشتیاق دس روپے کی موٹر میرے بچوں کے لیے خرید لایا تو میں نے غصے سے جھلا کر کہا "میں تو اس موٹر کے پیسے نہیں دوں گی تم رکھو اپنی۔" "دیکھیے بیگم صاحب میں تو اپنے پیسوں کی موٹر لایا ہوں تم کو لیے۔" اس پر وہ غصے سے بولا کہ بس۔ "تم سے کس نے کہا تھا بچوں کے لیے موٹر لانے کو" تو اشتیاق چپ ہو گیا ان کی طرف گھور کر سہم گیا۔ "جب سے منہ بٹھا رکھو۔" صاحب میں بچوں کا کہنا نہیں ٹال سکتا۔ وہ جو کہیں گے میں منہ سے کروں گا۔"
اُس نے ایسے معصوم لہجے میں اُن سے بات کی کہ اُن کا سارا غصہ اُتر گیا۔ مسکراتے ہوئے ایک طرف کو سرک گئے میں

بھی کیا بولتی بس چُپ ہو کر سرتے سے سپاری کاٹنے لگی۔

زرینہ خاموشی سے مسکرا مسکرا کر نصرت کی باتیں سُنتی رہی مگر اُس نے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اشتیاق کو جانتی ہے۔ نہ اگلے سال میں اشتیاق نے ایک بار بھی بتایا کہ وہ ہم دونوں کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہم نے سوچا بے چارہ جہاں لگا ہے لگا رہے اس کی خامیاں بتانے سے کیا فائدہ۔ اور یہاں زور آور خان صاحب کے ہاں رہ کر اشتیاق بہت ٹھیک ہو چلا تھا بال ماتھے پر نہیں لٹکتے تھے۔ ذہنی طور پر بہت حاضر رہتا تھا کپڑے صاف ستھرے پہنتا تھا۔ شعر و شاعری ترک کر دی تھی۔ دن بھر یا تو کچن میں رہتا یا خان صاحب کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا۔ ملازم اُن کی دیکھ بھال کے پیسے دو آیا تھیں الگ سے مقرر تھیں مگر بچے جس قدر اشتیاق سے مانوس ہو گئے تھے اتنے گھر کے کسی دوسرے ملازم سے نہ تھے۔ میں نے اور زرینہ نے شکر کا سانس لیا: "چلو۔ یہ اشتیاق نارمل تو ہوا۔"

ایک رات زور کی گھنٹی بجی کوئی تین بجے کا وقت تھا میں نے گھبرا کر دروازہ کھولا باہر سردار زور آور خان کا ڈرائیور رحمان کھڑا تھا۔

"حضور جلدی چلیے۔ بیگم صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"کیا بات ہے حامد؟" میں نے پوچھا۔

"اشتیاق نے زہر کھایا ہے!"

"ہیں" میرے مُنہ سے نکلا

"ہاں صاحب۔ اشتیاق نے زہر کھایا ہے اور خان صاحب پنڈی گئے ہیں گھر پر بیگم صاحبہ کے دو بھائی ہیں مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جائے۔ ڈاکٹر منصور کو ٹیلی فون کیا تھا بیگم صاحب نے مگر وہ بولے یہ پولیس کیس ہے۔ میں نہیں آ سکتا۔ اور اشتیاق مر رہا ہے۔"

زرینہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تم جلدی سے چلے جاؤ بے چاری نصرت سخت پریشان ہو گی۔"

خان صاحب کے ڈرائنگ روم کے عین مرکز میں فرش پر سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ایک لاش رکھی تھی اور نصرت اور اُن کے دونوں بھائی اور گھر کے دوسرے ملازم حیرت سے گم سُم کھڑے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"کیا مر گیا؟" میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔

"نہیں ابھی تو زندہ ہے!" ایک آیا آہستہ سے سسکتے ہوئے بولی۔

میں نے چادر ہٹا کر نبض دیکھی سینے کے زیر و بم میں زندگی کی گھر گھراہٹ تھی اور نبض ٹوٹ رہی تھی۔ نصرت ایک بھوری شال اوڑھے پریشان سے ہوا چیلی چیلی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"کب اس نے زہر کھایا؟" میں نے نصرت سے پوچھا۔

نصرت کچھ نہیں بولی۔ جیسے اُس نے میرا سوال سُنا تک نہ ہو۔

نصرت کا چہرہ ابھی بھی ہو رہا تھا کہ بستر کے قریب میں نے اپنے بستر کے قریب کسی کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔ جب جاگا تو معلوم ہوا اشتیاق ہے۔ وہ اوپر والے کمرے سے چلا آیا تھا میرے کمرے میں پہنچا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا "مجھے لگتا ہے میں نے زہر کھا لیا ہے۔"

میں نے پوچھا "کون سا زہر؟"

"برو۔ ٹیک ٹو۔"

"کتنا کھایا؟"

"کچھ زیادہ ہی ٹیک ٹو۔" اس کی زبان زہر سے موٹی ہو چکی تھی اور آواز میں لکنت تھی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ ایک ڈیڑھ شیشی لیکن اس کے منہ سے نکلا تھا صرف کچھ۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگا۔ پانی سے قے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے مزید باتوں کا سلسلہ ختم کر دیا۔ "اسے اٹھا کر نیچے لاؤ۔ میں ڈاکٹر ... ہسپتال لے جائیں گے۔"

"مگر پولیس۔" نصرت کانپ کر بولی۔

"پولیس کو وہیں سے اطلاع کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "نزدیک کا ہسپتال کون سا ہے؟"

"جناح۔"

"یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

"کوئی چار میل۔"

"جلدی چلو۔"

جس وقت چار نوجوانوں نے مل کر اشتیاق کو پہلی منزل سے نیچے اتارا اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سڑک کے کنارے کے روشنی کے کھمبے پانی میں بھیگے ہوئے یوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے اپنی زرد زرد زندگی پر سوگ منا رہے ہوں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کہیں کہیں روشنی کے پھٹے چیتھڑے نظر آتے پھر اندھیرا انہیں کھا جاتا پھر نکلتے۔ ایک گدھوں کی لدی ہوئی ایک گاڑی پہاڑ ... چلنے لگی جیسے ایک عورت اپنی عصمت کے ساتھ رات کی ... میں اپنے گھر کی طرف بھاگ رہی ہو۔

ایمرجنسی وارڈ میں!

اے فارم بھرو!

بی فارم بھرو!

سی فارم بھرو!

زندگی تم بھی تو رکو!!

اشتیاق کا سر بھورے رنگ کے تیل کا تھرے کے گدے پر ٹکا ہے اس کی آنکھیں کسی گہرے گڑھے میں جا گری ہیں اور ...

وارڈن کھوں کھوں کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔

پچتر روپیہ ایڈوانس دو۔

یہ رسید لو۔

دھنو۔ مریض کو کمرہ ۸ میں لے جاؤ اوپر۔ لفٹ سے۔ میں ابھی ڈاکٹر کوٹھاری کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔

باہر کوئی ٹرک گزرتا ہے۔

گھوں گھوں۔

اشتیاق کا سینہ ہونکتا ہے

ہُش ہوں۔

آئیل کلاتھ کا مڑا ہوا بستر اپنے پایوں میں لگی ہوئی ربڑ کی چرخیوں کے ذریعہ لفٹ کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے۔ لفٹ اوپر کی منزل پر جاکے رُک جاتی ہے۔ بستر برآمدے میں سے گزر رہا ہے کمرہ نمبر سات کے اندر جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اندر آتی ہیں۔ سات نمبر کا پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں آتی ہیں اور ہم باہر بنچ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

ہلکے ہلکے پیڈوں میں بے آواز نرسیں خاموشی سے گھوم رہی ہیں۔ اردلی نیند کی غنودگی سے بیزار ٹہل رہے ہیں۔ کہیں کوئی مریض تھکے تھکے کراہتا ہے زندگی دھیرے دھیرے سسکتی ہے۔

"اشتیاق نے زہر کیوں کھایا؟" میں پوچھتا ہوں

"نہیں کیا ہوگا۔" نصرت کا چھوٹا بھائی اندازہ لگا کے کہتا ہے۔

"میں نے ہوتے ہوئے گھر کا سارا خرچ اشتیاق کے سپرد کر دیا تھا۔ ہر وقت چار پانسو روپے اشتیاق کی جیب میں رہتے تھے، ابا نے اشتیاق سے حساب دینے کو کہا تھا۔ آج اس نے زہر کھا لیا۔ میرا خیال ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔" نصرت کا دوسرا بھائی بولا۔ "اشتیاق میں دس برائیاں ہوں مگر وہ چور نہیں ہے۔ آج شام اس نے ایک دبلے ... نہیں کی میرے خیال میں پچھلے ہفتے جو مرادآباد سے اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کے آبائی مکان والے مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف ہوا ہے معلوم ہوتا ہے اس کا اثر بہت ہوا ہے۔"

"ابھی نہیں۔ تم جانتے ہو" اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "اشتیاق کو دولت، روپے پیسے سے کبھی محبت نہیں۔ یہ سب عشق کا چکر ہے۔ گلشن کا!"

"گلشن؟ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ گلشن کون ہے؟ میرے ذہن میں ایک بتی روشن ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔"

"ایک نئی آیا رکھی ہے صاحب نے بڑی خوبصورت لونڈیا ہے عمر سولہ سترہ برس کی ہے۔ بھاگ بھاگ کر کام کرتی ہے۔ اس کا نام گلشن ہے۔ صاحب ہم نے سنا ہے کہ اشتیاق کی پہلی بیوی کا نام بھی گلشن تھا۔"

"ارے!" میں چونک گیا۔

"جی ہاں۔ اسی وظیفے کے چکر میں زہر کھالیا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پہلے تو صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ اس لڑکی کو نکال دو۔ یہ کام ٹھیک سے نہیں کرتی ہے پھر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ میں اسے باہر سے نکلوانا چاہتا ہوں کہ اس کا نام گلشن ہے۔ میں نے کہا بھلے مانس، اس کا نام گلشن ہے تو کیا ہوا کام تو ٹھیک کرتی ہے۔ مگر اشتیاق نہیں مانے۔ بار بار اس کی شکایت کرتے رہے مگر جب صاحب کسی طرح نہیں مانے تو صاحب کو تو معلوم نہیں کب انہوں نے ارادہ بدلا اور کب اشتیاق میاں نے رویہ بدل دیا۔ اب یہ اس لڑکی پر مہربان ہونے لگے۔ دوسرے نوکر تو چائے پیتے تھے یہ اس کو کافی پلانے لگے جو صرف صاحب اور بیگم صاحب پیتی ہیں۔ پھر ایک دن گلشن کو جو پتہ چلا کہ اس کو کافی ملتی ہے جبکہ دوسرے نوکروں کو صرف چائے ملتی ہے تو وہ ایک دم بھڑک گئی اور اس نے اس دن سے کافی پینے سے انکار کر دیا۔ ایک دن اس نے اشتیاق کو بازار سے دیسی صابن لانے کو کہا تو یہ اس کے لیے انگریزی صابن لے آئے۔ اس نے کھوپرے کا تیل منگایا تو یہ کنگھا، ہیئر پن وغیرہ اٹھا لائے۔ کل گلشن کی ماں کا خط آیا جو بیگم صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اب اشتیاق کی تو عادت تھی دروازہ پر کھڑے ہو کر دوسروں کی بات سنتے رہتے تھے۔ گلشن کی ماں نے لکھا تھا کہ اس نے گلشن کی شادی کی بات چیت پکی کر لی ہے لڑکا کسی سیٹھ کی کمپنی میں دربان ہے۔ یہ خیال بار بار ہی تھے کہ وہ آئی کیا منہ لٹکا تی۔ بس جب سے یہ سنا گم سم بیٹھے بیٹھے ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے اور مجھ سے کہتے تھے اب جینا بیکار ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ بولے کچھ نہیں! اور پھر اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے گلاب جینا بیکار ہے۔ یہ تو دوپہر کی بات ہے .... رات کو انہوں نے زہر کھالیا ......" حامد اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

میں نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ "مگر زہر کھانے سے پہلے اس کمبخت نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی؟"

"جی نہیں صاحب" حامد خفا ہو کے بولے "اصل بیماری تو عشق تھا۔ دس دن تو ہوئے ہیں گلشن کو آئے ہوئے۔ ان دس دنوں میں انہوں نے اس لڑکی سے نفرت بھی کی، دوستی کی ابتدا بھی کی محبت بھی کی پھر آپ ہی آپے میں آ گئے۔ سب کچھ دس دنوں میں کر لیا۔ لڑکی کو تو کچھ خبر بھی نہیں ہے صاحب۔ وہ تو ایسی بدصورت ہے اور ایسی بھدی کہ خیال بھی اسے تو گمان تک نہیں گزر سکتا کہ کوئی اس سے عشق کر سکتا ہے۔"

حامد چونکہ بڈھے تھے اور زندگی کے اس دور میں سے گزر رہے تھے جب کوئی کسی سے محبت نہیں کر سکتا ہے اس لیے داستان سناتے وقت ان کے لہجہ کی شدت یہ تھی جس طرح ان کی مجبوری کی غمازی کر رہی تھی اس سے مجھے بڑا لطف آیا۔

کوئی ساڑھے چھ بجے کے قریب ڈاکٹر کرشنا کماری کمرہ نمبر سات سے برآمد ہوئے اور مجھے دیکھ کر بولے۔ "ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اگلے چوبیس گھنٹے اس پر بہت نازک ہیں۔ میں نے اس کا معدہ صاف کر دیا ہے۔ گلوکوز کے سیلائن پر رکھ دیا ہے کھانے کو دوائی دی ہے انجکشن دیے ہیں کچھ لکھ دیے ہیں۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ مگر کیا مریض اس وقت ہوش میں ہے۔"

"ہوش میں تو ہے مگر ابھی بہت کمزور ہے ابھی زیادہ لوگ اس سے نہ ملیں تو بہتر ہوگا۔" ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صرف آپ اس سے چند منٹ کے لیے مل لیں۔ میں نے تھانے ٹیلی فون کر دیا ہے کسی وقت بھی پولیس انسپکٹر اس کا بیان لینے کے لیے

ہے کیونکہ مریض کی حالت بہت نازک ہے . . . . .

اسنا کہ جب ڈاکٹر کو ٹھری سے چلے گئے تو نصرت کا چھوٹا بھائی برافروختہ ہو کے بولا" خان صاحب گھر پر نہیں ہیں اور یہاں پولیس کے
نے کس کس کے بیان جوں گے۔ آپ کے بیٹے کو اتنی عقل نہیں آئی کہ اگر مرنا ہی تھا تو سمندر میں ڈوب کے ہی مرجاتا ۔ کسی گاڑی
کے نیچے آ کر ہی مرجاتا۔ کہیں پر مرتا مگر اس گھر سے دور رہ کر ہی مرتا اور یوں ہم سب کو پریشان کر کے تو زہر نہ کھاتا . . . !

بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے کہا" مرنے والوں کو ہمیشہ اپنے بعد زندہ رہنے والوں کی سہولیت کا خیال کر کے مرنا چاہیے اس سلسلے
میں آپ ایک رسالہ خودکشی شایع کریں تو بہتوں کا بھلا ہو گا۔"

اس کے بعد میں کمرہ ضرب سات میں داخل ہو گیا۔

اتفاق سے اُس وقت کمرہ میں کوئی نہیں تھا۔ نرس کوئی دوا لانے کے لیے گئی تھی۔ اشتیاق گھرتے تکیوں میں سر نکالے لیٹا تھا۔ اس
کے بازو کی رگ میں گلوکوز جا رہا تھا۔ دوسرا بازو اس کے سینے پر تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے سیاہ چہرے کے پیچھے سفید تکیوں
کے کورے کی چمکوں پر بارش کے قطرے لرز رہے تھے اور کانچ کی سطح پر روشنی اور سائے امید و بیم کی کشمکش کی طرح لرزاں تھے۔

اشتیاق!" میں نے اُس کے بستر کے قریب جا کر سرگوشی میں کہا۔" اشتیاق سُنو!"

میں نے پھر ذرا اونچی سرگوشی میں کہا۔" کان کھول کے سُنو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نرس آ رہی ہے۔"

اشتیاق نے آنکھیں کھولیں۔ اور جب میں نے دیکھا کہ اُس نے مجھے پہچان لیا ہے تو میں نے اُس کے قریب جُھک کر کہا۔" کسی وقت بھی
پولیس تمہارے پاس بیان قلم بند کرنے کے لیے آ جائے گی۔ اُس سے صرف یہ کہنا ہو گا کہ تمہارے پیٹ میں درد تھا اور تم امرت دھارا لے
رہے تھے۔ اتفاق سے کمرہ میں تمہارے سرہانے 20 — ڈی ڈی ٹی کی شیشی بھی پڑی تھی وہ بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہے جتنی امرت
دھارا کی۔ اس لیے رات کو جب تمہارے پیٹ کا درد بڑھا تو تم نے غلطی سے امرت دھارا کی جگہ 20 — ڈی ڈی ٹی پی لی۔ غلطی سے پی
لی۔ پی ہی گئے بس اتنا کہنا۔ سمجھتے ہو!"

اشتیاق نے میری طرف دیکھ کر خاموشی سے سر ہلا دیا۔

آنکھوں کی پُتلیاں نیم ساکت، ہونٹ اندر کو بھنچے ہوئے، رُخساروں کے گڑھے گہرے ہو رہے تھے۔ تاریکی میں کھوئے ہوئے سینہ کھلا اور ننگا
تھا اور ... سے ڈھکا ہوا کسی ویران جزیرہ کی مانند اور دُبلی پتلی پسلیاں کسی شکستہ عبد کی سیڑھیوں کی طرح زندگی کے سوکھے تالاب کی طرف

. . . . .

اشتیاق! اشتیاق۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے اُس کے سر پر جُھک کر گہری شدت سے پوچھا۔
وہ کچھ دیر تک بالکل ساکت رہا جیسے اُس نے میرا سوال نہ سُنا ہو۔ پھر اس کا ہاتھ اس کے سینے پر سرکنے لگا۔ دھیرے
دھیرے اپنا سینہ اپنی انگلیوں سے سہلاتے ہوئے ہوا کی سی سرگوشی میں بولا۔

یہ سینہ خالی ہے۔"

سینہ خالی ہے۔ کتنی صدیوں سے انسان کا سینہ خالی ہے اور انسان نے اس خالی سینے کو رام نہ بھر سکے اور مسیح نہ بھر سکے اور

میں دیر سے تم کو باہر کے صحن میں ہوں۔ وہ اسے اس مہینے کے اندر خوشگوار گئے ہیں اور اس کی کلائیاں میں ایک ایک [illegible]
اور تم کہاں کہاں سے کوڑا اکٹھا کر کے لا رہے ہو۔ اگر کسی طرح سے یہ ظاہر ہو جائے۔ پہلے تم نے اس روز کتاب کے [illegible]
ایک پھول توڑ کے اندر کس طرح ملتا ہے۔ پھر سیکڑوں کیسے نے کہ تم نے اس میں [illegible] دیے اور ٹیل روٹیاں کاٹ کاٹ کر
پھینکتے رہے ہو۔ تم بڑی ہاتھ پیٹ جاتے ہو اور خود ہے مگر دوسروں کے پیٹ [illegible] اپنے [illegible]
کے [illegible] سے محبت کرتے رہے مگر تم گلشن کو کبھی نہ بھلا دے۔ اور کسی کا [illegible] نہ ہو سکا۔ گلشن گلشن تم کتنے بھٹکتے رہے اور [illegible]
جو کر ایک پیشے سے دوسرے پیشے کی کھوج میں بھٹکتے رہے۔ تاکہ کسی طرح تم اس خلا کو پر کر سکو جسے صرف ایک عورت کی محبت پر کر سکتی ہے۔۔۔۔

بچے!

زمیں اندر آگئی۔

میں نے ایک بار پھر اشتیاق کے ساتھ شفقت ہونے کیا اور جیت چہرے کو دیکھا جس کے پیچھے نہ کرنے کا ہمیشہ سے چند
قطرے ہو لے [illegible] ڈالے اور اس کا پانچ [illegible] دن پہلے [illegible] چلے گئے ۔۔۔۔۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

نسیم منزل

شوکت تھانوی

——— شکور بیٹھا خود ہی بڑبڑا رہا ہے ———

شکور: (خود ہی بڑبڑاتے ہوئے) واہ جی واہ۔ بڈھے ہو گئے شکور میاں تم بھی اسی ڈیوڑھی پر۔ اپنی بات تو پوری کر دکھلائی۔ جب نوکری کرنے آئے تھے تو یہی کہا تھا کہ اب جنازہ ہی اٹھے گا اس گھر سے اپنا۔ تو اب جنازہ اٹھنے میں کسر ہی کیا رہ گئی ہے۔ اس عمر میں تو موت سر ہی پر منڈلاتی رہتی ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ مگر اتنے ہی دنوں میں کیا کچھ نہیں دیکھا تم نے شکور میاں۔ مینہ برستا دیکھا اس گھر پر۔ گردش کے کھلائے جان دیکھے۔ پھر جوانوں کے کرتوت دیکھے۔ دونوں ہاتھوں سے دولت اڑائی گئی۔ بڑے صاحبزادے نے پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھا۔ اسے جی قارون کا خزانہ ہو تو وہ بھی خرچ ہو جائے۔ آخر یہ حال ہو گیا کہ مکان کرائے پر اٹھ رہا ہے۔ کرایہ پر نہ اٹھے گا تو بک جائے گا۔ اب بڑے بھائی کہتے ہیں۔ پگڑی لو۔ سال بھر کا کرایہ پیشگی۔ اور چھوٹے بھائی کہتے ہیں کہ یہ ڈکیتی ہے مگر کوئی پوچھے شکور میاں تم کون۔ تین میں نہ تیرہ میں نہ سُتلی کی گرہ میں ———

نسیم: (آواز آتی ہے) شکور۔ شکور بابا۔

شکور: (بلند آواز سے) حاضر سرکار۔ آ رہا ہوں۔ (پھر بڑبڑاتا ہوا جاتا ہے) شکور کو بیٹھنے نہ دینا دو گھڑی۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں اس بڈھے کی کمر سیدھی نہ ہو جائے اگر اس کی تھکن دور ہو گئی تو ایک روٹی نہ کھالے یہ پیٹو۔ اندھیرے منہ اٹھو اور پھر آدھی رات تک آپ لوٹے جا ہے لوٹنے ..... (بلند آواز سے) مجھے بلایا تھا میاں؟

نسیم: جی ہاں۔ کلیم میاں سے کہیے کہ ذرا میرے کمرے میں آئیں۔

شکور: بہت اچھا (جاتا ہے) کوئی پوچھے بھئی آواز کلیم میاں کو بھی دے سکتے تھے جو شکور کو دی گئی ہے۔ مگر کلیم میاں کو آواز دیں ان کے دشمن جب ان کو بلانے کے لیے شکور موجود ہے تو اس سے کام کیوں نہ لیں۔ دو وقت کی روٹی اور بیس روپے مہینہ مفت ہی تھوڑی دیے جاتے ہیں۔ ان داموں نوکر کے پیر میں چکر اسی لیے تو باندھا جاتا ہے کہ وہ بس چکر ہی چکر کاٹتا رہے اور چلتے چلتے گھس کر رہ جائے۔ پھر نوکر بھی ایسا جو کہے کہ جنازہ ہی جائے گا اس گھر سے۔

چھوٹے میاں۔

کلیم میاں: کیا بات ہے شکور بابا۔

شکور : میاں نے کہا، کہا نہیں فرمایا ہے کہ آپ اُن کے کمرے میں آجائیں۔ آجائیں نہیں تشریف لے آئیں۔

کلیم : شکور بابا! شکریہ۔ آپ اس تکلف کی تکلیف نہ فرمایا کریں۔ شاید آپ بھول جاتے ہیں کہ آپ نے مجھے گودوں کھلایا ہے۔ بہتر ہے میں جا رہا ہوں۔

شکور : اب میں بھول جاؤں گا۔ ان کو گرد و غبار تو یہی رہتا ہے کہ کہیں یہ بھول گئے ہوں۔ بابا نوکر کا کیا ہے وہ نوکری کرتے کرتے بوڑھا بن جاتا ہے۔ ٹکڑا روٹی تو چھپر پر تو دیا۔ ان ہماری بھی کیا باتیں ہیں شکور میاں۔ سٹھیا گئے ہو۔ دنیا کیا کہتا ہے۔ نوکر بس نوکر ہی ہوتا ہے، سو ایسے سے یہ وقت آیا تم سے اور چھوٹے چھوٹے تھے ہو۔ اب اگر یہ بھی نہ کہیں ہو تو شاید ٹکڑا نصیب ہو جائے نہیں تو پھر سے بھرو اور جب یہ تم کچھ تو پھر واقعی تمہارے شکور۔ تمہارے میاں شکور تم پر بھی ہو۔ تم آدمی تھوڑا ہی ہو کولہو کے بیل ہو۔

کلیم : مجھے بڑا ستا جاتی جان آپ نے۔

شمیم : بھئی وہ کیا ہے بڑا ان صاحب سے جو مکان دیکھنے آئے تھے،

کلیم : اُن کو مکان پسند ہے کرایہ امر بھی لکھنے کو تیار ہیں۔ آدمی بھی شریف معلوم ہوتے ہیں۔

شمیم : صاحب اُن کی شرافت کرنے کو کیا ہمیں چاٹنا ہے۔ ہم کوئی اُن سے رشتہ داری جوڑ رہے ہیں کہ آپ اُن کا حسب نسب معلوم کرتے پھرے۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ سال بھر کا پیشگی کرایہ اور کرایہ کے علاوہ دو ڈھائی ہزار دینے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

کلیم : یہ بات میں نے اُن سے نہیں پوچھی۔

شمیم : جو آپ نے پوچھا ہی کیا ہے صرف ان کے خاندانی حالات، جواب نہیں ہے آپ کا بھی کلیم میاں۔ پوچھنے اور طے کرنے کی جو باتیں تھیں وہی آپ چھوڑ گئے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ باتیں آپ نے کیوں نہیں پوچھیں؟

کلیم : اس لیے کہ میں ان باتوں کو جائز نہیں سمجھتا۔

شمیم : کیا غضب، کمال کرتے ہیں بھئی آپ بھی۔ بھائی میرے آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مکانوں کی اتنی قلت ہے اور کرایہ داروں کی اتنی کثرت کہ ہم جو مطالبہ بھی ان کے سامنے رکھیں وہ ہاتھ جوڑ کر اس کو منظور کریں گے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ہماری یہ عنایت کیا کم ہے کہ ہم ان کو رہنے کے لیے مکان مہیا کر رہے ہیں جس کا وہ خواب بھی نہ دیکھ سکتے۔ اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ لے کر مکان اُن کے حوالے کر دیں۔

کلیم : ہونا تو یہی چاہیے اور جائز طریقہ تو یہی ہے۔ مگر آپ ضرورت مندوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ان کا خون چوسنا چاہتے ہیں۔ میں اس کو غلط سمجھتا ہوں۔ پگڑی کا ناجائز مطالبہ کم سے کم مجھ سے ممکن نہیں ہے۔

شمیم : بھئی حد کر دی آپ نے بھی۔ میرے بھائی صرف یہی طریقہ ہے کہ ہم مکان کی فوراً مرمت بھی کرا سکتے ہیں۔ اور اپنا کچھ قرضہ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ ارے بھئی ڈھائی ہزار نہ سہی ڈیڑھ ہزار سہی مگر کچھ نہ کچھ تو لینا ہی چاہیے۔

حلیم : بہرحال یہ تو اصولی اختلاف ہے۔ میں اس کو اصولاً زیادتی بلکہ مجرمانہ زیادتی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک تو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار جو کرایہ مقرر کیا گیا ہے وہ بھی بہت زیادہ ہے اس زیادتی کے بعد یہ زیادتیاں جو آپ فرما رہے ہیں اصولاً یا قانوناً کسی حیثیت سے بھی جائز نہیں۔

شمیم : موقع سے فائدہ نہ اٹھانا میرے نزدیک حماقت ہے۔ اس وقت سب ہی یہ کر رہے ہیں۔ ہمارے پڑوسی میر صاحب ہی ہیں اپنے دو مکان پگڑی پر اٹھا کر تیسرا مکان بنوا رہے ہیں یا نہیں۔ جب سب ہی پگڑی لے رہے ہیں تو آپ کو کیسا پس و پیش ہے۔

حلیم : پس و پیش صرف یہی ہے کہ یہ جرم ہے اور جرم بھی ایسا کہ میری طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی۔

شمیم : بہتر ہے۔ آپ یہ قضیہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں یہ مکان بھی اٹھائے دیتا ہوں کرایہ پر اور پیشگی ہی اتنی رقم بھی لیے لیتا ہوں کہ بغیر کسی انتظار کے فوراً ہی اس کی مرمت بھی شروع ہو جائے اور اس کا حلیہ بھی بدل جائے۔

حلیم : میری رائے یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ ابا جان سے مشورہ کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ خود اس طریقے کو پسند نہ فرمائیں گے۔

شمیم : پھر وہی ابا جان۔ صاحب ہزار مرتبہ آپ سے کہا ہے کہ ابا جان کو آپ ہر معاملے میں نہ لایا کریں ان کو بیٹھا رہنے دیجئے اپنے گوشۂ عافیت میں۔ وہ کیا جانیں کہ ہوا کا رخ کیا ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ دنیا ان کے زمانے سے کس قدر مختلف ہو چکی ہے۔ اس دنیا سے نمٹنا اب ہمارا کام ہے ان کا نہیں۔

حلیم : جب میرے اور آپ کے درمیان اتنا وسیع اصولی اختلاف موجود ہے تو فیصلہ ابا جان ہی کر سکتے ہیں۔

شمیم : چھوڑو بھی پہلے وہاں سے اصول اور اختلاف لے کر بھائیوں بھائیوں میں کہیں اختلاف ہوتے ہیں۔ جب ہزار دو ہزار روپے کے نوٹ ہاتھ میں پھڑپھڑائیں گے یہ سب اختلاف ختم ہو جائے گا۔

حلیم : آپ غلط کہہ رہے ہیں بھائی جان۔ نوٹوں کی اس سے دبیز گڈی تو ڈاکہ ڈال کر مل سکتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ دبیز گڈی قتل کر کے مل سکتی ہے اگر جرم ہی کرنا ہے اور نوٹوں کی گڈیوں کے لیے کرنا ہے تو یہ ایک جرم ہی کیوں کیا جائے کوئی بڑا ہاتھ مارنے میں کیا مضائقہ ہے۔

شمیم : آپ کے خیال میں اپنے مکان کو پگڑی پر اٹھانا اور اپنے مکان کا پیشگی کرایہ لینا گویا ڈکیتی اور قتل قسم کے جرائم کی صف میں آتا ہے۔ کمال ہے صاحب بھائی میرے روپے کی ہم سب کو شدید ضرورت ہے ورنہ ڈھل جائیں گے۔ سچ پوچھو تو میں اسی ایک ترتیب کی وجہ سے مکان کرایہ پر اٹھانے کے خیال سے متفق ہو گیا ورنہ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بھی کوئی رقم ہے۔

حلیم : سو باتوں کی ایک بات یہ ہے بھائی جان کہ اگر آپ کو یہ مکان پگڑی پر اٹھانا ہے یا اس کا سال دو سال کا کرایہ پیشگی لینا ہے تو میں نہایت ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔ میں بیچ میں نہ پڑوں گا۔

شمیم : بہتر ہے نہ پڑیے آپ بیچ میں اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ ابا جان ہی کو اس سلسلے میں فیصلہ کرنا چاہیے تو بدرجۂ مجبوری

میں بھی تیار ہوں ورنہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابا جان کو خواہ مخواہ یہ زحمت دی جائے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم بھائیوں میں کا اتفاق نہیں ہے۔

کلیم: اگر اتفاق اس طرح نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں باہم سازشیں نہیں کر سکتے تو بہت مبارک ہے یہ اختلاف۔

حلیم: خیر میں آپ سے یہ پند و نصائح سننا نہیں چاہتا۔ آپ بے شک ابا جان سے کہہ دیں کہ میں پیشگی کرایہ وصول کرنے کی تائید میں ہوں اور کچھ مزید روپیہ بھی چاہتا ہوں بلکہ آپ یہ زحمت کیوں فرماتے ہیں میں خود بات کیے لیتا ہوں (جاتا ہے۔)

شکور: (بڑبڑاتا ہے) کچھ نہیں رہا ہے اب سے پٹ کر یہ ایک کھنڈر رہ گیا ہے اب اس پر دانتا کل کل ہو رہی ہے۔ بڑے صاحبزادے کا بس چلے تو کمبل ڈال کر لوٹ لیں جو ان کو ملے اور چھوٹے میاں کے بس میں ہو تو ساری دنیا کو سمیٹ میں لا کر گھر میں کر گھر میں ملتا ہے تو یہ ہے مگر شکور میاں سچ پوچھو تو دونوں ہی کا جواب نہیں پر تم کرو شکور میاں۔ تین میں نہ تیرہ میں دشتلی کی گرہ میں۔ تم یہ باتیں سوچتے ہی کیوں ہو کیوں بھلا یہ مشکل کہ زندگی نے کا بی بی بی بی کو دیا آئی۔ بی بی ہو میں کہ یہ آئی تو مجھ سے کیا۔ مرد ہو تو کیسے کیسے تو ذہن پا باہر کی روٹی اور چولہے کا مالک ہے۔

حلیم: (دور سے آواز دیتا ہے) شکور، شکور!!

شکور: حاضر ہوا میاں۔

شمیم: (آواز دے کر) چھوٹے میاں کو بھیجو ابا جان یاد فرماتے ہیں۔

شکور: (چند قدم بڑھ کر) بہت اچھا (پھر بڑبڑاتا ہے) یاد فرماتے ہیں مطلب یہ کہ ہوتے ہیں چھوٹے میاں بھی کوئی سبق ہیں کہ ان کو یاد فرمایا جائے۔ آدمیوں کی طرح یہ کیوں نہیں کہا جاتا، ابا جان بلاتے ہیں اس زبان کو تو شکور ہی سمجھتا ہے کہ کوئی یاد کرے تو خود یاد کر رہ جائے ان باتوں کا مطلب۔ اسے میں نے کہا چھوٹے میاں حضور یاد فرماتے ہیں آپ کو۔

کلیم: کہو ابا جان! میں اسی طرف جا رہا تھا۔

شکور: (پھر بڑبڑاتا ہے) اب لے کر ہی لے ابا جان کو کرن ٹھیک کتا ہے۔ میں ہوتا ان کی جگہ تو اس جھگڑے کو بیچ اپنا رب کا حصہ دے دیتا اور خود الگ بیٹھ کر کرتا اللہ اللہ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بڑا بیٹا تو اڑائے گل چھرے اور چھوٹا رہ جائے منہ دیکھتا۔ پر تجھے کیا شکور میاں تم تین میں نہ تیرہ میں دشتلی کی گرہ میں (دروازے پر دستک)

مولوی صاحب: تشریف لے آئے۔ بیٹھے، بیٹھے کلیم میاں۔ بیٹھ جائیے اپنے بھائی جان کے برابر۔ مجھے ابھی حلیم میاں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کرایہ دار رکھنے کے سلسلے میں اب کچھ پس و پیش کر رہے ہیں۔

کلیم: جی نہیں تو۔ آپ بزرگ ہیں آپ کی تجویز میں پس و پیش کس طرح کر سکتا ہوں۔ البتہ بھائی جان کی اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ کرایہ کے علاوہ کرایہ دار سے ایک مستقل رقم پگڑی کے طور پر لی جائے اور کرایہ بھی کم سے کم ایک سال کا پیشگی وصول کیا جائے۔

نوری صاحب: پگڑی؟ یہ خیال آپ کو کیسے آیا شمیم میاں۔ میرے تو تصور میں بھی نہ تھا کہ اس حد تک آپ کا ذہن رسا پہونچ سکتا ہے۔

شمیم: ابا جان میں خود پگڑی اور پیشگی کرایہ کی تائید میں نہیں ہوں مگر خیال صرف یہی تھا کہ اس طرح ہم مکان کی فوراً مرمت کرا سکتے ہیں۔ اور کرایہ داروں سے جو کرایہ وصول کر رہے ہیں مکان اس کے مطابق بنا سکتے ہیں۔ اگر آپ پگڑی کی تائید میں نہیں ہیں۔ تو ایک سال کا کرایہ ہی پیشگی مل جائے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

نوری: آپ کے نزدیک یہ بجائے خود ایک قسم کی پگڑی نہیں ہے؟

شمیم: ابا جان آج کل عموماً یہی ہو رہا ہے۔ اور مکان کے متلاشی اس سے زیر بار نہیں ہوتے بلکہ ان کو خوشی ہوتی ہے کہ نہ صرف مکان مل گیا بلکہ اس استحکام کے ساتھ ملا ہے کہ اب گویا سال بھر تک ان کو مالک مکان بے دخل نہیں کر سکتا۔

نوری صاحب: ان کو جس قسم کی مسرت ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ ان کی جگہ پر ہوں جب ہی کر سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں کہ تقریباً دو ہزار روپیہ یکمشت آپ کو دے کر کوئی خوش ہو سکتا ہے۔

شمیم: ابا جان یہ پیش کش خود حکیم صاحب کی طرف سے ہوئی ہے کہ ہم سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر مکان اُن کی مرضی کے مطابق بنا دیں۔

نوری صاحب: یہ غلط ہے میں مکان کرایہ پر دے رہا ہوں اپنی مرضی کرائے پر نہیں دے رہا ہوں۔ اس مکان کی مرمت میری مرضی کے مطابق ہوگی۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سال بھر کا پیشگی کرایہ لے کر ہم سال بھر کے لیے کرایہ دار کی مرضی کے غلام ہو جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جو شخص یکمشت اتنی بڑی رقم دے گا اس کے مطالبات کس قدر سخت ہوں گے۔ دو ہزار کی رقم پر تو آپ ریجھ گئے مگر یہ اندازہ نہ کیا کہ اس کے بعد کرایہ دار کی فرمائشوں کی تعمیل سال بھر کا کتنا شدید اور مسلسل عذاب ہوگا کہ آج غسلخانوں میں فلیش کا اہتمام کر دیجیے۔ آج باورچی خانے میں پنکھا لگا دیجیے۔ اس کمرے کا رنگ فیروزی ہو۔ اور اُس کمرے کا شہابی۔

شمیم: ابا جان ان میں سے کوئی مطالبہ ان کی طرف سے نہیں ہے وہ تو صرف معمولی مرمت اور قلعی چاہتے ہیں۔

نوری صاحب: جی ہاں میں جانتا ہوں ابھی کوئی مطالبہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو صرف مکان کی ضرورت ہے مگر جب مکان مل جائے گا تو ان کو معذرت نئی آسائشوں اور آرائشوں کی ضرورت بھی ہوگی اس کے علاوہ جس سے ہم اتنی بڑی رقم یکمشت لیں اس کے لیے اہتمام کرنا بھی ہمارا فرض ہو جاتا ہے۔ پھر آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ سال بھر کا کرایہ تو آپ یکمشت لے کر خرچ کر دیں گے اس کے بعد کیا ہوگا۔ سال بھر کی ضروری مرمت کہاں سے ہوگی۔ ہم کو یقیناً یہی محسوس ہوگا کہ ہم نے آدھا مکان بھی کرایہ پر اُٹھا دیا اور اب خود اپنی گرہ سے اس کی دیکھ بھال پر روپیہ صرف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہاں ضرورت کے لیے روپیہ پس انداز کرنے کا نہ طریقہ ہے نہ سلیقہ لہٰذا میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ آپ سال بھر کا کرایہ پیشگی وصول کر کے اپنے مصائب میں اور بھی اضافہ کر لیں۔

شمیم : جیسی آپ کی مرضی۔

کلیم : میری رائے یہ تھی کہ حکیم صاحب یا جو کرایہ دار بھی آتا ہے اس سے ہم یہ طے کر لیں کہ سال بھر میں ایک مہینے کا کرایہ اس مکان کی مرمت پر صرف ہوا کرے گا۔

دراصل ہونا تو یہی چاہیے مگر چونکہ مکان کافی مرمت طلب ہے لہٰذا فی الحال بجائے ایک مہینے کے دو مہینے کا کرایہ مرمت پر صرف ہوگا مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ دو مہینے کا کرایہ چھوڑ دیا جائے۔ اصولاً ہم صرف ایک مہینے کا کرایہ چھوڑ سکتے ہیں اسی طریقے پر عمل کیا جائے آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔

شکور : (بڑبڑاتے ہوئے) اچھی چھٹی ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم نے کی ایک بولی سی قسم اور منائیں گے کچھ دن جیو۔ جیسے کہ تاشوں کی پتیوں کے پہاڑ وہ بڑے میاں نے سارا قصہ ہی مسمار کر دیا۔ بس ایک مہینے کا کرایہ لو اور لگا دو مکان پر۔ بس اسی بے بسی کا کھلنے لگا شکور میاں تمہارا تو فائدہ اسی میں تھا کہ چلتے یہ تاش پتے گھر نہ گرتے کچھ مل ہی جاتا تم کو بھی چلو نہ سہی۔ اللہ مالک ہے اپنا بھی۔ تو یوں اس گھر میں گھومو تم سے کیا تم تو تین میں نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں۔ یہ تماشہ بھی دیکھو تو بڑے بھائی شاید کچھ رو دھو لئے ہیں چھوٹے بھائی سے۔

کلیم : (شمیم کو مخاطب کرتے ہوئے) بھائی جان۔ بات تو سنیے۔ ٹھہریے تو سہی۔

شیم : مجھ میں کچھ سننا نہیں چاہتا جو آپ کا جی چاہے کیجیے۔ میری طرف سے آپ ایک مہینے کا کرایہ کیا نہیں بلکہ کرایہ دار کو اپنے گھر میں رکھنے کا معاوضہ خود اپنی گرہ سے دیں۔ میں اب اس گھر کے کسی معاملے میں دخل دینا ہی نہیں چاہتا آپ جانیں اور آپ کا کام۔

کلیم : میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اب آپ حکیم صاحب سے خود بات کریں گے یا

شمیم : میں کسی سے کوئی بات وات نہیں کروں گا۔ آپ کا گھر ہے آپ مالک و مختار ہیں آپکے اشاروں پر اس گھر کا انتظام چل رہا ہے۔ میں ہوتا کون ہوں کسی سے کوئی بات کرنے والا۔ مجھ سے اب کوئی مطلب نہیں۔

کلیم : آپ اس وقت تو ناراض ہو رہے ہیں۔ مگر بعد میں آپ ہی کو معلوم ہوگا کہ بگڑے ہوئے بیٹے کے جرم سے بچ کر آپ نے اپنے احساس کو کس قدر تسکین پہنچائی اور چھوٹی کرایہ داری کے اپنی ذمہ داریوں کو کس قدر کم کیا ہے۔

شمیم : مجھے آپ کے ان قیمتی مشوروں کی ضرورت نہیں آپ اپنے نیک احساس اور اپنی ذمہ داریوں کی نیک دلی کے ساتھ جو چاہیں کریں مگر مجھ کو بخش دیں میں ان معاملات میں پڑنا ہی نہیں چاہتا میری طرف سے بوجھ ہے یہ گھر اب۔

(جاتا ہے۔)

شکور : (بڑبڑاتے ہوئے) شکور میاں بس۔ وہ تو بالکل ہی رو دھو گئے۔ اگر چہ پڑھیں تو سب بہتر تھے کی بات اتنی بڑی قسم آتی نظر آ رہی تھی۔ نہ جانے کیا کیا منصوبے بن رہے سب خاک میں مل کر رہ گئے۔ جیسے سال بھر کچھ ہو کا چار دن کی چاندنی تو ہو ہی جاتی پہلے ان ایک مرتبہ پھر جھلک دکھا ہی جاتے۔ مگر ان چھوٹے میاں نے سارا مزہ کر کرا کر دیا۔ پر بھئے کیا کرے نہ تین میں نہ تیرہ میں دستی کی گرہ میں۔

خزانے کا سانپ

علی عباس حسینی

مادھو کا مکان سیتا پور میں سب سے اونچے ٹیلے پر تھا۔ وہ گاؤں کا سب سے بڑا کسان اور "بھوم دھر" تھا۔ چاول کی کھیتی تھی اور منوں کی پیداوار۔ اتنا ڈھیروں نقد اور کھانے والے تین! ایک وہ، ایک اس کی بیوی بیا اور ایک ان کی محبت یا رفاقت جو کہیے گھورو۔ باپ بیٹے کی صورت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مادھو پانچ فیٹ کا موٹا، توندیل، چندیا بھی صاف اور داڑھی مونچھ بھی۔ گاڑھے اور اسی کپڑے کی اونچی دھوتی پہنے، ننگے پاؤں، ننگے سر، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غلاف چڑھا ہوا بھت ہی ... ن جبل ہے!

گھورو سترہ برس کا نوجوان تھا۔ سبزہ آغاز، چھریرا بدن، ساڑھے پانچ فیٹ سے نکلتا ہوا قد، متناسب اعضا، کھلتی رنگت۔ کپڑے بنے اس کے بھی ہوتے اور اکثر پھٹے بھی، مگر جوانی خود ایک حسن ہے اسے کون چھپا سکتا ہے! یہ دلکشی اسے باپ کی جگہ ماں سے ملی تھی۔ بیا کسی زمانے میں یقینی صورت شکل کی اچھی رہی ہوگی۔ وہ اب بھی مرجھایا یا گھٹا پھول تھی۔ جسم کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، اوپر سے غائب ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، نینوں کے بان، نہ چلتی تھیں۔ وہ تیر غلافی پلکوں کے کوسنے کی کیچڑ میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔ مادھو کی کنجوسی کھانے دیتی تھی نہ پہننے۔ ہر لمحہ ملکیوں کی ساری اسی وقت اترتی جب وہ میلی چکٹ ہو جاتی۔ گھٹنوں میں سے صرف ہاتھ پاؤں کے کڑے تھے۔ چلتی تھی تو سوکھی تیلیوں والی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی۔ باتیں کرتی تو معلوم ہوتا کبھی گرجتی تھی یا تکلی پر ہر بات تول کر بولنا پڑتا ہے۔ لفظ مشکل سے ملتے ہیں اور دقت سے منہ سے نکلتے ہیں۔ ہر وقت خیال رہتا کہیں کوئی ایسی بات منہ سے نکل جائے کہ شوہر برا مانے، لیکن اس سوکھی گڑیا میں گھورو کی حیات کے ہر فقرہ پر کبھی نیل کا جوار چڑھتا آجاتا۔ اس وقت وہ گویا چھلک پڑتی۔ لڑکا ہاتھ پاؤں سے سبل، ناک نقشے کا درست، پھر بے زبان ایسا کہ بچپنے میں ہٹ کی، نہ جوان ہوکر ضد پر اڑا۔ جہاں باپ نے کھلایا، کھایا، جو پہنایا، پہنا۔ دیکھتا تھا کہ گھر پر چاول کی کھیتی ہے، منوں نقد پیدا ہوتا ہے، ہزاروں روپے ہیں، مگر نہ گیہوں کھانے کو ملتا ہے نہ باسمتی چاول۔ بس جوار، چنا جیسے قسمت میں لکھ گئے تھے۔ مگر یہ بھی دیکھتا تھا کہ باپ مالک تھا، جس کے سب کچھ اختیار میں تھا، وہ خود بھی انہی موٹے جھوٹے کپڑوں میں اور انہی روکھے سوکھے کھانے پر رہتا تھا۔ تو پھر گھورو کیا کہتا کیا کرتا! وہ کیسے کوئی چیز اپنے منہ سے مانگتا۔

گھورو کی ماں کو حیرت ضرور تھی۔ اب اس طرح ننگے بھوکے رہنے کی غرض کیا ہے! زندگی کا کوئی مقصد تو ہوتا ہی ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ روپیہ کمانا، اسے اکٹھا کرنا، اسے جوڑ جوڑ کر رکھنا بھی منزل و مقصد حیات ہو سکتا ہے اور اس کا شوہر مادھو اسی کو سب سے بڑی منزل سمجھتا ہے۔ منزل کا انسانی خواہشوں، منصوبوں اور امنگوں کی طرح کبھی کنارہ نہیں ہوتا! پہلے ایک قریب

کی منزل دکھائی دیتی ہے۔ آدمی وہاں پہنچا، تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے آگے ایک اور دلفریب مقام ہے۔ تو اُسے اور آگے کی طرف لگا۔ پہنچا جب اس ٹیلے تک ساحل کی طرف اس سے دُور بہت کچھ چھپے عکس دکھائی دینے لگے۔ جب جان کی بازی لگا کر اس ساحل پر قدم رکھا تو اس نے دیکھا ایک اور ساحل کھڑا کر دیا۔ غرض یہ راہ ہر منزل پر کھلنے کی بجائے بڑھتی جاتی ہے!

ادھو کے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا لالچ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ جیسے جیسے اُس کا کھیت پھیلتا اور دھیرے دھیرے گھیت تو وہ ہیں تو بنا وہ اس سے آگے کر اور بھی پھیلانے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور وہ ان میں اس طرح گم ہو جاتا، کھو جاتا کہ اسے بیٹے کی جوانی دکھائی دیتی اور نہ اپنا بڑھاپا دکھائی پڑتی۔ وہ کہتی: "آنے والی بیزاری بیماری لگ رہی ہے۔ اب بہو لے آؤ، گھر کا کام سنبھالے۔ لڑکا اب جوان ہو، دیکھتے نہیں، اس کا کام میں اب دل ہی نہیں لگتا۔ صبح شام ادھر اُدھر پھرتا رہتا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو بیٹھے بٹھائے جگ ہنسائی ہو جائے گی۔"

ادھو اپنی توند پر ہاتھ مار کر کہتا۔ "تم تو مُفت میں ہلکان ہوتی ہو اور پریشان کرتی ہو۔ بیٹے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ ایک اور کھانے والا اس گھر میں لے آؤں۔ پھر تھوڑا بہت روپیہ چاہیے۔ بہن کبھی کبھی سمجھاتی کہ تو وہ ہم بھی اس کے سر میں کر دیا کرتے تھے بکی بکی بکا!" اور وہ منہ کھولے بیوی کو آنکھ مار کر قہقہہ لگاتا۔ یہ مردانہ وار قہقہہ نہ ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک جذبات کی اتنی فضول خرچی کوئی اچھی چیز نہیں تھی۔ اس لیے بات بدل کر بکا بکا ہو جاتا۔ یعنی شکل کھلے ہوئے پھولوں کی جگہ اور وہ گھسی کملائی کی۔

مگر اب کے ایسے ادھو بہت خوش تھا۔ گیہوں کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ سرکار سے کنٹرول بھی اٹھ گیا تھا۔ زیادہ نقد خریدا جا سکتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ سستے بھاؤ اسے بیچنا پڑا تھا۔ پار سال تو اس نے صرف پانچ سو من گیہوں کے بیچے تھا اور جب بھاؤ چار سیر کی جگہ ڈھائی سیر پہنچا تو اسے بیچا۔ اب کے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ بیچا تھی نہ ہوگا جب اس وقت تک نہ اٹھائے گا جب تک مٹکے سے دُگنا نقد نہ بچے گا۔ اس نے گھر کے بڑے صحن کو پکی اینٹ کرا کے کھدوایا اور اس تہہ میں بھوسا بھروا دیا اور گیہوں کی بڑی بڑی بوریاں اس پر تلے اُوپر رکھوا دیں۔ اوپر بیچ میں اور بھوسا ٹھونس کر اس نے صحن کو اونچا اونچا کر دیا۔ یہ مٹی اس نے اصلی اور پکی منڈیر بنے دی۔ اُس نے دو دو چار چار مزدور لگا کر دُرمٹ سے اسے کوٹ کر سڑک کی طرح سخت کر دیا اور اسے ہر طرح مضبوط بنا دیا۔

اب وہ بے فکر تھا۔ بڑے بڑے آڑھتیے اور بیوپاری کلکتے سے آتے، گیہوں خریدنے پر اصرار کرتے۔ مگر ادھو نے سانپ کی طرح پھن کاڑھے بیٹھا سب کو پھنکاریاں مار مار کر بھگا دیا۔ وہ کہتا: "یہ جب ہی نکلے گا جب کہیں ضلع بھر میں گیہوں کا دانہ بھی نہ بچے گا۔ چھوٹے کسان زیادہ پیداوار بازاروں میں بیچ چکیں گے اور دکانوں اور گوداموں میں بھی کہیں ایک دانہ دکھائی نہ دے گا۔"

ادھو کے گول مول بھسنے سے اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ سمجھتے تھے اس ڈھول میں خول ہی خول ہوگا۔ ایسے شخص سے عقل سے کیا واسطہ۔ مگر وہ بلا کا ہوشیار اور مستقل مزاج تھا۔ آج ہیرا پور میں سب بڑی کاشتکاری اور سب سے اونچی حویلی اس

ت اثبوت تھی۔ باپ مرا تھا تو اس نے دو بیگھے کھیت، دو ہل بیل اور ایک کچا مکان چھوڑا تھا۔ مادھو نے اپنی محنت، اپنی کنجوسی، اپنی
مرو برے، پیسے پیسے کو دانت سے پکڑ کر گاؤں کا سب سے شاندار مکان بھی بنوایا۔ وہ چار ہل کی کھیتی بھی کرنے لگا اور پچاس بیگھے زمین کا
ہو دھر گیا۔ مکان کی نیو ٹیلے پر بڑی گہری ڈالی تھی۔ اسے اس کا خیال تھا کہ بید پور گھاگھرا کے کنارے ہے اور دریا اس کے گھر
ے دو دھمک کے فاصلے پر بہتا ہے۔ ایسے معاملات میں "آگم کا سوچ" اس کا اصول تھا۔

اس لیے اب وہ گھر کی طرف سے بے فکر اور کھیتی کی طرف سے مطمئن ہو کر بیکٹ پر بیٹھا زیل گڑگڑاتا اور اس کی آواز میں ایک
ہستی اور اس کے دھڑکن میں ایک رقص کی کیفیت محسوس کرتا۔ اسے معلوم ہوتا جیسے کبھی دیوی گنگا جل میں غوطہ لگا کر سطح آب سے
نکلتے ہوئے اپنے گوسکڑی کے بلبلے سے بھی زیادہ باریک ساڑی میں لپٹی جاتی ہیں اور ناچتی جاتی ہیں اور ان کے گھنگھروں کی جھنکار اتنی
ہی دلفریب، اتنی ہی شیریں، اتنی ہی رسیلی تھی جتنی کہ تھال میں گرتے اور بستے ہوئے زرد و سپید سکوں کی۔ وہ یک بارگی اٹھ کر زیل کر
دیوار کے کونے سے لگا دیتا، ٹہلنے لگتا، سوچنے لگتا، گنگنانے لگتا اور اس طرح مسکرا پڑتا جیسے بلی چوہے کو کھا کر مسکراتی ہے، جیسے
ڈاکٹر ایک پیچیدہ کا آپریشن کر کے مسکراتا ہے، جیسے گدھ میدان جنگ کو لاشوں سے بھرا ہوا دیکھ کر مسکراتا ہے۔

یہ دن گزرتے گئے۔ رُت بدلی، موسم بدلا، جون کا مہینہ آیا، بادل کے ہجوم آئے۔ انھوں نے کچھ دنوں تو آسمان پر چہل قدمی
کو قدم ذرا تیز کیے، دوڑنے بھاگنے لگے اور آخر میں تھک کر جگہ جگہ پر دم لینے کے لیے ٹھہرنے لگے۔ گاؤں والوں نے پھیل
روئی ہیروں کو سمیٹنا شروع کیا۔ کھلیانوں میں پڑا ہوا اناج، بھوسا، ایکھ، پتیاں، چھلکے، اپلوں کے گرد ... سوکھی لکڑیوں کے ٹھنے کاٹ
کر چھپروں اور کوٹھڑیوں میں رکھنے لگے۔ جہاں پانی روکنے اور دھان لگانے کے لیے وہ جیسی کھیتوں کی مینڈیں اونچی کرتے
... برسات گھاگھرا کے بہتے تیور بھی ضرور دیکھ آتے۔ بید پور بلندی پر ... تھا گر گھاگھرا کا کیا اعتبار، کس وقت کون سی کروٹ
... وہ ہمیشہ برسات میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اتنا بڑا دریا چھوٹی ندی میں بدل جاتا ہے۔ ادھر اُبلا اُدھر بڑھا۔ اس کنارے
... اس کے قصے کہے ڈوبا کتے ہیں۔ ویرانہ راجہ کے سپاست ... اس دریا کے بیچ ہر ساتی ہوا کا ایک جھونکا ہی کافی سے زیادہ
... اس کی قطع ایک بدست ہاتھی کی سی ہو جاتی ہے۔ اس باغ کے درخت نوچے، اس سبزہ زار کو روندا۔ فیل خانے کی دیواریں پاٹ
... اور ایک کے گلے کا ہیکل سونڈ سے کھینچ کھینچ کر توڑ پھینکا۔ اخبار والے، ریڈیو والے بھی برابر خبردار کر رہے تھے۔ اب کی برسات
... ہے۔ پچھلے برسوں کی سی جانی پہچانی نہیں ہے۔ جنگ میں گرائے جانے والے بموں اور سائنس دانوں کے تجربوں نے
فضا میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ روسی اسپتنکوں اور امریکی راکٹوں نے پوری بالائی فضا میں ہل چل ڈال دی ہے۔ پانی کی ... قیامت کا
... ندی نالے کتنے چڑھیں، بڑھیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ادھو ایسی سنی ان سنی کر دیتا۔ اسے یقین تھا اس کا مکان، اس کا کھیت سب دریا سے کئی فرلانگ کے فاصلے پر ہیں۔ منھ پھیلنے
... ... کی کوئی وجہ۔ گیہوں بیچنے کا جب بھی موقعہ ہے، اب طرح کی آفتیں آئیں۔ ہزاروں اپنا اپنا ... گرہ ... گھر
... ہزاروں خاندان برباد ہو گئے۔ گیہوں کے بھی خوب ... ... ایسے ہی ... میں ... دام
... گئے۔

جب دھا پانی بہنے لگا۔ ایک ہفتہ تک متواتر دیہات بہتا۔ بل کھول کے بہتا، بجلی تڑپ کے ساتھ کڑاک کڑک کر بادل گرج کر برسا۔ کچھ دیواریں گریں اور چھتیں بیٹھ گئیں، چھپروں کی ٹٹیاں اور کھمبا وغیرہ سب کے ٹوٹنے لگے۔ کچھ مویشی بہہ گئے کچھ لوگ زخمی ہوئے مکانوں کو کڑھ مل گئے، کچھ بیگ کر انتظار تیز اور بیماری میں گرفتار ہوئے۔ ادھر دریا نے اپنا پاؤں نکالنے تو دونوں کناروں کو بھرا، پھر چھلک کر پھیلا اور بڑھا اور اس بہاؤ اس کا دریا اور اس چھلکنے سے چلا تیز، بہا اور ٹوٹنے کر منہ زوالت وہ گاؤں اچھل کر جاتا اور گزرتے، وادیاں اُن کے پل میں چھو کرتا اور بچّوں کو گراتا، سڑکوں کو پامال کرتا، بہتے کو دیتا، جنگلوں کو اکھاڑتا، آبادیوں کو ڈبوتا، نکل جاتا۔ میدپور کی جنبیں کو چاٹتا، ٹکریں مارتا اور کاٹنا شروع کر دیا۔ ایک دو دیا سے قریب والے گھروں میں شور اٹھا۔ "پانی دیواروں کو توڑ کر اندر گھس رہا ہے۔" لوگ مویشیوں کو ہانکتے، بچّے تھوڑا سا سامان کندھوں اور سروں پر رکھ کر اور بہت کچھ گھروں میں چھوڑ کر نکل بھاگے۔ حکام ضلع کی طرف سے بھی کچھ لوگ آ گئے کی رہنمائی اور ان کی ہدایت پر عمل کر کے دوسری شام تک سارا گاؤں دوسرے دیہات میں پناہ لینے چلا گیا۔

مگر مادھو اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ کہتا ہے: "جان ہے تو جہان ہے" یہاں تو گھر ہی جان تھا اور گھر ہی جہان۔ ... کی طرح اس نے اپنے گھر میں مضبوط جڑیں گاڑ لی تھیں۔ اس نے اس دن کا پہلے ہی سے بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ کیوں جاتا؟ ... جھتا ہے تو بہنے دو۔ بھوکے بھی تو جئیں گے۔ اسی روز سیاہ میں تو اس کی تقدیر چمکنے والی تھی۔ اسی اندھیرے میں تو اس کے گھر کے چراغ جگمگ جگمگ کریں گے

جب بیوی نے دریا کی اور بیٹے نے بھی ڈرتے ڈرتے کہا "تم نہیں جانے پر بھی" دیا چاہتی تو مادھو گرج کر بولا: "دونوں ابھی جاؤ اور مویشیوں کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ میں بعد میں آؤں گا۔" بیٹا نے بھی وعدہ کیا، بہت ترسا پھر وہ باپ اپنی بات سے نہ ٹلا اور گھر سے قدم نکالنے پر تیار نہ ہوا۔ بیا ہار گئی مگر شوہر پرست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ماں بھی تو تھی۔ اس نے کلو کو سمجھا بجھا کر مویشیوں کو لے کر نکلنے جانے کے بہانے دوسرے گاؤں بھیج دیا۔

کلو کا سارا دن اسی کام میں گزرا۔ جانوروں کے لیے چارے کا بندوبست کرنے میں رات ہو گئی۔ پانی بھی بڑے دھندے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی طرح تڑپ کے ساتھ آیا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھ گیا اور "رام رام" کرنے لگا۔ کم ہی باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ کلو بھی بھیگ کر چوپا ہو گیا تھا۔ گاؤں کے پناہ گزینوں نے اسے زبردستی پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا اسے ایک سوکھی دھوتی دے کر کپڑے بدلوائے اور آگ کے پاس بٹھایا۔ اسے اپنے چنے چبینے میں شریک کیا اور اسے اس کالی ڈراؤنی بھیانک رات میں کسی طرح میدپور نہ جانے دیا۔ صبح تڑکے ہی کلو نے اپنی کالی بھینس کے ساتھ وہ اٹھ کر میدپور کی طرف بھاگا۔ گاؤں سے ذرا دور تک ہوا اور ہی اس نے دیکھا سامنے ہیں جل تھل ہے۔ صرف مادھو کا گھر جزیرہ سا بیچ میں کھڑا ہے۔ کنارے ہی سے کھڑے کھڑے اس نے "پتاجی، پتاجی" کہہ کر پکارا۔ مادھو نے چھت پر آ کر آواز دی۔ "کشتی اور بیا ڈاہے کر آؤ کام نہیں، یہاں سب ٹھیک ہے۔"

بکھو یا بیا کلو کشتی ڈھونڈنے لگا۔ اسے پولیس والے مل گئے۔ دارو غہ جی نے کشتی بھی دلوائی، بیا ڈاہے

اور خوش خان ایک سپاہی کو بھی ساتھ کیا۔ وہ جوان بھی تھا، ہمت والا بھی تھا اور تیراکی کا ماہر بھی۔ دونوں کشتی میں چلے لیکن پانی کے بہاؤ سے زیادہ وہ دو خطرے سے تھے۔ ایک تو ڈوبے مکانوں کے "ڈینو ہیکر" دوسرے بہتے ہوئے درختوں کے "ڈینوسر" پر موجوں سے لڑتے، دھارے کو کاٹتے نیچے اُوپر کی بلاؤں سے بچتے، جب دونوں کنارے پر پہنچے تو مادھو اپنے دالان میں کھڑا بے چین ملا۔ اس نے جھٹ کر کشتی سے پھاوڑا اٹھایا اور اندر گھس گیا۔ لکھو "ماں، ماں" پکارتا پیچھے دوڑا۔ زنان خانے کے کمرے سے کراہنے کی آواز آئی۔ جا کر دیکھا تو ماں چھت سے گرے بیم کے نیچے دبی پڑی ہے اور کمزور ہاتھوں سے دھنی اور مٹی ہٹانے کی کوشش کر رہی ہے اور مادھو، زخمی بیوی کو نکالنے کی بجائے آنگن کی زمین کھود رہا ہے۔ لکھو کے پکارنے پر خوش بھی دالان کے پیچھے کشتی باندھ کر اندر آگیا۔ دونوں نے مٹی، پلاسٹر کا ڈھیر ہاتھوں سے ہٹایا اور بے ہوش ماں کو نکالا۔ لکھو اسے گود میں اٹھا کر کشتی میں لے آیا۔ وہاں اپنے زانو پر ماں کا سر رکھ کر اُس کے چہرے سے خاک و خون پاک کیا۔ "ماں، ماں" پکارا اور جواب نہ پانے پر اس کے سینے پر منہ رکھ کر رونے لگا۔

دوسرے کنارے سے گاؤں والوں نے شور کیا۔ "ارے لکھو جلدی کر جلدی! بھر آئی ہے تاڑ بھر اونچا پانی بس کوس بھر اُدھر ہے۔ جلدی سب کو لے آ، بھاگ! بھاگ!" خوش خان نے پکارا۔ "مادھو! مادھو، جلدی کر، تو بھی جلدی!" اور جواب نہ پانے پر لکھو کو مُردہ ماں پر روتا چھوڑ کر پھر اندر گھسا۔

مٹی کے صحن کو پانی نے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا۔ گھڑے کا حلقہ صاف اُبھر آیا تھا اور نالیوں کی جگہ تیزی سے کٹتے ہی جا رہا تھا۔ مادھو نے دیوانہ وار آس پاس کی مٹی پھاوڑے سے کاٹ کر دراڑوں میں بھرنا شروع کر دی تھی۔ نہ جانے کہاں کی اس میں قوت اور پھرتی آگئی تھی۔ وہ دوڑتا جاتا تھا اور سوراخوں کو، خالی جگہوں کو بھرتا جاتا تھا۔ پھاوڑے سے مٹی رکھ کر دباتا، پاؤں سے ٹھونکتا اور کہتا — "گھڑے میں گھسے گا، نہیں جانتا، مادھو کا ہے! مادھو موجود ہے۔ ہونہہ، دیکھیں اب کیسے جاتا ہے۔"

خوش دُور ہی سے چیخا۔ "ارے چھوڑ اسے، بھاگ چل! سارا گھر گرنے والا ہے۔" مادھو نے اسے ایسی حقارت سے دیکھا۔ "تو جان بچا اپنی۔ میں تو جیتے جی اپنا گھڑا برباد نہ ہونے دوں گا۔" خوش لپکا کہ زبردستی پکڑ لے چلے۔ مادھو پھاوڑا ہاتھ میں تول کر کھڑا ہو گیا۔ "اب قدم بھی آگے بڑھایا تو سر توڑ دوں گا۔" خوش نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مادھو ہنسنے لگا۔ "تجھ کو کس نے یہاں بُلایا؟ جاتا کیوں نہیں؟ جا یہاں سے! چل!" اور وہ وار کرنے والے انداز سے سپاہی کی طرف بڑھنے لگا۔

دفعتاً زمین ہلنے لگی۔ پھر تڑخنے کی آواز ہوئی۔ ایک بہتے ہوئے شیشم کے درخت نے مادھو کی دیوار کو ٹکر ماری۔ پانی کی چھینٹیں بہت بلندی سے اُڑ کر چھت پر گریں، صحن میں آ کر پاش پاش ہوئیں۔ مادھو نے قہقہہ لگایا۔ لال لال آنکھیں کر کے خوش کی طرف بڑھا، یکایک ڈگمگایا اور پھاوڑا ہاتھ سے پھسل کر خوش کی طرف چلا۔ سپاہی چیخ کر بھاگا۔ کشتی میں اُچک کر آگیا۔ ساتھ ہی تاڑ سے اونچی موج مادھو کے محل سے آ کر ٹکرائی۔ موجوں نے کشتی کو دُور پھینک دیا۔ ایک چادر آب پھیلی جس میں نہ مکان تھا، نہ گھڑا اور نہ اسے جان سے عزیز رکھنے والا مادھو!

لکھو دیوانہ وار چیخا۔ "پتا جی! پتا جی!" خوش پاس والوں کے غیر ہمدردانہ لہجے میں بولا: "اسے جانے بھی دے! خزانے کا سانپ تھا پاپی!"

آپا

اپنے ایک افسانہ کا تجزیہ

ممتاز مفتی

میری نظر میں آپا ہمیشہ سے ایک [illegible] کہانی رہی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ یہ کہانی کسی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ فرمائش کرنے والے ملک صاحب تھے۔ جن کے احسان کا بدلہ چکانا تھا۔ ایک اخلاقی فرض پورا کرنا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ اخلاقی فرض پورا کرنے کی خواہش چاہے کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو پھر بھی اس سے عہدہ برآ ہونا جان چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آپا میں نے اپنے جذبے کی وجہ سے نہیں لکھی تھی۔ اور اگر فرمائش نہ ہوتی تو شاید میں آپا پر کبھی افسانہ نہ لکھتا۔

دوسری وجہ بھی سن لیجیے!

میں ان لکھنے والوں میں سے ہوں جنہیں شہرت پہلے ہی سے چھپی طور پر مل گئی۔ اور بعد میں افسانہ نویسی سیکھنا پڑی۔ عام طور سے ہوتا یوں ہے کہ لوگ پہلے لکھتے ہیں بار بار لکھتے ہیں۔ پھر چھپتے ہیں۔ بار بار چھپتے ہیں پھر کہیں شہرت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی لازم نہیں کہ ضرور شہرت حاصل ہو جائے۔

میں نے پہلی چیز بھی فرمائش پر لکھی۔ جذبے سے نہیں ویسے ہی لکھ دی۔ جان چھڑانے کے لیے۔ وہ چیز چھپ گئی۔ نہ صرف چھپ ہی نہیں بلکہ بڑے دھوم دھڑلے سے چھپی۔ یوں بیٹھے بٹھائے ان جانے میں شہرت حاصل ہو جانے کے بعد یہ مشکل آ پڑی کہ مجھے سنجیدگی سے سوچنا پڑا کہ کیا لکھوں۔ کیسے لکھوں۔ سوچ سوچ کر میں نے یہ طے کیا کہ افسانے کا موضوع اونچا ہونا چاہیے۔ کوئی عظیم حقیقت۔ عام حقیقت نہیں۔ دل کی تہوں میں چھپی ہوئی کوئی بات۔ جتنی دور کی کوڑی لاؤ اتنا ہی اچھا۔

اس زمانے میں آپا ایک عام کردار تھا۔ ہر گھر میں چولہے کے قریب چوکی یا پیڑھے پر ایک نہ ایک آپا بیٹھی ہوتی تھی جو نگاہیں جھکائے رکھتی۔ چولہے کی اوٹ میں مسکاتی اور دھیمی آواز میں بات کرتی۔ اس زمانے میں سبھی آپا کی تعریف کرتے تھے لیکن کوئی بھی اسے دل سے نہیں چاہتا تھا البتہ ان دنوں ساجو باجی عام نہ تھی۔ سب بڑے بوڑھے اس کو دیکھ کر کانوں پر ہاتھ رکھتے۔ بڑی بوڑھیاں منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں۔ نوجوان ساجو باجی کو دیکھتے تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ باچھیں کھل جاتیں۔

آج کل تو سڑکوں پر، بازاروں میں، دکانوں پر، بسوں میں، ریستورانوں پر، کلبوں میں، ہر جگہ ساجو باجیوں کی بھیڑ لگی ہے آج کل تو آپائیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں جیسے اس زمانے میں آپا ایک عام چیز تھی بے حد عام۔ ایک ایسے افسانہ نویس کے لیے جسے چھٹ شہرت مل چکی تھی آپا سے عام موضوع پر قلم اٹھانا بعید کی بات تھی ——— ان دو وجوہ کی بنا پر میرے نزدیک آپا کی حیثیت ایک [illegible] افسانے سے زیادہ نہ تھی۔

اب فرمائش کی تفصیلات بھی سن لیجیے۔ یعنی آپا لکھنے کی فرمائش کرنے والے لوگ کون تھے۔ کن حالات میں فرمائش کی گئی اور میں اس فرمائش کو پورا کرنے پر کیوں مجبور تھا۔

یہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے ان دنوں میں ایک ہائی سکول میں ٹیچر تھا۔ تنخواہ نہایت قلیل تھی۔ کھانے والے تعداد میں زیادہ تھے۔ اگرچہ میں نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ ٹیوشن نہیں کروں گا لیکن حالات نے مجبور کر دیا۔ میں نے اپنے ایک بڑے اور صاحب رسوخ دوست سے کہا کہ اگر ہو سکے تو کوئی ٹیوشن دلوائیے۔ ایک روز میرے دوست میرے ہاں آئے بولے 'ٹیوشن کرو گے' ارادہ بدل تو نہیں گیا۔ میں نے کہا ضرور کروں گا ارادہ اور بھی پکا ہو گیا ہے۔ وہ مجھے شہر کے ایک رئیس کے گھر لے گئے۔ تعارف کرایا۔ معزز رئیس نے میرا جائزہ لیا۔ پھر کہنے لگے آؤ میں تمہیں تمہارے شاگردوں سے ملا دوں۔ معزز رئیس میرا تعارف کرا کر چلے گئے تو میں نے آزادانہ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ دونوں میرے روبرو بیٹھی ہیں۔ آپا اور ساجو باجی۔ آپا بڑی تھی سانولی تھی۔ نظریں جھکائے ہوئے تھی کبھی کبھار کنکھیوں سے دیکھتی اور تھوڑی اوٹ میں مسکاتی۔

ساجو چھوٹی تھی گوری چٹی چنچل تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی۔ مسکرائے جاتی اور لگاتار باتیں کیے جاتی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں میرا جائزہ لیتی رہیں آپا جھکی جھکی آنکھوں سے ساجو علانیہ طور پر۔ ساجو نے منہ بنایا۔ بات بدلنے کے لیے میں نے پوچھا کیا پڑھو گی۔ ساجو پیچھے سے اٹھی اور حساب اور الجبرے کی کتابیں اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں ———— حساب اور الجبرا میں نے صرف میٹرک تک پڑھے تھے۔ میٹرک کے امتحان میں حساب اور الجبرے کے پرچے میں میں نے ۱۰۰ میں سے صرف ۱۶ نمبر حاصل کیے تھے۔ حساب الجبرا اپنے بس کی بات نہ تھی۔ دراصل میرا خیال تھا کہ ٹیوشن انگریزی کی ہوگی اور انگریزی کا میں میں اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتا تھا۔ حساب کو دیکھ کر ہی اپنی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ ساجو بات کو بھانپ گئی۔ اور اس کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی۔ جھٹ اپنا رومال نکالا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے کہا اس رومال سے کیا بنے گا۔ گھر سے کوئی تھان اٹھا لاؤ۔ بس اس جملے نے مجھے قائم کر دیا۔ ابتدائی جائزے کے تاثرات گویا معدوم ہو گئے۔

میں نے کہا ہٹاؤ اس مضمون کو۔ ہم بنیوں کا مضمون نہیں پڑھاتے۔ انگریزی پڑھو مضمون ہوا نا۔ ساجو بولی انگریزی کیوں پڑھیں اس میں تو ہم آپ سے فائق ہیں۔ اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل سے پڑھانے نہیں آؤں گا۔ لہٰذا ادھر ادھر کی گپ میں وقت گزار دیا۔

اس کے بعد میں انہیں پڑھانے نہ گیا۔ تیسرے روز وہ رئیس بزرگ سکول میں آ گئے بولے میاں تم نے کمال کر دیا ایک روز آئے اس کے بعد رسید ہی نہ دی۔ میں نے صاف کہہ دیا جناب عالی حساب پڑھانا اپنے بس کا روگ نہیں۔ بولے میاں کسر نفسی کی حد ہوتی ہے کوئی۔ لڑکیاں تو کہتی ہیں کہ حساب میں تم سے زیادہ لائق اتالیق کبھی دیکھا ہی نہیں۔ میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانے اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

میں پہنچا تو وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ساجو کی مسکراہٹ میں سکندر اعظم کی جھلک تھی۔ میں نے بے تکلفی سے کہا کیوں مجھے حساب کے شکنجے میں ڈال رہی ہو تم۔ ایک سوال حل کرنے میں اپنا چھٹانک بھر خون خشک ہوتا ہے۔

اس پر ساجو نے اٹھ کر میرے سامنے دو حل کیے ہوئے پرچے رکھ دیے۔ یہ (ذاتی) امتحان کے حساب کے پرچے تھے۔ ا

نے سوچی سے زیادہ نمبر لیے تھے اور ساجو نے سوچی سے ۔۔ ۔ میں حیران رہ گیا۔ ساجو بولی آپ تو خواہ مخواہ گھبرا گئے۔ میں نے کہا پر اس شوق کا کیا مطلب۔ ساجو بولی۔ پڑھ پڑھ کر تھک جاؤ تو کوفت بھی تو شانی ہوتی ہے۔

پڑھنے کے دوران ہم تھکن اور کوفت مٹاتے رہتے۔ کتابیں سامنے پھیلا کر گپیں ہانکتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ میں حاجتمند ہوں۔ اور وہ حاجت روائی کر رہی تھیں۔ جب ساجو مجھے مسودہ دیتے ہوئے مسکرائی تو میں کہنا چاہتا تو یہ ہماری رام کہانی ہے۔ اس پر وہ جھٹ بولتی۔ معمولی کہانی سے کسی کو کیا مزا آتا ہے بھلا!

دو مہینے کے بعد میرا تبادلہ ہو گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کوئی خدمت کر سکتا۔ اس پر آپا نے ساجو کی طرف اشارہ کیا۔ ساجو بولی۔ کر سکتے ہیں آپ۔ میں نے پوچھا وہ کیسے بولی۔ آپ ہم پر ایک کہانی لکھ سکتے ہیں۔ ان دو ماہ کے دوران انھیں علم ہو چکا تھا کہ میں افسانے لکھتا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت آپا نے دبی زبان سے کہا۔ کہانی ضرور لکھیے گا۔ آپا کی وہ سرگوشی ابھی تک فضا میں تیر رہی ہے۔

آپا چھپی تو گویا سلگتی پر تیل پڑ گیا۔ بڑی شہرت نصیب ہو گئی اس کے باوجود میں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ وہ حقیقتیں کس قدر غیر اہم ہوتی ہیں۔ اور حقیقت کو چھپانے کے لیے ماہیت کا پردہ دبیز ترین پردہ ہے۔ آج تک یہ حقیقت میرے دل کی گہرائیوں میں نہیں بیٹھ سکی۔ اور آج تک میں افسانے کے لیے اس کے موضوع ڈھونڈتا ہوں۔

آپا چھپی تو مشہور نقاد اور افسانہ نویس حسن عسکری نے مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا۔ لکھا تھا۔ "آپا بہت پسند آئی لیکن ازراہِ کرم کسی ساجو باجی کا پتہ لکھ بھیجیے۔" میرے اس افسانے پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی تھی۔ حسن عسکری کے اس ایک جملے میں معانی کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ آج بھی جبکہ ساجو باجیاں گھر گھر موجود ہیں اور ساجو باجی کا پتہ پوچھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آج بھی حسن عسکری کا وہ جملہ اسی طرح بامعنی ہے۔

انگریزی میں ایک کہاوت عام ہے۔

"Gentlemen prefer blondes but they marry brunettes."

میرا افسانہ آپا اس کہاوت کی ضد تھا۔ میں نے اس افسانے میں یہ کہا کہ شرفا آپا کے مداح ہوتے ہیں لیکن ساجو سے بیاہ رچانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اب مجھے شک ہونے لگا ہے جس تیز رفتاری سے ساجو باجیاں عام ہوتی جا رہی ہیں اسے دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید جلد ہی پڑھنے والے اس افسانے کو پڑھ کر یہ محسوس کرنے لگیں یا کوئی نقاد مجھے خط میں لکھے کہ ساجو باجی بہت پسند آئی کسی آپا کا پتہ بتائیے۔

حالات کا رُخ دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید مستقبل قریب میں آپا ایک خیالی کردار کی حیثیت اختیار کر لے۔ اور آپا کی محبت کی تفصیلات الف لیلیٰ کی باتیں معلوم ہونے لگیں۔ اور حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت کھو دے ——— لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کئی ایک بار ساجو باجیاں زمین کے کسی خطے پر کھمبیوں کی طرح اُگیں۔ ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئیں۔ لیکن ہمیشہ یہ سیلاب آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے کسی ان جانے اصول کے مطابق صدیوں کے بعد ساجو

...جیسے وہ دور آتا ہے۔ اور صرف اتنی دیر رہتا ہے جتنی دیر ستارہ ٹوٹتا ہے۔ آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور پھر صدیوں آپا میں راج کرتی
... جتنی لوگ انھیں بے حد پسند کرتے ہیں لیکن ساجو باجی کا پتہ پوچھتے پھرتے ہیں۔

ساجو باجی ازلی محبوب ہے اور قدرت ساجو باجی کو شاید اس لیے عام نہیں ہونے دیتی کہ مبادا وہ اپنی محبوبیت کھو
... اور عورت کی کشش عام ہو کر ختم ہو جائے۔ نہیں حسن عسکری کا وہ جملہ اپنی آفاقیت نہیں کھو سکتا۔

میں نے محبت کے موضوع پر کئی ایک افسانے لکھے ہیں۔ میں نے بار بار یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ کئی ایک ڈھکے چھپے
... محبت کا بہروپ دھار لیتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک مرتبہ ایک بھڑ بھن بھن کرتا ہوا پروانوں کی محفل میں آ دھمکا بھن بھن
... بھی پروانہ ہوں ——— اسی طرح کبھی نفرت کا بنیادی جذبہ بھن بھن کر کے کہتا ہے میں محبت ہوں، کبھی انتقام کا جذبہ اپنی
... محبت کا روپ دھار لیتا ہے۔ کبھی حالات ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ محبت کا سوانگ بھرنے کے بغیر چارہ نہیں
... کبھی مروت محبت ایجاد کر لیتی ہے۔ کبھی پڑوس کی شرارت محبت کی شکل میں پھوٹ نکلتی ہے۔

ہاں میں نے محبت پر کئی افسانے لکھے۔ دُور دُور کی کوڑی لانے کی کوشش کی۔ ان جانی باتیں کہنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ خیال
... عام محبت کی بات کروں۔ میں کوئی چھوٹا موٹا لکھاری تھوڑے ہی تھا کہ عام محبت پر افسانہ لکھتا۔ اور کسی عام کردار کو پیش کرتا۔ آپا
... عام کردار تھا۔ اور اس افسانے میں محبت کی عام تفصیلات درج ہیں۔ یقیناً اگر فرمائش نہ ہوتی تو میں کبھی یہ افسانہ نہ لکھتا
——— لیکن قاری نے "آپا" پڑھ کر تالیاں بجائیں اور میرے محبت کے دُوسرے افسانوں کو نظر انداز کر دیا۔ یہ دیکھ
... دل میں اُلٹی ضد پیدا ہو گی۔ اگر عام پڑھنے والے ایسے عام افسانے پسند کرتے ہیں تو کیا کریں جیں کیا عام آدمیوں کے
... لکھا کروں؟

اور پھر آپا۔ آپا کا افسانہ تو خلوص سے خالی ہے۔ جگر خالی ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں جو آپا کا مصنف ہوں
... ہوں میں نے لوگوں کی نگاہیں آپا کی طرف منعطف کیں۔ یہ دیکھیے یہ آب دار موتی دیکھیے۔ اس کی آب و تاب دیکھیے۔
... قیمت کا اندازہ کیجیے ——— لیکن لوگوں کی توجہ آپا کی طرف منعطف کر کے میں خود ساجو باجی کا پتہ پوچھتا پھرا۔ کسی ساجو باجی
... بتائیے۔ خدا کسی ساجو کا پتہ بتائیے۔ اور پڑھنے والوں نے افسانہ پڑھ کر کہا۔ آپا خوب ہے بے حد خوب ہے۔ لیکن کسی
... کا پتہ بتائیے۔

عنوان کا مسئلہ

کنہیا لال کپور

شاعر ہونا بھی کتنی مصیبت ہے! واللہ ہم اس بات کا شکوہ نہیں کر رہے کہ شعراء کو واہ واہ کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے ہی اُن کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ خوبصورت اشعار کی تخلیق کریں لیکن اُن کے لیے انہیں معاوضہ نہ دیا جائے۔ یا اتنا کم دیا جائے جس سے اُن کی گزر نہ ہو سکے۔ جب ملٹن ایسے شہرۂ آفاق شاعر کو اُس کے لافانی شاہکار "پیراڈائز لوسٹ" کے عوض صرف پانچ پونڈ پیش کیے گئے تو باقی شعراء کس کھیت کی مولی ہیں۔ آپ کہیں گے شاید ہم اس بات کی شکایت کر رہے ہیں کہ شعراء کو اکثر مشاعروں میں "ہوٹ" کیا جاتا ہے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ شاعر تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مشاعروں میں شرکت کرتا ہے وہ کبھی اس بات پر پریشان نہیں ہوتا کہ اس کے اشعار کا خیر مقدم "سبحان اللہ" "مرحبا" "بہت خوب" کے نعروں سے کیا جائے گا یا اُسے مطلع کے بعد فوراً مقطع پڑھنے کو کہا جائے گا۔ ہم تو صاحب اُس سخت مقام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو شاعر کی راہ میں سنگِ گراں کا درجہ رکھتا ہے۔ یعنی اپنی نظم کے لیے مناسب عنوان تجویز کرنا۔ آپ فرمائیں گے: بھلا یہ کونسی مشکل بات ہے۔ آخر شاعر جس موضوع پر نظم کہتا ہے۔ وہی اس کا عنوان ہو سکتا ہے: آپ نے بجا فرمایا لیکن اگر آپ جدید شاعری کے لوازم پیشِ نظر رکھیں تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عنوان کا مسئلہ خطرناک حد تک پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ ہماری اس نظم کو لیجیے جو ہم نے "آل انڈیا مشاعرہ لکھنؤ" میں پڑھی اور جس کا عنوان ہم آج تک دریافت نہیں کر سکے۔

جھیل میں مینڈک بھی ہیں کچھوے بھی ہیں
آسماں میں دیکھ کر قوسِ قزح
آ گیا کیوں مجھ کو پھر تیرا خیال
دیکھتا ہوں جب میں سطحِ آب پر مرغابیاں
سوچتا ہوں کاش اڑ سکتا میں شکرے کی طرح
مجھ سے تو اچھے ہیں مینڈک اور یہ مرغابیاں
جھیل کی گہرائی کا جھیل ہی جی کا مزار
کوئی کچھوا دیکھ کر مجھ کو رو دے
مجھ سے ہمدردی جتانے کے لیے

پانی سے باہر بھاگ آئے گا کیوں؟
تم تو ہو مجھ سے ہزاروں کوس دُور
حالِ دل تم کو سُنانا ہے محال
قرضخواہ کو آج کیا دُوں گا جواب
کل بڑی مشکل سے ٹالا تھا اُسے
کاش میں طوطا ہی ہوتا دہر میں
ٹائیں ٹائیں کرتا رہتا شاخ پہ بیٹھا ہوا
دیکھتا واں سے کہ میرے سامنے جو جھیل ہے
اُس میں کچھوؤں کے علاوہ چار سو مینڈک بھی ہیں۔

آپ ہی فرمائیے اس نظم کا کیا عنوان ہو سکتا ہے۔ آپ کہیں گے: "کچھوے اور مینڈک"۔ ہم عرض کریں گے اس میں مُرغابیوں اور طوطے کا بھی تو ذکر ہے۔ اس لیے "شکرا اور مُرغابیاں" کیوں نہیں۔ اور آپ قوسِ قزح، کُرسی، دُور بیٹھی محبوبہ اور قرضخواہ کو کیوں بھول گئے۔ اور پھر آپ نے اُن داخلی واردات کے بارے میں کیا سوچا ہے جو اس نظم کی جان ہیں۔

چلتے چلتے آپ کو ایک نقاد کا قصہ بھی سُنا دیں جن کی خدمت میں ہم اس لیے حاضر ہوئے کہ وہ اس نظم کا کوئی مناسب عنوان تجویز کریں۔ نظم سُننے کے بعد وہ ہم سے پوچھنے لگے: "آپ کو مرگی یا خفقان کے دورے تو نہیں پڑتے؟" ہم نے حیران ہو کر جواب دیا "نہیں، آپ کو کیسے وہم ہو گیا کہ ہم ان نامراد امراض میں مبتلا ہیں؟" انھوں نے دوبارہ سوال کیا: "کیا آپ بھنگ یا چرس کے زیرِ اثر رہنا نہیں رکھتے؟" ہم نے جب اس سوال کا جواب نفی میں دیا تو بڑی شفقت کے ساتھ فرمایا: "آپ دماغی بیماریوں کے کسی لائق ڈاکٹر سے فوراً رجوع کیجیے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے آپ کا دماغ چل گیا ہے یا چل جانے کی تیاری کر رہا ہے۔" ہمیں اُس نقاد سے مل کر خاصی مایوسی ہوئی۔ گھر پہنچ کر ہم نے ایک اور نظم لکھی جو آپ کی تفریحِ طبع کے لیے پیش کرتے ہیں:

جتنے نقاد ہیں زمانے میں
یعنی قدرت کے کارخانے میں
ان سے مل کر خوشی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی
ان سے مل کر اُداس رہتا ہوں
وقفِ حرمان و یاس رہتا ہوں
بات آتی ہے اوڑھ کر کمبل
شکوا کرتا ہے کہتی شام سے

کس لیے شکل آہ و زاری ہے
زندگی موت سے پیاری ہے
اُٹھ کر دُنیا ہے منتظر تیری
ہر طرف بج رہے ہیں نقارے
باغ میں شور ہے عنادل کا
پائے تو بھی سراغ منزل کا
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ایسے ہی وہ اگر یہاں آئے
زندگی میں بہار آ جائے
یہ مگر عشق ہے جنوں میرا
پی کے مے ذرا بہک گیا ہوں میں
کتنا کڑوا مزا ہے قطرے کا
روتے رہتے ہیں رات بھر کتے
اُن کی شب کی سحر نہیں ہوتی

نظم لکھنے کو تو لکھ لی لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی اس کا عنوان کیا ہونا چاہیے۔ درجنوں عنوانات قائم کیے لیکن کوئی بھی پسند نہ آیا۔ آخر ایک پروفیسر صاحب سے کہ جن کی لیاقت کی دُھوم تھی مشورہ کیا۔ وہ نظم پڑھنے کے بعد کہنے لگے: ساری نظم میں صرف دو کام کے مصرعے ہیں اور وہ غالب سے چرائے گئے ہیں۔ اس لیے نظم کا عنوان ہونا چاہیے غالب کے ہاں ڈاکہ۔ ہمیں اُن کا مشورہ ناگوار گزرا۔ ہم اُن کی لیاقت کے علاوہ اُن کی نیت پر بھی شک کرنے لگے۔

اُنہی دنوں ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب سے مُلاقات ہوئی۔ نظم سُننے کے بعد اُن پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ جب ذرا ہوش و حواس ٹھکانے ہوئے تو فرمایا: اس میں کوئی شک نہیں آپ اس نظم میں کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کا اندازہ نہیں لگ سکا۔ بات تو آپ نے نقاروں سے چلائی۔ اس کے بعد رات کا قصہ لے بیٹھے۔ اور پھر نہ جانے کیوں آپ کو فضا میں نقارے بجتے سُنائی دیے۔ نقاروں سے یک لخت آپ کا تخیل عنادل کی طرف پہنچا۔ پھر آپ کو غالب کا شعر یاد آیا۔ خاتمہ آپ نے کتوں کے رونے پر کیا۔ اب آپ کی نظم کا مرکزی خیال کیا ہے۔۔ کیا نظم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ بہتر یہی ہے تو عنوان رکھیے۔ "پی کے مے ذرا بہک گیا ہوں میں" ہم نے عرض کیا: "وہ ... صورت نظم کا اشارہ ہو وہ عنوان" ایڈیٹر صاحب نے فرمایا: "پہلے اس نظم کو ہم اپنے رسالے میں بغیر کسی عنوان

ہم نے اُن کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے جواب دیتے ہیں اور قارئین سے عنوان تجویز کرنے کے لیے کہتے ہیں۔ جو اب ... ب
مشلاً ... نے عجیب و غریب عنوانات تجویز کیے۔ ہماری توقع کے خلاف قارئین نے عجیب و غریب عنوانات تجویز کیے۔ ... ہیں منظور ہے چنانچہ نظم چھاپ دی گئی۔
... اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ ... جنوں میں کیا کیا کچھ ... بکس رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ... گھٹتا پھوٹتے آنکھ ... ماروں ... بھول بھلیاں ... دھندا ...
... سمجھانے کا" وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں یہ عنوانات پڑھ کر قارئین کی عقل پر رونا آیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سخن فہمی کا دیوالہ پٹ چکا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ... س نظم کا عنوان سوچیں گے۔ چنانچہ آج سہ پہر سے مغز پچی کر رہے ہیں۔ لیکن ہماری مشکل حل ہوتی نظر نہیں آتی۔ آپ نے ... یہ نظم ملاحظہ فرمائی۔ آپ ہی کچھ دستگیری کیجیے۔ ہاں ذرا سوچ کر بتائیے تو کہ اس نظم کا کیا عنوان ہونا چاہیے۔

اِحتیاطِ عشق

حجاب امتیاز علی

میں اوپر کی منزل میں روشن جھروکے پر بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ نیچے پائیں باغ موتیا کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

اتنے میں باہر کے صدر دروازے پر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ "کیا واہیات ہے" میں نے اپنے دل سے کہا۔ "کتاب کا یہ ورق کتنا دلچسپ تھا۔ تحریر میں روانی کے ساتھ عمق تھا۔ لوگ واقعی بہت ستاتے ہیں۔ کم از کم یہ صفحہ ختم کرنے دیتے۔ مجھے چاہیے وہ ایک غصیلے کتے پال لوں تاکہ بے وقوف دوستوں سے نجات ملے۔"

کڑھاتے ہوئے میں نے کتاب بالکنی کی دیوار پر رکھی، نیچے باغ کی طرف جھانک کر دیکھا۔ جانے میں نے کتنی ہی کتابیں دوستوں کی مداخلت بے جا کی وجہ سے بالکنی پر رکھیں اور بھول گئی یا ہوا کا جھونکا انہیں اڑا لے گیا۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو اچھا خاصا چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ اور یہ سب دوستوں کی وجہ سے! ہاں ——— تو میں نے کتاب حسب معمول و عادت بالکنی کی دیوار پر رکھی اور نیچے باغ میں جھانک کر آنے والے کو دیکھنے لگی۔ دیکھا تو میری پیاری اور راز دار سہیلی ایلفا اوپر چلی آرہی تھی۔ میری خفگی خوشی سے اور اکتاہٹ مسکراہٹ سے بدل گئی۔ ہم مذاق دوست آئے تو دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

"آؤ آؤ۔ چلی آؤ۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ تم تھیں۔" میں نے چلا کر کہا۔

"سنو" وہ زینے دوڑ کر طے کرتے کرتے بولی: "میں تم کو ایک بے حد پیاری بات سنانے آئی ہوں۔"

"ہائے جلدی سناؤ۔"

"آج رات منیر آرہا ہے۔" وہ ہانپتے ہانپتے بولی۔

"منیر!!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ ہنس پڑی: "قسم سے وہ منیر۔ پانچ دن کی چھٹی پر آرہا ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ اس سے میری ملاقات کرم کی بندرگاہ پر ہوئی تھی۔ میں نے یکایک اپنے دل میں اس کی گہری محبت محسوس کی تھی اور اس کے بعد ہمارے عہد و پیمان ہوئے۔" یہ کہہ کر اس نے جھک کر دیوار پر سے عشق پیچاں کا ایک پھول توڑ لیا اور اسے سونگھنے لگی۔

"لیکن ایلفا۔ تم نے محبت میں عجلت تو نہیں کی؟" میں نے شام کے ملگجے آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بس رہنے دو تم اپنی احتیاط عشق رہنے دو۔ تم دوسروں کو بزدلی سکھاتی پھرتی ہو۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دل کھو دیا"

دوستی شروع کردی۔ بات یہ ہے۔ اس کی صندلی رنگت اور اس کی دیو قامتی کی میں شیدائی ہوں۔ آنکھوں میں گہرائی ہے اور مسکراہٹ میں دل ربائیت۔"

میں نے کتابیں سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے اور اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی: "بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تمہارے جواب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تم میرے پاس کس غرض سے آئی ہو؟"

ایفو مرشد حجرے کی ایک نیچی سی دیوار پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی تھی مسکرا کر بولی: "میں چاہتی ہوں کہ اسے بجائے کسی ہوٹل یا ریستوران میں مدعو کرنے کے ـــــ تمہارے سنگ مرمر کے شہ نشین میں رات کے کھانے پر مدعو کروں۔ وہ محبت کے خواب دیکھنے کی بہترین جگہ ہے۔ سرخ گلاب گردنیں اٹھا اٹھا کر نیلے آسمانوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ اور تاروں بھری رات کا سناٹا اس شہ نشین کے قریب دبے پاؤں گزر جاتا ہے۔"

جب آدمی محبت کرنے لگتا ہے تو نجانے اس کا لہجہ شاعرانہ کیوں ہو جاتا ہے اس کے احساسات شبنم کی بوند کی طرح صاف اور شفاف کیوں بن جاتے ہیں اور اس کی احساس کمتری پر لگا کر کیسے اُڑ جاتی ہے۔

میں نے ایفو کی شاعری سنی پھر بولی: "مجھے کوئی انکار نہیں ایفو۔ تم شوق سے میرے شہ نشین کو اپنی محبت کی [illegible] بناؤ۔"

اس نے جھک کر مجھے پیار کیا بولی: "لیکن کھانے پر تمہیں بھی موجود ہونا چاہیے روحی۔"

"شکریہ تمہارا۔ میں ضرور کھانے پر موجود ہوں گی۔ بلکہ شہ نشین کے عقب میں جو رات کی رانی کی جھاڑی لگی ہے اس میں ٹیپ ریکارڈر رکھ کر عشقیہ غزلیں بھی بجاؤں گی۔"

"کیا بات ہے تمہاری روحی۔ واقعی مجھے تو اس کا خیال بھی نہ آیا ہوتا۔ ٹیپ ریکارڈر۔ موسیقی محبت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ آئندہ مہینے ہماری شادی بھی ہو رہی ہے۔ تم آج رات اس کی رعنائی کی قائل ہو جاؤ گی۔"

"میں اب بھی قائل ہوں۔ تمہاری زبانی سن چکی ہوں۔"

"لیکن دیکھنے کی اور بات ہوتی ہے روحی۔ تصویری پڑھنے اور عملاً کام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ چھریرا جسم۔ آنکھوں میں، مسکراہٹ میں بلا کی اظہاریت۔ جیسے مونالیزا کی مسکراہٹ؟"

"لیکن ایفو مجھے کلاسیکی مسکراہٹیں پسند ہیں گویا [illegible] کی سی مسکراہٹ؟"

"تم ہر وقت اعتراض کرتی رہتی ہو یہ عادت تمہاری بری ہے روحی۔ آج رات تم [illegible] مسکراہٹوں کی قائل ہو جاؤ گی۔" وہ دیوار پر سے کود پڑی اور فرطِ جذبات سے بے چین ہو کر سیٹی بجاتی زور زور سے جھٹکنے اور [illegible] لگی۔

مجھے ہنسی آئی وہ عجیب سا تھا۔ لیکن میں ضبط کر گئی۔ پھر کچھ یاد کر کے بولی: "چاہے آپ اسے انہیں بہت ماں کہو۔ چند [illegible] بات ہے۔"

وہ وفورِ مسرت سے مجھ سے چمٹ گئی۔ "کمال کر دی تم نے تو۔ ایسی عمدہ رائے کیسے سوجھی تمہیں۔"
میں بولی۔ "بات یہ ہے میں نے ابھی ابھی گلستان کی چھت پر ایک گلابی رنگ کا کمرہ دیکھا ہے۔ ایک آسمانی رنگ کی
اس میں فٹ کی ہے۔ وہ کچھ پہلے کاسنی حال کے پڑے ہوئے ہیں۔ چاہو تو تم اپنے کلاسیکی پیکر کو اس قوس و قزح میں شریک کر
سکتی ہو۔"

"وہ واقعی قابل ہے کہ اسے قوس و قزح میں ٹھہرایا جائے؟" وہ شدتِ مسرت سے چیخ پڑی۔
دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں جلدی میں اپنے جسم پر ... چھوڑ کر نکلے پارلر چلی گئی ہو جا کر کچھ ہدایات دینے لگی۔ باورچی کو تاکید کی کہ بریانی کا گوشت بالکل گلا ہوا ہو۔ یعنی اتنا نرم کہ چڑیا بھی کھا سکے۔ اور ہر سالن میں زعفران کی افراط ہو۔ میٹھے میں شہد کی انتہا ہو۔ اور نمک مرچ بہت احتیاط سے استعمال کرے۔ میں نے کھانوں کی فہرست دیکھی تو میٹھے بیست چودہ تھے۔ دال چاول علیحدہ اور کھانے علیحدہ، اس سے علیحدہ۔ اس کے بعد گل دستے کے سگریٹ پیش کیے جائیں یہ خیال کے تمام طرح کی ... کھانے کے میز کے سب سے پر رکھنے کو بھی کہہ دیا تھا۔ پھر باغ کے دروازے میں بیٹھ کر کافی پینا علیحدہ انتظام تھا۔ کافی کے ساتھ لیکیور کے جام تھے۔
بڑھا باورچی گہری سوچ میں مبتلا سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو کہ میں شاہ ... کی دعوت کر رہی ہوں۔

جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ سو ہم نے وہ دوپہر پھولوں سے لدی ہوئی باغ کی ایک روش پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہوئے بسر کر ڈالی۔ کیونکہ انتظار کی گھڑیاں صدیوں میں کٹتی ہیں۔ ہم دونوں ہی کھیل میں ہارتے رہے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ کھیل رہے ہیں۔ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی روپہلی تھی لیکن آسمان پچھلے پہر نیلم کی طرح دمک رہا تھا۔ کاسنی شہتیروں پر سبز رنگ کے بیٹھے دو محبت کے نغمے الاپ رہے تھے۔ وہ دوپہر ہم نے بڑے اضطراب میں کاٹی۔
میں چھ بجے کر تیار ہوں جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر عنبر شاہ کے چھ بجے ہی سے زرق برق لباس میں بن ٹھن کر تیار تھی۔ ... نے ایک گلابی رنگ کی چادر جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ جس کا ... کھلا تھا اور حسین آدمی سے ملاقات کے لیے تیار تھی۔
"ایک مہینے بعد ہماری شادی ہو جائے گی روحی۔ میرے ابا نے پانچ مہینے پہلے وہی لباس کا آرڈر دے دیا تھا تاکہ عین وقت میں درزی کی وجہ سے خلل نہ پڑے۔"
"بڑے دور اندیش ہیں۔ بڑا اچھا کیا۔" میں نے تعریف کی پھر بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں ہر بات اتنا کام کر دی ہے پھر بھی تم نے بہت کم ... وہی لباس ... چٹ منگنی پٹ بیاہ اسی کو کہتے ہیں شاید۔"
"... اور کیا کرتی؟ میں تم جیسی سست نہیں ہوں کہ ایک بات پر گھنٹوں سوچتی رہ جاؤں۔ اور ایک اقرار پر سالوں ... رہوں۔" انہوں نے حسرت سے ہری خاموشیاں ... جائیں۔
میں بولی: "میں تم جیسی ہی کہاں سے لاؤں؟ اپنی اپنی فطرت ہے۔"

ایفو مسکرا کر کہنے لگی: "لیکن تم منیر کو دیکھو گی تو انگشت بدنداں رہ جاؤ گی اور میری تیزی پھرتی کا رونا دوبارہ نہ رو ؤ گی۔
چوڑا جسم۔ آنکھوں میں چمک۔ مسکراہٹ میں بلا کی افکاریت۔"

بہار کی اس ہوشربا حسین رات میں جب ہم منیر کو لینے ہوائی اڈے پر پہنچیں تو معطر ہوائیں ہمارے رخساروں کو مس کر رہی تھیں۔ ایفو بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایفو کہنے لگی۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں۔ اب منیر فوج میں شریک ہو گیا ہے۔ پہلے محض شاعر تھا۔ اب فوجی باقاعدگی نے اسے اور دلکش بنا دیا ہوگا۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"فوجی باقاعدگی؟" میں نے کہا۔ "مگر اس سے تو انفرادیت ماری جاتی ہے۔"

"ماری جاتی ہے تو ماری جانے دو۔ بانکپن تو پیدا ہو جاتا ہے۔" ایفو نے جھٹ کہا

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اپریل کی تاروں بھری رات تھی ——— اتنے میں اچانک تاروں کے نیچے ایک دُم دار تارہ ابھرا۔ وہ ہوائی جہاز تھا۔ پھر وہ زمین پر لڑکھڑاتا ہوا یوں اترا کہ میں نے سمجھا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

مسافر اترنے لگے۔ ہم دونوں دور کھڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر اتنی روشنی نہ تھی کہ ہم مسافروں کی شکلیں دیکھ سکتے۔ آخر مشکل سے ایک دراز قد آدمی ہاتھ میں بیگ لیے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

ایفو چیخ پڑی۔ "وہ رہا ——— وہ ——— ہنس کی طرح چلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چلا آ رہا ہے ———"

میں بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"منیر!" شدت جذبات سے پست آواز میں ایفو چیخی۔

"ایفو!" منیر چلایا۔

جب ہم تینوں ٹرفوں کے اِدھر اُدھر اور اندھیرے کے سبب سے باہر روشنی میں نکل آئے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک [illegible] بد قد و بد اندام آدمی جس کی آنکھوں میں وحشت تھی جس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی جس کے بھدے پن نے اسے احمق سا بنا رکھا تھا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ اس کے ہونٹوں کے گرد مونچھوں کی کمان [illegible] ہی ہے۔

"ہائے ——— یہ؟" ایفو اچانک زور سے چیخ پڑی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہائے ——— یہ — یہ نہیں ہو سکتا۔"

مرد نے پلٹ کر دیکھا مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا؟ ارے ایفو پیاری۔ سال بھر میں تم مجھے بھول گئیں؟ میں منیر ہوں۔"

مجھے ہنسی سی آ گئی جسے میں نے بڑی احتیاط سے روکنے کی کوشش کی۔ فوجی تربیت نے اس میں بانکپن پیدا کر دیا ہوگا۔

وہ وقت سے مجھ سے چپٹ گئی۔ "کمال کر دیا تم نے۔ ایسی خوبصورت ایک بات ...

میں بولی۔ "بات یہ ہے جنہیں نے ان ... کی جگہ ... ہے ...

اس میں بحث کی ہے۔ وہ پہلی ... آپ ... میں ...

سکتی ہو۔"

"وہ اس قابل ہے کہ اسے قوس و قزح میں پھیلا دیا جائے۔" وہ شدت مسرت سے چیخ پڑی۔

دعوت کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں جلدی ہی اپنے جسم میں ... پانی ... میں ... ہو ...
دیتی ہوں۔ ... کو ... بالکل ... دیا ہے۔ ... بھی کھائے۔ اور ہر ... افزا ہو۔ میٹھے میں ... کی انتہا ہو۔ اور ... بہت احتیاط سے استعمال کرے۔ میں نے کھانوں کی فہرست دیکھی تو ... چور ... الگ علیحدہ اور ... اس سے علیحدہ۔ اس کے بعد ... کے سگریٹ ... پھولوں ... کو ... میز کے سب ... کر دیا تھا۔ پھر باغ کے دروازے میں بیٹھ کر کافی ... انتظام تھا۔ کافی کے ساتھ ... بادام تھے۔

بوڑھا ادریس گہری سوچ میں ... چلا گیا۔ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے سوچ رہا ہو کہ میں شاہ ... کی دعوت کر رہی ہوں۔

جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر ہم نے وہ دوپہر پھولوں سے مہکتی باغ کی ایک روش پر بیٹھ کر شطرنج کھیلتے ہو بسر کر ڈالی۔ کیونکہ انتظار کی گھڑیاں صدیوں جیسی لگتی ہیں۔ ہم دونوں ہی کھیل میں ہارتے رہے۔ کیونکہ کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا ... کھیل رہے ہیں۔ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی دوپہر ... آسمان ... کی طرح دمک رہا تھا۔ کاسنی شفیروں پر سبز رنگ کے بیٹھے ... کے ننھے ... رہے تھے۔ وہ دوپہر ہم نے بڑے اضطراب میں کاٹی۔

میں پہلے کہہ چکی ہوں جہاز آٹھ بجے آنے والا تھا۔ مگر میں شام کے چھ بجے ہی سے زرق برق لباس میں ... کر تیار تھی۔ ... نے ایک ہلکے گلابی رنگ کی چادر جسم کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ جس کا عطر لگا رکھا تھا اور حسین آدمی سے ملاقات کے لیے تیار تھی۔

"ایک مہینے بعد ہماری شادی ہو جانے کی رو تھی۔ میرے ابا نے پانچ مہینے پہلے ... لباس کا آرڈر دے دیا تھا تاکہ میں درزی کی وجہ سے خلل نہ پڑے۔"

"بڑے دور اندیش ہیں۔ بڑا اچھا کیا۔" میں نے تعریف کی پھر بولی۔ "تم نے اس سلسلے میں ہر بات ... کر دی۔ پھر میں تم نے بحث کی۔ ... لباس ... کر سکتے ہیں ...۔"

"ورنہ اور کیا کرتی؟ میں تو بس ... کہ ایک بات پر گھنٹوں سوچتی رہ جاؤں۔ اور ایک ... ہوں۔" ... نے حسرت سے مری خامیاں ... کر جائیں۔

میں بولی: "میں تم کو تیزی کہاں سے لاؤں۔ یہی تو میری فطرت ہے۔"

دیونسی کر کہنے لگی: "لیکن تم منیر کو دیکھو گی تو انگشت بدنداں رہ جاؤ گی اور میری تیزی پھرتی کا رونا دوبارہ نہ روؤ گی۔"

پھرتیلا جسم، آنکھوں میں چمک، مسکراہٹ میں بلا کی انفرادیت۔"

بہار کی اس ہوشربا حسین رات میں جب ہم منیر کو لینے ہوائی اڈے پہ پہنچیں تو معطر ہوائیں ہمارے رخساروں کو مس کر رہی تھیں۔ الیفو بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگا رہی تھی اور میں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد الیفو کہنے لگی۔ "میں نے تم کو بتایا نہیں۔ اب منیر فوج میں شریک ہوگیا ہے۔ پہلے محض شاعر تھا۔ اب رسمی باقاعدگی نے اسے اور دلکش بنا دیا ہوگا۔" وہ ہنسے جا رہی تھی۔

"رسمی باقاعدگی؟" میں نے کہا۔ "مگر اس سے تو انفرادیت ماری جاتی ہے۔"

"ماری جاتی ہے تو ماری جانے دو۔ بانکپن تو پیدا ہو جاتا ہے۔" الیفو نے جھلا کر کہا۔

"ضرور۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اپریل کی تاروں بھری رات تھی ——— اتنے میں اچانک تاروں کے نیچے ایک دُم دار تارہ اُبھرا۔ وہ ہوائی جہاز تھا۔ پھر وہ زمین پر لڑکھڑاتا یوں اُترا کہ میں نے سمجھا کوئی شہاب ثاقب ٹوٹ کر گر پڑا ہے۔

مسافر اُترنے لگے۔ ہم دونوں دور کھڑی ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھیں۔ زمین پر اتنی روشنی نہ تھی کہ ہم مسافروں کی شکلیں دیکھ سکتے۔ آخر بمشکل ہمیں ایک دراز قد آدمی ہاتھ میں بیگ لیے اپنی طرف آتا ہوا نظر آیا۔

الیفو چیخ پڑی۔ "وہ رہا ——— وہ ——— ہنس کی طرح چلتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ چلا آ رہا ہے ———"

میں بھی اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"منیر!" شدت جذبات سے پست آواز میں الیفو چیخی۔

"الیفو!" منیر چلایا۔

جب ہم تینوں مسافروں کے اژدہام اور اندھیرے کے سیلاب سے باہر روشنی میں نکل آئے تو میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو ایک وہ ایک فربہ اندام آدمی جس کی آنکھوں میں وحشت تھی جس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی جس کے بھدے پن نے اسے احمق سا بنا دیا تھا ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ غور سے دیکھنے پر اس راز کا بھی انکشاف ہوا کہ اس کے ہونٹوں کے گرد مونچھوں کی کمان بھی رکھی ہے۔

"ہائے ——— ہی۔" الیفو اچانک زور سے چیخ پڑی پھر سر اُٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہائے ——— یہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔"

مرد نے پلٹ کر دیکھا مسکرا کر بولا۔ "کیوں نہیں ہو سکتا! ارے الیفو پیاری۔ سال بھر میں تم مجھے بھول گئیں؟ میں تو منیر ہوں۔"

مجھے ہنسی سی آگئی جسے میں نے بڑی احتیاط سے روکنے کی کوشش کی۔ فوجی تربیت نے اس میں بانکپن پیدا کر دیا ہوگا۔

ایلزے ... ذہن میں گونجنے لگے۔

"ایلزبیتھ پرچھائیاں آنکھوں میں لیے سوال کر رہی تھی۔ "تم؟"

"تمہیں تعجب ہے ایلز؟" کسی ملائکائی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"کاش کرشمہ ہوتا۔ یقین نہ ہوتا ——" ایلز بے حد پریشان ہو کر بولی۔ "نیر باہر تو نکلو۔ کار کھڑی ہے"

ہم تینوں کار میں جا بیٹھے۔ دو تین منٹ موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ چشم زدن میں تیز تیز اُسے دیکھ کر میں خود حیران تھی۔ ایلز پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ دائیں بائیں میں اور ایلز تھیں۔ درمیان میں وہ اکڑا بیٹھا تھا۔ مجھے زور کی ہنسی آ رہی تھی میں سر دوپٹے سے ڈھکے رومال سے اپنا منہ بند کر رہی تھی۔ جانبازی اور جرأت کی ایسی عبرتناک سزا کسی کو پاتے میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ایلز بدحواس اور غمگین بیٹھی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس نے نیر پر ایک سرسری نظر ڈال کر پوچھا: "آخر بتاؤ تم کو ہو کیا گیا۔ کیا افتاد پڑی؟ اتنے بدل کیسے گئے؟"

"میں بدل سکتا ہوں ایلز؟ وہی دل ہے وہی جذبات۔"

"مگر —— تم وہ نہیں رہے ——! سال بھر میں درخت کی تصویر اتنی نہیں بدلتی جتنے تم بدل گئے ہو؟"

"کس طریق پر بدلا ہوں؟" نعمان عزیز نے معصومیت سے سوال کیا۔

شاید اس کے بچے کی معصومیت کا احساس ایلز کو بھی ہو گیا: "مرا مطلب ہے۔ بس۔ یہی —— کہ تم ... ذرہ ہے —— اچھا یہ دیکھو —— یہ آگیا ہوٹل گلستان۔ تمہارے لیے سب سے اعلیٰ درجے کا کمرہ مخصوص کرا لیا ہے۔"

میں حیران ہو کر ایلز کو دیکھنے لگی بولی۔ "یہاں؟"

ایلز ذرا تلخی سے بولی۔ "ہاں ہاں یہاں۔ یہاں یہ زیادہ آرام سے رہیں گے۔" پھر وہ منیر کی طرف مڑ کر بولی: "ناشتہ کر چکے ہیں۔ آج چلی جاؤں گی تو کل صبح تم سے ملاقات ہو سکے گی۔ خدا حافظ۔ فی امان اللہ ——"

منیر خاموشی سے اُتر کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب ہم اپنے گھر پہنچے تو باورچی خانے کی طرف سے گرم کافی کی سوندھی مہک اور بریانی کے گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی جو سارے میں پھیلی ہوئی تھی مگر ایلز کی اشتہا غائب تھی اور وہ گہری سوچ میں تھی اور میں بے احتیاطی ... پر غور کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بولی: "زدی۔ آج کی ناشتہ کر چکے میں بڑی دور جا رہی ہوں۔ پھر کبھی تم سے ملاقات ہوگی۔"

وہ باغ کے زینے سے کود کے باہر نکل گئی۔

"ایک واقعہ ہے۔ مگر سچا۔ کاش آپ اسے کہانی سمجھیں۔"

کوڑیوں کے مول



تحریر: بمل مترا

ترجمہ: احمد سعدی

مختصر حالات زندگی



مصنف

میں ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے متوسط طبقے کے ایک بنگالی گھرانے میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بنگالی زبان میں ایم۔اے کیا۔ پھر انڈین ریلوے میں ملازمت کر لی اور مختلف عہدوں پر کام کرتا رہا۔ ان میں سے ایک اینٹی کورپشن افسر کا عہدہ بھی تھا۔

دوران ملازمت مجھے پورے ہندوستان میں سفر کرنے کا موقعہ بھی ملا اور ملک میں بسنے والے مختلف طبقے اور مختلف مکاتب خیال کے لوگوں کے مسائل اور حالات جاننے کا بھی۔ ۱۹۵۶ء میں، میں نے ملازمت چھوڑ دی اور مستقل طور پر تحریر و تصنیف کو ذریعہ معاش بنا لیا۔

میں اب تک دو سو سے زائد افسانے اور سات ناول لکھ چکا ہوں، جن میں "صاحب بی بی غلام" سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ لوگوں نے مجھے اسی ناول کے بعد جانا۔

میرے تین ناول "صاحب بی بی غلام" "کوڑیوں کے مول" اور "اکائی دہائی سینکڑہ" ۱۶۹۰ء (جب پہلی بار انگریز ہندوستان میں آئے تھے) سے لے کر ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء (جب چین نے ہندوستان کے شمالی مشرقی حصہ پر حملہ کیا تھا) کے زمانہ کو احاطہ کر کے لکھے گئے ہیں۔

میرا تازہ ناول "بیگم میری بسواس" زیر تصنیف ہے جو کلکتہ کے ایک بنگالی ہفتہ وار "دیش" میں قسط وار چھپ رہا ہے۔

میری تصانیف کے بیشتر حصے کا تمام ہندوستانی زبانوں و دیگر غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

"کوڑیوں کے مول" کا ترجمہ انگریزی اور ہندی میں ہو چکا ہے اور اب اردو اور ملیالم میں ہو رہا ہے۔

بمل مترا

پہلی قسط پیش کرتے وقت ہمیں مصنف کے حالات زندگی نہیں مل سکے تھے۔ (ادارہ)

کوڑیوں کے مول

دوسری قسط

بمل مترا

ترجمہ : احمد سعدی

لیکن دوسرے دن شام ہی کو دیپنکر دھر لیا گیا۔

بہت سارے برسوں بعد بہت سارے فاصلے طے کرنے کے بعد دیپنکر کو احساس ہوا تھا کہ آخر یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ دوسرے لوگوں کی طرح دیپنکر بھی تو تمام عمر سادہ سی زندگی گزار سکتا تھا ! جیسی زندگی ابھیکر، رام مورتی اور سوم گزار رہے تھے ! وہ لوگ ملازمت کر رہے ہیں ! ملازمت میں ترقی پائی ہے، شادی کی ہے، ان کے بچے ہیں، صبح کو دفتر جاتے ہیں اور شام کو گھر واپس آ کر دنیا داری کرتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں ! ان لوگوں کو تو کوئی کمی نہیں ہے، پھر دیپنکر کے ساتھ ایسا کیوں ہوا ؟ وہ بھی ایک دفتر میں بھرتی ہوا تھا ! دوسرے پانچ آدمیوں کے ساتھ جو کچھ پیش نہیں آیا، اس کے ساتھ پیش آیا تھا، ملازمت میں خلاف توقع ترقی ملی تھی ! لوگ سب سین صاحب کہتے تھے، لیکن سین صاحب بن کر بھی کیا ہوا ! سین صاحب بننے کے بعد بھی بار بار اس کے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ خود اس کے وجود کے اندر جیسے اس کے وجود کی کوئی انتہا نہ تھی، پھر باہر کی روشنی اور ہوا کے ساتھ باہر کے دانہ اور پانی کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ کیسے قائم ہو گیا ! کیوں اس دن اس نے امرا کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر کھڑکی میں جھانکا تھا ؟ کرن کی کشش تھی ! اتنی چھوٹی سی عمر میں اس کے اندر ایسی کوئی کشش تو نہیں رہنا چاہیے تھی !

واقعی، دوسرے ہی دن شام کو دیپنکر دھر لیا گیا۔

کرن اس روز بھی اسکول آیا تھا، اسکول کے بعد دیپنکر نے پوچھا —— "آج اس سادھو کے پاس نہیں جاؤ گے ؟"

"سادھو کے پاس تو شام کو جائیں گے۔" کرن نے جواب دیا —— "چلو سہ پہر کو میٹنگ میں تقریر سن آئیں۔"

"کہاں ؟"

"برٹش پارک میں۔"

برٹش پارک میں اس روز ایک بہت بڑی میٹنگ تھی، پولیس سے میدان بھرا ہوا تھا، دیپنکر کو پہلے پہل بہت خوف محسوس ہوا، پھر بھی بہت بڑا مجمع لگا ہوا تھا۔

کرن اس طرف روز ہی جیسے آتا تھا، اسے کوئی خوف نہیں تھا۔

اس نے کہا —— "آؤ، اندر آؤ۔"

اندر بہت سارے لوگ زمین پر بیٹھے تھے، کانگریس کی میٹنگ تھی، دو چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں اور ایک گیس بتی رکھی تھی، اندھیرا ہونے پر جلائی جائے گی، دو معزز کرسی پر بیٹھے تھے، نصف پارک میں لوگ بھرے ہوئے تھے، قریب ہی دو تین کرسیاں اور بھی تھیں، اخبار کے رپورٹر اور پولیس کے آدمی کاغذ پنسل لیے ہوئے بیٹھے تھے۔

* دیپنکر کیا ہے، وہ کسی کا نام نہیں جانتا تھا، پتا چلا کہ صدر کون ہے، کیا کچھ ہو رہا ہے، کون بولے گا —— اور جاننا

وہاں [illegible] تا تھا۔

[illegible] — سبھاش بوس کون ہے بھئی؟"

کسی نے [illegible] — سبھاش بوس نہیں جانتے ہیں؟ گیانجن نیوگی کتنے دن دیکھنا، یہیں تقریر کریں گے [illegible]

وہیں بالیگرپ [illegible] ہے۔"

صرف تقریر [illegible] کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک سفید پوش چیخ پڑنے لگا، جیسے غیر متحرک بائیسکوپ ہو۔ وہ غیر متحرک تھے لیکن تقریر کی وجہ سب کچھ آسانی سے سمجھ میں آتا تھا۔ فرنگی سپاہیوں نے آکر کس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا، انگریزوں نے کس طرح صنعت گروں کی انگلیاں کاٹ ڈالیں، اور وسعت پانے والے مظالم، کیا کیا کہیں تک [illegible] مظالم، یہ سبھی کچھ دکھایا جا رہا تھا اور گیانجن نیوگی تقریر کر رہے تھے۔ گیا تقریر تھی، تمام لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ پہلے بعد [illegible] سوز مظالم ڈھا کر انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا، انگریز کتنے ظالم، پاجی، بدمعاش اور ظالم تھے، عکسی تصویروں کے ذریعہ دکھایا جا رہا تھا۔

گیانجن نیوگی نے کہا — ہم لوگ انسان ہیں یا جانور؟ ہم لوگ درخت ہیں یا پتھر؟ ہم لوگ کیا ہیں؟ ہم لوگ انسان نہیں ہیں، ہاں جانور بھی نہیں ہیں، جانور ہوتے تو بھی بھڑک کر جلتے، احتجاج کرتے، بدلہ لیتے۔ ان لوگوں نے ہمیں گولیوں سے ہلاک کیا ہے اور ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟ آپ لوگ بتائیے ہم لوگوں نے کیا کیا ہے؟"

ایک آدمی نے جواب دیا — ہم لوگوں نے ان کی خوشامد کی ہے —"

گیانجن نیوگی نے کہا — نہیں، ہم لوگوں نے انگریزوں کے پاؤں چاٹے ہیں۔"

قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہا — ٹھیک، ٹھیک —"

گیانجن نیوگی کی تقریر جاری تھی — اس کا مہینہ تھا، پیلے ڈاک کے راستے سے مسٹر کمبل جا رہے تھے۔ مسٹر کمبل جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ ان کے قریب سے ایک کالج کا طالب علم چھتری سر پر تانے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر صاحب کا پیلا خون اندر ہی اندر کھول اٹھا۔ اتنی ہمت! صاحب کے سامنے سر پر چھتری تان کر چلے گا! سیاہ نیٹو، اس کی یہ ہمت!

صاحب نے کہا — چھتری بند کرو۔"

لڑکے نے حیران ہو کر پوچھا — کیوں، چھتری کیوں بند کروں؟"

صاحب نے کہا — میرا حکم —"

لڑکے نے پوچھا — تم کون ہو جو تمہارا حکم مانوں؟"

صاحب نے کہا — دیکھو گے میں کون ہوں؟ یہ دیکھو —"

اتنا کہہ کر لڑکے کو پیٹنے لگا۔ لڑکا نیم جان ہو کر وہیں پڑا رہا اور صاحب چلا گیا۔

معاملہ عدالت تک پہنچا، مقدمہ چلا، فیصلہ ہوا اور جج نے فیصلہ دیتے ہوئے کہا — قصور لڑکے کا ہے۔"

صاحب کو ختنہ ہو گیا تھا، انگیل صاحب کا کوئی قصور نہیں! اس کے بعد اسپیشل صاحب خود تحقیقات کرنے آئے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا ——— لعنت ہو تم دونوں پر جس کے تینوں ساتھیوں کو مجسٹریٹ کے سامنے لا کر بید لگائے جائیں، وہ ستر، اگر ہم مسلمان ہوتے تو ان بیدوں کے نشانات ہماری پیٹھ پر بھی پڑتے! ہم لوگ پتھر اور بدتر ہیں، اسی لیے ان انگریزوں کے پاؤں چاٹتے ہیں اور لوگ جو میرے قریب بیٹھے ہوئے ایسمبلی کے لیے رپورٹیں تیار کر رہے ہیں ——— ان لوگوں کو کیا نام دوں ———

جتنا کہ انھوں نے ہوئے تمیت اپنا پاؤں زمین پر دے مارا۔

یکایک پولیس باہر سے دوڑتی ہوئی آئی اور لاٹھی چلانے لگی، مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا اور جو لوگ اتنی دیر سے خاموش بیٹھے تقریر سن رہے تھے، اٹھ کر بھاگنے لگے۔

یکایک کرن نے کہا ——— بھاگ چلو رمیو، جلدی بھاگ چلو ———

اس کے بعد کیا ہوا؟ کرن کہاں گیا، رمیکر اور کہاں گیا برٹش پارک، ابھی تک اندھیرا نہیں ہوا تھا، گلی کے اندر ہی اندر وہ کہاں سے کہاں جا نکلا، ایکدم ہابرہ روڈ پر پہنچ گیا، وہاں سے چند ہی قدم کے فاصلے پر حاجی قاسم کا مکان تھا، بہت بڑی بلڈنگ تھی، وہاں سے گزر کر رام دھنی کی پان کی دکان کے قریب سے گزر کر وہ ایکدم حاجی قاسم کے بازار میں جا پہنچا، ٹیپو سلطان کی بلڈنگ کے سامنے ایک بہت بڑا برگد کا پیڑ تھا، وہاں سے برگد کے پیڑ کے پیچھے سے ہوتا ہوا وہ سیدھا آگن کاری کے تالاب کا چکر لگا کر ایشور گنگولی لین میں شیو مندر کے قریب آ پہنچا، اس وقت تک رمیکر کی حالت سکون سے سوچنے کے قابل ہو چکی تھی، اس طرف کوئی گہما گہمی نہیں تھی، یہاں پہنچ کر رمیکر نے اچھی طرح نگاہ دوڑا کر دیکھا، آس پاس، دائیں بائیں، آگے پیچھے کہیں کوئی پولیس نہیں تھی، دوڑتے دوڑتے وہ بری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اتنی دیر میں اب اس کی سانس درست ہو گئی تھی، کرن کہاں گیا؟ اس کے ساتھ سادھو کے پاس جانے کی بات تھی، وہ بھی پوری نہیں ہوئی، رمیکر آہستہ آہستہ ایشور گنگولی لین کی طرف چلنے لگا، بنکو کی دکان میں بیگنی اور آلو چاپ کے خریداروں کی بھیڑ لگنا شروع ہی ہوئی تھی اور [illegible] میز پر اس وقت تک اڈہ جما ہوا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے پکارا ——— ماں ———

ماں نے اسے دیکھتے ہی کہا ——— تم اتنی دیر تک کہاں تھے گھر کا؟ میں یہاں بیٹھی بیٹھی فکر میں گھل رہی تھی۔

شام کو ماں ہرڈھی رکھ دیا کرتی تھی، صبح شام قسمت میں ہرڈھی ہی لکھی تھی اور گرمی میں کسی کسی دن پنتا بھات۔ اس کے بعد وہ باہر نہیں نکلتا تھا، شام کے بعد ہی وہ پڑھنے بیٹھ جاتا، لیکن پڑھتے وقت بھی اس کا دھیان دوسری طرف رہتا، کرن اس وقت کیا کر رہا ہوگا، ممکن ہے پولیس کی لاٹھی کھا کر راستے میں پڑا ہو، ممکن ہے لوگ اسے ہسپتال لے گئے ہوں، ایسی ہی بہت ساری باتیں وہ سوچتا رہتا!

ماں کہتی ——— کتابیں سامنے رکھ کر بیٹھا بیٹھا کیا سوچ رہا ہے بیٹے؟

تھوڑی دیر بعد ہی ماں باورچی خانے میں چلی جاتی، چولھے پر ہانڈی چڑھاتی اور وہ دادا کے صندوق سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

[illegible] کی وہ چوٹی [illegible] ایک سے [illegible]

[illegible] تھا۔ حیرت ہے انہوں نے سوچا تک نہ تھا کہ [illegible]

[illegible] ہے؛ [illegible]

[illegible]

[illegible] کوئی بھی نہیں [illegible] یہ لوگ [illegible]

اس طرح تو کوئی بھی نہیں سوچتا تھا اگر [illegible] تو ضرور سوچتا، [illegible] ہے بے شرم نہیں آتی۔

دیپکر باورچی خانے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ماں اس وقت بہت مصروف تھی، چولہے پر سالن کو [illegible] چاول صاف کر رہی تھی۔

"ماں!" اس نے پکارا۔

میں [illegible] ——— پڑھنا لکھنا چھوڑ کر تو یہاں کیوں آ گیا بتا؟ تیرا پڑھنا لکھنا کیا چولہے میں گیا؟ اسی طرح تو تباہ ہو گا، اسی طرح تو انسان بنے گا ———

نہ کچھ بھی ذکر سنا، اس نے سوچا تھا وہ اس سے دریافت کرے گا ——— وہ لوگ کیا ہم سے علیحدہ ہیں، وہ تو انگریزی پڑھتے ہیں، لیکن کیا ہم لوگوں سے مختلف ہیں، ہم جیسے نہیں ہیں؟ وہ لوگ ہماری ہی طرح بنگالی ہیں، ہماری ہی طرح کپڑے پہنتے ہیں، بھات کھاتے، پھر ہم لوگوں سے مختلف کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ وہ لوگ تو [illegible] کھانا نہیں چھوڑتے، ان لوگوں پر تو کوئی نہیں [illegible]۔

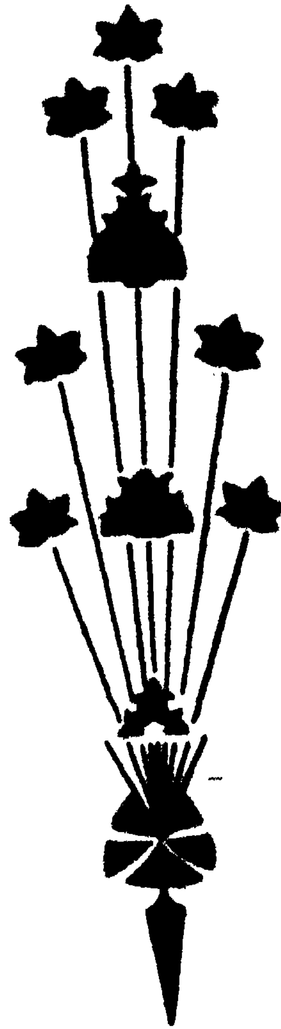
دیپکر کو یاد تھا، اس وقت دیپکر نے کہا تھا کہ تمام کالی گھاٹ کے لوگ ایک طرف ہیں اور اس کرایہ دار کی ذات دوسری طرف [illegible] اس لیے ان کے [illegible] کوشش [illegible] تھی، آس پاس کے تمام لوگ جو اس محلے یا اس علاقے میں رہتے ہیں، وہ لوگ تو [illegible] سے، اتنی [illegible] ان لوگوں کے پاس تو نہیں ہے۔ کوئی بہت [illegible] جیسے [illegible] ایک بی، ایشور گنگولی لین [illegible] مکان میں آیا تھا اور اس کے لڑکا [illegible] جیسا تھا، ان کا ملازم بھی سر جھاڑتا تھا، سر کے بال سنوارتا تھا، یہ لوگ [illegible] میں بہت [illegible] بیرسٹر [illegible] لیکن یہ لوگ اس جگہ رہتے ہوئے بھی ایک [illegible] کے [illegible] گئے۔ یہ جگہ [illegible] کر سکتی تھی، یہ جگہ دیپکر کر سکتی تھی، یہ جگہ چھنو دی، مدھو سودن اور [illegible] اگر، داد [illegible] پیوشا اور [illegible] کر سکتی تھی، بجلی کی [illegible] دکان کے لیے [illegible] تھی۔

دیپکر کو مدھو سودن سے خبر ملی۔

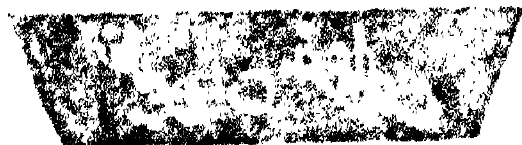
مدھو سودن نے پہلی بار اس سے کہا تھا ——— "تمہارے مکان میں کرایہ دار آیا ہے رے دیپو؟"

دیپکر نے کہا تھا ——— "کہاں؟ مجھے تو نہیں معلوم ———"

مدھو سودن نے کہا تھا ——— "ہاں رے، میں نے آتے وقت دیکھا کہ جو آدمی [illegible] بڑے بڑے [illegible] تمہارے گھر [illegible] سامان اتار رہا تھا [illegible] سب [illegible] تھے ———"



نظمیں غزلیں



... لگ کر ... نے کہا تھا ـــ "سبھی لوگ گئے ہیں! ایک دم میم صاحب لوگوں کی طرح ـــ"
... کی ... کے بارے میں تبصرے ہوتے تھے۔
وہ ... کا تھا ـــ "کون آیا ہے سب؟ ... کے مکان میں، نیا کرایہ دار معلوم ہوتا ہے؟"
... کے بڑے بھائی نے کہا تھا ـــ "اس محلے میں ایسے لوگ آئے ہیں! معاملہ کیا ہے، یہ تو جیسے جنسوں کی ٹولی ہیں! ابے ـــ"

محلے بھر میں خبر پھیل گئی تھی، اس محلے میں تو ایسا کرایہ دار کبھی نہیں آیا تھا۔ اس محلے کے لوگ پرانی ساکھ کے خریدار تھے، تھوڑا سا پیار ... گرم ... کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کسی مکان کے سامنے ٹیکسی آکر کھڑی ہوتی، تو یہ لوگ حیران رہ جاتے، پتہ لگاتے، کون آیا ہے، ... یہ لوگ دوسرے کی ... ہوتے دیکھ کر بات سے ٹٹول کر جانچتے ہیں اور اس کی قیمت کا اندازہ کرتے ہیں۔ یہ ... شیام بازار نہیں ہے، یہ قدیم گنگا کے پرانے خاندان کا شہر ہے، یا ان مقدس مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ یہاں تو ایسے کرایہ دار کے آنے کی بات نہیں تھی، اس طرف برٹش ... روڈ، اس طرف لینڈس ڈاؤن روڈ اور اس ... روڈ ... اسٹریٹ ـــ وہ سب متمول لوگوں کا علاقہ تھا۔ ... کے سبھی بنگالی اسی طرف بستے تھے۔ اس ... ایک ہی ... گلی میں آگیا تھا۔

اس نے پھر ایک بار آواز دی ـــ "الو!" ـــ

کسی ... بھی ... وہ پوچھ سکا، ان اس وقت وہاں ... رہی تھی۔

... پاؤں کے ... کے کمرے میں آ رہا تھا کہ اتنے میں اسے ... کی آواز سنائی دی۔ ... کے قدم رک گئے! پھر آہستہ آہستہ اندھیرے میں چلا گیا اور دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ بڑے آدمیوں کا چہرہ ہی مختلف ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے؟ ان کے گھر میں بھی اسی کا ہم عمر کوئی لڑکا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا، اس کے ساتھ ایک ہی کلاس میں وہ پڑھتا! یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے؟

یکایک اسے محسوس ہوا جیسے گھنگھرو کی آواز رک گئی ہو۔

آواز کیوں رک گئی؟

وہ چپکے سے کھڑکی کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا، پھر اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا اور اس کے بعد اندر جھانک کر دیکھا۔

"کون ہے؟ کون چھپ کے وہاں پر؟"

چونکہ وہ بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آدمی نے آکر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ... نے اندھیرے میں بھی پہچان لیا، یہ ... ہی ... تھا۔

ملازم اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کوٹھی کے دروازے سے اندر کمرے میں لے گیا۔ ... نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش ... ـــ "مجھے تم نے کیوں پکڑ رکھا ہے؟ واہ رے! میں نے کیا کیا ہے؟"

ملازم نے جھڑک کر کہا — چل چور! دروازے سے جھانک کر دیکھ رہے تھے —

دیپک نے کہا — غلط ہے، میں کیا صرف دیکھ رہا تھا، میں کوئی چوری کر رہا تھا —

اندر سے کسی کی آواز سنائی دی — کون ہے؟ پکڑ کر لے آؤ، اس کو قریب پاس لے آؤ۔ ملازم نے اسے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا۔
دیپک کو بہت خوف محسوس ہوا۔ اس نے ملازم کا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن ملازم کے جسم میں بڑی طاقت تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ رکھا تھا۔

یہ لڑکا — دروازے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا جی۔ دیکھو دیدی لڑکی یہ جانا نہیں چاہتا۔

اندر سے دیدی لڑکی کی آواز آئی — چھوڑ کر میرے پاس لے آؤ۔

ملازم نے دیپک کا ہاتھ کھینچا۔ سامنے جو برآمدہ تھا اس کے بعد دروازے کے بعد زینہ تھا اور پھر بیٹھنے کے سامنے ہی کمرہ تھا۔ کمرے کے اندر تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک قیمتی پردہ لٹکا ہوا تھا۔ کمرے میں چاروں طرف قیمتی پردے لٹک رہے تھے۔ ہاتھ پکڑے ہوئے ملازم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی نے کہا۔

"ارے، تم ہی ہو وہ! یہ تو ننھا سا ہے — کہاں رہتے ہو؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

دیپک کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے — "میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مجھے خواہ مخواہ پکڑ کر لایا ہے۔"

دیپک نے چپکے سے اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شاید کاجل کی دھاریاں تھیں۔ اس وقت کالی کی طرح سب نظر نہیں آیا تھا۔ نہانے کے بعد اس نے سلک کی ساڑی کو بڑی خوبصورتی سے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں کانوں میں دو جھمکے جھول رہے تھے۔

لڑکی اس کے اور بھی قریب آگئی — "کیا نام ہے تمہارا؟"

دیپک نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور چہرے سے یہ اندازہ کرنا چاہا کہ اسے کیا سزا مل سکتی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر کسی سزا کی جھلک نہیں تھی۔ اسے تسلی بھی نہیں ہو رہی تھی اور خوف بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

لڑکی نے پوچھا — "بتاؤ! تم اپنا نام بتاؤ، سچ سچ بتاؤ؟"

دیپک نے کہا — "اگر تم میری ماں سے کہہ دو —"

لڑکی مسکرا دی۔ اس کے دانت کتنے خوبصورت تھے! اسے مسکراتے دیکھ کر کچھ تسلی ہوئی۔

"میری ماں کو معلوم ہوگا تو میری ماں بہت خفا ہوگی۔" دیپک نے کہا — "میں اب ایسا نہیں کروں گا، مجھے چھوڑ دو —"

"ہاں، میں تمہیں چھوڑ رہی ہوں۔ ملازم تم باہر جاؤ تو۔"

ملازم باہر چلا گیا۔ اب کمرے میں لڑکی اور دیپک رہ گئے۔

لڑکی نے کہا — "بتاؤ، تمہاری ماں سے نہیں کہوں گی۔ تمہارا نام کیا ہے؟ کہاں رہتے ہو؟ جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے؟"

دیپک نے [illegible] ۔۔۔ میں کتابیں بیٹھی تم کو دیکھ رہا تھا اور کسی کو نہیں دیکھ
دی [illegible] ۔۔۔ [illegible] کا نخرہ بھی خوب ہے، مجھے دیکھ رہے تھے میرے اندر
دیکھ رہے کیا بات ہے [illegible] دیکھ رہے تھے میں پھر بھلا [illegible] ۔۔۔

دیپک نے کہا ۔۔۔ میں نے خواب دیکھا تھا، اسی لیے ۔۔۔

خواب؟ کیسا خواب؟ میرا خواب دیکھ رہے تھے؟

دیپک کو اب بیتے ہوئے دنوں کی باتیں یاد کر کے ہنسی آ گئی تھی۔ بچپن میں دیپک واقعی بہت بے وقوف تھا، اس کے علاوہ [illegible] میں ملی ودیدی کی ایسی لڑکی تو اس وقت تک اس نے نہیں دیکھی تھی۔ ایشور گنگولی لین کے آس پاس جتنی لڑکیاں بھی رہتی تھیں ان میں سے ایک بھی ملی ودیدی جیسی نہیں تھی۔ دوسری لڑکیاں جس طرح کپڑے پہنتی تھیں، ملی ودیدی اس طرح کپڑے نہیں پہنتی تھی، وہ [illegible] سے گھٹنوں تک اگر ساڑی کو جسم کے گرد لپیٹتی تھی کہ نظر میں بہت بھلی لگتی تھی!

ملی ودیدی نے پوچھا ۔۔۔ تمہارا گھر کہاں ہے؟

دیپک نے جواب دیا ۔۔۔ یہیں اگھور دادا کے مکان میں رہتا ہوں ۔۔۔ پرسوں میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ کوئی پاؤں میں گھنگھرو باندھ کر ناچ رہا ہے، اس کے بعد میں نے جھانک کر دیکھا تو ایک بھالو پاؤں میں گھنگھرو باندھے ناچ رہا تھا ۔۔۔

ملی ودیدی ہنستے ہوئے تم نے بھالو کو خواب میں کیوں دیکھا؟ میں بھالو ہوں؟

اتنا کہہ کر ملی ودیدی ہنسنے لگی۔

دیپک نے کہا ۔۔۔ نہیں، پنڈت جی نے کہا تھا، بڑے ہو کر جب تم لوگ کتابیں پڑھو گے تو سب کچھ تمہاری سمجھ میں آئے گا، خواب کے بھی بہت سے معنی ہوتے ہیں۔

پنڈت جی کون ہیں؟

دیپک نے کہا ۔۔۔ ہمارے دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں، انھوں نے کہا تھا، جو لوگ بڑے ہوتے ہیں، ان لوگوں کے خواب سچ ہوتے ہیں، میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ میرا خواب بھی سچا ہے یا نہیں۔

اس کے بعد قصہ ختم کر کے بولا ۔۔۔ مجھے چھوڑ دو، میں پھر کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

ملی ودیدی نے کہا ۔۔۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑوں گی ۔۔۔

اس کے بعد آواز دی ۔۔۔ راگھو ۔۔۔

راگھو کے آتے ہی ملی ودیدی نے کہا ۔۔۔ دیکھو تو راگھو، کاکا بابو دفتر سے آ گئے ہیں یا نہیں؟

کاکا بابو کون ہیں، کاکا بابو کیسے آدمی ہیں اس وقت دیپک کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا، لیکن اس وقت اسے ایسا لگا جیسے وہ [illegible]۔

[illegible]

[illegible]

لڑکی نے کہا — [illegible]

ریکھا نے کہا — میرا انتظار ہوگا۔

لڑکی نے کہا — خود ہی [illegible] ہوگی — [illegible] ہوگی۔

اتنا کہہ کر اس کا ہاتھ کھینچتی ہوئی اندر کے دروازے [illegible]

ہوا تھا اور کرسی کے سامنے ایک پردہ لٹکا ہوا تھا۔

لڑکی نے زور سے مخاطب کرتے ہوئے کہا — کالا بابو!

اندر سے آواز آئی — کیا ہے منی — کیا ہوا؟

لڑکی نے کہا — دیکھیے کالا بابو، [illegible] دیکھیے —

اتنا کہہ کر لڑکی ریکھا کو کھینچ کر کمرے کے اندر لے گئی۔

ہل — یہ دیکھیے، [illegible] بہت [illegible] دیکھیے —

اتنا کہہ کر اس کو زبردستی گھسیٹ کر کالا بابو کے سامنے لے گئی۔

ریکھا نے دیکھا — ایک صاحب میز کے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کے قریب ہی ایک ستار بھی رکھی ہوئی تھیں۔

کالا بابو نے کہا — چھوڑ دو، چھوڑ دو، چھوڑ دو منی — آ، اس کو تکلیف ہوگی —

منی دیدی نے چھوڑ دیا اور بولی — کتنا بدمعاش لڑکا ہے، جانتے ہیں کالا بابو! مجھے پھاڑ کھا رہا تھا۔

کالا بابو نے کہا — کیا، تم اسے پھاڑ کر رہے تھے؟ منی دیدی کو تم نے پھاڑ کھایا ہے؟

شاید بولیں — وہاں کیا ہوگا، میں نے اسی وقت تم سے کہا تھا، اتنا [illegible] مشہور ہوتے ہوئے تم نے اس محلے میں کیا یہ کام کیا —

کالا بابو نے ریکھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا — تم نے منی کو پھاڑ کھایا ہے؟

"میں نے پھاڑ کھایا نہیں ہے۔" ریکھا نے جواب دیا — "میں نے کب تم کو پھاڑ کھایا ہے، [illegible]!"

کالا بابو نے کہا — پھر تم جھانک کر کیا دیکھ رہے تھے؟

اتنی دیر میں منی دیدی ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گئیں۔ ریکھا نے چاروں طرف تعجب سے دیکھا، کتنی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا، اس سے پہلے جو کالا بابو [illegible] تھے، وہ کبھی اس طرح کمرے کو سجا کر نہیں رکھتے تھے!

منی دیدی نے کہا — میں نے کل ہی گھر سے کہہ دیا تھا کالا بابو کہ آج وہ بالکل تیار رہے — اور میں نے

ٹیک سی رہا تھا ۔۔۔ اور پھر چلا گیا ۔

کالا باؤ یہ دیکھ کر ڈر سے سُن ہو گئے، وہ دہشت سے ایک جگہ کھڑے رہ گئے۔

کالا باؤ کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا تھا ۔۔۔ یہی نے اس وقت کر دیا تھا، اس محلے میں ملاقات کر ۔۔۔

تم نے زبردستی ملاقات ۔۔۔

دیپک نے کہا ۔۔۔ مجھے چھوڑ دیجیے، میں پھر کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا ۔

کالا باؤ نے کہا ۔۔۔ علاوہ اسے، میں تمھیں پیٹ رہا ہوں یا تمھیں پکڑ رکھا ہے جو تم اس طرح کر رہے ہو، تمھارا نام کیا ہے ؟

"میرا نام دیپک سنگھ ہے: دیپک نے جواب دیا ۔۔۔ "میں انگوٹھے والے کے اسی مکان میں رہتا ہوں ۔"

"اور، انگوٹھے والے صاحب، وہ تمھارے کون ہوتے ہیں ؟"

"میرے کوئی نہیں لگتے، وہ ہمارے ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں، انھوں نے ہی مجھے اور میری ماں کو رہنے کے لیے اپنے گھر میں جگہ دی ہے، مجھ کو کھانے پہننے کو دے دیتے ہیں، مجھے بہت مانتے ہیں ۔"

کالا باؤ نے کہا ۔۔۔ "بہت اچھی بات ہے، میں نے سنا تھا بہت کنجوس آدمی ہیں، خیر جو بھی ہو، تم ہر روز کیوں جھانک کر دیکھتے تھے ؟"

دیپک نے کہا ۔۔۔ "میں نے پرسوں ایک خواب دیکھا تھا کہ میرے گھر کے پاس کوئی ناچ رہا ہے، چھم چھم چھم چھم گھنگرو بج رہا ہے۔ اس کے بعد کل جب اسکول گیا تو پرانا دوست بارہ، ہمارے پنڈت ماسٹر نے پوچھا، کس نے کون سا خواب دیکھا ہے، میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ ان کو سنا دیا ۔۔۔"

"اس کے بعد تم جھانک کیوں گئے، بولو ؟"

"وہ خواب سناؤں گا تو آپ لوگ خفا ہوں گے ۔"

کالا باؤ نے کہا ۔۔۔ "نہیں، خفا کیوں ہوں گا، بولو کیا خواب دیکھا تھا ؟"

دیپک نے کہا ۔۔۔ "گھنگرو کی آواز سن کر میرا جی چاہا کہ جا کر دیکھوں کون ناچ رہا ہے۔ اس کے بعد میں گھر سے نکل کر گلی میں آیا، گلی پار کر کے آپ کے مکان کے سامنے آیا، وہاں آکر دیکھا کہ بالائی منزل کے ایک کمرے سے گھنگرو کی آواز سنائی دے رہی ہے، میرا جی چاہا کہ جھانک کر دیکھوں، کون ناچ رہا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کھڑکی کا پٹ کھول کر اندر دیکھا ۔۔۔"

"بولو، جھانک کیوں گئے، پھر کیا دیکھا ؟"

دیپک نے کہا ۔۔۔ "میں نے دیکھا کہ ایک بھالو ۔۔۔"

"بھالو، بھالو ناچ رہا ہے ؟"

ابھی دست ہو کر کے بیٹھے ۔ وہ [illegible]

[illegible] — کیا کہتے ہو! ملو تمہیں [illegible]

خاندانی بیٹھتے بیٹھتے ہیں — اماں کیا ہوگا، ایسا خوبصورت [illegible]

دینکر نے کہا — وہ تو خواب تھا، خواب کیا سچ ہوتا ہے! خواب سچے ہوتے ہیں یا نہیں ہم دیکھتے ہیں، جاگ کر دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا، یہاں [illegible] — جو [illegible] ہیں ان کے خواب سچے ہوتے ہیں، میں تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"

کاکا بابو نے کہا — "دل لگا کر پڑھو۔ تم اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟"

"میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔" دینکر نے جواب دیا۔

"واہ، تمہیں گھر پر کون پڑھاتا ہے؟"

"میں خود پڑھتا ہوں۔" دینکر نے جواب دیا — "حساب کبھی کبھی بابا بتا دیتے ہیں، کیونکہ بابا بہت اچھا حساب جانتے ہیں —"

"تو تم صرف حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو — ملو تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، ملو بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔"

ملو دیدی نے کہا — "واہ رے، کاکا بابو آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سنگیت ہے، رقص ہے —"

"کوئی بات نہیں" کاکا بابو نے کہا — "غریب لڑکا ہے، ذرا سا بتا دو گی تو کیا ہوگا۔"

دینکر کی بپتا ایک بہت بڑھ گئی۔ اس نے کہا — "گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے بابا کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں انگور دادا کا کھانا پکاتی ہے، اگر انگور دادا ہم لوگوں کو پناہ نہ دیتے تو سب مر گئے ہوتے۔"

کاکا بابو نے کہا — "ٹھیک ہے، تم آ جایا کرو، ملو تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"

ملو دیدی نے کہا — "مگر میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کاکا بابو۔"

انھوں نے کہا — "سنی تو کلکتہ آ رہی ہے، سنی کے آنے کے بعد اسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہوگا، اسی کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی —"

دینکر نے کہا — "انگریزی بڑی مشکل ہے، حساب میں کر لوں گا، بابا سے سیکھ لیا تھا۔"

انھوں نے کہا — "انگریزی، حساب اور بنگالی سب کچھ تمہیں ملو پڑھا دیا کرے گی، ملو بہت اچھی [illegible] جانتی ہے، وہ تمہیں بھی پڑھا سکتی ہے — کیوں ملو؟ اور اگر اس مرتبہ دس روپیہ اسکالرشپ ملے — تمہیں معلوم ہے ملو،

تھے ۔ بالکل ایسے ہی، دیپکر کی بہن شیلا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں، ہم من سے لگتا ہے دوستی کر کے بیٹھی رہے ہیں، دونوں بہنیں ایک ساتھ پڑھیں گی۔"

گڈی دیدی نے کہا ـــــ "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہو گی وہ میں جانتی ہوں، سنی کو تو آپ نے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔"

خالہ نے کہا ـــــ "سمجھا ہے، میں نے سنی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمہاری ہی طرح گوری تھی، ہے نا؟"

گڈی دیدی نے کہا ـــــ "وہ بچی تھی اب ایسی ہو گئی ہے کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں ـــ اسی عمر میں میرے برابر ہو گئی ہے۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

کاکی ماں نے پوچھا ـــــ "کیا ہے شاکر؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کھانا تیار ہے ماں جی۔" شاکر نے جواب دیا ـــــ "نکال دوں؟"

کاکی ماں نے کہا ـــــ "کیا کہتے ہو شاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتی ہوں بات ختم کر کے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہو، تھوڑی دیر بعد میں خبر دوں گی۔"

دیپکر نے کہا ـــــ "ماں کو فکر لگی ہو گی، میں جاتا ہوں۔"

کاکا بابو نے کہا ـــــ "جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جا کر ـــــ"

دیپکر کو عجیب سا احساس ہوا، یکایک احساسِ ممنونیت سے اس کا دل بھر آیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسی محبت، ایسی ہمدردی اسے زندگی میں کہیں سے نہ ملی ہو، اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور ان کے دونوں پاؤں کو چھو کر ان کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی، پھر اس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپکر کو اپنوں جیسے لگے تھے، دیپکر کو جیسی مسرت محسوس ہوئی تھی، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا، اس وقت انھوں نے اس طرح بے محبت کیوں جتائی تھی کون جانے؟ لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دنیا کو سمجھ سکتا؟ یا وہ اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے کچھ دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دوسرا مقصد ہے!

اور گڈی دیدی؟

واقعی گڈی دیدی آئی تھی اسی لیے تو سنی بھی آئی تھی!

اور سنی آئی تھی اسی لیے تو دیپکر اس حقیقت کو پا سکا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ

[illegible] بابو دور سے مُنہ بسور کر کے بیٹھ گئے۔ وہ خالہ کی بیٹی ایک [illegible]

کاکا بابو نے کہا ـــــ کیا کہتے ہو؟ لکھی تمہیں بھائی نظر آتی ہے؟"

خالہ بھی ہنستے ہنستے بولیں ـــــ ارمان، کیا ہوگا، ایسا خوبصورت چہرہ اللہ [illegible]

دیپنکر نے کہا ـــــ وہ تو خواب تھا، خواب کیا سچ ہوتا ہے؟ خواب سچے ہوتے ہیں؟ [illegible] تو آ رہی تھی کہ میں دیکھ رہا تھا، دیکھا کہ میرا خواب سچ نہیں تھا، یہاں تک کہ بابو نے کہا ہے ـــــ [illegible] کہ خواب سچے ہوتے ہیں تو غریب آدمی کا لڑکا ہوں، میرے خواب کس طرح سچے ہوں گے؟"

کاکا بابو نے کہا ـــــ دل لگا کر پڑھو۔ تم اس مرتبہ کلاس میں کیا ہوئے تھے؟"

"میں ہر مرتبہ فرسٹ ہوتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا۔

"واہ، ویری گڈ، کون پڑھاتا ہے تمہیں؟"

"میں خود پڑھتا ہوں۔" دیپنکر نے جواب دیا ـــــ حساب کرن کے بابا سمجھا دیتے ہیں، کرن کے بابا بہت اچھی طرح جانتے ہیں ـــــ"

"وہ تم لکھی سے حساب اور انگریزی پڑھ سکتے ہو ـــــ بیٹے، لکھی تمہیں بہت اچھی انگریزی سکھا دے گی، لکھی بہت اچھی انگریزی جانتی ہے۔"

لکھی دیدی نے کہا ـــــ واہ رے۔ کاکا بابو آپ بھی کیا اچھے آدمی ہیں، میرے پاس وقت کہاں ہے، مجھے تو خود اپنے پڑھنے کے لیے وقت نہیں ملتا، اس کے علاوہ سلائی ہے، رقص ہے ـــــ"

"کوئی بات نہیں: کاکا بابو نے کہا ـــــ غریب لڑکا ہے، ذرا سا پڑھا دو گی تو کیا ہوگا؟"

دیپنکر کی ہمت ایک دم بڑھ گئی۔ اس نے کہا ـــــ گاؤں میں پہلے ہم لوگوں کی حالت بہت اچھی تھی، میرے بابو کو [illegible] نے قتل کر دیا تھا اسی وقت سے میری ماں مجھے لے کر کلکتہ چلی آئی تھی، ماں اگھور دادو کا کھانا پکاتی ہے، اگر اگھور دادو [illegible] پناہ نہ دیتے تو سب بھوکے مر گئے ہوتے۔"

کاکا بابو نے کہا ـــــ ٹھیک ہے، تم آ جایا کرو لکھی تمہیں پڑھا دیا کرے گی۔"

لکھی دیدی نے کہا ـــــ مگر میری اپنی پڑھائی نہیں ہو سکے گی کاکا بابو۔"

انھوں نے کہا ـــــ ستی تو کلکتہ آ رہی ہے، ستی کے آنے کے بعد اُسے بھی تو تمہیں پڑھانا ہوگا، اسی کے ساتھ اسے بھی پڑھا دو گی ـــــ"

دیپنکر نے کہا ـــــ انگریزی ہی مشکل ہے، حساب میں کرن کے بابا سے سیکھ لوں گا۔"

انھوں نے کہا ـــــ انگریزی، حساب اور جغرافیہ سب کچھ تمہیں لکھی پڑھا دیا کرے گی، لکھی بہت اچھی طرح [illegible] جانتی ہو، وہ مجھے بھی پڑھا سکتی ہے ـــــ کیوں لکھی؟ اس کو اس مرتبہ دس روپیہ اسکالر شپ ملا ہے ـــــ تمہیں معلوم ہے کہ

تم سے بابا تمھارے رزلٹ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے دوستی کو بھی یہیں بھیج رہے ہیں، دونوں بہنیں ایک ساتھ پڑھیں گی۔"

ممی دیدی نے کہا —— "ایک ساتھ رہ کر جو پڑھائی ہوگی وہ میں جانتی ہوں، دوستی کو تو آپ نے دیکھا نہیں ہے کاکا بابو۔"

خاتون نے کہا —— "مجھے یاد ہے، میں نے دوستی کو چھوٹی سی عمر میں دیکھا تھا، تمھاری ہی طرح گوری تھی، ہے نا؟"

ممی دیدی نے کہا —— "وہی دوستی اب ایسی ہو گئی ہے نا کہ دیکھ کر آپ پہچان نہ سکیں گی کاکی ماں —— اسی عمر میں میرے برابر ہو گئی ہے۔"

اتنے میں ایک ملازم دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

کاکی ماں نے پوچھا —— "کیا ہے ٹھاکر؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"کھانا تیار ہے ماں:" ٹھاکر نے جواب دیا —— "نکال دوں؟"

کاکی ماں نے کہا —— "کیا کہتے ہو ٹھاکر، ابھی تو چائے پی ہے، ابھی کھاؤں گی؟ تم تو دیکھتی ہوں بات نکال کر کے رہائی حاصل کرتے ہو، تھوڑی دیر بعد تمھیں خبر دوں گی۔"

دیپکر نے کہا —— "ماں کو فکر لگی ہوگی، میں جاتا ہوں۔"

کاکا بابو نے کہا —— "جاؤ، رات بڑھ رہی ہے، پڑھو لکھو جا کر ——"

دیپکر کو عجیب سا احساس ہوا، یکایک احساسِ ممنونیت سے اس کا دل بھر آیا، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ایسا پیار، ایسی شفقت ایسی ہمدردی اسے زندگی میں کبھی سے نہ ملی ہو۔ اچانک وہ کاکا بابو کے قدموں میں جھک گیا اور ان کے دونوں پاؤں کو چھو کر ان کے قدموں کی خاک سر پر رکھ لی، پھر اس نے کاکی ماں کو بھی پرنام کیا۔

اتنے دنوں کے بعد اب جب کبھی اسے بیتے دنوں کی یاد آتی ہے تو حیرت ہوتی ہے، ان لوگوں کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہ تھا، ان کے ساتھ کبھی کوئی سروکار بھی نہیں رہا تھا، اس نے کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس روز وہ دیپکر کو اپنوں جیسے لگے تھے۔ دیپکر کو بڑی مسرت محسوس ہوئی تھی، وہ صرف اچھے ہی نہیں لگے تھے، صرف پیار کی پناہ ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس دن اسی معمولی سے واقعہ کو مرکز بنا کر ان کے ساتھ وہ متعارف ہوا تھا جب دوسروں کے رحم و کرم پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ اس وقت انھوں نے اس طرح بلا تحقیق کیوں جتائی تھی کون جانے، لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وہ اس طرح زندگی کا روپ دیکھ سکتا؟ اس طرح دنیا کو سمجھ سکتا؟ اور اس طرح حقیقت معلوم کر سکتا کہ زندگی صرف زندگی ہی نہیں ہے، دکھ صرف دکھ ہی نہیں ہے، خوشی صرف خوشی نہیں ہے، زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ تشریح ہے اور خوشی کا بھی ایک دوسرا مقصد ہے!

اور ممی دیدی؟

واقعی ممی دیدی آئی تھی اسی لیے تو دوستی بھی آئی تھی!

اور دوستی آئی تھی اسی لیے تو دیپکر اس حقیقت کو پا سکا تھا کہ زندگی کے بھی دوسرے معنی ہوتے ہیں، دکھ کی بھی ایک الگ

اور روشنی کا بھی ایک دوسرا تصور ہے

کمرے سے نکل کر دیپکر زینے سے نیچے اتر رہا تھا۔ پچھلے سال پردادی کے آنے کے بعد دیپکر دیکھ رہا تھا کہ مکان کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ مدھو آنٹی ساری تبدیلیاں کر چکی تھیں! باہر سے اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ان لوگوں نے ایک چھت میں، کمرے وغیرہ کے علاوہ پورا کچھ بدل دیا تھا۔ پھر ان لوگوں نے چھلے کے کاسے قرینے سے سجا دیا تھا۔ ہر دروازے پر ایک پردہ، ڈالا ہوا تھا۔ کرسی، میز، کرسی، صوفہ، الماری اور آئینہ۔ کمرے میں کہیں پر جگہ نہ تھی۔ دیپکر آہستہ آہستہ زینے سے نیچے اتر گیا! ماں شاید پریشان ہو رہی ہو گی، شاید ڈھونڈ بھی رہی ہو کر دیپک کہاں چلا گیا۔

زینے سے نیچے اترتے ہی کسی نے اسے پکارا۔

"اے چھوکرا سن۔"

دیپکر نے پلٹ کر دیکھا، وہ لڑکی تھی منکی!

اس نے پوچھا ——— مجھے پکار رہی ہو؟"

لڑکی زینے پر بیٹھی تھی جو تیزی سے نیچے آئی اور اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔

دیپکر لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر چونک اٹھا، اتنی دیر تک اس کی آنکھوں کا رنگ ایسا تو نہ تھا۔

اس نے پوچھا ——— تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے کہا ——— اگر پھر کبھی تم میرے یہاں آئے تو تمہاری ٹانگ توڑ دوں گی۔"

"واہ رے، میں نے کیا کیا ہے؟"

یکایک لڑکی نے اس کا کان پکڑ کر کھینچا ——— "بحث کرتے ہو؟"

اس نے خوب زور سے کان کھینچ دیا۔

دیپکر نے کہا ——— میں بحث تو نہیں کرتا۔"

"پھر بحث، تم اس مکان میں نہیں آ سکتے، میں نے کہہ دیا۔"

دیپکر نے کہا ——— لیکن کاکا بابو نے ہی آنے کو کہا ہے۔"

"کاکا بابو کو کہنے دو، میں کہتی ہوں تم نہیں آؤ گے۔"

دیپکر لڑکی کے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔

اس نے کہا ——— "اچھا، نہیں آؤں گا۔"

"ہاں، نہیں آنا!"

اتنا کہہ کر اس نے دیپکر کو دھکیل دیا، اور دیپکر دھکا کھا کر زینے کے نیچے گر پڑا۔ گرتے ہی اسے سر میں چوٹ لگی، وہ ڈر کر ہو گیا، دیکھا وہ لڑکی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس نے فوراً کہا ——— "میں نہیں آؤں گا، میں وعدہ کرتا ہوں کبھی دیدی، پھر کبھی نہیں آؤں گا۔"

لڑکی ایک لمحہ رکی، پھر قریب آکر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

بولی ——— "چوٹ لگی ہے؟ ڈر سے کانپ گیا ارے؟"

دیچکپنے کہا ——— "تم نے مجھے کیوں دھکیل دیا؟ میں نے تمہارا کیا کیا تھا جو تم نے مجھے دھکیل دیا؟"

لڑکی نے جواب دیا ——— "یونہی، میں دیکھ رہی تھی کہ تم ڈرتے ہو یا نہیں۔"

دیچکپنے کہا ——— "اب میں تمہارے یہاں نہیں آؤں گا، کاکا بلائیں گے تو بھی نہیں آؤں گا، مجھے چھوڑ دو۔"

لڑکی ایک لمحہ اسے پیار کرنے لگی، بولی ——— "نہیں رے، میں دیکھ رہی تھی، تم ڈرتے ہو یا نہیں، تم کل پھر آنا، مجھے ڈر نہ ہو، ضرور آنا۔"

اتنا کہہ کر وہ دیدی چلی گئی اور دیچکپ حیرت سے بڑی دیر تک خاموش کھڑا اس کی ملکانے اسی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد آہستہ آہستہ گھر کے دروازے کے راستے آنگن میں آ گیا۔ اس کا سر ابھی تک درد کر رہا تھا۔

گرو نے پوچھا ——— "اس کے بعد کل تم کہاں چلے گئے تھے؟ میں دیر تک ڈھونڈتا رہا ———"

"میں حاجی قاسم کے بازار کی طرف بھاگ گیا تھا" ——— دیچکپنے جواب دیا ——— "اس کے بعد آنگن کا رنگ تالاب کا چکر لگا کر سلطان کی عمارت کے قریب سے ہوتے ہوئے شیخ توکی کے راستے گھر چلا گیا تھا۔"

واقعی ان دنوں کا بالی گنج اب پہچانا نہیں جاتا۔ اس وقت اس بہاری ایونیو کے موڑ پر حاجی قاسم کا بازار تھا، اس کے بعد اسی راستے جنوب مشرق کی طرف چلنے پر ٹیپو سلطان کی قدیم عمارت تھی، اب قطار در قطار دکانیں ہو گئی ہیں۔ دن رات ٹرامیں اور بسیں بھاگتی دوڑتی رہتی ہیں، لیکن اس وقت، اس وقت کا ان کا ماحول ایسا نہیں تھا، بالی گنج بھی آج کے جیسا نہیں تھا۔ ٹیپو سلطان کی عظیم الشان عمارت اس موڑ سے دور کیکاری کا سب کچھ پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کے سکوں کی طرح دکھائی دیتی۔ عمارت کے سامنے بڑے بڑے برگد کے پیڑ اُگ آئے تھے۔ بیسے دوپہر کے وقت بھی اجاڑ اُجاڑ سی دکھائی دیتی۔ وہاں پر جاتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا، بلکہ دوپہر کے وقت ہوا کے جھونکے کھا کر پھڑکتے پتے مجموم اُٹھتے اور چاروں طرف پُر اسرار سی آواز پھیل جاتی اور کبھی کبھی کوئی خطرناک سانپ زور زور سے پھنکار… اس وقت سارے محلے میں ایک عجیب سا خوف طاری ہو جاتا۔ اس موڑ کے مغربی جنوبی کونے پر مچھ… پڑا تھا، ٹکٹ بنانے والے بھی پر بیٹھے [redacted] کے تختوں پر بچھے بکسانے کے لیے رکھ دیتے، اس کے شمال جانب آشوتوش کی سرسوں کے تیل کی دکان … دوپہر کے وقت کتنی ہی بار اس نے اس دکان سے تیل خریدنے کے لیے اُسے بھیجا تھا، دیچکپ وہاں جا کر کولھو پر بیٹھ جاتا تھا کولھو چلتا تھا، کولھو میں جتے ہوئے بیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی رہتی اور وہ دن رات مسلسل کولھو کے گرد چکر کاٹتا رہتا۔ دیچکپ دو دو گھنٹے کولھو پر بیٹھا رہتا تھا، اس وقت تک اُسے یاد بھی نہیں رہتا کہ اُسے سرسوں کا تیل خریدنا ہے اور جب وہ تیل لے کر … اُسے ماں کی کتنی ہی ڈانٹ کھانی پڑتی، اور اسی آشوتوش کی دکان کی شمال جانب حاجی قاسم کی بڑی سی عمارت تھی اور اس عمارت

پیچھے ایک بہت بڑا باغ تھا، دیکھنے کتنی ہی بار باغ کے اندر جھانک کر دیکھا تھا، باغ میں بہت سے سانپ [illegible]
کی چڑیاں تھیں، وہ سب کہاں چلے گئے، جب اس باغ کو کاٹ کر سارا میدان بنا دیا گیا تو وہ باغ ختم ہوگیا، اس پاس [illegible]
مکان بن گئے اور محلے کی حیثیت ہی بدل گئی، اس طرف اس کا بہت برا اثر پڑا، اب سبھی آتے [illegible] کے [illegible]
پیڑوں کے ساتھ ساتھ دھان کی بالیاں جھومتی لہراتی رہتیں اور دیکھو کیا ایک یہ احساس ہوا کر وہ ہمیشہ [illegible] سے بہت [illegible]
[illegible] اس دن کیا صرف دھان کا کھیت ہی تھا، صرف پیڑ شعلوں کی حالت ہی تھی، صرف [illegible] پڑا، صرف [illegible]
اس وقت دیکھو کی کتنی بڑی دنیا تھی، اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جوان ہوتے ہوتے دنیا سمٹ کر چھوٹی ہوگئی ہو، اب
وہ طلسمی باغ کہاں چلا گیا، کس کے ساتھ کتنی ہی بار وہ اس باغ میں جا چکا تھا، وہ کس کا باغ تھا، اس کا کون مالک تھا، وہ کچھ بھی
نہیں جانتا تھا، وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ اس باغ کے درمیان ایک تالاب تھا اور تالاب کے کنارے ایک [illegible]
پیڑ تھا، [illegible] سے پھل لگتے تھے، سیندور کی طرح لال لال اور گودے ایسا میٹھا ہوتا تھا، اس باغ کے بعد ہی ریلوے لائن کا
باغ تھا، اس باغ میں ایک بیچ کا پیڑ تھا، بڑی بڑی بیچیں پک کر جھڑتی رہتی، کتنی ہی بار اس نے بیچ کے پیڑ پر چڑھ کر بیچ کھاتے
ہوئے دور تک نظر دوڑا کر دیکھا تھا، کہیں سے ریل گاڑی کی آواز سنائی دیتی —— کو او —— او —— او —— چھک چھک
چھک چھک، وہ آواز بھری وہ پہر ہی کتنی میٹھی معلوم ہوتی تھی، بچے بھی ہوئے جرود اور بیچ ہوئی بیچ سے بھی زیادہ وہ آواز میٹھی معلوم
ہوتی، اس وقت اسے کیا معلوم تھا کہ ایک روز اس کی زندگی بھی ریل ہی سے وابستہ ہو جائے گی اور اسی ریل کی ایک سیٹی لڑکپن
میں اس کی زندگی کی ریل گاڑی اس طرح دوڑاتی ہوئی آ جائے گی اور یہی ریل گاڑی ایک دن اس کی زندگی کے تمام مسائل کو حل کرے
گی ——

ایک روز دیکھو کالی گھاٹ اسکول کے انفینٹ کلاس میں بھرتی ہوا تھا۔
یہ اسکول میں اس کا پہلا واقعہ تھا، زندگی میں پہلی بار وہ اس اسکول میں گیا تھا اور ایک روز نارنگی اور مٹھائی لے کر وہ اس
اسکول سے چلا آیا تھا، جیسے یہ روزیہ جیک ہاکر دوسرے اسکول میں چلا گیا تھا، اسے بہت دنوں تک یہ واقعہ یاد رہا تھا، وہ محسن چندر
سرکار، وہ جاڑا دو چندر دھر، وہ بہاں چاند مترا اور دوکرن کار رشی یار دھیاتے، وہ نرل پست، اور وہ دیکھو سین جس کا والد نمبرپلیٹ
میں تھا، یہ سبھی کالی گھاٹ اسکول میں پڑھتے تھے، اس کے بعد مترشے دار ان کے بعد ہی دھرم دار س ٹرسٹ ماڈل اسکول اپیل بیٹھا
اسٹریٹ میں داخل ہو گیا۔

ماں نے کہا ——— وہ اسکول بہت دور ہے، تجھے میں قریب ہی اسکول میں داخل کرا دوں گی:
دھرم دار س ٹرسٹ ماڈل اسکول میں جانے ہوئے دیکھو کو ایسا برا نہیں لگا تھا، اس کے ساتھ کا کرنا جب نئے اسکول میں آیا
تھا، تبھی ہی تو کر محسن چندر سرکار پرانے ہی اسکول میں رہ گیا، وہ نئے اسکول میں نہیں آیا تھا، راستے میں محسن کو دیکھتے ہی اسے خوف
محسوس ہوتا تھا کوئی بات چیت کیے بغیر دیکھو کو دیکھتے ہی محسن اس کے سر پر چپت مار دیتا۔
کبھی ایسا ہوتا کہ دیکھو راستے پر چلا جا رہا ہے یکایک غلط سمت سے محسن آ جاتا دکھائی دیتا۔

مکھن کی نگاہ سے بچنے کے لیے دیپکر راستے کے بالکل کنارے کنارے چلنے لگا لیکن اتنی ہی دیر میں مکھن اس کے بالکل قریب پہنچ جاتا۔

آتے ہی کہتا ــــ "کیا رے، کہاں جا رہا ہے؟"

اور کہتے کہتے اس کے سر پر ایک چپت رسید کر دیتا اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

کبھی کبھی دیپکر رو دیتا تھا، اپنے آنسو پونچھتے ہوئے وہ سوچتا اس کے سر پر چپت کیوں مارتا تھا؟ دیپکر نے کیا کیا تھا؟ ہزار سوچنے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مکھن اس سے اتنا خفا کیوں تھا؟ کتنی ہی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے لیکن وہ رو بھی نہیں سکتا تھا، اس اگر دریافت کرے کہ اسے کس لیے مارا ہے، کیوں مارا ہے؟ تو دیپکر کیا جواب دے اور کبھی کبھی اس کے جی میں آتا کہ شاید اس کے سر کے بال ترشے ہوئے نہیں ہیں اسی لیے مکھن اسے چپت مارتا ہے یا پھر میلے کپڑوں کی وجہ سے مارتا ہے لیکن نہیں، جب اس کے بال ترشے ہوئے ہوتے، جب بھی مکھن چپت مارتا، دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتا، جب بھی مکھن چپت لگاتا، بعد میں اس نے سوچا تھا شاید اس کے سر پر چپت مار کر مکھن کو خوشی ہوتی ہے، وہ کسی خطا یا قصور کی بنا پر اس کے سر پر چپت نہیں لگاتا، اس کے بعد وہ اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوا تھا، کالج سے نکل کر ملازمت کی مگر پھر بھی اُسے مکھن سے کبھی رہائی نہ مل سکی، جیسے ساری دُنیا میں اس ایک شخص نے بہت سارے مکھن کا رُوپ دھار لیا ہو اور مختلف شکلوں میں پھیل گئے ہوں، جیسے مکھن کے ہاتھ سے انسان کو نجات حاصل کرنا مشکل تھا۔

اُس روز خیال بھنڈار لین کے نکڑ پر آتے ہی دیپکر نے دیکھا، مخالف سمت سے مکھن آ رہا تھا، سہ پہر ہو چکی تھی اور اس راستے پر نلکے سے پانی چھڑکا جا رہا تھا، مکھن کو دیکھتے ہی دیپکر کا دل خوف سے دھڑکنے لگا، اگر آج بھی مکھن اُس کو مارے!

دیپکر ایک طرف سرک گیا، لیکن پتہ نہیں مکھن کو کیا شرارت سوجھی کہ وہ اس کے مقابل آگیا۔

سامنے آتے ہی مکھن نے کہا ــــ "کیا رے، تو نے میرا اسکول کیوں چھوڑ دیا؟ میرے ڈر سے؟"

دیپکر نے کوئی جواب نہیں دیا، سہمی سہمی نظروں سے مکھن کی آنکھوں کی طرف دیکھنے لگا۔

مکھن کا دھیان اسی طرف تھا، اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی اس کے سر پر چپت رسید کر دی۔

روزانہ چپت کھا کھا کر دیپکر قدرے ڈھیٹ ہو گیا تھا۔

اُس نے کہا ــــ "تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے رے؟ تو مجھے ہر روز کیوں مارتا ہے؟ میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے، بول تو؟"

مکھن کو دیپکر سے اس احتجاج کی توقع نہ تھی، وہ غصہ سے تلملا اٹھا۔

بولا ــــ "میں ماروں گا، میری خوشی، ماروں گا، یہ لو پھر مارتا ہوں، تو کیا کرے گا؟"

اتنا کہہ کر اس نے سچ مچ پھر ایک چپت جڑ دی، اس مرتبہ اُس نے اور زور سے مارا۔

دیکھو ہوا وہ سے گیا تھا پھر ہوا سے سخت چوٹ لگی، اسے دھکا سا لگا اس کا سر چکرا رہا تھا۔

اس نے کہا ——— "میں کچھ نہیں کرتا اس لیے!"

ٹھسو اس کے اور بھی قریب آگیا ——— "دیکھتا ہوں تیری ہمت بہت بڑھ گئی ہے، بہت ہو گئی ہے نا ———"

اتنا کہہ کر اس نے پھر ایک چپت لگا دی اور اس کے بعد سر کے بال پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے

"ایک گھونسا دوں گا تیری ناک توڑ دوں گا، ساری شیخی نکال دوں گا۔"

"مادرے، میں نے تیرے ساتھ کب شیخی کی ہے؟ چھوڑ دے، تو مجھے مارتا ہے!"

اب ٹھسو نے اس کے سر پر گھونسے برسانے شروع کر دیے۔

"پھر، پھر شیخی! پھر شیخی کرے گا؟ پھر!"

ٹھسو ایک تجربہ کار اور ایک گھونسہ مار تھا۔ دیکھو کو سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں دے رہا تھا، دائیں، بائیں، سامنے، پیچھے ہر سمت سے وہ متواتر مارے جا رہا تھا۔ دیکھو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔

وہ مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا ——— "شیخی بگھارتے ہو تو، تجھے اس شیخی کا مزہ بھی چکھاتا ہوں۔"

اپنا سر بچانے کے لیے وہ جوں ہی پلٹا اس کا توازن بگڑ گیا اور وہ دھڑام سے سڑک پر گر پڑا۔ اب ٹھسو کو اور بھی آسانی ہو گئی۔ دیکھو کے گال پر، منہ پر، سر پر متواتر گھونسے، تھپڑ اور ٹھڈے پڑنے لگے۔ دیکھو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ زندہ نہیں بچے گا، جیسے ٹھسو اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اس کی جان لے کر ہی چھوڑے گا اور اگر اس دن ٹھسو کے ہاتھ سے اس کی جان نکل جاتی تو دنیا کی بہت ساری باتیں وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکتا، شاید اسے بہت سارے دردناک تجربات سے بھی نجات مل جاتی، بہت ساری تکلیفوں کے جھیلنے سے بچ جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو ستی کو کیسے دیکھ سکتا اور اگر ستی کو نہ دیکھ پاتا تو اس کی زندگی رائیگاں ہو جاتی۔

ٹھسو کی مار کھاتے کھاتے جب دیکھو بے دم ہو گیا تھا تو یکایک ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

اس نے کسی طرح نظریں اٹھا کر دیکھا، سامنے ٹھسو دیدی کھڑی تھی۔

اسکول کی گاڑی سے اتر کر ٹھسو دیدی گلی کے اندر جا رہی تھی کہ اس کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی تھی۔ اس نے آتے ہی ٹھسو کے سر کے بال پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی بغیر کچھ کہے سنے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا تھا۔

ٹھسو ایک دم گھبرا گیا تھا، تھپڑ کھاتے ہی وہ زمین پر لڑھک گیا لیکن ٹھسو دیدی پھر بھی چھوڑنے والی نہیں تھی، وہ ٹھسو کے گال پر، سر پر، پیٹھ پر دھڑا دھڑ تھپڑ مارنے لگی۔

"ابے سٹو پٹو، تو نے اسے کیوں مارا تھا؟ تو نے اسے کیوں مارا؟"

اس کے بعد پھر تھپڑ اور گھونسے سے اس کی مرمت کرنے لگی۔ ٹھسو دیدی بڑی طاقتور تھی۔ اس نے اپنی کمت ——

سڑک پر ڈال دیں اور اس کے بعد اچھی طرح کھمن کی مرمت کر دی۔ کھمن کی اس وقت عجیب حالت تھی، وہ نہ تو لکھی دیدی کو مار سکتا تھا اور نہ ان سے لڑ سکتا تھا۔ خلافِ توقع مار کھا کر جیسے وہ بوکھلا گیا تھا۔ اتنی دیر میں دھیکو اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دور سے اس حادثہ کو دیکھنے لگا۔ اس نے سوچا۔ ٹھیک ہوا، اچھا ہوا، اتنے دنوں کے بعد آج کھمن کی شکست ہوئی تھی۔ آج پہلی بار کھمن زیر ہوا تھا، جیسا اس کو مارتا تھا ویسا ہی سبق ملا ہے۔

دیر تک اس کی مرمت کرنے کے بعد لکھی دیدی نے کہا —— "اگر اب کبھی تو نے اسے مارا تو تیری آنکھ نکال لوں گی۔ موئے، بھاگ یہاں سے —— جا۔"

اتنی دیر میں دھیکو کی ہمت کافی بڑھ گئی۔

کھمن سہما سہما اٹھا اور جسم پر لپٹی ہوئی دھول جھاڑتا ہوا سیدھا مخالف سمت چلا گیا۔

اس کے بعد لکھی دیدی نے راستے پر پڑی ہوئی اپنی کتابیں اٹھا لیں۔

دھیکو نے قریب جا کر کہا —— "وہ مجھے ہر روز مارتا ہے لکھی دیدی، روز مجھے اسی طرح مارتا ہے، میں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑتا پھر بھی بلا وجہ مجھے مارتا ہے۔"

لکھی دیدی کا چہرہ غصہ سے تمتمایا ہوا تھا۔

دھیکو نے کہا —— "لکھی دیدی تم نے اچھا کیا جو اسے پیٹ دیا، مجھے بلا وجہ ہر روز مارتا ہے۔"

لکھی دیدی نے یکایک اس کا کان پکڑ کر اس کے سر پر کئی تھپڑ لگائے۔

"اسٹوپڈ کہیں کا، وہ تجھے ہر روز مارتا ہے اور تو چپکے سے مار کھا لیتا ہے؟ تو اسے پیٹ نہیں سکتا؟ تیرے بدن میں طاقت نہیں؟ اسٹوپڈ گدھا کہیں کا، احمق کی طرح مجھ سے کہتا ہے کہ وہ مجھے روز مارتا ہے —— میں تجھے بھی پیٹوں گی۔"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے اسے پیٹنا شروع کیا۔

دھیکو کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہ نکلے۔ اتنی دیر تک کھمن سے مار کھا کر جو کچھ نہیں ہوا تھا، لکھی دیدی کے ہاتھ سے مار کھا کر دھیکو کو اس سے زیادہ تکلیف ہوئی۔

دھیکو نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر کہا —— "اب مت مارو لکھی دیدی، اب ایسا نہیں کروں گا، اب ایسا نہیں کروں گا۔"

لکھی دیدی اس وقت اپنے آپے میں نہیں تھی، وہ اور بھی زور زور سے اس کے سر پر مارنے لگی —— "میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی، اسٹوپڈ کہیں کا، دوسروں کی مار کھا کر تمہیں صرف رونا آتا ہے، روتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی —— مرد بنا ہے ——"

اس کے بعد مکان کے قریب آ کر لکھی دیدی بولی —— "جاؤ، گھر جاؤ، پھر کبھی نہیں روؤ گے بچے، تم مرد ہو کس لیے ——"

اتنا کہہ کر اس نے دینکر کو دھکیل دیا اور چکرایا ہوا سا بھرتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

رات کے وقت جب وہ پڑھنے کے لیے بیٹھا تو اس کا دل پڑھائی میں بالکل ہی نہیں لگا۔ انگریزی دور کے ہندوستان سے متعلق تاریخ کی کتاب سامنے رکھے ہوئے وہ بڑی دیر تک پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی دونوں آنکھیں چند صفحہ بعد بھاری محسوس ہوئیں۔ اس نے سوچا، یہ لوگ اس محلے میں کیوں آگئے ہیں؟ یہ کرایہ دار یہاں کیوں آگئے؟ یہ لڑکی اسے مار ڈالتی ہے۔ اس سے پہلے جو کرایہ دار رہتے تھے وہ تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ چنرنی اور دوسروں کو گالی دیتی تھی، اچھا کرتی تھی۔ ان لوگوں کو بھی گالی دیتی تو اچھا ہوتا۔ یہ لوگ بھی اس مکان میں نہیں رہتے، یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جاتے۔ پہلے ہی چلے جاتے تو اچھا تھا۔ نیچے والی ہیں۔ اس طرح تو خود دینکر بھی ناچ سکتا ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اسی طرح ٹھمک ٹھمک کر کوئی ناچ سکتا ہے۔ ماں کا خواب ہی ٹھیک تھا ——— ہمارا خواب ہی صحیح تھا۔ یہ بھی ہماری ہی طرح ناچتی ہے۔ پکچروں میں بہت سے مدراسی ہمارا ناچ دکھانے آتے ہیں۔ مارن ڈانس کی بات ہے اور ہمارا ناچتا ہے۔ اور چہرہ؟ چہرہ بھی کوئی بہت اچھا ہے، بڑی خوبصورت ہے، اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تو منتی دیدی کا ہے۔ لیکن منتی دیدی تو کبھی ایسا کچھ نہیں کرتی اور وہ پڑھنا لکھنا کس کو آتا، دس روپیہ اسکالرشپ ملتے ہے۔ اگر میرا صاحب کے اسکول میں منتی دیدی پڑھتی تو اسے بھی اسکالرشپ ملتا۔

ماں کسی کام سے کمرے میں آئی تھی۔

دینکر نے پوچھا ——— ماں!

ماں نے کہا ——— کیا کہتے ہو؟ ———

دینکر بولا ——— چنرنی آج کل گالی کیوں نہیں بکتی ہے؟

ماں شاید بہت مشغول تھی۔ اس کی بات سن کر چڑچڑی ہو گئی۔ بولی ——— تمہاری ساری باتیں واہیات ہوتی ہیں۔ وہ کیوں گالی بکے گی، کس کو گالی دے گی؟

دینکر نے کہا ——— یہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، چنرنی ان کو گالی کیوں نہیں دیتی؟ گالی دیتی تو یہ لوگ بھی یہاں سے چلے جاتے ———

میں تمہارے ساتھ بک بک نہیں کر سکتی بابو۔

اتنا کہہ کر ماں چلی گئی۔ دینکر پھر تاریخ کی کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیسی کا ایک سکندر کیس کے ایک کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس کی کہانی پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا کون جانے؟ اس دن کوئی بھی ششانک بابو کی کلاس میں سبق نہ بتا سکا تھا۔ ششانک بابو بڑی سنجیدہ طبیعت کے آدمی تھے۔ وہ پرمانند بابو جیسے نہیں تھے۔ دینکر کا سب سے زیادہ پرمانند بابو کی کلاس میں دل لگتا۔

پرمانند بابو کلاس کرتے ہوئے بہت سی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

اس روز پرمانند بابو نے کلاس میں آتے ہی پوچھا ——— آج تم لوگوں کو کہاں سے پڑھنا ہے؟

ماسٹر دیکھ، اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سکندر اور پورس سر" اس نے جواب دیا۔

پران متھو بابو نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی، پوچھا ——— "پورس کون تھا؟"

پچک نے جواب دیا ——— "ایک راجہ تھا سر۔"

پران متھو بابو نے کہا ——— "خوب، خوب، لیکن راجہ کے معنی کیا ہیں؟ تم بتا سکتے ہو؟"

انھوں نے کرن کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"تم؟ تم؟ تم؟"

یکے بعد دیگرے انھوں نے کئی لڑکوں سے پوچھا مگر کوئی جواب نہ دے سکا۔ راجہ کے معنی راجہ! راجہ کے معنی اور کیا ہو سکتے ہیں؟ سو کوئی بھی اس آسان سوال کا جواب نہ دے سکا، سبھی پران متھو بابو کی طرف منہ کھولے تکتے رہے۔

پران متھو بابو نے کہا ——— "راجہ کے معنی تم لوگ نہیں جانتے تو اس میں شرمانے کی ایسی کوئی بات نہیں، راجہ کے معنی بہت سے لوگ نہیں جانتے، بہت سے راجہ بھی نہیں جانتے ——— تو پھر سنو ———"

اس کے بعد ڈبے سے پان نکال کر منہ میں رکھ لیا اور بولے ——— "ایک وقت ایسا تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، راجہ بھی نہیں تھا، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے! جس کے معنی یہ ہوئے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے! جب سبھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو نہ سزا کی ضرورت رہتی ہے نہ سزا دینے والے کی، لیکن یہ حالت زیادہ دن تک قائم نہ رہی، آہستہ آہستہ کشمکش نے جنم لیا ——— یعنی آہستہ آہستہ مذہب دنیا سے غائب ہونے لگا، مذہب اٹھنے ہی والا تھا کہ دیوتاؤں کو خوف محسوس ہوا کوئی پوجا نہیں کرے گا، یگیہ نہیں ہوں گے اور یگ میں آہوتی نہیں دی جائے گی، دیوتا کھائیں گے کیا! سبھی دیوتا برہما کے پاس گئے اور برہما کے پاس جا کر بولے کہ اب کون سی تدبیر کی جائے؟ تب برہما نے سوچ کر ایک راجہ تیار کر دیا، راجہ کا نام پرتھو تھا اور یہ پرتھو ہی دنیا کے راجہ ہو گئے، وہ وشنو کے اوتار تھے، ان کے راجہ ہونے سے پھر پوجا ہونے لگی، یگیہ دیا جانے لگا اور مذہب پھر لوٹ آیا، وہ اپنی رعایا کو خوش رکھتے تھے اسی لیے چاروں طرف ان کی تعریف ہونے لگی، وہ رعایا کا رنجن کرتے یعنی خوش رکھتے تھے، اسی لیے لفظ رنجن سے راجہ کا نام تخلیق ہوا۔"

اس کے بعد سنبھل کر بیٹھتے ہوئے انھوں نے پوچھا ——— "اب تو سمجھ گئے، راجہ کس کو کہتے ہیں؟"

تمام لڑکے یک زبان ہو کر بولے ——— "سمجھ گئے سر۔"

"لیکن سبھی راجہ پرتھو راجہ کی طرح اچھے راجہ نہیں ہوتے، ایسے راجہ بھی ہیں جو رعایا کو خوش نہیں رکھتے، رعایا کو کھانے پہننے کی سہولتیں نہیں دیتے، ہمارے دیش کے شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کا نام تم لوگوں نے سنا ہے؟"

سبھی خاموشی سے پران متھو بابو کو تکتے رہے۔

کرن یکایک درمیان میں بول اٹھا ——— "سر، سی۔ آر۔ داس جب راجہ ہوں گے تو بہت اچھے راجہ ہوں گے۔"

"تب۔ کیا۔ رام راج ہوں گے؟"

پران ناتھ بابا نے حیرت سے کرن کی طرف دیکھا۔

انھوں نے پوچھا — "تم سے کس نے کہا؟"

کرن نے جواب دیا — "ایک سادھو بابا نے سر۔"

"کون سادھو بابا؟"

"اصلی سادھو ہے سر۔ اصلی ہمالیہ کا سادھو۔ کہا ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو سب۔ کب۔ رام راج ہوں گے اور میرے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی اور ہمارے ملک میں سبھوں کی حالت بہتر ہو جائے گی اور ہم لوگ اچھی اچھی چیز کھائیں گے، دہی، مٹھائی، سندیش، سب کچھ ہوگا۔"

پران ناتھ مسکرائے، ان کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

انھوں نے کہا — "ملک آزاد ہونے کے بعد ملک کے لوگوں کی حالت بہتر ہو جائے گی، یہ بات سادھو کے بتلانے کی نہیں۔ خیر جانے دو، میں کہہ رہا تھا، رابندر ناتھ ٹیگور کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے "راجہ رانی"۔ تم بڑے ہونے کے بعد تم لوگ وہ کتاب ضرور پڑھو۔ رابندر ناتھ ٹیگور ہمارے ملک کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ تم لوگ دیکھو گے، ایک روز ان کی تصویر ہر گھر میں لٹکائی جائے گی۔ لیکن تم لوگوں نے ان کا نام بھی نہیں سنا ہے؟"

دلیپ بابو اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا — "میں نے ان کی تصویر دیکھی ہے سر۔"

"تم نے انہیں دیکھا ہے؟ کہاں دیکھا ہے؟"

دلیپ نے جواب دیا — "کالی مندر میں سر۔"

"کالی مندر میں؟"

"ہاں سر۔ مندر میں ماں کو قربانی دیتے وقت —"

اسے آج بھی یاد تھا، وہ ہر روز محلے کی ... سے پھول توڑ کر مندر میں لے آتا تھا، کنڈا پکڑ کے کنارے سے جا کر، کالی، شیو، گنیش اور دوسرے مندروں کے دیوتاؤں کے لیے پھول لے آتا تھا۔ کبھی کبھی ماں بھی اس کے ساتھ ہوتی، وہ پرنام کرتی، ماں کو دیکھا دیکھی دلیپ بھی پرنام کرتا۔ پرنام کر کے اسے کیا فائدہ اور کیا نقصان ہوا، اسے یاد نہیں تھا لیکن ان دنوں پرنام کرنا اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔

ایک روز ماں نے اس سے پوچھا تھا — "وہ دیکھو، دیکھ رہے ہو؟ بتاؤ تو؟"

دلیپ نے دیکھا تھا ایک سر... جس کی لمبی لمبی سفید داڑھی تھی، ماں کے مندر اور ماں مندر کے درمیان راستے پر کھڑے ہوئے ... کر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"وہ کون ہے ماں ؟"

وہ گرد و پیش سے بے خبر کھڑے تھے، ان کے ساتھ چند لڑکے اور لڑکیاں تھیں، وہ سب بھی دیوتا کی طرف دیکھ رہے

...کے چہرے کتنے خوبصورت تھے، ان کے لباس کتنے خوبصورت تھے، وہ سب مورتیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ماں اسی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ کون ہے ماں؟"

ماں نے جواب دیا ——— "ان کا نام روبی ٹھاکر ہے۔"

"روبی ٹھاکر کون ہے ماں؟"

"بہت اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہیں۔"

صبح کا وقت تھا، اس وقت مندر میں بھیڑ نہیں تھی، اس روز رابندرناتھ کو وہاں کسی نے بھی نہیں پہچانا تھا، لیکن ماں پہچان

گئی ... ماں بہت عقلمند تھی، اگر بابا سے نہ گئے ہوتے تو ماں اور بھی بہت کچھ جان سکتی، پھر ماں کو اگھور دادو کا کھانا پکانا پڑتا اور

... ماں کے ساتھ وہ بھی اسی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"دیپو بابو!"

یکایک اپنا نام سن کر دیپنکر چونک اٹھا، تاریخ کی کتاب بند کر کے جب وہ کمرے سے باہر آیا تو حیران رہ گیا، رگھو

... کشمی دیدی کا ملازم رگھو کھڑا تھا!

رگھو نے کہا ——— "تمہیں کاکا بابو بلا رہے ہیں دیپو بابو۔"

دیپنکر کی آنکھوں کے حلقے حیرت سے پھیل گئے۔

اس نے پوچھا ——— "مجھے؟ مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟"

رگھو نے جواب دیا ——— "کاکا بابو ابھی دفتر سے واپس آئے ہیں، کشمی دیدی لوگوں کے سامنے کے کمرے میں دیپو بابو کو بلا کر

..."

دیپنکر کچھ سوچنے لگا، اسے پھر کیوں بلا رہے ہیں! پھر اسے ڈر لگا، اس نے کیا قصور کیا ہے! کشمی دیدی ہی کا تو قصور ہے!

... دیدی نے تو آتے جاتے وقت ... وہ دیوار ... پھر بھی دیپنکر کچھ نہیں بول رہا ہے ... کبھی بولے گا، چودہ سال تک دیپنکر

... بولے گا، کسی سے کچھ نہیں کہے گا، چودہ سال تک، اور چودہ سال میں سے ایک سال تو گزر ہی چکا ہے۔

پرانی چند بابو نے کہا تھا ——— "اگر چودہ سال تک تم کچھ نہ بولے تو ایک دن تمہاری زبان سے جو بات بھی نکلے گی وہ

... ہو جائے گی، جو بولو گے وہی ہوگا ———"

دیپنکر نے پوچھا تھا ——— "میرے منہ سے جو نکلے گا وہی ہوگا؟"

"وہی ہوگا" پرانی چند بابو نے جواب دیا تھا ——— "رام جی بن گئے تھے، چودہ سال تک مسلسل، متواتر، لگاتار، بن باس کاٹا"

ـــ بات کبھی جھوٹ نہیں بولو گے ـــ

کرنے لگی تو پوچھا ـــــ پھر اگر میں کہوں کہ میرے ابا کی بیماری ٹھیک ہو جائے گی؟

"ہاں، وہی ہوگا!"

"اگر میں کہوں کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک بن جاؤں؟"

"وہی ہوگا، جو چاہو گے وہی ہوگا ـــ"

اور اسی دن سے دیکر اور دیکر نے طے کیا تھا کہ وہ دونوں چودہ سال تک سچ بولیں گے۔ ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولیں گے لیکن وہ اپنے عہد پر تھوڑی دور چلے تھے کہ اُنہوں نے جیب کے پیسے چرا کر کے جگو کی دکان سے کر پاپ اور بسکٹ خرید کر کھایا تھا اور گھر نہیں کہا تھا۔

مگھو نے کہا ـــــ "چلو دیکھو بابا ـــ"

دیکر سوچ رہا تھا کہ وہ دیکر بابا سے پوچھے، آنکھ سے ہوتے ہوئے وہ باورچی خانے کی طرف جانے جانے رک گیا۔ بہت نہیں، ہاں اس سے بہت ساری باتیں پوچھنے لگے گی اس سے بہتر ہے کہ وہ واپس آ کر ہی سب کچھ بتا دے گا۔

دیکر نے پوچھا ـــــ "کیوں بابا نے تجھے کچھ معلوم ہے؟"

مگھو نے جواب دیا ـــــ "میں نہیں جانتا ـــ"

آنگن سے کمرے کے باہر کے راستے سے ان کے کمرے میں داخل ہونے کا دروازہ تھا۔ مگھو ان کے آگے چل رہا تھا اور دیکر ان کے پیچھے تھا۔ ان لڑکوں کے صحن کی دیوار پر چڑھتے ہی زینہ شروع ہو جاتا تھا۔ زینے سے اوپر چڑھتے ہی دائیں طرف چھوٹے سے کمرے میں ایک سادھو بابا بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی مگھو دیکر کی اور مخالف سمت میں ان کی ماں بیٹھیں۔

"کیوں دیکر بابا، آج راستے میں تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

دیکر نے ایک بار مگھو اور بابا کی طرف دیکھا۔ مگھو وہاں جوش و باتیں سنا رہی تھی۔

"بیٹو! پہلے تم اس کرسی پر بیٹھو، اب بتاؤ کیا ہوا تھا، سچ بولو گے، ایک بات بھی جھوٹ نہیں بولو گے؟"

دیکر نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ـــــ "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ ایک سال سے میں نے سچ کے سوا کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــ"

"ایک سال سے پہلے بولتا تھا جو جھوٹ بالکل ہی نہیں بولے؟"

"نہیں، میں اور بھی تیرہ سال تک مسلسل سچ بولوں گا!"

اس کی بات سن کر وہاں پر حیران ہو گئے، بابا کی ماں نے بھی مسکراتے ہوئے کالا بابا کی طرف دیکھا۔ بولیں ـــــ "او ہاں، خوب لڑکا ہے!"

مگھو دیدی نے آنکھ سے پھر کہا ـــــ "بیٹے بابا سے سچ بات ہی بولو، شرما کر اور ـــــ"

کاکا بابو نے ممی ڈیڈی کو منع کیا۔

"بس ——— تم چپ رہو ممی، اب بتاؤ تو تیرہ سال تک کیوں سچ بولو گے؟"

ویکٹر نے جواب دیا ——— "میرے ہیڈ ماسٹر کہتے ہیں کہ اگر چودہ سال تک کوئی مسلسل سچ بولے تو اس کے بعد اس کی زبان سے ہر بات نکلے گی سچ ہو جائے گی۔"

اس کی بات سن کر کاکا بابو ہنسنے لگے، کاکی ماں ہنسنے لگیں اور ممی ڈیڈی بھی ہنس پڑی۔

کاکا بابو نے کہا ——— "اور تم نے اسے سچ سمجھ کر یقین کر لیا؟"

بیچارہ ویکٹر ایک کتنا سیدھا اور کتنا معصوم تھا، کبھی کبھی ویکٹر کو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زمانہ اچھا تھا جو کوئی اس سے جو کہتا وہ یقین کر لیتا تھا، اس نے یقین کر لیا تھا کہ ان کے بابا کی بیماری اچھی ہو جائے گی، یقین کر لیا تھا کہ کوڑی سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، یہ یقین کر لیا تھا کہ آمد داس ایک دن راجہ ہو جائیں گے اور اس نے یہ بھی یقین کر لیا تھا کہ اگر چودہ سال تک سچ بولا جائے تو جو بات بھی زبان سے نکلے وہ سچ ہو جائے گی ——— اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں تھیں جنہیں ویکٹر نے یقین کر لیا تھا، آج اتنے دنوں بعد اب اسے محسوس ہوا تھا کہ دنیا کا یقین کر لینا ہی بہتر ہے، کیا یقین کر کے آخر کار اسے کچھ بھی نہیں ملا؟ اور اس نے یقین کر لیا تھا اس لیے اس کا سب کچھ کھو گیا؟

کاکا بابو نے پوچھا ——— "راستے میں جو لڑکا تمہیں مارتا ہے، وہ کون ہے؟"

"وہ پہلے میرے ہی اسکول میں پڑھتا تھا۔" ویکٹر نے جواب دیا۔

"تمہیں کیوں مارتا ہے؟"

"میں نہیں جانتا، میرے ہاتھ میں جو کچھ ہوگا وہ چھین لے گا اور کچھ نہ لے تو بھی مارتا ہے۔"

"اسی لیے آج میں نے اسے خوب پیٹا ہے کاکا بابو۔" ممی ڈیڈی بولی ——— "یہ خاموشی سے مار کیوں کھائے؟ یہ نہیں مار سکتے، ان کے بدن میں طاقت نہیں ہے؟"

ویکٹر نے کہا ——— "ابھی وہ جتنا چاہے مجھے مار لے، ایک دن میں اس کا بدلہ چکا دوں گا کاکا بابو۔"

کاکا بابو نے پوچھا ——— "وہ کیسے؟"

"میں غریب ہوں اس لیے وہ مجھے مارتا ہے۔" ویکٹر نے جواب دیا ——— "میں جب بڑا آدمی بن جاؤں گا تو وہ نہیں مارے گا، جب میرے پاس بہت سارا روپیہ ہو جائے گا تو وہ مجھے نہیں مارے گا۔"

"کیوں؟"

ویکٹر نے کہا ——— "ممی ڈیڈی کہتے ہیں کہ روپے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے، روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔"

... نے کہا ——— "تم تو بہت عقل مند ہے۔"

[illegible] ـــــ انگریز دادا نے مجھ سے کہا کہ اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو [illegible] ہندوستانی [illegible] اس
وقت کسی [illegible] کر سکتا۔

کالا بابو تو [illegible] بولے ـــــ یہ سب غلط ہے [illegible] انگریز دادا نے تمہیں غلط [illegible]
چیز خریدی نہیں جا سکتی، جب تم [illegible] ہو گے تو سمجھو گے کہ دنیا میں روپیہ ہی بڑی چیز نہیں ہے۔

لیکن انگریز دادا نے جو کہا ہے [illegible] انگریز دادا بھی تو بہت [illegible] ہیں ـــ

کالا بابو نے کہا ـــــ [illegible] بہت سے لوگ [illegible]
تھا [illegible] انگریز دادا بھی شاید اسی قسم کے ہیں، ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ [illegible]!
پھر [illegible] ایک [illegible] جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا، کوئی رشتہ
بھی نہ تھا اور گھر سے [illegible] قسمت [illegible] نکلے تھے ـــ

یہ کہانی [illegible] تفصیل سے سنی تھی۔

[illegible] ایک دن بتایا تھا ـــ [illegible] ضلع کے ایک [illegible] گاؤں کا ایک لڑکا جس کا نام [illegible] تھا اور جو [illegible]
[illegible] تھا اور [illegible] روپیہ [illegible] گھر سے فرار ہو گیا تھا، فرار ہو کر وہ کہاں چلا گیا، یہ کسی کو
معلوم نہ تھا، اس کے ہاتھ میں ایک پیسہ بھی نہ تھا [illegible]
[illegible] چلا گیا تھا [illegible] میں جا پہنچا تھا۔

کالا بابو نے کہا ـــــ میں نے جب پہلی بار ملازمت [illegible] وہ جگہ بالکل نئی تھی، میں زندگی میں کبھی [illegible]
تھا [illegible] ـــــ میں نے دیکھا، شہر سے سات
[illegible] جنگل میں [illegible] دن رات کام میں [illegible] رہتے
[illegible] انگریز [illegible] رہ گیا
[illegible] بنگال [illegible]!

اس وقت تک [illegible] بابو سے [illegible] نہیں ہوئی تھی، بنگالی دیکھ کر [illegible] ملاقات کرنے کی خواہش ہوئی۔

مجھے دیکھ کر انہیں بھی بہت حیرت ہوئی اور انہیں دیکھ کر مجھے بھی!

[illegible] بابو نے کہا ـــــ [illegible] جناب، [illegible] آئے ہیں تو [illegible]
تھا ـــــ

میں نے کہا ـــــ پندرہ روپیہ میری تنخواہ ہے، پانچ روپے اور [illegible] الاؤنس ہے، اتنے روپیوں میں [illegible]
[illegible]؟

[illegible] بابو نے کہا ـــــ اس [illegible] رشوت [illegible] روپے [illegible]

اس کے بعد میں تمھاری کاکی ماں کو بھی لے گیا۔

کیتھی دیدی نے پوچھا —— "میں اس وقت پیدا ہو چکی تھی کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے جواب دیا —— "اس وقت تو ذرا سی بچی تھی، میں تمھیں گود میں لے کر گھومتا رہتا تھا ——"

"اور ستی؟"

"ستی اس وقت کہاں تھی، وہ تو ابھی اسی دن پیدا ہوئی تھی، برسات کا موسم تھا، رم جھم رم جھم بارش ہو رہی تھی، میں دفتر سے ہو کر گھر لوٹا تھا اور اس وقت رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے، بتی گل کر کے سویا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی، ایک [illegible] کرتے کرتے اس دن اتنی رات ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا، اتنی رات گئے کون ٹیلیفون کر سکتا ہے، ریسیور کان سے لگانے کے بعد معلوم ہوا، بھوبنیشور بابو تھے ——"

میں نے پوچھا —— "کیا بات ہے، اچانک کیا ہوا دادا؟"

ادھر سے بھوبنیشور کی آواز آئی —— "تمھیں ایک خوش خبری سنانی ہے، میرے یہاں بچی پیدا ہوئی ہے۔"

میں تو جیسے اچھل پڑا، پوچھا —— "کب؟"

"ابھی ابھی ——!"

میں نے کہا —— "پھر سندیش کھلائیے دادا، ایک نہیں اب دو بچیاں ہو گئیں، اس کا نام ستی رکھیے، بڑی کا نام کیتھی [illegible] ہے، دونوں مل کر ستی کیتھی بن کر رہیں گی۔"

کاکی ماں کو مخاطب کر کے کاکا بابو نے پوچھا —— "تمھیں بھی یاد ہیں وہ سب باتیں؟"

کاکی ماں نے جواب دیا —— "یاد کیسے نہ رہے گا بھلا؟ تم اتنی رات ہی کو پھر چلے گئے تھے۔"

کاکا بابو نے کہا —— "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ملازمت کرنے سے پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ روپے سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے، لیکن بھوبنیشور سے ملاقات ہونے کے بعد میرا یہ خیال بدل گیا۔ ان دنوں تمھاری کاکی ماں کو ساتھ لے کر گیا ہی تھا کہ ایک [illegible] بیماری اسی دوران میں اس کی لپیٹ میں آ گیا، بڑی خطرناک بیماری تھی، گھر کے تمام نوکر چاکر بھاگ کھڑے ہوئے، ایک آدمی بھی [illegible] دیکھنے والا نہ تھا، تمھاری کاکی ماں بھی بالکل اجنبی تھی، کسی کو پہچانتی تک نہ تھی، میں تو بے ہوشی کے عالم میں بے سدھ پڑا ہوا [illegible] زندگیاں گن رہا تھا، سوچا، زندگی کا سفر اسی طرح کلکتہ کی زمین پر تمام ہو گا۔

لیکن نہ جانے کہاں سے رہنے والے بھوبنیشور بابو، جن سے سات پشت تک میری کوئی رشتہ داری نہ تھی، [illegible] آدمی [illegible] پاتے ہی دوڑے ہوئے میرے پاس آئے اور اس کے بعد ڈاکٹر اور دوا کی فکر سے میں آزاد ہو گیا، جس دن وہ میرے [illegible] تھے اس دن سے لے کر اس وقت تک جب تک میں بالکل صحت یاب نہ ہو گیا، وہ میرے ہی پاس رہے، وہ گھر کے تمام کام دھندا چھوڑ کر صرف میری ہی تیمارداری کرتے رہے! ایسا کیوں کرتا ہے؟ مجھے صحت یاب کرنے میں ان کی کون سی غرض پوشیدہ [illegible] ان کے ساتھ میرا کون سا رشتہ تھا! میں ان کا کون تھا جس کے لیے انھوں نے اتنا کچھ کیا؟ اپنا روپیہ، اپنا وقت اور اپنے آدمی

دے کر انھوں نے بچہ گود لیا ـــــ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟"

اس کے بعد وہ میکر کی طرف دیکھ کر بولے ـــــ "اسے بھی اسی طرح سے دنیا میں بہت کچھ جھیلنا پڑے گا، ہر کی منافع داری۔ وہ دیکھو بھلا کیا روپے پیسے سے پرکھنے کی چیز ہے؟"

ممی ڈیڈی نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ کاکا کی ماں بھی کچھ نہ بولیں۔ اسد جیکر بھی خاموش رہا۔

کاکا کہنے لگا ـــــ "اور جیسا باپ ہے ویسی ہی لڑکی بھی ہے۔ میں نے جمشید بابو کو سمجھایا تھا کہ لیکن جو ہیں تو کیا ہوا، انھیں تو اگر اچھی تعلیم دی جائے تو یہی لڑکیاں لڑکوں سے بہتر ثابت ہوں گی۔ جمشید بابو نے کہا ہے کہ بیٹی تمہارے رزلٹ سے بے حد خوش ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ رستی کو بھی بمبئی بھیج دیں گے۔ وہاں اس کی تعلیم اچھی ہو رہی ہے۔"

"اور ہاں، ایک بات کہنا میں بھول گیا تھا، مسٹر کٹ ... کل صبح سویرے ہی باہر جاؤں گا۔"

کاکی ماں نے پوچھا ـــــ "کل صبح سویرے کیوں؟"

"فوری کام ہے" پریشان ہو کر کہا ہے: "یہی دیکھو! جب تک برما میں تھا، بڑے آرام سے تھا۔ سستا ملک تھا۔ اچانک ... تباہ ہو گیا ہے۔ اور اتنی پرانی جگہ کو چھوڑ کر مجھے یہاں چلا آنا پڑا۔ ... نہ ہو تو پھر نوکری کیسے کر سکتے ہیں۔ پھر کسی روز حکومت پٹنہ تباہ کر کے ... کو دے۔"

میکر ... ہو گیا۔

کاکا بولے ... "میں نے جو کچھ کہا ہے نہیں یاد رہے گا ... اگر پھر کچھ ... اس دنیا میں ... کی قیمت کوئی نہیں دیتا۔ اس دنیا میں خود داری کی قیمت کوئی نہیں دیتا" ـــــ

"نہیں وہ مجھ سے زیادہ ... ہے!"

کاکا بولے ـــــ "... تجربے کہہ گئے۔"

ممی ڈیڈی نے کہا ـــــ "... بات ... نے کی ہے۔ ... کاکا بابو میں نے اس لڑکے کی اچھی طرح تربیت کر دی ہے۔"

کاکا بولے ـــــ "اچھا بابا ـــــ اس دنیا میں ... آدمی خواہ کچھ بھی ...۔"

اس روز میکر زیادہ دیر وہاں نہیں رکا تھا۔ ممکن ہے اس نے سوچا ہو ... پتہ نہیں کہاں کا کہاں چلا گیا، لیکن اس دن کاکا بابو کی بات سن کر وہ عجیب تذبذب میں پڑ گیا تھا ـــــ کس کی بات صحیح ہے؟ ممی ڈیڈی کی یا کاکا بابو کی؟ یا پہلی ... اپنے ... کی زبانی سنے ہوئے ... کے گھاٹ پر بیٹھے ہوئے ... کی؟ کس کی بات زیادہ سچی ہے؟

[illegible] جو بچے کاکا بابو کی بات ہی سچی ہے! اس روز رو رہے ہوتے ہوئے بھی کاکا بابو طاعون کی بیماری میں مر رہے تھے ——
[illegible] جو جیتے جاگتے رہ جاتے کیوں انھیں بچایا؟ کیوں، کس وجہ سے انھوں نے کاکا بابو کو صحت یاب بنا دیا! پھر اس نے سوچا، اگر
[illegible] ہوتا تو اب تک کر سکتا! ابھی صحت یاب ہو گئے ہوتے، بہت دنوں پہلے ہی صحت یاب ہو کر وہ پھر کسی اسکول میں [illegible]
[illegible] ہو گئے ہوتے! لیکن کاکا بابو کی عمر بھی تو اب زیادہ ہو چکی ہے، کاکا بابو نے بھی تو بہت کچھ دیکھا ہے! تو کیا کاکا بابو نے جو
[illegible] حاصل کیے ہیں جو کچھ دیکھا ہے وہ سب غلط ہے!

وہ ہر روز دیکھتا کہ کاکا بابو سوٹ پہن کر دفتر چلے جاتے تھے۔ ایشور گنگولی لین سے نکل کر وہ سیدھے کنڈو پکر کی سمت چلے جاتے۔ وہاں سے بس یا ٹرام پر سوار ہو کر دفتر چلے جاتے، ایشور گنگولی لین کے بہت سارے لوگ دفتر جاتے تھے —— [illegible] کاکا بابو کے دفتر جانے کا وقت ان سے علیحدہ تھا، ان کے جانے کا کوئی مقرر وقت نہیں تھا۔ کسی کسی روز وہ صبح سویرے دفتر چلے جاتے اور بڑی رات گئے واپس آتے تھے۔ اس وقت مکان کا صدر دروازہ بند ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اندر کی طرف سے [illegible] کی آواز اور بھی صاف سنائی دیتی تھی اور حاجی قاسم کے باغ کی پرلی طرف سے بہت سے گیدڑوں کے ایک ساتھ چیخنے کی آواز آتی رہتی۔ اس وقت سبھی لوگ سو جاتے تھے۔ کالی گھاٹ میں، مندر میں، پتھر گھاٹ میں اور نیپال بھٹاچاریہ اسٹریٹ میں کوئی بھی جاگا ہوا نہ ہوتا۔ اکھو دادا بھی شاید اس وقت برتن اور گھڑوں کی ڈھیری کے قریب ہی کہیں پڑ کر تھک کر کچھ دیر کے لیے سو جاتے تھے، لیکن ان کے یہاں —— اس ٹھکر کی کے مکان میں کبھی کبھی اس وقت تک روشنی جلتی رہتی۔ اس وقت [illegible] چکر کی آواز سنائی دیتی۔ شاید اسی وقت کاکا بابو دفتر سے لوٹتے تھے۔ کیسا دفتر تھا! جہاں اتنی رات تک کام ہوتا تھا وہ [illegible] تھا! کاکا بابو کس دفتر میں کام کرتے تھے؟ کیا کام تھا؟

لیکن یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ جب سے وہ لوگ آئے تھے چھنونی جیسے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔ وہ چیختی چلاتی اب [illegible] لیکن اب اس کی آواز میں وہ تیزی نہیں رہی تھی۔ شاید ان کے یہاں آ کر اس نے [illegible] پیدا کر لیے تھے۔ ابھی اسی دن وہ کچھا سے [illegible] ایک ٹالی بجاتے ہوئے کر رہی تھی ——

وہ آنکھیں مٹکاتے ہی بیٹا بیٹا اس نے شروع کر دیا تھا —— "آؤ، مر جا، تیرے منہ میں آگ، اس وقت بھی کھانے [illegible] ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ——"

دیپنکر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا —— "کس کو گالی دے رہی ہو چھنونی؟"

"یہ دیکھو نہ بیٹا، اس بلی کی حرکت دیکھو، منہ سونگھ سونگھ کر چلی آتی ہے۔"

دیپنکر نے دیکھا، چھنونی کی وہ پالتو بلیاں تھیں جو سر اٹھائے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

دیپنکر نے پوچھا —— "تم ان لوگوں کو گالی کیوں نہیں دیتیں چھنونی؟ یہ جو نئے کرایہ دار آئے ہیں، ان کا [illegible] کہہ کر [illegible] نہیں دیتیں؟ اس گھر کی ایک لڑکی مجھے بہت اچھی لگتی ہے ——"

چھنونی نے جواب دیا —— "آہا! بیچارا ان کی بچی ہے۔ باپ کو چھوڑ کر دنیا میں آگئی ہے، اس کو کیسے گالی دے سکتی

جو کیا؟ اس کو کالی دیوی سے تو بچتے ہوئے گناہ نہ ہوگا؟

اس وقت چیز لی ایک تھال میں کچھ سے چھپاتے ہوئے بلیک پاول کا سا بات لیے ہوئے تھی جس کی ہیکل کے ٹکڑے تھے اور وہ ال کا لاڈ کی بھی تھی۔ چیز لی اب پہلے جیسی چیز لی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے جیسے چیز لی کو کوڑی دے کر خرید لیا ہو۔ چیز لی پیسے والوں کی خریدی ہوئی باندی ہو گئی تھی۔ اگر دار ادو کی بات ہو چکی تھی! اگر دار ادو کی بات ہو چکی تھی! روپیے سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے: روپیے سے کسی کو بھی خریدا جا سکتا ہے۔ وچکر کے پاس اگر روپیہ ہو جائے تو کوئی بھی اُسے نہیں مارے گا۔

اوپر سے اُتر کر کالی کے دروازے کے قریب آتے ہی یکایک پیچھے سے کسی نے اُسے آواز دی۔

"اے سُن —"

وہی بھولی آواز تھی۔ وچکر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی متعجب ہو اُٹھا۔

لکھی دیدی! وہ جگہ تاریک تھی۔ اندر کے پیڑ کے بالکل نیچے ٹھیک کوٹھی کے دروازے کی چوکھٹ پر لکھی دیدی دبکے جسم سے سٹ کر کھڑی ہو گئی۔

بولی — "اچھے بھائی دیکھو، میرا ایک کام کر دو گے؟"

وچکر کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ لکھی دیدی اس کے ساتھ اتنے پیار سے بات کر رہی تھی!

اس نے پوچھا — "کون سا کام؟"

"یہ خط ایک آدمی کو پہنچا دو گے؟"

لکھی دیدی کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

وچکر نے پوچھا — "کس کو؟"

"پہلے بتاؤ، ٹھیک دے آؤ گے نا؟"

"ٹھیک دے آؤں گا، دے کر دیکھو —"

"کسی سے کہو گے تو نہیں؟"

لکھی دیدی نے اس کے ساتھ کبھی اس طرح بات نہیں کی تھی۔ لکھی دیدی آج کچھ دیر میں پہلے سے نرم ہو گئی تھی۔

"نہیں، کسی سے نہیں کہوں گا، تم خط دے دو، دے کر دیکھو میں دیتا ہوں یا نہیں —"

"تو پھر ایک کام کرو —"

اتنا کہہ کر لکھی دیدی نے لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

بولی — "کوئی دیکھے گا تو نہیں، تمہاری ماں تو نہیں دیکھے گی؟"

وچکر نے کہا — "میں چھپا کر رکھوں گا، تم سے وعدہ کرتا ہوں کسی کو نہیں دکھاؤں گا — کس کو دینا ہوگا

بتاؤ؟"

لکھی دیدی نے دبی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "کنڈے والے پوکھر کے کنارے ٹھیک مندر کے پیچھے جو دروازہ ہے وہیں پر
ایک دبلا لڑکا کھڑا ہوگا ـــــ اس کے ہاتھ میں دے دینا ـــــ"

"لیکن اس کی شکل کیسی ہے؟"

"سفید قمیص، سفید پتلون اور سفید جوتا ہوگا اور زرد رنگ کا کوٹ ہوگا اور کوٹ کے بٹن ہول میں ایک گلاب کا پھول ہوگا
ٹھیک پہچان لوگے نا؟"

"کتنے بجے؟"

لکھی دیدی نے کہا ـــــ "کل ٹھیک سات بجے صبح ـــــ"

دینو نے کہا ـــــ "ٹھیک ہے، اس وقت تو میں ہر روز مندر میں پھول دینے جاتا ہوں، تم کچھ فکر مت کرو، میں دے دوں گا، پھر کیا ہوگا؟"

لکھی دیدی نے کہا ـــــ "نہیں ـــــ"

اس کے بعد دینو چلا آرہا تھا، لیکن لکھی دیدی نے پھر آواز دی۔

"بات سنو، ادھر آؤ ـــــ"

دینو کے قریب جاتے ہی لکھی دیدی نے کہا ـــــ "یہ لو، تم کھاؤ گے ـــــ"

اندھیرے میں بھی دینو نے دیکھ لیا، مٹھی بھر چاکلیٹ تھا، لکھی دیدی نے اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ ٹھونس دیا، چاکلیٹ دے کر لکھی بھی چلی گئی اور دینو کھڑکی کا دروازہ بند کر کے آنگن میں آکر کھڑا ہوگیا، اس کے بعد اس نے ہاتھ کی بند مٹھی کھول کر ایک بار دیکھا۔ بہت سارے چاکلیٹ تھے، منساری کی دوکان میں جیسے چاکلیٹ شیشے کے مرتبان میں رہتے تھے، یہ بھی ویسے ہی تھے بلکہ اس سے بھی بہتر تھے، چمکی میں لپٹے ہوئے چوکور چوکور چاکلیٹ تھے، اس کا جی چاہا کہ ایک اسی وقت چکھ کر دیکھے، لیکن پھر اس نے سوچا ـ بعد میں کھاؤں گا۔

دوسرے دن صبح ابھی صبح کی روشنی نہیں پھیلی تھی، ماں نے اس سے پہلے ہی اسے جگا دیا تھا، دینو نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے دیے اور جھٹ پٹ کپڑے پہن کر تیار ہوگیا۔ اس کے بعد لکھی دیدی کا خط جیب میں ڈال لیا، اسے حاجی قاسم کے مکان والے باغ میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا، باغ کی دیوار ایک طرف سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ اسی راستے سے اندر چلا جاتا تھا، اندر بہت سارے پھول تھے، گیندا، رات کی رانی، چمپا، گلاب، گل سوسن اور دوسری بہت سی اقسام کے پھول تھے، کبھی کبھی پیڑوں کی ٹوکری بھر لاتا۔ پھر یہی پھول وہ مندروں میں جا کر دے آتا تھا، پہلے ماں کالی کے مندر میں، اس کے بعد مدھو سودن کے مندر میں، اس کے بعد گنیش، شمبھو ناتھ، شیو شکتی، اس کے بعد سب سے آخر میں نو کشور اور سونار کاٹک کے مندر میں ـــــ ہر مندر میں تھوڑے تھوڑے پھول دینے پڑتے تھے اور سارے پجاری دینو کو پہچانتے تھے۔ اس کے جاتے ہی سبھی اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے

ہے ـــــ وہ مکمل اس حرف حرف ـــ
پھول دینے کے بعد ویکٹر نے ایک بار پھر کہا تھا۔
اس نے سمجھایا تھا کہ پھر کام کرتے وقت کہتے۔ نماز میں جتنی حق تعلیم حاصل کرو۔ خوشی حاصل کرو اور ترقی کرو

سکون ـــــ

اور بہت دنوں کے بعد جب ویکٹر جیسے ہی ایم۔ بی۔ اے ہو گیا تھا تو ایک دن گلا یاسمین بیگ کا سکھ لیکر
پھر شرم سے اس کے قدموں پر سر رکھ کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا تھا ـــــ

"حضور آپ میرے ماں باپ ہیں۔ آپ کا بھلا ہو گا حضور۔ بھگوان آپ کو بہت دے گا حضور۔"

اس دن ویکٹر کو ہنسی آئی تھی۔ بہت سے لوگ یونہی اس کو دعائیں دیتے تھے۔ پہلے وہ لوگ بھی بیک فون شیئر کرتے تھے جس کی زبان ہوگئی سے سیٹھ صاحب کہتے تھے۔ اس کی خواہش کے وہ مزدور بار بار اسی طرح کہتے تھے کہ وہ سیکنڈل اور کرپشن کو جو چھوٹی بیٹی پر بیتا تھا۔ وہ کرپشن اور وہ چیک اس بات سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اس کو عزت کا نام اور وہ جب بولتا تھا وہی سب کچھ ایسی چیز وہ تھا تو پھر سیٹھ صاحب کو دنیا تھا پھر خود کا تھا۔ اس سے کیا ہوا! اس سے اس کا کیا فائدہ ہوا! اور وہ چالیس! جو چالیس پیٹی دی تھی اس کے ہاتھ میں تھوڑا سا دیا تھا۔ وہ بھی ایک قسم کی رشوت تھی! رشوت لینے کا بھی سیکھ نے ویکٹر کو خود دینا چاہا تھا! کوئی مسئلہ نہیں ویکٹر کا منہ بند کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے کیا وہ بات چھپ سکی! وہ کیا چھپنے والی بات تھی!

"ارے ـــــ"
ویکٹر پیچھے مڑ کر دیکھتے ہی حیران رہ گیا تھا۔ اتنے سویرے ممی ڈیڈی بستر سے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں آ کر کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے تم اٹھ گئی ہو؟ آواز میں کہا ـــــ خدا کے لئے ہے نا؟ بھول گئے نہیں؟"

ویکٹر نے کہا ـــــ نہیں یہ دیکھو! میری جیب میں ہے ـــــ

"بیٹے وہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے اپنی ماں کو تو نہیں دکھایا۔"

"نہیں ـــ"

"بیچ کہتے ہو ـــ؟"

ویکٹر نے کہا ـــــ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ پھر وہ سال تک جھوٹ بولوں گا بھی نہیں۔

ممی ڈیڈی نے پھر پوچھا ـــــ وہ شکل یاد ہے نا؟ سفید قمیص، سفید تہبند، سفید جوتا اور زرد رنگ کا کوٹ

کوٹ کے بٹن ہول میں گلاب کا ایک پھول ـــــ؟"

"یاد ہے ـــــ"

ہٹا کر دیکھ پھولوں والی ٹوکری میں سے ہوتے باہر چلا گیا۔

[illegible] دھوبی والی گھاٹ میں جتنے لوگ تھے ان سب کا کا بابا بالکل ہی مختلف تھے۔ دیپکر نے کتنے ہی مکانات دیکھے تھے۔ بچپن میں
[illegible] ماں کے زمانے میں جا چکا تھا۔ مکان کا اندرونی حصہ دیکھ چکا تھا۔ کرن کا مکان بھی دیکھ چکا تھا۔ کسی کا مکان بھی
[illegible] بیاہ پھینک اور اکمال بھیوں کے مکانات دیکھ چکا تھا۔ لیکن کا کا بابا کے مکان اور ان کے مکان میں کوئی مماثلت نہیں
[illegible] مدت میں ان دونوں کسی کے یہاں نوکر اور باورچی نہ تھے۔ کرن کے گھر کا خرچ تو بھیک کے پیسے ہی سے چلتا تھا۔ جیسے تو فروت
[illegible] گھر میں چاول، دال اور آٹا تھا اور صرف یہی نہیں —————— مدھو سودن
[illegible] جا کر اس نے دیکھا تھا۔ مدھو سودن کے تمام بھائی بہن مل کر بیٹھے بھات کھا رہے ہوتے۔ ایک بڑی سی تھالی میں مدھو سودن
[illegible] دن بھات اور دال نکال کر رکھ دیتی اور وہ تمام بھائی بہن دائرہ بنا کر تھالی کے گرد بیٹھ جاتے اور کیلی مدھو سودن کی ماں کھلاتی
[illegible] رکھوالی رہتی۔ پھینک پتہ جی کی گلی میں رہتا تھا۔ پھینک کی ماں بوڑھی ہو گئی تھی اور بوڑھی ہو کر راستے کی دکانوں میں سے
[illegible] پیسے سے اس کے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ بیشتر لوگوں میں سے ہوتے ہوتے آگے جانے کے بعد وہی یہاں میں اندر کا گھر تھا۔
[illegible] سب آتے رہتے۔ کماری پوچھا تو [illegible] وہ ماں پوچھا کے تو فقیر ماں کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ اس
[illegible] دروازے پیوں دکھایا تھا۔ اس گھر کی تکلیف بھی نہیں تھی اور اگھور داد و بابا اگھور داد و کے پاس بھی تو بہت سارا روپیہ تھا۔
[illegible] پاس کتنا روپیہ تھا اس کی تعداد کو اگھور داد و بھی معلوم نہ تھی۔ پھر بھی اگھور داد و کا مکان بے رونق اور بدصورت
[illegible] داد و کو دیکھ کر پتہ نہیں کے بڑے ہی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ گھر بھر میں صرف منی دیدی کی ایسی
[illegible] صورت کھو جا سکتی تھی۔

[illegible] منی دیدی کی تو زندگی میں سنائی نہ دیتی۔

[illegible] —— یہ کیا کپڑا پہن رکھا ہے تم نے بیٹی؟ کوئی اچھی سی ساڑی پہن لو، آج سال کا پہلا دن ہے ——

منی دیدی منہ چھپا کر ہنسنے لگتی۔

[illegible] —— کیوں کپڑا نہیں ہے شاید؟ اتنی ساری لال کنارے کی ساڑی کیا ہوئی؟ کیا سب بالما کے خزانچی پر چلی
[illegible] کی عقل کہیں ہے بڑو تو؟

منی دیدی خوف سے ڈر جاتی۔

[illegible] —— تم داد و سے مت کہہ دینا۔ داد و دکھیں گے تو میں نے ہی تم سے کہا ہے۔

[illegible] —— تمہاری ہی محبت تو ہے بیٹی، ورنہ تمہاری قسمت میں بھی تو یہی پھرتی؟

[illegible] اگھور داد و کے ہنستے ہی اس نے کہہ لیا۔

[illegible] —— بابا، آپ کے ایک بات کہنی تھی ——

روپیہ!

[illegible]

بولے ——— روپیہ! منی جی لڑکی میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا! تم نے کیا میرے پاس روپیہ کا پیڑ دیکھ لیا ہے!

ماں نے کہا ——— میں آپ سے روپے کی بات نہیں کر رہی ہوں، آپ کا روپیہ آپ ہی کے پاس رہے گا لیکن لڑکی کی شادی تو کریں گے ——— یا نہیں کریں گے؟

انجم داؤد کو اتنی دیر بعد ذرا اطمینان ہوا

بولے ——— شادی! لیکن منی جی! شادی میں تو روپیہ خرچ ہوگا، روپیہ میں کہاں سے لاؤں گا، سنو تو سہی!

تو روپیہ خرچ ہوگا اس لیے آپ نہیں کریں گے؟ جیسے نانا جی آپ؟ استاد محترم کہتے ہیں یہ بھی تو محرم کا [illegible] ہے! حالانکہ میں اس لیے کہ تو آپ پڑھ کر ثواب ہی پڑھے گا اور اگر آپ سے یہ نہیں ہو سکتا تو اس کے گلے میں کسی اندھے کنوئیں میں ہی جا دیجیے، سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔

انجم داؤد تھوڑی دیر بالکل خاموش کھڑے رہے۔

ماں نے کہا ——— لڑکی کی طرف آپ نے دیکھا، سارا [illegible] آپ کبھی نہیں دیکھتے۔ لڑکی کی عمر بڑھ رہی ہے۔ وقت آپ کے نہیں ہیں، آپ نہیں دیکھیں گے تو کون دیکھے گا!

اب کے انجم داؤد چیخ اٹھے۔

بولے ——— میں! میں کیوں دیکھوں گا؟ اس منی جی کو؟ میں کون ہوں؟ منی جی نے ماں کو کہا، منی جی نے آپ کہا [illegible] کیا منی جی مجھے کھانا چاہتی ہے؟ مجھ سے اب نہیں ہوگا ———

آپ سے نہیں ہوگا تو کس سے ہوگا؟

وہ میری کیا لگتی ہے منی جی؟ میں اس کا کیا لگتا ہوں؟ میں کیا اس کا باپ ہوں؟ میں کیا اس کی ماں ہوں؟ میں کوئی نہیں ہوں۔

اتنا کہہ کر انجم داؤد گھٹ گھٹ کر روتے ہوئے زینے کی طرف چلے گئے۔ اوپر جانے کے بعد [illegible] منی جی نے میرا روپیہ دیکھ لیا ہے، میرا روپیہ دیکھ لیا ہے منی جی نے، میں منی جی کو گھر سے نکال دوں گا، نکل جا منی جی، نکل جا، جا [illegible] سب ...

مگر دادو کی بک بک جھک جھک ختم ہو نہیں رہی تھی۔
مگر دادو کے جانے کے بعد شتی ڈیڈی اپنی جگہ سے باہر نکل آئی اور ماں کے قریب آکر خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔

ڈیڈی ——

ماں نے کہا —— تم ٹھیک تو تھی، اتنا ڈرنے سے کام نہیں چلے گا، عورت بن کر پیدا ہوئی ہو تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ برداشت نہیں کرو گی تو خود ہی دکھ اٹھاؤ گی۔ کوئی تمہارے لیے کچھ نہیں کرے گا —— تم ذرا ہمت سے کام لو

——

ماں کہنے لگی —— میں نے یہ سب بہت دیکھا ہے۔ ایک کپڑے میں ایک ماہ کے بچے کو لے کر میں گاؤں چھوڑ کر بھاگ نکلی۔ مجھے بھی رشتہ داروں نے کتنا خوف دلایا تھا لیکن تمہاری طرح میں نے کیا خوف کھایا تھا؟ خوف کرتی تو اس لڑکے کی پرورش کر سکتی ——

پنچم ماں کتنی محنتی تھی، اس کی پرورش کرتی تھی۔ دوسرے کے گھر کا تمام کام کر کے بھی ماں چاروں طرف کتنا بھاگتی دوڑتی رہتی تھی۔ ماں نے ہی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے کہہ کر اسکول کی فیس معاف کروا دی تھی۔ ماں ہی نے اسے اپنے ساتھ [illegible] گھر سے [illegible] وہاں شیر چیتا اور ہاتھی دکھایا تھا۔ بندر کو چنا کھلوایا تھا۔ ماں ہی نے اسے بہت سی باتیں سمجھائی تھیں۔ ماں ہی نے اسے کالی گھاٹ [illegible] میں داخل کرا دیا تھا۔ آج اگر ماں زندہ ہوتی! ویکٹر کبھی کبھی سوچنے لگتا۔ اگر ماں زندہ ہوتی تو کیا اسے دیکھ کر خوش ہوتی؟ [illegible] مرتبہ اس کا [illegible] دیکھ کر خوش ہوتی! ماں نے کیا اسے صرف بین صاحب بنانا چاہا تھا۔ ماں نے تو اپنے لڑکے کو انسان بنانا چاہا!

نہیں یا وہ انسان ہو سکا؟ کیا ڈگری انسان بنا سکتے ہیں؟ یہ ملازمت کی ترقی؟ یہ ڈی۔ ٹی۔ آئی؟ یہ ڈی۔ ٹی۔ ایس؟
[illegible] ایک مرتبہ ایک واقعہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ کالی گھاٹ اسکول کا طالب علم تھا۔ کالی گھاٹ اسکول کا [illegible] ہو رہا تھا۔ ویکٹر اس سے [illegible] تھا کہ اس کی دلچسپی [illegible] وہ زیادہ [illegible] گھنٹے کا۔ ڈرامہ کا نام "نیاگ" تھا [illegible] ویکٹر سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ تھا، اونچے درجوں میں پڑھنے والے لڑکے [illegible] اسکول کے لڑکوں [illegible] گھنٹہ بجنے کے ساتھ ہی [illegible] پردہ اٹھ گیا۔ اف وہ بھی کیا دنیا تھی! دیکھتے ہی دیکھتے [illegible] دور پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہاں موجود نہ ہو۔ اس روشنی سے، اس اجتماع سے، اس گھنٹے کی آواز سے [illegible] سے بہت دور کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔

[illegible] رو رو کر تالی بجا رہا تھا۔

لیکن ویکٹر کا خیال اس طرف نہیں تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے [illegible] کلاس میں اسی دنیا کی [illegible]
[illegible] ایک وقت تھا جب دنیا میں کوئی راجہ نہیں تھا، ریاست بھی نہیں تھی، سزا بھی نہیں تھی، سزا دینے والے بھی نہیں تھے۔ لیکن [illegible] نے جنم لیا اور مذہب دنیا سے ختم ہونے لگا۔ تمام دیوتا ڈر گئے۔ سب برہما کے پاس دوڑ پڑے ——
ویکٹر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دور [illegible] جیسے [illegible] نے دنیا [illegible] شروع کر دیا ہو [illegible]

نا انصافی کرتا ہے تو مہاجر معلوم کرتا ہے [illegible] جو خون کرتا ہے [illegible] اس کا تدارک کون کرے گا؟ اس وقت اس کا تدارک کرنے والے کہاں ہیں؟ اس وقت دیوتا سب کہاں ہیں؟ برہما کے پاس کون جائے گا؟ پرماتما کی تخلیق کون کر سکتا ہے جب وہ وشنو کا وقت کہاں ہے؟

دادا دیکھتے دیکھتے دیکر کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مگر تیج کے ساتھ دیکر بھی رونے لگا ——

ان تم نے غریبوں کی دولت چھین لی! مہاجر اگر چوری کرے،

میں نے سنا ہے کہ دنیا کا بھی ایک راجہ ہے —— تم اگر چوری

کرو تو [illegible] انصاف کون کرے گا!

واقعی [illegible] انصاف ہوگا؟ مہاجر اگر ظلم کرے تو کس سے انصاف کی درخواست کی جائے؟ کہاں جائے وہ دنیا کا [illegible] [illegible] کی شادی [illegible] اور [illegible] تو [illegible] کرے گا [illegible] اگر وہ بھی نہ ہو تو وہ کس سے اس کا تدارک کرنے کے [illegible] اس دنیا کا [illegible] کہاں ہے؟ [illegible] وہ کس ریاست میں رہتا ہے؟

اس نے [illegible] [illegible] تو اس کو بھی ہے اور صرف اس کا [illegible] گھیسٹی [illegible] [illegible] [illegible] کے [illegible] دیکر [illegible] بچے [illegible] [illegible] [illegible] سادھو [illegible] [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] دیکھنے کے لیے [illegible] [illegible] کے [illegible] دیکر بھی [illegible] [illegible] [illegible] ٹھیک [illegible] [illegible] پر ایک [illegible] [illegible] ہوتی ہے [illegible] سادھو [illegible] ہو گیا تھا۔

ایک ایک کر کے [illegible] [illegible] کی [illegible] کر [illegible] دی جا رہی تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] پر [illegible] تھے اور [illegible] کی [illegible] سے [illegible] ٹھاٹ بیٹھے تھے۔

ایک [illegible] [illegible] سادھو نے بات شروع کی [illegible] سادھو [illegible] بات [illegible] [illegible] اور [illegible] گیا۔

[illegible] سادھو کی [illegible] کاٹ [illegible] سادھو [illegible] [illegible] کے بعد وہ [illegible] کیا [illegible] [illegible] ایک [illegible] ہو گیا [illegible] ہو گئے اور [illegible] [illegible] رہ گئی۔

دیکھو [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] نے جواب دیا تھا۔

"کیوں ——— ؟"

ماں نے کہا تھا ——— "ان کی بھی تو جان ہوتی ہے، ان کو بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔"

"لیکن ماں کالی جو بکرے کا خون پیتی ہے پھر وہ کیا کھائے گی ؟"

ماں نے کہا تھا ——— "ماں کالی تو دیوی ہیں، دیوی دیوتا بغیر کھائے پیئے بھی زندہ رہ سکتے ہیں ——"

ماں کو اس وقت معلوم نہیں تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ جو لوگ دیوتا کے نام پر کاٹتے ہیں وہ ضرورت پڑنے پر دیوتا کا نام لے کر انسان بھی کاٹ سکتے ہیں، جو لوگ ظلم کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کو موقعے کی کمی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ کوئی — دیوتا کا نام لے کر بے انصافی کرتا ہے، کوئی راجہ کا نام لے کر نا انصافی کرتا ہے اور کوئی ملک کے نام پر نا انصافی کرتا ہے، بات ایک ہی ہے، دیوتا ہو، راجہ ہو یا ملک، جو اصل میں یہ ایک بہانہ ہی ہوتا ہے، بکرا بے زبان جانور ہے اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتا، لیکن کیا انسان بھی بے زبان ہے ؟ اگھور داود دیوتا کے نام پر جان کو کاٹتے ہیں لیکن کسی جان نے بھی تو کبھی احتجاج نہیں کیا!

ایک روز وینکر نے اگھور داود سے پوچھا تھا ——— "اچھا، اگھور داود تم جو اپنے جانوروں کو کاٹتے ہو تو وہ تمہیں کچھ نہیں کہتے ؟"

اگھور داود کو شاید اس روز بہت زیادہ سلامی ملی تھی۔ اس روز وہ بہت خوش تھے۔

بولے ——— "ڈور منہ جلا، کہیں گے کیا، وہ لوگ بھی تو دوسروں کو کاٹتے ہیں!"

"وہ لوگ کس کو کاٹتے ہیں، دیوتاوں کو ؟"

"ڈور، ڈور، میرے وکیل جان موکل کو کاٹتے ہیں، ڈاکٹر جان مریضوں کو کاٹتے ہیں۔"

"اور بھگوان کس کو کاٹتے ہیں ؟ میں کس کو کاٹتے ہیں ؟"

اگھور داود کی ذہانت دیکھ کر اس روز وینکر حیران ہو گیا تھا، اگھور داود کو سب کچھ معلوم تھا، ان کی معلومات ماں سے بھی زیادہ تھیں، ماما بابو سے بھی زیادہ تھیں، شاید ان کی معلومات پران متو بابو سے بھی زیادہ تھیں، اگھور داود کی جیسی لمبی داڑھی بھی کر رکھتے تھے، لیکن حیرت ہے ان کی معلومات کتنی زیادہ تھیں!

وینکر نے پوچھا تھا ——— "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں سبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں ؟"

اگھور داود نے جواب دیا تھا ——— "ہاں رے ہاں منہ جلا، سبھی ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں، میں بھی کاٹتا ہوں، بھگتی کاٹتی ہے اور پیچھے پیچھے تیرا رشتہ بھی ——"

وینکر نے کہا تھا ——— "لیکن میں کسی کو فریب نہیں دوں گا، اگھور داود، دیکھ لینا ——"

اگھور داود نے کہا تھا ——— "کیوں رے منہ جلا، تو اپنی ماں کو فریب دے گا اور تیری ماں مجھے فریب دے گی۔"

وینکر نے جواب دیا تھا ——— "نہیں اگھور داود، میں کبھی کسی کو فریب نہیں دوں گا۔ کبھی نہیں، تم دیکھ لینا ——"

اگر وہ ادھورے تھے، بے بس تھے ——— تو پھر جا کر پورے کیوں نہیں ہو گئے [illegible]

میرا کیا ہے، میری بات میرے جوتے سے ———

لیکن حیرت ہے، ادھورے ادھوری باتیں اتنی سچی ثابت ہوں گی، مگر [illegible] چُن لے گا، جس نے سوچا تھا، محسن نے کیا کہا تھا کیوں اس پر تمام الزام دھرے گئے تھے، محسن نے کیا تھا اس سے [illegible] بھیجا تھا، محسن کیا اس دنیا جیسا تھا، وہ پھر اس دنیا میں اتنے دنوں سے رہا تھا، اتنے دنوں سے [illegible] جب جب وہ آیا وہ شہر کی سڑک پر آیا تھا تو وہاں کیا حرکت محسن کی سے اس کی وحشت ہوئی تھی۔

ایک وحشی نے اس سے کہا تھا ——— "تم انسان نہیں ہو، ورنہ تم اگر انسان ہوتے ....."

دیکھو نے جواب دیا تھا ——— "لیکن میں دیوتا بھی تو نہیں ہو سکتے ———"

وحشی نے پوچھا تھا ——— "پھر تم کیا ہو؟"

دیکھو نے جواب دیا تھا ——— "میں کیا جانوں، تم ہی بتا دو؟"

وحشی نے کہا تھا ——— "تم جھوٹے ہو، تم ایک جانور جو ہو، تمہارا چہرہ دیکھنا بھی گناہ ہے، تم اس دنیا سے [illegible] ہماری زمین سے چلے جاؤ، نکل جاؤ۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر شور کر کے رونے لگی تھی اور اس رونے پر وحشی کو تسلی بھی نہ دے سکا تھا، اس کی ڈھارس بھی نہ بندھا سکا تھا، وہ وحشی کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

اور یہی شخص جب پہلی بار ملنے آئی تھی تو اس کے ساتھ کیسی حادثاتی ملاقات ہوئی تھی، وہ کتنا مغرور تھا۔ پھر بھی [illegible] وہ کتنی خوبصورت لگی تھی، گھر گھر والے [illegible] [illegible] اس کے گھر والے اور گھر والوں کے [illegible]۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اور [illegible] دیا تھا

[illegible] ہوئی بات ——

[illegible]

پھر وہ [illegible] قریب چلا گیا۔

لکشمی دیدی نے کہا ——— "آؤ، اندر آؤ ———"

جب سے پہلی بار لکشمی دیدی نے دروازہ بند کر دیا تھا لکشمی دیدی نے اس روز اپنے بالوں میں کوئی خوشبودار تیل لگایا تھا جس کی بھینی شرارت سی تھی۔ دیپک نے لکشمی دیدی کے چہرہ کی طرف دیکھا، اس سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہوئی ہے، آخر لکشمی دیدی کا چہرہ اتنا یوں ہے!

لکشمی دیدی نے پوچھا ——— "ارے، تو نے کل خط نہیں دیا تھا ———"

"کیوں؟"

دیپک کو حیرت ہوئی، نہیں دیا کیا مطلب؟ ٹھیک اسی آدمی کے ہاتھ میں تو وہ خط دے آیا تھا۔

اس نے کہا ——— "کیوں؟ ہر روز جس کو خط دے کر آتا ہوں، اسی کو تو دے آیا ہوں، اُسے نہیں ملا؟"

لکشمی دیدی نے کہا ——— "پھر اسے میرا خط ملا کیوں نہیں، اس نے مجھے لکھا ہے!"

دیپک نے کہا ——— "واہ رے، اتنے دنوں سے تمہارا ہر خط اس کو دے آتا ہوں اور کل کا خط کیوں نہیں دوں، بھی خوب ہو۔"

"پھر اُسے ملا کیوں نہیں، تو نے وہ خط کیا کیا، بول؟"

لکشمی دیدی کی آنکھوں سے غصہ جھلکنے لگا، اس نے بہت دنوں سے لکشمی دیدی کو اس طرح غصہ ہوتے دیکھا نہیں تھا۔

"بتا، وہ خط تو نے کیا کیا؟ کس کو دے دیا ہے؟ کہاں رکھا ہے، بتا؟"

دیپک نے کہا ——— "واہ رے، بیکار اوپر تو فضول خفا ہو رہی ہو، میں تمہارا خط لے کر کیا کروں گا؟ اتنے سارے خط اس کو دے آیا ہوں پھر بھی خط کیوں نہ دیتا؟"

"تو اس نے کیا غلط لکھا ہے؟"

دیپک نے کہا ——— "میں کیا جانوں؟"

"تو نہیں جانتے تو کون جانتا ہے؟ میں نے تو تمہارے ہی ہاتھ سے خط بھیجا تھا ———"

"تو کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں تمہارا خط نگل گیا ہوں؟"

"تو نے کس کو خط دیا ہے، سچ بتاؤ ———"

لکشمی دیدی یکایک اُسے پیار کرنے لگی۔

اُس نے کہا ——— "میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی، ڈرو مت، مجھے بتا دو کہ خط تم نے کیا کیا؟ وہ کہاں گیا ہے، شاید؟"

"تم کیوں ہوگا؟ میں تو ہر روز جیب میں رکھ کر لے جاتا ہوں، کل بھی جیب ہی میں، وہ تو تم نے دیا تھا ———"

"لیکن خط کا جواب تو نہیں دیتے ہو! جانے کیا معلوم ہے اس خط میں کتنی باتیں لکھی تھیں، وہ اگر کسی کے ہاتھ میں پہنچ جاتے ؟ ولی اگر پڑھے ؟"

وکٹر یکایک تن کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکا کر بولا

"لیکن تم بہر حال اس آدمی کو خط کیوں لکھتی ہو ممی دیدی ؟ وہ تمہارا کون ہے ؟"

ممی دیدی یکایک جیسے گم سم ہو گئی۔

وکٹر نے کہا ـــــ وہ ہر روز شام کے وقت تمہارے خط کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے، وہ تمہارے گھر کیوں نہیں آتا؟ گھر میں تو سب ہی کے سامنے اس سے کیوں باتیں نہیں کر سکتیں ؟ اور ایسی کون سی باتیں ہیں جو تم ہر روز اُسے خط لکھتی ہو ؟"

ممی دیدی دیر تک خاموش رہی پھر بولی

"تم نے ضرور میرا خط پڑھ لیا ہے، کیوں ؟"

وکٹر نے کہا ـــــ میں خواہ مخواہ تمہارا خط کیوں پڑھوں گا۔ تمہارا خط پڑھنے کی مجھے کیا غرض پڑی ہے، مگر وہ آدمی تمہارے گھر نہیں آ سکتا ؟"

ممی دیدی نے پوچھا ـــــ سچ کہتے ہو؟ تم میرا خط نہیں پڑھتے ؟"

"سچ کہتا ہوں ممی دیدی۔ میں نے تمہارا ایک خط بھی نہیں پڑھا ہے ؟"

"سچ کہتے ہو ؟"

"میں تو کہہ چکا ہوں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

"پھر وہ خط اُسے کیوں نہیں دیا ؟"

ممی دیدی جیسے کسی فکر میں پڑ گئی ـــــ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو

یکایک اُس نے کہا ـــــ پرسوں شام کے وقت ایک اور خط دے آؤ گے ؟

وکٹر نے کہا ـــــ کیوں نہیں دے آؤں گا۔"

"پھر جانے سے پہلے مجھ سے خط لے لوگے، کیوں ؟"

وکٹر نے جواب دیا ـــــ اچھا ـــــ

اتنا کہہ کر وکٹر چلا ہی تھا، یکایک ممی دیدی نے اُسے آواز دی

"سنو وکٹر ـــــ"

وکٹر رک گیا۔

ممی دیدی نے کہا ـــــ تم بڑے اچھے آدمی ہو ـــــ

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑ کر اوپر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اسی تیزی سے زینہ پھلانگتی ہوئی نیچے آ گئی، اس

... دیکھنے لگی تھی۔

"بولو ——— کیا ہے؟"

مسی دیدی نے ہاتھ بڑھا کر دینکر کو مٹھی بھر چاکلیٹ دینا چاہا۔

دینکر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا ہے؟"

مسی دیدی نے کہا ——— "اس روز جو چیز دی تھی۔"

"تمہارا یہ چاکلیٹ میں نہیں لوں گا۔"

مسی دیدی چونک اٹھی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں لوگے؟ تم چاکلیٹ نہیں کھاتے؟"

"کھاتا ہوں" دینکر نے جواب دیا ——— "لیکن تم سے نہیں لوں گا۔"

"کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

دینکر نے کہا ——— "اس دن بھی میں نے چاکلیٹ نہیں کھایا تھا۔ تم نے جس طرح دیا تھا اسی طرح رکھ دیا ہے۔ تم مجھے

... دیکر دیکھی دیدی ———"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

دینکر نے کہا ——— "تم چاکلیٹ نہیں بھی دوگی تو میں تمہارا خط پہنچا دیا کروں گا۔ جب تک تم چاہو گی میں پہنچاتا رہوں گا۔

... جو ہوگی میں کر دوں گا۔ لیکن تم مجھے چاکلیٹ نہ دیا کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ———"

مسی دیدی نے پوچھا ——— "کیا؟ کیوں؟ کیا ہوا بتاؤ نا؟"

دینکر نے جواب دیا ——— "تم سمجھتی ہو کہ چاکلیٹ نہیں دوگی تو میں تمہارا خط نہیں لے جاؤں گا۔ کیوں؟"

مسی دیدی نے کہا ——— "تم خواہ مخواہ ایسے آیا کرو نا۔ اچھا تو ہے۔ لیکن چاکلیٹ لینے میں کیا ہے؟"

"... دیکھو نا۔" دینکر نے کہا ——— "خط پہنچاتا ہوں یا نہیں!"

مسی دیدی ہنستی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اسے پیار کرنے لگی ———

"کیوں رے؟ میرا کام کرنے سے تجھے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

دینکر نے سر جھکا کر جواب دیا ——— "یونہی ———"

"لیکن میں تو تجھے برابر چھیڑتی رہتی ہوں۔ پھر بھی تجھے مجھ پر غصہ نہیں آتا؟"

دینکر نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسی دیدی کے سینے میں منہ چھپا کر کھڑے رہنے میں کتنا آرام تھا۔ مسی دیدی کے جسم سے

... خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

"اب میں تجھے کبھی نہیں ماروں گی بچے ———" نکھو دیدی نے کہا اور اس کے بعد چاکلیٹ نکال کر اس کو
دے دیا ———

"میں کتنی بھلی ہوں، چاکلیٹ تمہارے لئے لائی تھی میں غصہ ہو گئی تھی ——— ٹھیک!"

ویلکر نے چاکلیٹ لے لیا، اب کے اس نے انکار نہیں کیا۔

"پرسوں صبح کے وقت ضرور آؤ گے نا؟" نکھو دیدی نے پوچھا۔

"ضرور آؤں گا۔" ویلکر نے جواب دیا۔

نکھو دیدی نے کہا ——— "اب تم جاؤ ———"

پھر ذرا سے توقف کے بعد بولی ——— "یاد رکھو گے پرسوں صبح کے وقت ———"

اتنا کہہ کر نکھو دیدی چلی گئی تھی اور ویلکر کوٹھی کے دروازے سے باہر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

آنکھوں میں تیز دھوپ چمک رہی تھی اور کل اس وقت تک جو درد کا بہانہ کر رہا تھا اور وہاں اس وقت تک سہم
تھی اور ویلکر املتاس کے پیڑ کے سامنے میں دیر تک کھڑا رہا تھا۔

ویلکر دیر تک کھڑا رہا مگر اس کی دوپہر تھی جبھی دروازے بند کیے سو رہے تھے، اس روز انکل داد جی بھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، چنانچہ جبھی سویرے سو رہیا پا کام کاج ختم کر کے شاید دروازہ بند کیے سو رہی تھی، نتنی دیدی پہلی منزل پر اپنے کمرے میں پتہ نہیں کیا کر رہی تھی، چھینٹے نیچے پھر تابی کھیلکر اس وقت کہیں بیٹھے اڈہ مار رہے ہوں گے، شاید پیپر مٹی کی کسی ڈھابے کی دکان یا پھر ادھر ہی فورڈ بازار کی شمال جانب کسی کیپل سٹال پر بستی کے اندر بیٹھے ہوں گے۔ دوپہر کے وقت ایشور گنگولی لین کا اونچا ٹیپ تھا، اس کنارے سے اس کنارے تک پتہ کی چھت والے مکان تھے اور وہ بہت دور نیچے آسمان کی وسعتوں چیلیں اڑ رہی تھیں۔ اور اس کے مکان کی چھت پر ایک بانس کے سرے پر ایک پتنگ الجھ کر پھڑپھڑا رہی تھی مراسے پر تھوڑی دیر ہی پہلے تو پیچھے والے پھول کا رتن لوٹ لے جاتے جب گذر لیں گے اس کے بعد آئس کریم بیچنے والا آئے گا، اس کے بعد پانی چھڑکنے والی گاڑی آئے گی، اس کے بعد دھرم داس ٹرسٹ ماڈل اسکول میں چھٹی کا گھنٹہ بجے گا اور اس کے ساتھ ہی کالی گھاٹ میں سہ پہر ہو جائے گی۔

لیکن ویلکر دیر تک املتاس کے پیڑ کے نیچے کھڑے رہنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ نکھو دیدی نے آج اسے اتنا پیار کیوں کیا؟ آج اس نے اس کی ٹھوڑی اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر کتنا پیار کیا تھا۔ نکھو دیدی کے جسم سے پھوٹتی ہوئی میٹھی میٹھی خوشبو اب بھی جیسے ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ یکایک ویلکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے آج کی دوپہر دوسرے دنوں جیسی نہیں تھی، آج کی دوپہر پہلے سے زیادہ حسین تھی، آج جیسے کتے کی آواز بھی اور دنوں کی طرح کرخت نہیں تھی، نیلے آسمان کی وسعتوں پر چیلیں اڑ رہی تھیں، وہ چیلیں نہیں تھیں ——— ویلکر کی خواہشیں تھیں جیسے آج ویلکر کی خواہشیں پنکھ نکال کر اڑ رہی تھیں۔ گرما کی یہ دوپہر کتنی حسین اور کتنی پیاری پیاری سی تھی۔ ایسا تو کبھی محسوس نہیں ہوا، ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا، املتاس کے پیڑ کے نیچے

...میں کھڑے رہنے کے بعد ڈینکر کو بڑی تکلیف سی ہوئی اس کے بعد پیڑ پر نگاہ ڈالتے ہی اُس نے دیکھا کہ پیڑ پر بیٹھا ہوا کوا
...سے غور سے دیکھ رہا ہے ۔ اتنی دیر سے وہ مسلسل کائیں کائیں کر رہا تھا لیکن اب خاموش ہو گیا تھا اور اب اس کی طرف
...بے ٹل ہی دل میں کیا سوچ رہا تھا ۔ وہ کوا بھی آج اسی کی طرح اکیلا تھا۔

...ے آ ــ آ ــ آ ــــ

ڈینکر بات سمجھ کر اُسے جھڑکنے لگا۔

کوا پہلے ذرا چوکنا ہو گیا اور اُڑنے کے لیے پر تولنے لگا ۔ لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر رُک گیا اور پھر ڈینکر کی طرف غور سے
...لگا

ڈینکر کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہی کوا اس روز اس کی تھالی سے جھپٹ کر بھات لے بھاگا تھا ۔ یہی کوا شاید انگنو دادو کے گھر میں
...چاول، کیلا اور سندیش ہر روز کھا جاتا ہے ۔ حاجی قاسم کے باغ کے ایک کونے میں ناریل کے کچھ درخت ہیں ۔ شاید یہ کوا
...درختوں پر رہتا ہے ۔ اس روز یہی کوا کبوتر کے ڈربے سے انڈا لے کر بھاگ گیا تھا ۔ یہ بہت بدمعاش کوا ہے ۔ ڈینکر نے بہت
...دیکھا تھا کہ اس کوے کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا ۔ اس وقت تک اچھی طرح اس کے پر نہیں نکلے تھے اور وہ دیر تک منہ کھولے
...رہتا اور راستے میں یہی کوا کہیں سے منہ میں کوئی چیز لاتا اور اس کے منہ میں ڈال دیتا ۔ بچے کا منہ لال تھا شاید بہت چھوٹا
...کے بعد ایک روز جب وہ باغ میں پھول چننے گیا تو اس نے دیکھا کہ بہت سارے کوے ایک جگہ جمع ہو کر ایک ساتھ
...کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں ۔ تقریباً ایک سو، دو سو اور تین سو کوے جمع ہو گئے تھے ۔ پہلے تو ڈینکر کو
...ہوا تھا ۔ اتنے سارے کووں نے صبح سویرے یہ کیسی محفل جما رکھی ہے ۔ درختوں کی نچلی شاخوں پر بیٹھے ہوئے بڑی بے چینی
...کر رہے تھے اور کبھی اُڑ کر اِس شاخ پر آ رہے تھے کبھی اُس شاخ پر جا رہے تھے اور شور مچائے ہوئے تھے۔

پہلے ڈینکر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا ۔ اس کے بعد اُس نے قریب جا کر دیکھا کہ ایک کوے کا بچہ کیچڑ میں چت مرا ہوا پڑا ہے
...کے پر چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ۔ آہا! اس بچے کو کس نے مار دیا ۔ باز پرندہ
...

اس کے بعد ڈینکر نے اس بچے کو کبھی نہیں دیکھا ۔ اس کے بعد یہی کوا اکیلا امرود کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھا رہتا اور کبھی
...رہتا ۔ ایسے ہی انگنو دادو کے گھر میں گھس کر چاول، کیلا اور سندیش جھپٹ کر لے جانے کی کوشش کرتا ۔ ماں کے باورچی
...سے بھرے برتن میں منہ ڈال دیتا ۔ بھات کی تھالی اور مچھلی کے ٹکڑوں کی طرف آہستہ آہستہ کھسکتا رہتا اور ماں اُسے دیکھتے ہی
...ڈانٹ کر بھگا دیتی۔

ہش ہش ــــ

لیکن کوا زیادہ دور نہیں بھاگتا ۔ پھر امرود کے پیڑ کی شاخ پر آ کر بیٹھ جاتا اور اِدھر اُدھر تاک جھانک کرنے لگتا اور کبھی کبھی
...کائیں کائیں کرنے لگتا۔

وکی نے اسے پھر کہا

"آ ـــ آ ـــ آ ـــ"

مگر اس وقت بکس خالی تھا، وہ گردن ٹیڑھی کر کے دیکھنے لگا۔

وکی نے تمام چاکلیٹ آنکھوں میں پھینک دیا ـــ

"کھالے، تو بھی سب کھالے، میں نے تجھے یہ سب دے دیا، سب تو ہی پیٹ بھر کر کھالے ـــ اب مجھ کو روز تمام چاکلیٹ بھی دے گی، تجھے دے دیا کروں گا ـــ آ ـــ آ ـــ"

کوا ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں آگیا۔

"مجھے چاکلیٹ کی ضرورت نہیں ہے نہ، ممی روز خود ہی یونہی دے دیا کرے گی، چاکلیٹ بیٹھے بیٹھے ہی دے دوں گا، بیٹھے بیٹھے دے دوں گا، ممی ویسے بھی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے، یہ سب تو کھالے، تو ہی کھالے یہ سب ـــ"

شیخ تو ٹھیک ہی کہنے لگا ـــ "اُسے سو بہت کہہ دیا، بہت ہو، آ کر مت جاؤ۔"

"میں روز کرے آؤں گا۔" وکی نے جواب دیا ـــ "میں کل سے ایک ہی روز میں چکر دے آؤں گا۔"

"نہیں، جس طرح گھر کر بادل آسمان میں ... اس نے کہا ـــ "ابھی پانی برسنے لگے گا، دیکھو رکے۔"

وکی نے آسمان کی طرف دیکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ... کے چاند ... سمندر میں گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چندی بابر کے سمندر میں ... چندی بابو کے گھر ... کی ہو رہی تھی، وہ ... پر ... نہیں ہوئی تھی، صرف جشن ... کے موقع پر بڑی دھوم دھام ہوتی ... اور وکی کتنی ہی بار جشن ... کے دن ... جا کر ناشتہ کر چکے تھے، اس روز وہاں جو بھی جاتا تھا، اسے ناشتہ پیش کر دیا جاتا تھا۔

جس روز ... اسکول میں ... بتایا کہ ... وہ گھر لوٹا تھا، رات زیادہ ہو چکی تھی، بڑی رات گئے ... ہوا تھا اور ... جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اس جیتی بابر کے سامنے ... اس نے بھوت دیکھا تھا۔

"ممی، اصلی زندہ بھوت ـــ"

وکی نے بڑے ہونے کے بعد دنیا میں بہت سے بھوت دیکھے تھے لیکن اس روز جو بھوت اس نے دیکھا تھا اس کی مثال نہیں۔

اس وقت ... کے کانوں میں ... بے گرنے ... بجتے تھے اور ... ہر بار کی سنائی ہوئی کہانی یاد آگئی، بہت پہلے کی بات ہے ... کا زمانہ تھا جب دنیا میں کوئی ... نہیں تھا ... نہیں تھی، سبھی ... کی پناہ میں ایک دوسرے کی بھلائی کرتے تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، اس کے بعد ایک ... نے جنم لیا ... اور ...

نیتی بھی اور اس کے ساتھ پیار رشتہ اور تعلق کی بنیاد پڑی۔ لوگوں کی عام عقل چھن گئی، وید ناپید ہو گیا اور لوگوں نے پوجا دینا بند کر دیا۔ ان دنوں دیوتا پوجا کے نذرانے کھا کر زندہ تھے، وہ سب فاقے کرنے لگے۔

اس حالت کو دیکھ کر تمام دیوتاؤں نے برہما کے پاس جا کر دربار کیا۔

برہما نے کہا ــــ تم لوگ وشنو کے پاس جاؤ، وہ اس کا تدارک کریں گے۔

آخر کار تمام دیوتا وشنو کے پاس گئے۔

بولے ــــ دنیا کے لوگ اب پوجا نہیں کرتے، وید نہیں پڑھتے، اب ہم لوگ کیا کھا کر زندہ رہیں گے، آپ اس کا تدارک کیجیے۔

وشنو نے جواب دیا ــــ تم لوگ اپنے گھر جاؤ، میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔

آخر کار اس کا انتظام ہو گیا۔ کیا انتظام؟ وہ یہ کہ انھوں نے دنیا میں ایک راجہ کی تخلیق کی۔

بولے ــــ اب اور کسی فکر و تردد کی ضرورت نہیں، اب یہی راجہ تمام لوگوں پر حکومت کرے گا، جو ادھرمی ہیں انھیں سزا دے گا اور جو نیک ہیں ان کی پرورش کرے گا۔

اس طرح پرتھو راجہ کی تخلیق ہوئی۔ دنیا میں امن لوٹ آیا، مسرت لوٹ آئی، مذہب لوٹ آیا، سب کچھ واپس آگیا اور دنیا والے پھر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن یکایک پھر [illegible] آیا۔

کرن بھی ادھر دیکھ کر اس کے ساتھ ہی واپس آ رہا تھا۔

اس نے کہا ــــ جانتے ہو دیپو، انگریز ہی ہمارے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ ان لوگوں کے جاتے ہی دیکھو گے ہم سب برابر ہو جائیں گے، اس وقت کوئی بھی چیز خریدنے کے لیے روپیے کی ضرورت نہیں رہے گی، دیکھ لینا ــــ"

دیپو نے کہا ــــ "تم سے کس نے کہا؟"

"میں خود جلسے میں جا کر سن آیا ہوں" کرن نے جواب دیا ــــ "اس جلسے میں ایک آدمی کہہ رہا تھا کہ ہمارے ملک میں بہت [illegible] سمندر کے پانی سے نمک تیار کرنے کا [illegible] ــــ اب نمک خریدنے کے لیے پیسہ نہیں دینا ہو گا۔"

دیپو نے پوچھا ــــ "تمہیں اتنا نمک کیا ہو گا؟"

کرن نے جواب دیا ــــ "اصل چیز تو نمک ہی ہے، کسی کسی دن میں صرف نمک بھات کھا کر ہی اسکول جاتا ہوں، صرف نمک بھات، جس دن نمک نہیں ہوتا ہے میں بھات کھا ہی نہیں سکتا ــــ"

"تمہارے بابا اب تک اچھے نہیں ہوئے؟" دیپو نے پوچھا۔

کرن نے جواب دیا ــــ "صبر کرو، اچھے ہو جائیں گے، اب زیادہ دیر بھی نہیں ــــ"

سوراج کس طرح آئے گا یہ کرن کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ پارک میں جا کر تقریر سنتا اور جو کچھ سنتا آ کر دیپو سے کہہ دیتا۔ تقریر

... جو شاید آیا تھا اس کا خون ایک سفید تھا اور وہ کسی دوزخ سے جیسے سارا تھا اور اس کی طرف ... تمام ہو چکا تھا ...
... سے سرخ ہوتا اس کا رنگ گہرا تھا لیکن بیچ کے پیلے کپڑوں میں اس کی رحمت بیٹھ ڈھکی ہوتی اور جب کبھی ...
... ہوتا تھا تو بہت حسین دکھائی دیتا تھا۔

اس روز ایسا دیکھنے کے بعد پکی میں بیٹھ کر ان راستوں پر چلتے جب وہ دونوں کالی بستی پہنچے تھے ... کے بعد ... بیچ گلوں فرشتے میں تھا۔ یہاں سے کہیں کوئی راستہ جاتا تھا اور وہ پکڑ کر سیدھے ... کی طرف آتا تھا ... کہیں بھی کسی ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں تھا۔

کھڑا ہو گیا۔

"کیوں ۔۔۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ گے؟"

"ہو جاؤں گا۔" وکٹر نے جواب دیا۔

"ڈر نہیں لگے گا؟"

"نہیں۔ ڈر کیسا؟" وکٹر نے جواب دیا۔

"اچھا تو اب میں گھر جاتا ہوں ۔۔۔"

... کر کے چلا گیا تھا۔ وکٹر نے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے کُتبے پر گیس بتی شمار ہو رہی تھی اور گیس بتی سے تھوڑی دور ... تھا، جیسے ایک ہی ... گھلا ہو۔ یکایک اسے پھر ڈاماس کے مقالے یاد آ گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بھی اس دنیا میں پہنچ گیا۔ اس نے کہا ۔۔۔

اب تم نے غریبوں کی دولت چھین لی: راجہ اگر چوری کرے،
میں نے سنا ہے اس دنیا کا بھی ایک راجہ ہے ۔۔۔ تمہاری
کہ تو تمہارا انصاف کون کرے گا؟

... کے مقالے اسے اچھی طرح یاد ہیں تھے۔ واقعی راجہ تو راجہ ہے۔ دنیا کا راجہ۔ وہ تمام جرموں کا انصاف کرتا ہے جو ... کو سزا دیتا ہے گناہوں کو معاف کرتا ہے: وہ دنیا کا راجہ اگر ناانصافی کرے ۔۔۔ اس کا انصاف کون کرے گا؟

یکایک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چنڈی والے مکان کے قریب باغ میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہو۔

کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟

وہ جگہ بالکل تاریک تھی اور باغ کے قریب تاریکی اور بھی گہری اور بھی دبیز ہو گئی تھی: وہ اب ایک قدم بھی چل ... سکتا تھا لیکن وکٹر کی ہمت جیسے سب ہو گئی تھی، جیسے اس کے دونوں پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگا ۔۔۔

"کیا ہے وہاں پر وہ کیا ہے؟"

ایسا لگا جیسے ایک بھوت دانت نکالے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا ہے اور سر جھلا جھلا کر ہنس رہا ہے اور اس کی خاموش ہنسی رات میں گونج رہی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وینکر کا سارا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا، وہ اپنی پوری طاقت صرف کر کے چیخنا چاہتا تھا، لیکن اس کی چیخ حلق میں اٹک گئی اور وہ سایہ تاریکی میں ڈوبا ہوا اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ ایسا لگا جیسے اس کی خاموش ہنسی کی صدائے بازگشت سے ایشور نگر کی گلیوں میں چھایا ہوا دبیز تاریکی کا پردہ تار تار ہو گیا ہو۔

ماں جاگ رہی تھی، باہر قدموں کی چاپ سنتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔

"کون، مکھو! تم آگئے؛ اتنی رات ہو گئی؟"

لیکن وینکر کا چہرہ دیکھ کر ماں کو بڑی حیرت ہوئی۔ وینکر کی زبان جیسے گنگ ہو گئی تھی اور اس کا سارا جسم پسینے میں تر تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر ماں سے لپٹ گیا۔

"کیا ہوا! تمہیں کیا ہو گیا؟"

وینکر نے کہا ——— "ماں! میں نے بھوت دیکھا ہے۔"

"بھوت!"

ماں کو بے حد تعجب ہوا۔ وینکر کو تخت پوش پر بٹھا کر پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔ ڈراما دیکھنے گیا تھا یا کیا، ڈر کے کریہ کیا ہوا!

"تم نے ڈراما دیکھا؟" ماں نے پوچھا۔

وینکر نے ہانپتے ہوئے جواب دیا ——— "ڈراما دیکھ کر آ رہا تھا کہ یکایک چنڈی بابو کے مکان کے کونے میں کھڑا ہوا ایک بھوت دیکھ کر بھاگتا ماں ———"

ماں ہنسنے لگی۔

"پاگل ——— معلوم نہیں تم نے کیا دیکھ کر کیا سمجھ لیا۔ بھوت ووت کا کوئی وجود نہیں۔ کہاں ہے بھوت؟ بھوت اصل ہی کی [illegible] اتنی عمر ہو گئی پھر بھی بھوت سے ڈرتے ہو؟"

وینکر نے کہا ——— "نہیں ماں، میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں، میری طرف دیکھ دیکھ کر بھوت ہنس رہا تھا، تم چلو میں تمہیں بھی دکھا دوں گا ———"

"اچھا تو پھر چلو، تمہارا بھوت کہاں ہے میں بھی دیکھ لوں۔"

اس معمولی سی بات میں ماں وینکر کو ساتھ لے کر نکل پڑی تھی۔ اس وقت رات کے بارہ یا ایک بجے ہوں گے۔ گاؤں کے لوگ سو چکے تھے اور چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ راستے سنسان تھے۔ چنڈی بابو کے مکان کا تیس نمبر تھا، تیس نمبر [illegible] کے اندر [illegible] تھی۔ وہ [illegible] کے لیے کتنی ہی بار چنڈی بابو کے مکان میں جا چکا تھا [illegible]

ـت تھی لیکن ابھی اتنی بڑی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ عمارت کے اندر ڈپٹی بابو کے مکان کے صحن میں ساس بیلا کی بہار تھی
ں پر مرغ پلے ہوئے اور بے ترتیب سے آگے سیڑھیاں بنا کر کہیں اور گودام دیواریں بھی تھیں اس دروازے کے اندر گلی میں
ـے کی دکان مکمل ہو گئی اور صحن دونوں سے بھر جاتا اور صحن کے چاروں طرف گرد بیلا کی ٹہنیاں لٹکا دی جاتیں۔ بہت سادہ
ں ہوتیں اور عورتوں کو دیکھتے جنہوں نے تبرے کے پیچھے جا کر ابھر جاتا۔ ایک لڑکے کے چبوترے پر ساہوکار کی دوکان
رکھی ہوتیں اور چھپنے چھپانے کے بچوں کر وہاں پر ایک ایک بتاشہ پرشاد تھا۔

ڈپٹی کے دن چندی بابو کے مکان میں بڑی بھیڑ لگی رہتی اور اس کے بعد سارے بازار کی صفائی ہوتی تھی اس کے بعد بستر
ں بچھائے گئے صحن میں اس مکان کے دو چار بچے اودھم مچاتے رہتے۔ ایک مرتبہ اسی چندی بابو نے اسے اپنے گھر
ال دیا تھا۔

اس وقت اس کی عمر اور بھی کم تھی اور وہ دھرم داس اسکول میں پڑھتا تھا۔ بھائی پور میں اس دن ایک تقریب تھی
اسے کچھ بھولا وقت تھا اور وہ کسی کے ساتھ ہی بہت دور تک گیا تھا اور تقریباً پڑھا ہوا سا کے قریب چھ
اور وہاں پر سب لوگ فٹ بال میچ ہو رہا تھا وہاں سے فٹ بال میچ دیکھ کر وہ واپس آ رہا تھا اس وقت شام کے پانچ بجنے تھے
ـب ایک ہنگامہ ہوا تھا جیسے کہیں پر کوئی بم پھٹا ہو۔

گئے اپنے کان کا پردہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا اور دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ راستے میں جتنے لوگ تھے وہ سبھی چونک اٹھے تھے اور
بے تحاشہ ادھر ادھر بھاگنے لگے تھے۔

• بھاگو چلو ریب ــــــ کر رہے گیا اور اتنا کہہ کر وہ دوڑ پڑا۔
اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر بھی بھاگ کھڑا ہوا۔
راستے میں ہر طرف بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔

اس کے بعد پھر ایک دھماکہ ہوا اور اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جو سائیکل پر جا رہا تھا، سائیکل سے نیچے گر پڑا، اس کے
پیچھے ایک اور آدمی سائیکل پر سوار تھا اس کے سینے میں پاس ایک گولی لگی اور وہ بھی زمین پر آ رہا اور وہیں کے قریب ڈھیر ہو گیا اور
جیسے لال لال خون کے فوارے چھوٹنے لگے۔ یہ سب دیکھ کر دونوں بد حواس ہو گئے اور بے تحاشہ بھاگنے لگے۔

وہ گھبرا کر پشت سے دوسری طرف ہو کر اور دوڑ کے دوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے رک گئے اس کا دم پھولنے
لگا اور وہ دونوں بری طرح ہانپنے لگے تھے۔ اور اس وقت کسی نے پکارا اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور بولا
• بسنت چیٹرجی کو مار ڈالا گیا ــــ
• کس نے مارا؟
• سودیشیوں نے!

وہ دونوں اتنا ہی کہہ سکے، بسنت چیٹرجی کو وہ تھا اُسے کس نے مارا؟ یہ سب کچھ وہ کہہ نہ سکے، جس کو بعد میں بھی موقع
...تھ۔ بھاگ رہا تھا، وہ دونوں وہاں پر بھی ٹھٹھک گئے، پھر بھاگ کھڑے ہوئے اور دوڑتے دوڑتے ڈیشور لنگڑا لین میں آکر
...رستے میں ان دونوں نے دیکھا کہ مخالف سمت سے ایک آدمی سائیکل پر چلا آ رہا ہے، اُسے دیکھ کر دونوں گھبرا گئے ——

"وہ ہمیں پکڑ لے؟"

کرن نے کہا —— "بھاگ چلو یہ ——"

سامنے ہی چنڈی بابو کا مکان تھا، اس بنگلے کا گیٹ کھلا ہی تھا، کرن دوڑ کر اندر چلا گیا اور اس کے پیچھے پیچھے وجنکر
...گھس گیا۔ اتنی ہی دیر میں سارے کلکتے میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ پولیس کے ڈپٹی کمشنر بسنت چیٹرجی کو سودیشیوں نے گولی مار کر
... چنڈی بابو بوڑھے آدمی تھے، وہ اس وقت ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔

انھوں نے چیخ کر کہا —— "رام دھنی گیٹ بند کر دو۔"

رام دھنی کہیں دوسری طرف تھا، وہ دوڑتا ہوا آیا اور گیٹ بند کرنے ہی جا رہا تھا کہ یہ دونوں اندر گھس پڑے۔

چنڈی بابو ان دونوں کو دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر تنے اور بولے

"گیٹ آؤٹ —— گیٹ آؤٹ —— گیٹ آؤٹ ——"

مجھے آج بھی یاد ہے، اس روز چنڈی بابو کو دیکھ کر وجنکر اور کرن شام کے اندھیرے میں غیر محفوظ حالت میں ان کی پناہ
...میں آگئے تھے، دو معصوم بچوں کو اس روز چنڈی بابو نے پناہ نہیں دی تھی۔ شاید انھوں نے ان دونوں کو قسمت کے ہاتھوں
...ب کر دینا اطمینان کر لیا تھا، لیکن ان کی قسمت کے بنانے والے نے آخرکار خود انھیں بھی زیادہ دنوں تک زندہ رہنے نہیں

لیکن یہ بہت دنوں بعد کا واقعہ ہے۔

اس روز بھی اُسے اسی چنڈی بابو کے مکان پر جانا تھا، راستے بالکل سنسان ہو چکے تھے، دور دور تک ایک آدمی کا بھی پتہ
... وجنکر کو ساتھ لیے ہوئے تنگ گلیوں سے گزرنے لگی۔ شتیو گھوش کے بعد ایک موڑ تھا اور اس کے بعد ہی چنڈی بابو کا مکان تھا، مکان کے
سامنے وہ باغ تھا، وجنکر کو چاروں طرف دیکھ دیکھ کر اس وقت بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے کہا —— "ڈرنے کی بات نہیں، میں تو تمہارے ساتھ ہوں، آؤ، کہاں ہے، تمہارا بھوت کہاں ہے؟"

وجینکر نے چاروں ہی سامنے نظر اٹھائی، کسے وہ چیز نظر آگئی، ابھی تک وہاں پر اندھیرا تھا، اندھیرے میں وہ بھوت ابھی تک
... ہنس رہا تھا، ٹھیک اسی طرح دانت نکالے ہوئے جیسے ... تھا۔

وجینکر نے کہا —— "وہ دیکھو، وہ رہا ——"

میں نے بھی چند لمحوں تک غور سے دیکھا۔ اس کے بعد ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر اچھی طرح جائزہ لیا۔

وجنکر نے کہا —— "دیکھ لیا، میں نے کہا تھا ——"

"اچھا تم ہی چلو دادا جان" — اس نے جواب دیا۔

یہ کہہ کر اس نے چھڑی اٹھائی اور ایک کیبن کی سمت چل پڑی۔ گیٹ کے بائیں جانب ایک کمرہ تھا جو شاید کسی زمانے میں صرف گیٹ کے اوپر کسی کی چوکی رہی ہو گی۔ اس کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سبھی لوگ گھر کے اندر ہی تھے۔ اتنی رات گئے کون جا سکتا تھا۔

اس نے آواز دی — "رام دھنی! اے رام دھنی —"

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر آواز دی — "رام دھنی! ایک بار باہر آؤ تو —"

رام دھنی باہر نکلا اور باہر آتے ہی اس نے پوچھا —

"کون؟"

اس نے جواب دیا — "میں دیپو کی ماں ہوں۔ تم ذرا اپنے باغ کی بتی جلا دو تو۔ باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے بابا؟"

رام دھنی پرانا آدمی تھا۔ اس بستی کا قدیم باشندہ تھا۔ رام دھنی نے اندھیرے میں بھی اس کو پہچان لیا۔

پوچھا — "کون؟ دیپو کی ماں؟ کیا چاہیے دیپو کی ماں؟"

"ذرا اپنے باغ کی بتی ایک بار جلاؤ گے رام دھنی" اس نے جواب دیا — "ذرا بتی جلا دو تو —"

رام دھنی نے سوچا، جا کر باغ کی بتی جلا دی اور دوسرے ہی لمحے اس طرف اجالا پھیل گیا۔ اس نے دیکھا اور ساتھ ہی دیپو نے بھی دیکھا۔ باغ میں ایک چبوترے کے اوپر بانس کی ایک اونچی لکڑی گڑی تھی اور اس کے اوپر ایک ہیٹ رکھا ہوا تھا اور ایک مٹی کی ہانڈی بندھی ہوئی تھی اور وہ لکڑی میں ایک لنگی پہنا دی گئی تھی۔ بندروں کو بھگانے کے لیے ایک آدمی کی مورتی بنا دی گئی تھی۔ ہوا میں آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ لنگی کے پلے میں ہوا بھر رہی تھی۔ واقعی کتنی حیرت کی بات تھی۔ دیپو اس راستے سے دن کے وقت کئی بار گزر چکا تھا لیکن اس نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

اس نے رام دھنی سے کہا — "اب تم بتی بجھا دو رام دھنی۔"

اس کے بعد دیپو سے بولی — "دیکھ لیا؟ ایک کیسا بھوت ہے دیکھ لیا؟"

اس روز دیپو مان گئے۔ اس پہلے اس بات کا ذرہ بھر بھی خدشہ ہو گیا تھا کہ دنیا میں بھوت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ انسان سے ڈر — بھوت وہ اس کا ایک واہمہ ہوتا ہے۔ لیکن دیپو جلد ہی بڑا ہو گیا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس بھوت کے بارے میں پوری واقفیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کسی زمانے میں بھوت کا کوئی وجود نہ رہا ہو لیکن اس کے بعد بھوت وجود میں آگیا تھا۔ بھوت نے زمانے میں جنم لیا تھا اور اس کے بعد انسان کی دنیا میں ان گنت بھوت پیدا ہوتے رہے تھے۔ ان کا چہرہ، ان کا لباس، پوشاک سبھی کچھ انسانوں کی طرح تھا۔ لیکن دراصل وہ سب انسان نہیں تھے۔ وہ سب بھوت تھے اور — انسانوں کا روپ دھار کر انسانوں کے سماج میں گھومتے پھرتے رہتے تھے اور موقع ملتے ہی انہیں ڈراتے رہتے تھے اور جب فرصت ملتی، انسانوں کا خون پی کر روپوش ہو جاتے تھے۔ دیپو کا یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔

اس روز جالی کام کے باغ سے جلدی جلدی پھول چن کر وہ مندر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ پہلے ماں کے مندر میں گیا تھا۔ ماں کے مندر میں جینا گلاب کے کئی پھول دینے کے بعد سیتا، رادھا، گنیش، جگن ناتھ، شری کرشن اور اس کے بعد بھگوان شیو کے مندر میں پھول دیا تھا۔

"دیکھئے کاکا —— پنڈت جی ذرا جلدی سے پھول لے لیجیے، بہت زور سے پانی آ رہا ہے۔"

واقعی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ خاص طور پر مندر کی چھت کے اوپر سیاہ بادلوں کا اجتماع تھا۔ اس کے بعد چبوترے پر بیٹھ کر ٹھیک کر مندر کے گرد گھوم کر گلی کے اندر سے کنڈو پر گھر کے دروازہ تک جانے کا راستہ تھا۔ دوسری طرف جس کے سامنے ہوتی پیڑے کی دکان تھی جس کے اندر پیڑے بنتے تھے اس کے بعد پورب رخ کا دروازہ تھا۔

اس وقت تک مندر میں کافی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی کاریں لگی ہوئی تھیں اور کاروں سے اتر کر گوری گوری مارواڑی عورتیں اور گورے چٹے مارواڑی مرد ننگے پاؤں مندر میں آ رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھکاریوں کی ٹولی لگی ہوئی تھی۔ ان کا لباس صاف ستھرا اور قیمتی تھا اور سرخ و سپید چہرہ! ان کے اندر بڑی بھگتی تھی۔ وہ پنڈت کو بہت زیادہ دان دیتے تھے اور اسی لیے پنڈے بھی ان کی بڑی خاطر و مدارات کرتے۔ اس کے برعکس وہ دینکر کی کوئی خاطر نہیں کرتے تھے کیونکہ دینکر انہیں ایک پیسہ بھی سلامی نہ دیتا تھا۔ صرف پھول دینے سے بھی کہیں ماں کالی کا پیٹ بھرتا ہے؟

یکایک بارش کی دو چار بوندیں ٹپ ٹپ اس کے جسم پر گر پڑیں۔

دینکر محراب کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں پر اس کا سر بھیگنے سے محفوظ رہے گا اور خود بھی نہیں بھیگے گا۔ ٹکٹکی دیدی کا مقصد اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہاں پر کھڑے ہو کر جہاں تک اس کی نگاہ جا سکتی تھی وہ متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بارش ہو رہی تھی۔ شاید وہ بھلا آدمی بارش کی وجہ سے نہیں آ رہا ہے یا ممکن ہے کہ ابر آلود آسمان ہونے کی وجہ سے وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا ہو۔ کہیں وہ خود آج وقت سے پہلے تو نہیں آ گیا؟ سات بج چکے ہیں کیا؟ اس طرف پیڑے کی دکان میں ایک دیوار گھڑی ہے۔ وہاں جا کر وقت دیکھنے سے پتہ چل جاتا!

دینکر سر کو بھیگنے سے بچاتے ہوئے دکان کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سات بج کر بیس منٹ ہو گئے تھے۔ دوسرے دن کی نسبت آج دیر ہو گئی تھی۔ اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ وہ بھلا آدمی اسی وقت تو آتا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے۔

کبھی کبھی وہ بھلا آدمی پہلے ہی سے آ کر کھڑا رہتا تھا۔

دینکر کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔

"آ گئے کھوکا؟"

دینکر جیسے خوشحال کرنے سے ملے رہتا۔

"نہیں ——"

[illegible] بات سے اتنا نروس کر دیا کہ وہ کچھ نہ کہہ سکا اور [illegible] [illegible] ہو یا ایک سرے ہی جاتا۔ اس کا رنگ صاف تھا اور وہ [illegible] [illegible] رہتا [illegible] کو بھی ساتھ تھا خود پڑھتے پڑھتے جیسے سگریٹ کا پیکٹ نکالتا اور پھر ہار کر سگریٹ سلگاتا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں اگل دیتا۔ وہ ایک ہی خط کو بار بار پڑھتا۔ ایک بار پڑھ لینے کے بعد دوبارہ پڑھتا، دوبارہ پڑھ لینے کے بعد سہ بارہ پڑھنے لگتا جیسے وہ اپنے خط میں کیا کچھ لکھتی تھی [illegible] جب [illegible] کر دیتا ہو، [illegible] اس [illegible] وہ [illegible] بار بار پڑھتا رہتا اور [illegible] کا ذرہ ذرہ جیسے ہوش [illegible] کی طرح گزارتا رہتا۔

آخری بار خط پڑھ کر وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر کہتا ——

• گڈ بائے ——

اتنا کہہ کر وہ سیدھا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا جاتا۔

اس کے بعد ڈیکر آہستہ آہستہ [illegible] پر گھر کے جنوبی سمت سے ہوتا ہوا [illegible] کی طرف چل پڑتا۔ جب تک وہ خط پڑھتا رہتا، ڈیکر کو بہت اچھا لگتا۔ وہ [illegible] طرح بنگالی نہیں بول سکتا تھا۔ پتہ نہیں کس ذات تھا۔ لیکن کچھ مختلف قسم کا تھا۔ [illegible] شکل سے بھی نہیں لگتی تھی۔ [illegible] گھاٹ میں ایک آدمی بھی ویسا نہ تھا۔ [illegible] کی دہلیز پر بیٹھ کر جو لوگ [illegible] مارتے تھے جیسے [illegible] کے [illegible] وہ بھی اس جیسے نہیں تھے۔ [illegible] اسکول کے پاس [illegible] جیسے نہیں تھے۔ [illegible] کے موڑ پر [illegible] کو دیکھا تھا وہ [illegible] کی طرح [illegible] تھا۔ وہ انگریزوں سے بڑی حد تک مشابہ تھا۔ [illegible] گھر کی سمت جو بڑے بڑے صاحبوں کی کوٹھیاں تھیں، [illegible] کی طرح تھا۔ چندو بابو بھی بڑے آدمی تھے۔ چندو بابو کے یہاں [illegible] منشی [illegible] تھا۔ لیکن ان کے گھر کے لوگوں کا چہرہ بھی ویسا نہیں تھا۔ [illegible] میں کچھ لوگوں کا چہرہ ایسا ضرور تھا۔ ڈیکر نے [illegible] بازار میں فٹ بال [illegible] دیکھتے وقت ایسے لوگوں کو دیکھا تھا۔ [illegible] روز پولیس کے ڈپٹی کمشنر [illegible] کا خون ہوا تھا، اس روز ڈیکر نے اسی قسم کے چہرے کے دو آدمیوں کو دیکھا تھا [illegible] نہیں تھے۔ [illegible] تھے۔ ان کا رنگ بھی گورا تھا۔ [illegible] دھوتی [illegible] ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ [illegible] بعد [illegible] دو دھماکے ہوتے ہی وہ دونوں [illegible] کے قریب [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] کی طرف چلے گئے تھے۔

ڈیکر کو یاد ہے

اس روز وہ [illegible] کا خط لے کر [illegible] پاس آیا اور [illegible]

[illegible]

— غضب ہو گیا ڈیکر ——

شاید کرن کے بابا مرگئے ہیں؟ دینکر خاموشی سے کرن کا چہرہ تکنے لگا۔

"میں تمہارے ہی پاس جا رہا تھا" کرن نے کہا

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

کرن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

دینکر نے پوچھا —— "تمہارے بابا مر گئے ہیں کیا؟ کب؟"

"نہیں" کرن نے جواب دیا —— "اخبار میں خبر چھپی ہے بھائی۔ سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے —— یا ہوگا؟"

سی۔ آر۔ داس قضا کر گئے؟ کیا ہوگا؟ کرن کو کتنی امیدیں تھیں، اُسے امید تھی کہ سی۔ آر۔ داس راجہ بن گئے! ئیں اب کیا ہوگا، کرن کا چہرہ کیسے مرجھا گیا تھا، کرن گونگے کی طرح دینکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کرن نے کہا —— "سادھو نے تو کہا تھا کہ سی۔ آر۔ داس اس ملک کے راجہ ہوں گے۔"

دینکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے، وہ بھی چپ چاپ کرن کا منہ تکنے لگا، کرن کی نگاہوں میں ساری دنیا بے نور ہوگئی تھی، اگر راجہ ہی مر جائے تو لوگوں کی حالت کیسے بہتر ہوگی، کرن کے بابا کی حالت کیسے سدھرے گی؟ تو کیا بے دام قرض دینا بیجا ہوگا؟ تمام عمر بھیک مانگنا پڑے گی؟ پھر اس کا مکان کیسے بنے گا؟ پھر سوراج کیسے ہوگا؟ اس روز کرن بے مسائل کا کوئی حل نہ پا کر جیسے ایک دم مایوس ہو گیا تھا۔

بہت دیر تک چپ رہنے کے بعد دینکر نے پوچھا

"اسکول نہیں جاؤ گے؟"

"اسکول میں آج چھٹی ہے" کرن نے جواب دیا —— "کل بھی چھٹی رہے گی۔"

اس کے بعد قدرے رک کر بولا —— "کل کیوڑا تلہ میں سی۔ آر۔ داس کو پھونکیں گے تم دیکھنے جاؤ گے بھائی؟"

"جاؤں گا۔" دینکر نے کہا —— "ہم دونوں ایک ساتھ چلیں گے۔"

کرن نے کہا —— "ذرا سویرے ہی چلیں گے بھئی، ورنہ کیوڑا تلہ میں بڑی بھیڑ ہو جائے گی۔"

اس روز گھر لوٹتے ہی وہ سب سے پہلے کسی ریڈی کے پاس گیا تھا، نیپال بھٹاچارجی اسٹریٹ کے موڑ پر مدھوسودن کی دکان پر آج بہت بھیڑ لگی ہوئی تھی، اخبار زمین پر پڑا ہوا تھا، سبھی پڑھ چکے تھے اور اب آپس میں بحث کر رہے تھے۔

دینکر ایک منٹ کے لیے وہاں پر رک گیا، محلے والے لوگ وہاں پر جمع تھے جن میں دونی کاکا کی عمر سب سے زیادہ تھی۔ دونی کاکا کہہ رہے تھے —— "مر گئے تو اچھا ہی ہوا، یہ سب چرخہ ورخہ کات کر کیا فائدہ ہوتا بھائی، چرخہ کات کر آزادی ملتی ہے؟ یا چرخہ کات کر ملک آزاد ہوتا ہے؟ ہوں! مجھے سمجھاؤ۔"

مدھوسودن کے بڑے بیٹے نے کہا —— "گاندھی جی تو راستہ دکھا رہے ہیں" مجھے دونی کاکا، گاندھی جی کی بات پر پورا وشواس کرنے والا

سب کچھ تو نہیں رہا۔"

پھر وہ اکڑ رہے تھے، انھوں نے کہا ——

"یہ ساری چاندی کا ڈھیر نہیں ہے بلکہ ایک سیلاب تھا وہ بھی چلا گیا۔ ابھی آپ لوگ نہیں سمجھ سکتے یہ بات، اگلا کبھی کو کبھی نہیں آنے کی، بعد میں سمجھیں گے —— دولت رہتے ہوئے تو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ——"

پیچھے والے ایک طرف کھڑے تھے، انھوں نے کہا ——

"سب ٹھیک ہے۔ ایم۔ سیکھا پیا کا بھروسہ ہے سب ہماری دولت وہی ہے ——"

پھر وہ ان کی بات اچک لی، بولے ——

"اسے رہنے دو، رہنے دو، کس کے ساتھ کس کا موازنہ کر رہے ہو! وہ جو کچھ ہیں ٹھیک ٹھیک بتاتے ہیں۔"

دھو سروں کے چھوٹے بیٹا نے ان کی بات کاٹ دی

"دیکھا جائے بابا سرسوتی پوریں کیا کہتا ہے ——"

دونوں کالا کی صورتیں بہت دیکھی تھیں، ان کے دلائل کے سامنے چھوٹے بڑوں کی منطق دھری کی دھری رہ جاتی۔ دونوں کالا دنیا کو اپنے دلائل سے مات دے دینے میں استاد تھے، وہ صرف پرستش گرو رشتے کے عادی تھے۔

انھوں نے کہا —— جس کا نام تل چادر کا نام کشل۔ وہ تمہارے سرسوتی پوریں چھوڑ آیا ہے، ایم۔ سیکھا کچھ ایک گرل ہی سب ٹھیک ہو جائیں گے ——

ان کی باتیں دیپکر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ اس قسم کے مباحثے تو بار بار ہوتے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے سب ہی سب۔ وہ سب سمجھتے تھے کہ اب کوئی بھی تو نہیں رہ رہا تھا، پھر ان کی طرح کوئی بھی تو ڈھال اور پریشان نہیں تھا! دیپکر اس لیے متعجب ہوا تھا!

دیپکر وہاں سے چلا آرہا تھا کہ اتنے میں پیچھے والے نے آواز دی

"ارے دیپو، سنو تو، اس طرف آکر سن جاؤ ——"

دیپکر کے قریب جانے پر پیچھے والے نے پوچھا ——

"ارے تمہارے مکان میں کون کرایہ دار آیا ہے؟"

"مکھو دیدی وغیرہ۔" دیپکر نے جواب دیا۔

"مکھو دیدی وغیرہ، جو لڑکی بس میں بیٹھ کر اسکول جاتی ہے یہ ناتینہ میٹرو پڑھتی ہے، میں نے دیکھا ہے، وہ ... ہے، اس کے باپ کیا کرتے ہیں پیشہ؟ بابا کیا کرتے ہیں؟"

دیپکر نے کہا —— پیشہ! بابو مکھو دیدی کے باپ نہیں ہیں، اس کے ماما ہیں، اس کے ماما تو بہاریں ... کالا کے ... ہیں، وہ لوگ بہت امیر آدمی ہیں۔"

"اچھا تو یہ کے کاکا کیا کرتے ہیں، تم جانتے ہو؟"
"دفتر میں نوکری کرتے ہیں۔" دینکر نے جواب دیا۔
پچھلے والے نے پھر پوچھا ——
"کس دفتر میں؟"
دینکر نے جواب دیا —— "یہ تو مجھے نہیں معلوم۔"
ونی کاکا نے پچھلے والے سے پوچھا ——
"تمہیں ٹھیک معلوم ہے؟"
پچھلے والے نے جواب دیا ——
"میں نے دیکھا جو ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ونی کاکا ——"

اس کے بعد سبھی مل کر آپس میں کاکا بابو کے بارے میں کچھ باتیں کرنے لگے۔ دینکر اُن کی باتیں سمجھ نہ سکا۔ اس وقت وہ صرف یہ سوچ رہا تھا ... سی۔ آر۔ داس کی موت پر کوئی بھی تو خوش نہیں ہے۔ سبھی لوگ تو پہلے ہی کی طرح آج بھی مشغول جانے ہوئے تھے۔ کوئی تبدیلی بھی تو نہیں ہوئی۔

دینکر آتے ہی مکھو دیدی کے مکان میں داخل ہو گیا۔ کاکا کی ماں اس وقت برآمدے میں بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں۔ غسل ... اور بھیگے ہوئے بالوں کو پیٹھ پر پھیلا دیا تھا۔

دینکر نے جاتے ہی پوچھا —— "کاکا کی ماں، مکھو دیدی کہاں ہے؟"
"اوپر پڑھ رہی ہے۔" کاکا کی ماں نے جواب دیا —— "دیکھو جا کر۔"
"آپ نے سنا ہے کاکا کی ماں، سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"
"کہاں؟" کاکا کی ماں نے کھوئے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔
"دارجلنگ میں۔" دینکر نے جواب دیا —— "کل کیوڑا تلہ میں بڑی بھیڑ ہوگی ——"

کاکا کی ماں جس طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹ رہی تھیں، اسی طرح بیٹھی ہوئی ترکاری کاٹتی رہیں۔ دینکر بہت ساری باتیں ان سے ... لیکن وہ بالکل چپ چاپ بیٹھی رہیں جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ پھر کاکا کی ماں اٹھ کر گوبر کر تھیلے میں رکھ ... اٹھانے کے متعلق ہدایت ... دینے لگیں۔ حیرت ہے یہ لوگ تو بیچارے یہ نہیں سوچ سکتے کہ بنگالیوں کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے! حیرت ہے! کتنی حیرت ... کی بات تھی۔ دینکر زینے کے سیدھا اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ اوپر کمرے میں اپنے اسی کمرے میں کاکا بابو بیٹھے ... پڑھ رہے تھے۔ پڑھنے میں وہ اس قدر محو تھے کہ دینکر کے قدموں کی چاپ بھی نہ سن سکے۔

دینکر ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر آواز دی

"کاکا بابو ——"

کاکا بابو نے چونک کر دیکھا، بولے ———

"ہوں، دیپو بابو ———"

اتنا کہہ کر وہ پھر اخبار پڑھنے لگے۔

دیپکر نے کہا ——— "سی۔ آر۔ داس مر گئے، اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے بولے ———

"کیا کہا؟"

"سی۔ آر۔ داس مر گئے۔" دیپکر نے جواب دیا ——— "اب کیا ہوگا کاکا بابو؟"

کاکا بابو نے اسی طرح اخبار پڑھتے ہوئے کہا ———

"ہوگا کیا، کچھ نہیں ہوگا ———"

"کچھ نہیں ہوگا؟"

کاکا بابو نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دیپکر تھوڑی دیر تک وہاں پر کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا جلی حرفوں میں اخبار میں چھپا تھا

DESHBANDHU PASSES

AWAY

A BOLT FROM THE BLUE

اور اس خبر کے چاروں طرف سیاہ لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ اور میان میں دیش بندھو کی ایک تصویر تھی۔ دیپکر دیر تک تصویر کو دیکھتا رہا۔ جسم پر ایک چادر لپٹی ہوئی تھی، کھدر کی چادر تھی اور سر کے پاس ناک کے نیچے کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ تعجب ہے! کوئی کچھ نہیں بول رہا ہے! یہ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ سی۔ آر۔ داس کے مر جانے سے کیا کچھ نہیں ہوگا؟ کسی کا کوئی نقصان نہ ہوگا؟ پھر پران متھا بابو بار بار سی۔ آر۔ داس کی باتیں کیوں کرتے ہیں اگر وہ پھر اس طرح کیوں روتا ہے؟ شاید لکھی دیدی بھی اپنے کمرے میں بیٹھی ہو، وہ رو رہی ہوگی۔

دیپکر نے لکھی دیدی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھی ہوئی ایک تصویر دیکھ رہی تھی۔ دیپکر کی طرف اس کی پشت تھی۔ وہ لکھی دیدی کے کمرے میں چلا گیا اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے تصویر پر نگاہ ڈالی۔ حیرت ہے، وہ اسی آدمی کی تصویر تھی جس آدمی کے پاس وہ ہر روز خط لے کر جاتا تھا۔

دیپکر کے قدموں کی آواز سن کر لکھی دیدی چونک اٹھی اور تصویر کو جلدی سے اس نے ساڑی کی تہہ میں چھپا لیا۔ بولی

"کون دیپو؟ خط دے دیا تھا؟"

دیپکر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ اس نے قدرے رک کر کہا ———

"لکھمی دیدی! تم نے سنا سی۔ آر۔ داس مر گئے؟"

لکھمی دیدی نے حیرت سے دیپکر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد بولی ——

"میں سن چکی ہوں، لیکن تم نے خط دے دیا تھا نا؟"

"ہاں دے دیا تھا۔" دیپکر نے جواب دیا۔

اس کے بعد تھوڑے رک کر اس نے پوچھا

"اچھا لکھمی دیدی! یہ جو سی۔ آر۔ داس مر گئے ہیں تو اس سے کچھ نہ ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

دیپکر نے کہا —— "اتنے بڑے آدمی مر گئے اور کچھ بھی نہ ہوگا؟"

لکھمی دیدی نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا ——

"ہوگا کیا؟ ایک دن تو سبھی کو مرنا ہے۔"

یہ بات دیپکر کو اچھی نہ لگی۔ سبھوں کے ساتھ سی۔ آر۔ داس کا مقابلہ! سی۔ آر۔ داس کیا دوسرے لوگوں کے برابر تھے؟ … دیدی کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ کتنا بڑا نقصان ہوا ہے! پچادا ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ دانت پیستے ہوئے … قدر نہیں کرتے۔

دیپکر وہاں سے چلا آ رہا تھا کہ یکایک اسے ایک بات یاد آگئی۔

اس نے کہا —— "تمہارا ایک خط ہے لکھمی دیدی۔"

"خط!" لکھمی دیدی یکایک اچھل پڑی —— "خط ہے تو بتایا کیوں نہیں؟ لاؤ ——"

دیپکر نے جیب سے خط نکال کر دے دیا۔

"میں ایک دم بھول گیا تھا ——"

… لکھمی دیدی اس کا ایک ایک سطر چاک کر کے پڑھنے لگی۔ خط پڑھتے وقت وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی، جیسے … لکھمی دیدی بے حد حسین ہو گئی ہے۔ غسل کر کے اس نے ایک سرخ ساڑی پہن رکھی تھی اور گلے میں سونے کا ایک ہار چمک رہا … وہ گندھا ہوا تھا اور اس کے گلے کا وہ گندھا ہوا حصہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ جتنی دیدی کا گلا اس طرح کھلا نہ … کرتے میں چھپائے رہتی تھی۔ لیکن لکھمی دیدی کے گلے کا بلاؤز چھپے ہوئے تھی۔ وہ بڑی دیر تک خط پڑھنے میں محو رہی۔ … میں نہ جانے کیا لکھا ہوتا ہے اور لکھمی دیدی بھی ہر روز کیا کچھ لکھتی رہتی ہے اور وہ آدمی بھی سب کام چھوڑ کر ہر روز کیا لکھا کرتا … خط کے انتظار میں کیوں بیٹھا رہتا ہے اور خط پڑھتے وقت اس کا چہرہ اس طرح خوشی سے کیوں کھل اٹھتا ہے؟ اس کے … گال کیوں سرخ ہو جاتے ہیں اور وہ اتنا سگریٹ کیوں پیتا ہے اور سگریٹ پیتے ہوئے ایک ہی خط کو بار بار کیوں پڑھتا

خوش ہوتے ہوئے یکایک کملو دیدی آپ ہی آپ بولی ——

"کل تو میں نہیں جا سکوں گی۔"

وِنکر نے پوچھا —— "کہاں نہیں جا سکو گی کملو دیدی؟"

"نہیں، میں تم سے نہیں کہہ رہی ہوں۔"

اس کے بعد وِنکر کی طرف دیکھ کر بولی ——

"دیکھو تو! اک مشکل آ پڑی ہے، کل تو میں نہیں جا سکوں گی۔"

"تمہیں کہیں جانے کے لیے کہا ہے کملو دیدی؟" وِنکر نے پوچھا۔

کملو دیدی نے جواب دیا —— "وہ تم نہیں سمجھو گے، وہ ایک خاص جگہ ہے لیکن کل تو ستی آ رہی ہے۔"

"ستی! ستی آ رہی ہے!"

کملو دیدی نے کہا —— "اس کو ستی کو لانے کے لیے جانا ہو گا۔ کل ستی آ رہی ہے نا! بابا نے خط لکھا ہے کہ صبح ساڑھے نو بجے ستی کا جہاز یہاں پہنچے گا۔"

ستی! ستی کے بارے میں وِنکر اتنی باتیں سن چکا تھا کہ اس کے بارے میں اسے پوری واقفیت ہو چکی تھی جیسے وہ ستی سے مل چکا ہو اور ستی کو دیکھنے کی اب کوئی ضرورت باقی نہ رہی ہو۔ بہت دنوں سے اس نے اپنے ذہن میں ستی کی ایک تصویر بنا رکھی تھی۔ وہ اب تک کلکتہ کا باہر رہا اور کملو دیدی کی زبانی اتنی ساری باتیں سن چکا تھا کہ ستی اب اس کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ جیسے کملو دیدی کی طرح ستی بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

وِنکر نے پوچھا —— "ستی کل آ رہی ہے یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟"

"آج ہی تو بابا کا ٹیلیگرام ملا ہے۔" کملو دیدی نے جواب دیا۔

"مگر وہ کس کے ساتھ آئے گی؟ ستی اکیلی آ سکے گی؟"

کملو دیدی نے کہا —— "بڑے ماموں اور ایک صاحب کلکتہ آ رہے ہیں۔ انہیں کے ساتھ بابا نے بھیج دیا ہے۔ وہاں اس کی تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے اسی لیے —— وہ دیکھتے نہیں، وہ بستر ستی کے لیے ہی کیا گیا ہے، ستی یہیں رہے گی۔"

اتنی دیر بعد وِنکر کی نظر پڑی، کمرے کے ایک طرف کملو دیدی کا بستر تھا اس کے دوسری طرف ایک دوسرا بستر لگا ہوا تھا۔

اس رات اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ستی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وِنکر نے اس وقت تک ستی کو نہیں دیکھا تھا لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اسے کھیلنے کے لیے گھر میں ہی ایک ساتھی مل گیا ہو۔ کملو دیدی بڑی تھی، منٹو دیدی بڑی تھی، چھوٹے پھونتا بھی اس سے عمر میں بڑے تھے اس لیے وہ کسی کے ساتھ نہیں کھیل سکتا تھا۔ جب سے

ـی کی خواہش ہوتی تو چھپ کر کرن کے گھر جانا پڑتا۔ اب ستی آ رہی ہے، ستی تو اس کی ہم عمر ہے۔ ستی تو عمر میں اس سے بڑی ہے ——

اُسے یاد ہے، اس روز رات کو وہ اچھی طرح سو نہ سکا تھا۔ اُسے یاد ہے وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا

اُس نے دھیرے سے ماں کو پکارا تھا۔

"ماں ——"

"کیا ہے، تم ابھی تک نہیں سوئے؟"

دھیکر نے کہا —— "اگر کل سویرے مجھے اُٹھنے میں دیر ہو تو مجھے جگا دینا ماں۔"

وہ کیوں سویرے اُٹھنا چاہتا تھا، سچ پوچھیے تو اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ پھر بھی اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اگر اُسے ـنے میں دیر ہو گئی تو اُس کا بہت نقصان ہو جائے گا۔

اور دوسرے دن دھیکر علی الصبح ہی جاگ گیا تھا۔ یکایک اُسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ صبح بھی اور دنوں ہی کی طرح تھی۔ اُسے حیرت ـی ہوئی، آخر یہ صبح بھی ویسی ہی کیوں ہے۔ کوئی بھی فرق تو نہیں، جس طرح ہمیشہ سورج مشرق کی طرف سے طلوع ہوتا تھا اور امرا کے پیڑ ـی پیلی شعاعیں پڑتی تھیں، اس روز بھی اس کی شعاعیں ویسی ہی پڑ رہی تھیں اور جنو بھی اور دنوں کی طرح آنگن میں جھاڑو دے ـہی اور کسی کو مخاطب کر کے گالیاں بکے رہی تھی —— تجھ پر غضب نازل ہو، تجھے موت آ جائے، خون کی قے کر کے مرے، ـ پر ڈال کر کیوڑا تلہ میں رکھ آؤں، جتنی جیسوا میں ہیں سب جمع ہو گئی ہیں، تجھے میں بھینٹ چڑھا دوں، چھنال عورت، ـے منہ میں ...."

آنگن کے ایک کنارے پر آہستہ آہستہ منہ دھوتے ہوئے دھیکر نے سوچا —— جنو کو شاید معلوم نہیں ہے کہ [illegible] داس مر گئے ہیں۔

اُس نے پوچھا ——

"جنو! تمہیں معلوم ہے؟ تم نے سُنا؟"

"کیا سُنوں گی رے، مجھے ان لوگوں نے کیا سُننے کے قابل رکھا ہے۔ ان جیسواؤں نے میری [illegible] آگ جلا کر رکھ دی ہے۔ [illegible] نے مجھے کچھ سُننے کے قابل رکھا ہے رے۔ ان ابھاگنوں کے منہ میں ......"

وہ صبح پتہ نہیں کیسے گزر گئی تھی۔ بھات کھا کر گھر سے نکلتے ہی اُس نے دیکھا تھا، بہت سارے لوگ کیوڑا تلا کی طرف ـتے، کرن کے گھر پہنچ کر اُس نے باہر ہی سے آواز دی ——

"کرن، کرن ——"

اندر جانے کی ممانعت تھی، ماں نے منع کر دیا تھا۔ اس وقت تک پارک آدمیوں سے بھر گیا تھا۔ نیپال بھٹا [illegible]

[illegible] جانے کے راستے میں بڑی بھیڑ لگ گئی تھی۔ انسانوں کے سروں سے بیگ بھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ [illegible] سے پہلے ریلوے اسٹیشن میں ٹرین پہنچنے کی بات تھی۔ اس کے بعد وہاں سے پیدل چلتے چلتے ایرپورٹ روڈ کا راستہ مال گودی روڈ پر آ گئے۔ اس وقت تک تمام لوگ درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ بچے جہاں بھی درخت کی شاخوں پر اپنی جگہ بنالی تھی۔

پھر بارہ بجے، ایک بجا، لیکن دور تک کسی کا پتہ نہ تھا۔

اچانک اُسے بھیڑ میں کرن نظر آیا۔

"اے کرن! تم یہاں! میں نے تمہارے گھر جا کر بہت آواز دی تھی —"

کرن نے کہا — "میں تمہارے انتظار میں بڑی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ آخر چلو آؤ، یہاں اس کھمبے پر چڑھ جاؤ، یہاں سے صاف دکھائی دے گا —"

آخر کار ڈھائی بجے دن کو یکایک سامنے سے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا اور اس سمندر کو چیرتے ہوئے جیسے تمام ملک کی امیدیں، آرزوئیں، خواہشیں اور حسرتیں جیسے ایک جگہ میں بیدار ہو اٹھیں۔ جیسے ملک کے اس عظیم سمندر نے وجے کی روح کو اور بھی تیز کر دیا ہو اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام انتہا کی ترچیزوں میں شامل کر رہ گئی۔ جیسے یکایک شہر سنسان ہو گیا، جیسے کہیں بھی کوئی آدمی نہ ہو، کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دے رہی ہو اور وجے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سامنے کی دنیا سے ترنگے جھنڈوں کا ایک پہاڑ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہوں۔ اتنے پھول تھے۔ میں وجے کی روح نے جیسے یہ ایک چاہا چاہا، جیسے جی بھر کر پھول چننے سے اُسے تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔ جیسے پھول چننے کے بعد اُسے تھوڑی سی تسکین مل جائے گی۔

جھنڈوں کا پہاڑ اس کے سامنے سے گزر گیا، لیکن اُسے پھر بھی ہوش نہ آیا۔

کرن نے کہا — "وہ دیکھو پنڈت جی —"

وجے نے اُن کے سفید بال، بے ترتیب کھدر کا لباس، وہ سب ہی ایڑی کا اٹھا ہوا ہوتا، وہ جیسے ہی وہ آج بھی یاد رہتے ہیں۔

کرن نے کہا — "وہ دیکھو مہاتما گاندھی —"

ایک ایک کر کے کرن نے سب ہی کی پہچان کرا دی۔ کرن سب کو پہچانتا تھا، وہ سب کو جلسے میں دیکھ چکا تھا۔

وجے نے کہا — "وہ دیکھو، ابھی وہ —"

ابھی وہ دوسرے پاس کے ایک کنارے کھڑے تھے۔ ان کی بینائی کمزور تھی، پھر بھی وہ دیکھنے آئے تھے، کرن جانتے تھے۔ پھر، پاس کے رشتے نزول پاس کر بھی دیکھا گیا۔ اس کا اسکول چھوڑ کر جو سال تھا سو ہر روز چلا گیا تھا۔ آج وہ بھی آیا تھا اور ایک دور ناموش کھڑا تھا اور کھڑا کھڑا دیکھ رہا تھا اور اس کے قریب ہی اس کا دربان کھڑا تھا۔ چپکے سے آیا تھا، کسی کو آیا نہ —

...سرکار، وہ بھی آج یہاں آیا ہوا تھا، مگر واپس جاکر اس نے سنا تھا کہ بنتی دیدی کو ساتھ لے کر ماں بھی آئی تھی، دونی کاکا
...تھی پھر رہے تھے، پھوسنے دا، دھو سودو کے بڑے بھیا اور پچاوا سبھی ٹولی بنا کر آئے تھے۔

دینکر نے کہا — "وہ دیکھو چھیٹے بھی آیا ہے —"

مگر دوادو کا بیٹا فوراً سے چھیٹے بھی آیا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دھوتی کو لنگی بنا کر پہن رکھا تھا، بڑی بھیڑ تھی ایک ...بھی ایسا باقی نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو، صرف کاکا بابو، کاکی ماں اور بنتی دیدی نہیں آئی تھیں جیسے وہ لوگ دوسری جماعت کے لوگ ...ہیں جیسے وہ سب دوسروں سے علاحدہ ہوں۔

یکایک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی سرشی کے پیڑ کی ایک شاخ چڑچڑاتی ہوئی زمین پر آرہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک جھنڈ ...کا تھا جو نیچے آگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، چاروں طرف شور غل مچ گیا، بولو ہری ہری بول ——

صبح سے لے کر شام تک وہ دن سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلکتے کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ...ہیں۔ اب اس روز کی بات کسی کو یاد بھی نہیں، سبھی بھول چکے ہیں، تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے! دینکر تمام رات ...سکا تھا، اس روز اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا، گھر لوٹنے کے بعد بھی اُسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔

کرن نے گھر لوٹتے ہوئے کہا تھا ——

"پھر دیکھو، اس سادھو کے پاس چلیں، ہیٹے سے دریافت کریں ——"

شمشان سے لوٹ کر وہ کرن کے ساتھ ساتھ سیدھا سونار کا ٹنگ کے گھاٹ پر سادھو کے پاس گیا تھا، ایسا کیوں ہوا؟ ...وہ اگر مرگئے — تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دینکر بھی کوئی نہ دے سکا تھا، دونی کاکا، پھوسنے دا، پچاوا ...کاکی ماں اور بنتی دیدی، کوئی بھی نہ دے سکا تھا، کسی کے دل میں ذرا بھی غم کا احساس نہیں تھا، حالانکہ نظر کے سامنے ...حادثہ ہو چکا تھا، سب کچھ خاک ہوکر ختم ہو گیا تھا، چتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگ ...سے مقصد تھا؟

دینکر نے پوچھا — "سو جاش برس کیوں نہیں آنے سے کرن؟"

کرن نے کہا —— "سو جاش برس زحل میں ہے، تمہیں نہیں معلوم؟"

دینکر نے پوچھا —— "پھر کیا ہوگا بھائی ——"

"چلو، سادھو سے جاکر دریافت کریں۔" کرن نے جواب دیا۔

پتھر پٹی جمہ رکر کے مندر کے آمنے سامنے سونار کا ٹنگ گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف خوانچے کی دکان تھی، پنڈال ...دکان تھا، پتھر بچھا ہوا راستہ تھا، کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی، کرن اُسے کھینچتا ہوا مغرب کی سمت لے چلا، مغرب کی سمت ...اور گنگا کنارے یہ سونار کا ٹنگ گھاٹ تھا، کرن ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف مڑ گیا۔

کے ابھرے ہوئے جسم کی جانب کے راستے میں بڑی بڑی چٹانیں تھیں، انسانوں کے سروں سے بڑھ کر ابھرا ہوا دکھائی دیتا تھا
اس سے پہلے جیسا کہ میں نے پیچھے کی بات کی تھی، اس کے جسموں سے پہلے چلتے ہوئے ابھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے،
کھلی ہوئی روشنی پڑ رہی تھی، اس وقت تک تمام لوگ اس پر چڑھ کر چلے گئے تھے، پیچھے جہاں سمندر نے ساحل کی شاخوں پر اپنی
جگہ بنائی تھی۔

پھر وہ بے ہوش ہوا، کیپٹن فلنٹ کو کسی کا پتہ نہ تھا۔

اچانک اسے بجلی سی کوند گئی۔

ڈاکٹر ... یہاں! میں نے کہا ... تم کو بہت آواز دی تھی ---

گرین نے کہا ---- میں تم سے انتظار میں بڑی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ آخر تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ یہاں سے

سب صاف دکھائی دے گا ----

آخر کار دکھائی دے رہا تھا کہ سامنے سے انسانوں کا ہجوم نہیں تھا، دکھائی دیا اور اس ہجوم کو دیکھ کر
سب میں تمام لوگوں کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ خود جنگل اور سمندر بھی ایک جگہ میں ساکن ہو گئے، جیسے دنیا کے اس عظیم منظر
نے ان کو ڈھک لیا ہو، اور ان کے ساتھ ہی ساتھ تمام انسانوں کو تیرتی چیزوں میں شامل کر دیا گیا۔ جیسے بجلی
تھم سی گئی ہو، جیسے کہیں بھی کوئی آدمی نہ ہو، کہیں سے بھی کوئی آواز سنائی نہ دے رہی ہو اور وہ چکر کھا رہا ہو جیسے اس
سال کی بہار آ کر ان کا ایک پہاڑ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہو، ہر طرف پھول ہی پھول ہوں۔ اتنے پھول تھے کہ
میں ... [illegible] نے جیسے کچھ کہنا چاہا، جیسے وہ ہمیں بہکا رہے ہوں، آنکھ سے تھوڑا سا سکون مل جائے گا، جیسے بچے کے
آنسو تھوڑی دیر کے لیے تھم جائیں گے

جزیرے کا پہاڑ ان کے سامنے سے گزر گیا، لیکن اسے پھر بھی ہوش نہ آیا۔

گرین نے کہا ---- وہ دیکھو، یہ ان کا ہجوم ہے ---

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، جب ہم نے قریب سے دیکھا تو وہ سب ہی ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو رہے تھے، وہ آج بھی یاد ہیں
سب کے

گرین نے کہا ---- وہ دیکھو، سامنے کا ہجوم ---

ایک ایک کر کے گرین نے جزیروں کی پہچان کرا دی، کیونکہ سمندر کو پہچانتا تھا، وہ سمندر کو پیشگی ہی دیکھ چکا تھا۔

وہ جیسے کہتا ہے ... وہ دیکھو، وہ کچھ ہوا ہو ---

ابھی وہ دو فٹ پانی کے ایک کنارے پر کھڑے تھے، جن کو پانی کاٹ رہا تھا، پھر بھی وہ دیکھنے آئے تھے کہ وہ جب
جزیرے پانی کے نیچے ڈوب رہے تھے کہ [illegible] کا ایک حصہ اس کا جسم بن کر ساحل سے دور ہو گیا تھا، آج وہ بھی آیا تھا کہ
وہ موتی کھڑا تھا، اور کھڑا کھڑا ڈوب رہا تھا اور اس کے قریب ہی اس کا دوست کھڑا تھا، پچھلی بار آیا تھا، کسی کو یاد نہ تھا ...

سو چند سرکار، وہ بھی آج یہاں آیا ہوا تھا! مگر واپس جا کر اس نے سنا تھا کہ چنتی دیدی کو ساتھ لے کر ماں بھی آئی تھی، دونی کاکا مونچھوں پیچکتے تھے، پھرنے ما، مدھوسودن کے بڑے بھیا اور پچا، سبھی ٹولی بنا کر آئے تھے۔

دینکر نے کہا — وہ دیکھو چھوٹے بھی آیا ہے —

مگر وہ ادھر کا تھا ذرا سے پیچھے بھی آیا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دھوتی کو لنگی بنا کر پہن رکھا تھا۔ بڑی بھیڑ تھی، ایک دن بھی جیسا باقی نہ بچا تھا جو آیا نہ ہو، صرف کاکا باپو، کاکی ماں اور سکھی دیدی نہیں آئی تھی جیسے وہ لوگ دوسری جماعت کے لوگ ہیں جیسے وہ سب دوسروں سے علاحدہ ہوں۔

یکایک جھکی جھکی بارش ہونے لگی۔

اور اس کے ساتھ ہی سرشی کے پیڑ کی ایک شاخ چڑچڑاتی ہوئی زمین پر آ رہی اور اس کے ساتھ ہی انسانوں کا ایک جھنڈ دوڑ کر گرتا ہوا نیچے آ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چاروں طرف شور غل مچ گیا، بولو ہری ہری بول —

صبح سے لے کر شام تک وہ دن سوگوار سا گزرا، جیسے سارے کلکتے کے باشندے اپنے عزیز کی موت کا سوگ منا رہے ہوں۔ لیکن اب اس روز کی بات کسی کو یاد بھی نہیں۔ سبھی بھول چکے ہیں۔ تمام باتیں کیا انسان یاد رکھ سکتا ہے! دینکر تمام رات نہ سو سکا تھا۔ اس روز اس کا دل بہت خراب ہو گیا تھا۔ گھر لوٹنے کے بعد بھی اُسے کچھ بھی اچھا نہ لگا تھا۔

کرن نے گھر لوٹتے ہوئے کہا تھا —

"چلو دینو، اس سادھو کے پاس چلیں، بیٹھ کے دریافت کریں —"

شام سے لوٹ کر وہ کرن کے ساتھ ساتھ سیدھا سونار کا ٹکمے کے گھاٹ پر سادھو کے پاس گیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ سو آدمی [illegible] اگر مر گئے — تو اس سے کیا ہوگا؟ اس کا جواب دینکر بھی کرن نہ دے سکا تھا، دونی کاکا، پھرنے ما، پچپا اور وہ [illegible] کاکی ماں اور سکھی دیدی، کوئی بھی نہ دے سکا تھا۔ کسی کے دل میں ذرا بھی غم کا احساس نہیں تھا۔ حالانکہ نظر کے سامنے [illegible] حادثہ ہو چکا تھا! سب کچھ خاک ہو کر ختم ہو گیا تھا! چتا کے دھوئیں سے آسمان سیاہ ہو گیا تھا، پھر اتنے آدمیوں کا سوگ [illegible] سے مقصد تھا؟

دینکر نے پوچھا — "سوامی جی ابھی کیوں نہیں آتے رسے کرن؟"

کرن نے کہا — "سوامی جی تو جیل میں ہے، تمہیں نہیں معلوم؟"

دینکر نے پوچھا — "پھر کیا ہوگا بھائی —"

"چلو آ، سادھو سے جا کر دریافت کریں۔" کرن نے جواب دیا۔

پیتر پنج [illegible] کے مندر کے آگے سامنے سونار کا ٹکمے گھاٹ جانے کا راستہ تھا، دونوں طرف خوانچے کی دکان تھی۔ پنڈت [illegible] خانہ تھا، پتھر بچھا ہوا راستہ تھا، کچھ دیر پہلے بارش ہو چکی تھی۔ کرن نے [illegible] جنوب مغرب کی سمت سے چل [illegible] کی سمت [illegible] اور گنگا کنارے [illegible] سونار کا ٹکمے گھاٹ تھا، کرن ایک گلی کے اندر سے بائیں طرف مڑ گیا۔

کرن نے کہا ——— سادھو کے پاس جا کر سب کے سب قدموں کو چھو کر پرنام کرنے لگے۔

"وہ کیوں؟"

"وہ کیوں، وہ اس لیے کہ سادھو خوش ہوگا، پرنام کرنے سے کون خوش نہیں ہوتا، ویسے بھی آسان ہے، پرنام کرنے میں کیا نقصان کیا ہے، اس میں تو پیسہ خرچ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد کرن نے تھوڑے توقف کے بعد کہا ———

"پیسہ ہی اصل چیز ہے چاہے سادھو ہو یا سادھو نہ ہو ———"

"لیکن میرے پاس تو پیسہ نہیں ہے۔"

کرن نے کہا ——— میرے پاس بھی پیسہ نہیں ہے، پیسہ دیا ہوتا تو سادھو کے پاس کیوں آتے، پیسہ نہیں دیا ہوگا اسی لیے تو سادھو کے پاس آ گئے ہوں ———

"تو پھر یہ لوگ وہاں کیا کرنے گئے تھے؟ کیا کھا کر زندہ رہتے ہیں؟"

"پیسہ دینے والے بہت سے لوگ ہیں" کرن نے جواب دیا ——— وہ لوگ سادھو کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور وہ زندہ رہتے ہیں لیکن سادھو دنیا تیاگ دیتا ہے، دولت کا تیاگ کرتا ہے، یہی تو سادھو ہے، اور کچھ نہیں کرتا ———

لیکن گھاٹ کے سامنے جانے سے کرن ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خاموش رہا، پھر بولا ——— "یہ دیکھو، سورج ڈوبتا ہے ہم بھی اب واپس چلیں گے ......"

"اب کیا ہوگا؟"

کرن نے کہا ——— نہیں، ہم لوگوں کی قسمت ہی خراب ہے، ادھر گئی وہ [illegible] جا کر بیٹھ رہی ہوں گی وہ یہاں نہیں آئے گا ورنہ پتہ چل جاتا۔

پھر وہ دونوں رشتے، پتھر پر چلتے ہوئے واپس آئے۔ اس کے بعد کرن [illegible] اسٹریٹ کے اندر مڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے ملکی دیدی کے گھر میں داخل ہو گیا۔ ستی آئی ہے کیا؟ [illegible] آنے کی بات تھی؛ ملکی دیدی نے آج ہی آنے کی بات تھی۔ ملکی دیدی نے کہا تھا۔

[illegible] میں [illegible] تھا [illegible] میں [illegible] تھا اور [illegible] میں [illegible]۔

دیکھا زینے پر چڑھ کر

کمرے میں [illegible] پلنگ پر [illegible] پلنگ کے [illegible] ملکی دیدی [illegible] ستی [illegible] میں سوئی ہوئی۔

زینے کے سامنے ہی ملکی دیدی سے ملاقات ہو گئی۔

ملکی دیدی بیٹھی ہوئی تھی

"کرن بیٹا ہو؟" دیکھتے ہی ملکی دیدی نے پوچھا ——— "تمہارا چہرہ ایسا کیوں ہو گیا ہے؟"

"شرشان گھٹ گیا تھا۔" دینکر نے جواب دیا ——— "سی۔ آ۔۔ واپس مڑ گئے ہیں نا۔"

"او، بھلا بھی تو ابھی آ رہے ہیں۔"

"کہاں سے؟"

"ستی کو ملنے گئی تھی۔" کھمی دیدی نے جواب دیا۔

دینکر کا دل دھڑکنے لگا۔

"ستی آگئی ہے کیا؟" اس نے پوچھا ——— "کہاں ہے، دیکھوں؟ دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟"

کھمی دیدی مسکرانے لگی

"نہیں رے، نہیں آئی۔ وہاں سے جاتے ہی بیمار پڑ گئی، بڑے زور کا بخار آ گیا تھا اسی لیے ———"

دینکر مایوس ہو گیا۔

پھر بھی وہ تھوڑی دیر تک کھڑا رہا، جیسے وہ بڑی امید سے کھڑا ہو، حالانکہ یہ امید بیکار تھی۔ کس بات کی امید … تھا، ستی اس کی کون تھی، ابھی تو اس کا ٹھیک نہیں تھا۔

کھمی دیدی زینے سے نیچے اترنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے دینکر بھی اترنے لگا۔

یکایک اس نے پیچھے سے آواز دی۔

"اچھا کھمی دیدی ———"

"کیا ہے، کہو؟"

دینکر نے پوچھا ——— "ستی شاید دیکھنے میں تمہاری ہی طرح ہے؟"

کھمی دیدی مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی

"او ہاں۔ تو شاید دن رات ستی ہی کے بارے میں سوچتے رہتے ہو؟"

دینکر شرما سا گیا۔ اس نے اپنا سر جھکا کر کہا

"نہیں تو ———"

"تو پھر؟ تم ہر وقت ستی کے بارے میں کیوں پوچھتے رہتے ہو؟"

دینکر کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ بار بار ستی کے بارے میں کیوں پوچھ رہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ سوچتا۔ واقعی ستی خواہ کیسی [illegible] ہو مگر وہ کھمی دیدی کی طرح چھپا چھپا کر کسی کو خط نہ لکھے۔ ستی خواہ جیسی بھی ہو مگر وہ کھمی دیدی کی طرح آئینے کے سامنے [illegible] رقص نہ کرے۔ ستی بھی کھمی دیدی کی طرح ناول پڑھنے کی میز کے پاس بیٹھ کر کسی غیر مرد کی تصویر نہ دیکھے۔ ستی نیک اور بھولی [illegible] کی طرح نہ ہو۔ وہ اس سے بھی زیادہ اچھی ہو تو بہتر ہے۔ ستی پتہ نہیں کیسی ہو۔

اس [illegible] گھر [illegible] ہوئے پانی [illegible] دروازے پر کھڑے ہو کر بھی دینکر [illegible] سوچتا تھا، شاید ستی نہ آئے

گھمی بے ستی یہاں نہ تھے اتنی دور سے آگیا آسان ہے۔ کہاں یہ اور کہاں [illegible] ہمیشہ باز [illegible] کی بھولی [illegible] کوشش کیا تو [illegible] کچھ نہ تھے گی۔ اگر آتے تو وہ اس کے نیچے اس طرح [illegible] بیچ۔ وہ بھی وکٹر گھمی دیدی کا [illegible] اس طرح چھپانے کے لیے تھے کہ وقت نے بدتری بیگانہ تھے۔

اب وہ شخص رہا تھا، وہ گشت [illegible] اور [illegible] مکان [illegible] رہا تھا۔

ایک [illegible] کی طرح [illegible] گھر کی طرف۔ [illegible] نہیں۔ وہ [illegible] گھر کے [illegible] سے [illegible] ایک گلی [illegible] ہو گئی۔

وکٹر پھر ایک بار پتھر کی دیواروں میں جا کر گھڑی دیکھا، غضب ہو گیا آٹھ بج گئے۔ اب وہ پوچھتا کب نکل جائے [illegible] لگائے گا۔

بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ پانی کی بوندیں اور بھی تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔

وکٹر بارش کی وجہ سے [illegible] دوڑ پڑا۔ اس کا [illegible] گھر [illegible] فاصلہ تھا۔ اس کا لباس [illegible] پانی میں بھیگ گئے اور [illegible] جب وہ گھمی دیدی کے دروازے پر پہنچا تھا پانی میں [illegible] پاؤں تک بھیگ چکا تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا

اسے گھمی دیدی کو اس کا [illegible] کرنا تھا اس سے کہ [illegible] شاید گھمی دیدی خفا ہوں گی [illegible] وہ [illegible] آدمی [illegible] تو وہ [illegible] کہا سکتا ہے۔

زینے کے نیچے [illegible] کی طرف سے کسی [illegible] آواز سنائی دی۔ مگر [illegible] نیچے بیٹھا ہوا ایک [illegible] دھواں تھا۔

وکٹر زینے پر چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ اوپر برآمدے میں کوئی نہیں تھا۔ دائیں طرف سونے اور پڑھنے کے کمرے تھے۔

وکٹر نے اندر جھانک کر دیکھا۔

"گھمی دیدی!"

وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ دوسرے کمرے میں بھی کوئی نہ تھا۔ بالائی منزل پر ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ وکٹر [illegible] کے [illegible] سے چپک گئے تھے۔ اس نے ہر کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ گھمی دیدی کہیں نہیں [illegible] وہ تو ہمیشہ اسی برآمدے میں بیٹھے اخبار پڑھتے رہتے تھے، جس روز [illegible] اس کا [illegible] تھا [illegible] بھی وہ اسی جگہ بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ گھمی دیدی کے کمرے میں ستی کا پلنگ [illegible] بچھا ہوا تھا۔ [illegible] دونوں طرف [illegible] سفید چادر بچھی تھی [illegible] بستر لگے ہوئے تھے۔ صرف [illegible] تپائی پر [illegible] چائے کی پیالیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"لکھی دیدی!"
ویکر نے پھر پکارا۔
اس کے بعد وہ زینے پر چڑھ کر اوپر چھت پر چلا گیا۔ اوپر چھت پر صرف ایک کمرہ تھا، اس کمرے میں کاکا بابو رہتے تھے۔ اس کمرے سے پورا کالی گھاٹ تصویر کی طرح نظر آتا تھا، چھوٹے چھوٹے گھر، بستی، گھاس پھوس کی چھت، مکان کا منڈیر، دور ... مکان، چندی بابو کے بلند مکانوں کی چھتیں، اور بھی بہت کچھ دکھائی دیتا تھا، اور اس طرف ٹیپو سلطان کی وہ عمارت جس میں ... مزاروں کا مسکن تھا اور اس سے پرلی طرف آدی گنگا کا تالاب اور اس سے بھی پرے دھان کے کھیت دور تک پھیلے ہوئے تھے ... دھان کے یہ کھیت جنوب کی سمت پھیل کر ریلوے لائن سے جا ملے تھے۔

اوپر جاتے ہی ویکر نے کاکا بابو کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، اور روزن میں اس کمرے میں ... رہتا تھا۔ لکھی دیدی اس کمرے میں بھی نہیں تھی۔ دروازے کا پٹ پکڑ کر اس نے ایک بار پھر جھانک کر اندر دیکھا۔ پلنگ پر اخبار اٹھا ... جیسے کچھ دیر پہلے اس کمرے میں کوئی تھا۔ شیلف میں بہت ساری کتابیں بھی ہوئی تھیں اور بہت سارے کاغذات کا بنڈل ... پاس ٹرنک تھا اور ٹرنک میں ایک چھوٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ صبح کی دھوپ فرش پر، پلنگ کی چادر پر اور دیوار کے کنارے ... بس مڑ گئی۔

لکھی دیدی کہاں چلی گئی!
نیچے جا کر کاکی ماں سے دریافت کرنا ہوگا۔ اتنے سویرے کاکا بابو بھی کہاں چلے گئے اور لکھی دیدی بھی کہاں چلی گئی۔
یکایک اس نے دیکھا۔ چھت کے شمال مشرقی کونے پر لکھی دیدی کھڑی تھی۔ ویکر کی طرف اس کی پشت تھی، کاکا بابو کی دوربین سے بہت دور کچھ دیکھ رہی تھی، انھوں نے بھی ویکر کو نہیں دیکھا۔
آہستہ آہستہ ویکر ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔
اس وقت لکھی دیدی آنکھوں سے دوربین لگائے ہوئے کچھ دیکھ رہی تھی۔
ویکر نے آواز دی۔
"لکھی دیدی۔"
لکھی دیدی چونک اٹھی، اس نے پلٹ کر ویکر کو حیرت سے دیکھا۔
"تم، تم کب آئے؟"
"میں بہت دیر سے آیا ہوا ہوں۔" ویکر نے جواب دیا ——— "میں تمھیں ہی ڈھونڈ رہا ہوں۔"
"خط دے دیا تھا؟"
"نہیں، وہ نہیں آئے تھے؟"
"نہیں آئے تھے! کیا غضب! پھر تم نے خط کس کو دیا؟"

ٹھمی کو بیٹھے دیکھ کر چتر نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ لو۔"

ٹھمی ویدی نے [illegible] ایک سرخ سی گولی ڈالی اور اس کے بعد [illegible]

"یہ دیکھو،" چتر نے کہا ۔۔۔ [illegible] انتظار کرتا رہا، پھر [illegible]

"تم نے کچھ دیر اور انتظار کیوں نہ کیا؟ [illegible]"

"میں تو تھوڑی دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے بعد اتنے زور کی بارش آئی کہ یہ دیکھو، بارش میں نہا گیا ہوں۔"

ٹھمی ویدی نے ایک بار اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ بولی ۔۔۔

"بارش تو تھوڑی ہی دیر میں رک گئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی دھوپ نکل آئی تھی۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ۔۔۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو ٹھمی ویدی،" چتر نے کہا ۔۔۔ "کہ وہ ٹھیک وقت پر آیا کرے۔ [illegible] میرا پاؤں دور [illegible] ہے ۔۔۔"

"تم بہت دور سے آ رہے ہو،" ٹھمی ویدی نے کہا ۔۔۔ "اسی لیے دیر ہو گئی ہے۔ [illegible] ہو گا۔ [illegible] دور بین ہو گی۔"

چتر نے قدرے رک کر پوچھا ۔۔۔

"یہ دور بین ہے ٹھمی ویدی؟"

"ہاں، [illegible] ۔۔۔"

"دکھائی دیتا ہے؟"

"دیکھ لو۔"

اتنا کہہ کر ٹھمی ویدی نے دور بین چتر کی آنکھوں سے لگا دی۔ پھر پوچھا ۔۔۔

"دکھائی دیتا ہے؟"

چتر نے دیکھا۔ دور بہت دور کی چیزیں بھی اس کے قریب دکھائی دیتی تھیں۔ اتنے قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر انہیں [illegible] تھا۔ اپنی مٹھی میں بند کر سکتا تھا۔ [illegible] شریف احمد کے مکان کی ٹین کی چھت [illegible] [illegible] اسکول، اور بھی دوسری دور دور کی چیزیں اس کے بالکل قریب آ گئی تھیں۔

پھر چتر نے دور بین کا رخ ٹھمی ویدی کی طرف کر دیا۔ ٹھمی ویدی کو [illegible] اپنی آنکھوں سے اپنے قریب دیکھنا [illegible] دور بین سے دیکھنے میں وہ کیسی لگتی ہے، وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔

"[illegible] دیکھ رہے ہو؟"

چتر کی آنکھوں کے سامنے [illegible]

"[illegible] کیوں نظر آ رہی ہو ٹھمی ویدی؟" اس نے پوچھا ۔۔۔ "کچھ دکھائی نہیں دیتا؟"

"میں اتنا سے قریب ہو جاؤں۔" نکھی دیدی نے جواب دیا۔
"قریب کا آدمی دُھندلا کیوں دکھائی دیتا ہے، نہیں، میں تمہیں دُوربین سے نہیں دیکھوں گا۔"
اُس نے آنکھوں کے سامنے سے دُوربین ہٹالی۔
"کیوں؟"
"نہیں، نہیں، تم بہت بُری دکھتی ہو، تم تو پہچان میں ہی نہیں آتیں۔"
"پہچان میں کیسے آؤں گی، دُوربین تو دُور سے دیکھنے کے لیے ہے، قریب کی چیز بھی کہیں دُوربین سے دیکھی جاتی ہے؟"

نکھی دیدی کی بات سُن کر اس چھوٹی سی عمر میں اُسے بڑی حیرت ہوئی تھی، بات سچ تھی، نکھی دیدی تو اُس کے قریب ... اس کے بالکل قریب، اگر وہ اس کے اتنے قریب نہ ہوتی کیا کبھی اُس کے ذریعہ خط بھجواتی؟ اس پر اتنا بھروسہ کرتی؟ اس کے ... قریب کے آدمی کو دُوربین سے دیکھنے میں سب کچھ اُلٹ پُلٹ ہو کر رہ جاتا ہے، قریب آتے ہی آنکھوں کے سامنے دُھند ... ہوتی ہے جیسے دُور بہت دُور کی کوئی چیز ہو، حالانکہ جب نکھی دیدی دُور چلی گئی تھی ——— جب اُس کی دسترس سے باہر ... تھی تو اُس وقت اُسے محسوس ہوا تھا جیسے نکھی دیدی اُس کے اصل قریب آگئی ہے، جیسے نکھی دیدی کو اُس نے بہت قریب سے ... دیکھ لیا ہے، جیسے نکھی دیدی کے بارے میں وہ سب کچھ جانتا ہے!

پھر اُس نے نکھی دیدی کو دُوربین واپس دے دی، بولا۔
"تم بھی ایک بار مجھے دُوربین سے دیکھو، نکھی دیدی۔"
"وہ کیوں؟" نکھی دیدی مسکرائی۔
"میں بھی تمہیں دُھندلا دُھندلا دکھائی دوں گا۔"
"دُھندلا نظر آئے گا تو مجھے ——— نظر آئے گا، تمہیں اس سے کیا ملے گا؟"
"نہیں، اس طرح تم مجھے پہچان نہ سکو گی۔"
اتنا کہہ کر وہ چلا آیا تھا، اس کے بعد ——— نکھی دیدی کے سامنے کھڑے رہنے میں اُسے شرم محسوس ہوتی رہی تو وہ تیزی سے ... چھپتا ہوا باہر راستے پر آکر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد بغل کے دروازے سے وہ اپنے گھر میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ ... اس کے قدم رُک گئے۔
... گلی کے دہانے پر کسی کی ایک ٹیکسی آکر رُک گئی، اس گلی میں کس کے یہاں ٹیکسی آئی ہے، پھر کوئی بیمار ہے ... ٹیکسی کے اندر ایک لڑکی تھی اور پیچھے بہت سا سامان تھا، اسباب بندھا ہوا تھا۔
ٹیکسی سے ایک آدمی اُتر کر مکانوں کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر وہ جھینپتے قریب آکر اس نے پوچھا ———
"... [illegible] ... کوئی سامان ہے نہ ہے؟"

"جی تو ہے۔ کس کو تلاش کرتے ہیں؟"

"مجھے بچاری کا سامان چاہیے۔"

"ہاں، ہاں، یہی سامان ہے ——"

وہ ٹیکسی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی اور ایک عورت بیٹھی تھی۔ ویلکر کی نگاہوں کے سامنے جیسے اچانک بجلی سی کوند گئی۔ یہ تو آ میں!

"ارے کہاں ہے، یہ سامان ڈال کر لے چلے؟"

اتنا کہہ کر وہ شخص ٹیکسی کے سامنے آنے لگا۔ وہ گرم سوٹ میں ملبوس تھا، اور کافی معتبر تھا۔

"... جلدی ہو رہی ہے، جلدی کیجیے" کہا ——

"آج ٹھہرنے ہونے کا بارہ سامان کا لاٹھی رکھا ہے، اور کہیں جگہ نہیں ملی تھی ——"

اس آدمی نے پوچھا ——

"تم تو میری بیٹی کا سامان پہچانتے ہو تو۔"

"جی ہاں ——" ویلکر نے جواب دیا۔

"تمہارا کیا سامان تھا؟ زیادہ بھاری نہیں ہے۔ ایک بستر اور ایک سوٹ کیس ہے ——"

ڈالی [illegible] سے پیچھے اتر آئی اور اس آدمی سے مخاطب ہو کر بولی ——

"آپ [illegible] تو ہو گئے [illegible] سامان [illegible] مشکل تھا ——"

اس کے بعد اس نے سامان کی ٹیکسی میں [illegible] رکھ دیا اور جوڑے کو ٹھیک کر دیا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں [illegible] حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"اوہ ...... میں نے پوچھا، ان کو ایسی جگہ [illegible] دیکھتے رہتی ہے۔"

اس آدمی نے کہا ...... "ہمیں [illegible] ہے [illegible] ——"

اس کے بعد ویلکر نے کہا —— [illegible] کدھر کی طرف [illegible] کیوں ہو؟ "سر پر اٹھاؤ، زیادہ بھاری نہیں ہے ——"

اس کے بعد کوئی بات کیے بغیر اس نے بستر اٹھا کر ویلکر کے کندھے پر ڈال دیا۔

"لے جا سکو گے؟"

ویلکر نے کندھے پر بستر اور ہاتھ میں سوٹ کیس لے کر جواب دیا —

"ہاں لے جاؤں گا۔"

"دیکھو ذرا سنبھال کے، یہ وہی گوشت ہی تو نہیں، کہیں پھسلا دیا —"
تانگے تلے وکٹر، اس کے پیچھے وہ آدمی اور اس کے پیچھے وہ لڑکی چلنے لگی۔
وکٹر کو عجیب سا احساس ہونے لگا، ایسا کیوں ہوا، ایسا کیسے ہو گیا۔ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ اسے کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

کالا بابو کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"یہی مکان ہے؟"

وکٹر نے کندھے سے بستر اتار کر جواب دیا۔

"ہاں —"

لڑکی نے پوچھا — "کتنے پیسے لو گے؟"

وکٹر پریشان سا ہو گیا، اس نے ایک بار لڑکی کے چہرے کو دیکھا، اس کے بارے میں کسی ویدی سے وہ سن چکا تھا، کیا یہی ستی ہے؟ ایسا ہی چہرہ تو کسی ویدی نے بتایا تھا، ایسی ہی سفید رنگت، ایسے ہی گھونگریالے بال —

اس آدمی نے کہا — "اس کو ایک آنہ دے دو۔"

وکٹر نے کہا — "نہیں، پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔"

اس آدمی نے کہا — "کیوں؟ تھوڑا سا تو سامان ہے، وہ بھی بالکل ہلکا ہے، اس کے پیسے ایک آنہ کم ہے؟ مگر دن بھر محنت کرنے سے کہیں چار پیسے ہاتھ آتے ہیں، بڑے خراب ہو گئے ہیں سب، یہ سامان تو خود اٹھا کر لا سکتا تھا —"

لڑکی نے کہا — "میں ایک آنہ سے زیادہ نہیں دوں گی، لے لو —"

اور ہاتھ بڑھا کر اسے پیسے دینے چاہے۔

"نہیں۔" وکٹر نے انکار کیا۔

اس آدمی نے کہا — "اسی وجہ سے ہلکا ہوں کہ کچھ نہیں ہوتا، ہلکا سا سامان ہے اس کے پیسے نہ دینے ہوں گے، نہیں بیٹا تو سستے میں آ گیا ہے —"

لڑکی نے پھر پوچھا — "لو گے تو لے لو۔"

"نہیں" وکٹر نے جواب دیا۔

اس آدمی نے کہا — "تم اور اس کی خوشامد مت کرو، رہنے دو، میں بھی دیکھتا ہوں وہ چار پیسے چھوڑتا ہے —"

دیکھا ہوا بہت اس کے چہرے پر چھا گیا۔ تمتماتی ہوئی دوپہر، وہاں کھڑا ہوا تھا قسمت کا مارا چپ چاپ۔ اس سفید بگلے کی طرح
تیس کی یاد سے اپنی آنکھیں صاف کرتا ہے۔

اکیلی سی ہے جسم سے کوئی چیز نکل گئی۔ مڑ کر دیکھا تو آنکھ کے چاروں طرف چھپے تھے، چار روپے اس کے جسم سے گر
کر چھن چھن کرتے ہوئے زمین پر ادھر ادھر بکھر گئے اور دیکھ کر پیاسا سرس ہو گیا جیسے ایک اس کی نفرت کو آج آنکھ ہو۔ آ
کا تھی بھی دوسرے ملک ہی کی بات ہے! کسی دن نے بھی اسے چالیس دیا تھا، ڈرتا ہی کی کسی دن کو کہاں سے بڑھ
دو تین، ڈریا نیا میں ہم اکٹھے رہے کہ کیا جی ——!

جوتے کا خطبہ

قاضی عبدالستار

[illegible] کے میڈ کا مرکزی ہال قمقموں، پھولوں اور چہروں سے جھلک رہا تھا۔ ادیب، دانشور، پروفیسر، طالبات، طالب علم [illegible] معزز مہمان سب اس دروازے کو گھور رہے تھے جس کے دونوں طرف والنٹیرز مہمان خصوصی کے انتظار میں کھڑے [illegible] رہے تھے۔ آخر وہ لمبی سیاہ موٹر آگئی جس پر سوار ہو کر کوئی بھی سماجی جنبدی کو خرید سکتا ہے۔ میزبانوں کا ہجوم چیلوں کے [illegible] طرح موٹر پر جھپٹا اور اس پر بچھا اور جوتا ہوا مہمان خصوصی کے طلوع کا انتظار کرنے لگا۔ پھر باس کا تجلی دیکھتے ہی [illegible] کھڑا ہو گیا۔ خاص مہمان کے کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہوتے ہی ادبی کانفرنس کے سیکریٹری (جو یونیورسٹی کے مشہور [illegible] تھے) اگر دونوں پر تسمے اور تعارف کے بہانے معزز مہمان کی شان میں منثور قصیدہ پڑھ دیا۔ معزز مہمان جو [illegible] دونا [illegible] کے ملک تھے اور سارے ملک میں "شو کنگ" کے نام سے مشہور تھے ہنسے وقار سے زیر لب مسکراتے رہے۔ آخر [illegible] نے گزارش کی کہ سر، محترم اپنے افتتاحیہ خطبے سے ادبی کانفرنس کا آغاز فرمائیں۔ صدر محترم مغل شہنشاہ کی طرح [illegible] سے ایک ایک قدم ایک سلطنت پر پڑ رہا ہو۔ ایک کے سامنے کھڑے ہوئے کھنکارے۔ بیٹھے میں دھنسے ہوئے [illegible] ادھر ادھر بھرے ہوئے ہال [illegible] کر تمکنت سے دیکھا جیب سے ایک کاغذ نکالا اور زور زور سے پڑھنے لگے۔ یعنی [illegible] سے لگے۔

حاضرین کرام!

میں اسٹیشن میں تھا جب جنرل ریجنٹ نے ٹیلی فون کے ذریعے مطلع کیا کہ آپ نے اس ادبی کانفرنس کی صدارت کے لیے میرا [illegible] ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے میرا نام [illegible] خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے اس کے لیے مبارکباد پیش کرتا [illegible] ادب اور [illegible] ہونے کے [illegible] میں کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے نہیں مگر [illegible] اور [illegible] ان کتابوں سے [illegible] جائے تو [illegible] سے الگ کر کے کہاں نہیں جا سکتا۔ میں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول کر لی کہ مجھے آپ کی دلجوئی اور [illegible] کے [illegible] اور ادب دونوں کی خدمت منظور ہے۔

خواتین و حضرات!

جس طرح سب قوموں کے عروج و زوال کی داستان [illegible] اسی طرح جو [illegible] کی تاریخ اور تہذیب کو آئینہ دکھاتا [illegible] ہندوستان کے ماضی سے [illegible] رہا ہے۔ [illegible] بیان [illegible] کہ عبارت [illegible] [illegible] ہیں۔ ماضی بعید میں ہندوستان [illegible] جوتوں میں تبدیل تھا۔ [illegible]

جنہوں نے جوتا پہننے سے بے پرواہ ہو کر حقارت سے دیکھا۔ اس کو ٹھوکر ماری اور جھٹ پٹ پرے کر دیا۔ اس طرح جو جوتا [illegible] کی پرورش کی جس نے ہم سے ملک کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور پارہ پارہ ہندوستان کو شمشان کا جوتا سب نے اپنے پیروں میں پہن لیا۔

جب تک مسلمانوں جوتے کی بہت کو تسلیم کرتے رہے بادشاہی کرتے رہے لیکن جب خانہ جنگی کے ہاتھوں جوتے کی صنعت غارت ہو گئی جیسے جیسے راجے اور نواب امیر اور وزیر بادشاہی دستر خوان کی چاپلوسی کی طرح جا بجا جوتے پہنے تھے۔ ان کو اور جوتوں نے ان کے پیروں کو ملک کی دولت اور زمین کی عظمت سے بیگانہ کر دیا۔ اور وہ ہاتھ پیروں کو ملک کے زرداروں اور پاپیوں کے نوکروں پر لٹکنے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ پوری قوم کا جوتا خراب ہو گیا۔ صنعت تباہ ہو گئی اور ایک ایک کر کے ملک پر قبضہ کرنے والے انگریزوں کے پیروں میں چلی گئی۔

آپ لوگوں نے جو کتابیں اور لطیفے اور حکایتیں پڑھی ہوں گی کہ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہونے اور کچہری میں داخل ہونے تو دیکھا کہ واجد علی شاہ ایک پاؤں میں جوتا پہنے مسند پر بیٹھا ہے اور ہاتھ میں نگی تلوار چمک رہی ہے اور دوسرا جوتا دروازہ کے پاس پڑا ہے۔ انگریزوں کو دیکھ کر نواب نے حسرت سے کہا کہ اگر میرے نوکر وقت پر پاؤں میں جوتا پہنا دیتے تو تم لکھنؤ میں داخل نہ ہو سکتے۔ آپ اس کو محض ایک لطیفہ سمجھتے ہوں گے لیکن اس معمولی واقعے نے ہندوستان کی تاریخ پر سیاہ پردہ ڈال دیا۔ ہم انگریزوں کے سو سال دور غلامی کی جوتے بازی کا شکار ہو گئے۔

جوتے اور معاشیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اب دو تین صدیوں کی تاریخ اور دنیا کے ساتھ جوڑا ہے۔ جس نے ہندوستان پر چڑھائی کی ان کو آپ بیشتر مختلف صوبوں کی طرح جوتا جوتا ہو کر [illegible] جھکا دیا۔ شہروں کی طرح سدا کو اپنا کر سونے والے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس فعل کی صحت کا راز جوتے کی معاشی اہمیت میں پوشیدہ ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ اگر بہت سی قومیں بات بات پر جوتے بھی نہیں پہنا دیتیں تو آپ دیکھئے چین اپنے بچوں کے پاؤں کو لوہے کے جوتوں میں قید کر دیتے ہیں تاکہ ان کے پیر بڑے نہ ہوں۔ [illegible] کی طرح نہ بڑھ سکیں۔ یہ حرکت کتنی بے تکی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن در اصل وہ اپنے بچوں کے جوتوں کے مصارف سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں بلکہ ان کو کئی سال تک ان کا شہر ایک خاص سائز کے جوتوں میں گزر کرتا ہے۔ دوسرے ممالک میں وہ بہت کم لوگ جوتے کی قیمت سے ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ علمائے معاشیات نے جوتے کے ذریعے ملک کی تجارت بڑھانے کا منصوبہ بنایا جسے ہندوستان جیسے ملک کی ترقی ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں جوتے کی صنعت سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اور جس سے فیض اٹھایا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان چین کی طرح جوتے سازی میں پر سراغ ہو جائے تو جس دولت سے تنگ آ جائے۔ اس سلسلے میں حکومت کا فرض ہے کہ وہ جوتے کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہر طرح سے ہاتھ بٹائے۔

جوتے اور حیثیت کا ایک دوسرے سے کچھ عمیق رشتہ ہے۔ جس سے قوموں کی زندگی کا معیار [illegible]

سے بدل دیا جائے تو گویا ساری دنیا کے اور خصوصاً ہمارے ملک کے اقتصادی مسائل حل ہو جائیں۔ ایک طرف چین
[illegible] سرمایہ مجتمع ہو کر کام چلنے لگے گا تو دوسری طرف دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آجائے گی۔ یہ نازک بات ہے۔ اسے
[illegible] ہے آپ نے چوربازاری یا ذخیرہ اندوزی سے دس لاکھ روپیہ کمایا۔ اس کا سونا خرید لیا۔ زمین میں دفن کر دیا۔ یعنی
[illegible] پیہ جو قوم میں گردش کر کے ساری قوم کی قوت خرید میں اضافہ کرتا وہ بازار کے نقد نفع سے مر گیا۔ اب فرض کیجیے آپ نے
[illegible] پیسے کے بجائے دس لاکھ جوتے کا پیشہ کرتے تو ان کا کیا کرتے۔ زیادہ بھی بیچتے تو [illegible] سے کس طرح چھپاتے۔
آپ ہی بتائیے کیا ہو؟ دوسرے الفاظ میں آپ اتنے ہی جوتے کمانے پر مجبور ہو جاتے جتنے کی آپ کو ضرورت
ہے۔ ساری دولت یعنی سارے جوتے بازار میں چلنے پر مجبور ہیں اور معاشی ترقی یقینی ہے۔

[illegible] نے اپنے جنسی فلسفہ کی توضیح کے لیے بچے کی حرکات کا بڑی شدومد سے بیان کیا ہے۔ میں بھی اپنے دعوی
[illegible] کی تکنیک پر عمل کروں گا۔ جوتے کی محبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس عیب [illegible] طفولیت سے کھرت
[illegible] یا شعوری یا تحت شعوری طور پر جوتے سے چمٹا رہتا ہے۔ مثلاً آپ اپنا جوتا اتار دیں۔ بچہ فوراً اس کی طرف
[illegible] [illegible] ایک [illegible] کا ثبوت ہے۔ [illegible] [illegible] کی [illegible] کا تصور کیجیے جیسے ہی
[illegible] پہلا [illegible] پر وہ کیفیت [illegible] [illegible] محسوس ہوا پیدا کرے گا۔ بچہ اسے بیٹھ سے لگانے کے لیے
[illegible] بھی اپنے آپ سے جدا [illegible] پسند [illegible] جوتے کی [illegible] عظمت کا ثبوت ہے۔

[illegible] کے [illegible] جوتوں کے [illegible] [illegible] تجربہ [illegible] [illegible] کسی [illegible] جوتے
[illegible] ہوگا۔ اور اس نے اپنے پاؤں [illegible] اپنے [illegible] [illegible] ساری دنیا کے پیروں پر [illegible]
[illegible] کسی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] پیروں
سے [illegible] نظر آئے گا۔

[illegible] انسانیت میں [illegible] تعلق ہے علمائے انسانیت کی تعریف میں بڑی [illegible] باتیں بنائی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے
[illegible] اور حیوانوں میں حد فاصل قائم کرتا ہے۔ جو انسان جوتا نہیں پہنتے ہیں وہ انسان سے [illegible] حیوان سے [illegible]
[illegible] [illegible] روشنی ڈالنے کے لیے مثال دیتا ہوں۔ آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آپ کی شخصیت [illegible] ہو جائے گی اسی طرح آپ [illegible]
[illegible] بڑے چھوٹے [illegible] جوتا آپ کی ذات [illegible] [illegible] وقار [illegible] گا۔ [illegible] سامنے کی [illegible] [illegible]
ہے۔

[illegible] کی پیدائش ہوئی تو دنیاؤں میں [illegible] [illegible] جہاں جوتا [illegible] کی [illegible] خدمت انجام دیتا ہے۔ [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] شاعروں کی [illegible] ہے۔ [illegible] شاعری [illegible] [illegible] بات جوتے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] خیال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

گیا ہے یعنی واضح صاف۔ پوری آمد اور صحیح پہلی غزل گیا ایک گھر کے عورتوں کی عکاسی ہے جس میں غزل کے اشعار کی طرح مختصر ساز، اور نظموں کے ہوتے جاتے ہیں۔ نظم بھی اس مشابہت کی صحت میں برابر کی شریک ہے۔ نظم کا ہر شعر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور پوری نظم کسی خیال کو اکائی کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ جس طرح کسی ایک شخص کے عورتوں کی [illegible] اس شخص کی [illegible] اور [illegible] کا ایک ہی نگاہ میں پورا عکس دیتی ہے [illegible] پوری نظم پورے گھر کے افراد کی [illegible] جس میں مختلف پردوں کے مختلف شاعروں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

[illegible] میں تشبیہ شاعرانہ [illegible] وجود میں [illegible] کے ساتھ ذہن منتقل کیا ہے جو [illegible] [illegible] کا تھا۔ شاعر نے محبوب کے رخسار کو چاند سے اتنی مرتبہ اور اتنے چیزوں سے تشبیہ دی [illegible] ہو کر رہ گیا [illegible] ہے یہ شاعر نے جوتے کی طرف توجہ دی [illegible] کے جسم کو [illegible] محبوب کے رخسار دونوں سے بیک وقت تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ شاعر نے بات باقی [illegible] نے [illegible] پیدا کر دیا۔ [illegible] دونوں [illegible] انسان نے [illegible] بنایا۔ یعنی جو آبِ آسمانی سے فطرت پر انسانی [illegible] کی علامت ہو سکتا تھا [illegible] [illegible] نہیں ہونے دیا [illegible] کے بدن پر چھینے اور [illegible] کی خوشبو سے پھیلا [illegible] [illegible] آگاہ [illegible] ہوتے کے پچھلے حصے سے [illegible] اور [illegible] [illegible] ہوتا ہے [illegible] شاعروں کو کسی نیا ہوا ——— [illegible] ہو۔

جس طرح آزادی کے ساتھ ساتھ [illegible] شکلیں اختیار کرتا ہے اسی طرح [illegible] [illegible] کے دور میں شاعر عورتوں نے غالب اور [illegible] کی [illegible] ساز شاعر کو جنم دیا۔ [illegible] [illegible] عورتوں نے [illegible] اور [illegible] کا استعمال عام کر دیا ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کرتے [illegible] شاعروں کی قوت تخلیق پر [illegible] کرتے ہیں اور نیا ادب [illegible] ہے۔

ہماری [illegible] ایسے ہوتے [illegible] ہیں جو انفرادیت کے [illegible] کی [illegible] [illegible] میں ان عورتوں کو پڑھنے کے لیے پردوں کے [illegible] کرنا پڑیں گے۔ [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] کوئی ایسی خاص تکلیف بھی نہ ہوگی۔ [illegible] کے بعد (جو انفرادیت سے [illegible] بھی ہوسکتی ہے) ایسے بے نظیر [illegible] پہنے جا سکیں گے جو عام مذاق [illegible] والوں کو میسر نہیں [illegible] [illegible] ان عورتوں سے متاثر ہو کر ایسی [illegible] اور [illegible] موجود [illegible] کے لیے [illegible] خاص [illegible] اور [illegible] کے لیے ساخت کی مخصوص [illegible] رواج پائے گی اور سب عورتوں کے [illegible] [illegible] کر سکے گا۔

[illegible] شاعر [illegible] [illegible] واضح کرنے [illegible] [illegible] ہے

میں نہیں کہہ سکتا کہ ادب کا آخرت سے کیا تعلق ہے لیکن ہوتے کا ہے۔ ہماری کمپنی کی مشرقی برانچ کے مسلمان بہنے میں ہوتے وقت کرتے ہیں جنہیں یہ کہ گروہ سے پل مراد ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے بغیر دقت کے گزر سکیں گے۔ میرا مشورہ ہے کہ ادیب اس خاص ضمن میں بھی ہوتے کی ترقی سے فیض اٹھانے کی کوشش کریں۔

ابھی کہنے کو تو بہت سی باتیں باقی ہیں لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ادبی اجتماع میں مزید ہوتے کا ذکر چلے۔ اس لیے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پورے سکون اور خلوص کے ساتھ میرا خطبہ سنا۔

(ہال دیر تک تحسین آفریں تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے گونجتا رہا۔)

قاتل

اشفاق احمد

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کے ہیولے سے چوڑے سے ٹکڑا دیا اور تین جھٹکے دے کر ایک دم چپ ہو گیا۔ اس زور کا اس کے کندھے پر مارا کہ اس کی آنکھوں کا ڈیلا سپنولیوں کی طرح باہر نکل کر سفید فرش اور خوشبودار قالین پر ہو گیا۔

تیسرے دن محمد سلیم پر استغاثہ زیر دفعہ ۵۰۹/۲۹۴ ہو گیا۔ وارنٹ جاری ہوا تو بیوہ ماں پچھاڑ کر گر پڑی۔ ماموں مسٹر ناؤن سے جا ملا گیا۔ بھرے دوست ڈاکٹر عزیز نے ضمانت بھری۔ کالے کوٹ والے سلطان خان نے عدالت سے استغاثے کی نقل حاصل کی تو محمد سلیم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مرقوم تھا:

جناب عالی! مستغیثہ حسب ذیل عرض پرداز ہے

مکان ہر دو فریقین ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں بلکہ ایک دیوار مشترکہ رکھتے ہیں۔ بوجہ موسم گرما فریقین اپنے اپنے کوٹھوں پر رات کو سوتے ہیں۔ مستغیثہ با عزت بیوہ ہے۔ ملزم ہر صبح کو اٹھ کر اپنے کوٹھے پر مستغیثہ کی جانب منہ کر کے ہر روز بہ نیت توہین شرمساری مستغیثہ برہنہ ہو کر پیشاب کرتا ہے جس سے شرمساری کی توہین ہوتی ہے۔ چنانچہ کل صبح ملزم مذکور اسی طرح پیشاب کر رہا تھا۔ مستغیثہ کے منع کرنے پر فحش گالیاں بہ نیت توہین بالقصد دینی شروع کر دیں۔ لہذا استدعا ہے کہ ملزم کو سزائے کافی دی جائے۔

فدویہ: شاہ سون بیوہ میر اہل خویش ساکن کشمیری گلیاں
پیر غازی روڈ اچھرہ۔ لاہور

جب محمد سلیم حاضر عدالت ہوا تو اس کا سارا وجود بید کی طرح کانپ رہا تھا اور اس کے حلق میں خشک سی تلخی کا ڈھیلا اٹکا ہوا تھا۔

لیکن اس سارے واقعے کا محمد سلیم کی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ محمد سلیم کی اصل کہانی تو اس واقعے کا ذکر ہے جب اس نے پہلی بار عدالت کا منہ دیکھا۔

محمد سلیم صحت مند اور شریف آدمی تھا اور متوسط درجے کی امیر بیوہ کا اکلوتا بیٹا۔ ابھی تک اس کے صرف ایک عورت سے تعلقات تھے اور ان تعلقات سے دونوں فریق خوش تھے۔ محمد سلیم کو تھوڑی سی آسودگی میسر آ جاتی اور دوسرے فریق کو تھوڑی سی مالی فراغت۔ اس بات کا علم اردگرد کے کچھ لوگوں کو تھا لیکن کسی نے اس معاملے پر خصوصی توجہ نہ دی تھی۔

ایک رات کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل ہوگا کہ اچانک محمد سلیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر باہر [illegible] تھا۔ اس نے رات کی خاموشی میں پوری توجہ باہر کی طرف دے کر [illegible] ہو گئی۔ پھر اچانک [illegible] محمد سلیم نے [illegible] ہو کر [illegible] سے چپ ہو گئی۔

سلیم نے کہا: میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔"

لڑکی نے بازو کو ٹٹولا، جیسے جیسے کہیں ہڈی ٹوٹی تو نہیں، اس پر سر دبا ہوں۔"

"نہیں، مگر سلیم نے کہا: تم نے ٹھیک کہا، شاید ٹوٹ گئی ہو۔ یہ لڑکی اور شاید مجھ سے کوئی خطرناک ہو گئے۔"

خطرناک شے کا نام سن کر لڑکی زور سے ہنسی اور اس کے ہونٹوں پر آہستہ سے آواز دے کر کہا: "مجھ کو یا

ہے کیا؟"

"نہیں" لڑکی نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا: "تو سو جاؤ۔"

"جب وہ سو گیا تو سلیم نے تھوڑی دیر بعد کہا کہ میرا ہاتھ بیکار ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟"

لڑکی پھر ہنسی اور کہنے لگی: "دیکھا تیرے دماغ سے گرمی نہیں نکلی، اس لیے تجھے برے برے خیال آتے ہیں" پھر اس

نے کہا کہ سلیم کے بازو میں بہت پہلے ہی نکالا دیا ہے اور سلیم اس کا سر تھپتھپانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد جب سلیم کے دماغ کی گرمی نکل گئی اور بات تمام ہو گئی اور شک ہو گیا تو لڑکی نے پوچھا۔ "بتاؤ اب بھی

درد ہو رہا ہے؟"

"ہاں ہوں" سلیم نے سر ہلایا۔

"پھر؟"

"پھر کیا" سلیم نے کہا: "اس میں تمہارا کیا کمال ہے، درد تو ختم ہونا تھا ہو گیا۔"

"وہ تو پھر ہمارا کوئی کمال نہیں۔" لڑکی چپ رہی اور پھر جیسے رو کر خاموش ہو گئی۔

صبح جب وہ تینوں چائے پینے لگے تو لڑکی نے کہا: "اشرف پتہ ہے رات سلیم کے بازو میں کتنا درد تھا؟"

اشرف نے آنکھیں ملتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ تو میں نے کوئی گھنٹہ بھر اس کی مالش کی ورنہ یہ تو کبھی اور بھی رو رہے تھے۔"

اشرف ہنسا اور بہت بھری نظروں سے سلیم کو دیکھ کر بولا: "بازوؤں میں درد ہو تو یہ رات بھر سوتا ہے۔ اس میں وہم ہے

وہم کی کیا بات تھی؟"

سلیم نے کہا: "کچھ نہیں میں یونہی خوف سا دل میں ہو گیا تھا۔"

"اور اب؟" لڑکی نے پوچھا: "اب تو کوئی خوف نہیں کسی قسم کا؟"

"اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میرے بازو میں درد تھا یا نہیں۔"

وہ چائے پیتے رہے، کسی ہلکے پھلکے موضوع پر بیٹھے رہے اور ایک ایک کر کے کپڑے بدلتے رہے۔ لڑکی نے اشرف کے بوٹ پالش کیے،

سلیم نے اپنے بٹنوں پر پالش پھیری۔ لڑکی نے اپنے پاؤں کے ناخن کاٹنے شروع کیے۔

پھر اشرف دفتر چلا گیا اور سلیم اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ اور لڑکی چوکھٹ کا تکیہ بنا کر سیڑھی میں چائے اور گوشت

عزیز سے پہلے شخص ملک روانہ ہو گئی۔

سلیم اس بات کا بھی کریم کی طرف سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر یہ تو صرف اس قدر کہ اس کے بازو میں پہلی مرتبہ درد اٹھا تھا۔

ایک شام کریم کے گھر کے قریب مسجد میں عصر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ پہلے سجدے سے اٹھتے ہوئے شدید سی تکلیف محسوس ہوئی اور دوسرے سجدے پر وہ کوشش کے باوجود اٹھ نہ سکا۔ بائیں پہلو میں پھر جب درد کی ٹیس اٹھی اور وہ اوندھے منہ صف پر لیٹ گیا۔

جب دل کی دھڑکن معمول پر آئی اور ماتھے پر زور کا ٹھنڈا پسینہ آیا تو سلیم نے آخری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کامیاب رہی وہ آہستہ آہستہ چل کر مسجد کی دیوار کے ساتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ سب ٹھیک تھا۔ اس نے دو مرتبہ اپنی ٹانگوں کو ہلایا اور چپل چھوڑ کر مسجد سے باہر نکل گیا۔

اس کے قریبی دوست ڈاکٹر عزیز نے کچھ گولیاں دیں اور ایک بوتل دوا تجویز کی اور بہت ہدایات بھی دیں۔ اس سے پرانا کمزور دل ٹھیک نہ ہوا۔ اس قدر کہ بیماری کا خوف اس کے دل سے دور ہو جاتا۔

سلیم کو ہسپتال میں داخل ہونے کو پندرہ دن ہو چکے تھے اور اس کا ہر طرح کا ٹیسٹ ہو رہا تھا لیکن بازو میں درد کے ساتھ تھے۔ ایک شام جب تکلیف میں بے حد اضافہ ہو گیا اور ڈاکٹر مرجانے درد کے لئے ڈی … کا ٹیکہ دیا تو سلیم دوا پینے کے بعد سفید تکیے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گیا۔ ڈاکٹر مرجانے بڑی دیر تک اس کی پائینتی پر بیٹھا اس کے تنفس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی چھاتی چپاتی کی طرح اوپر اٹھتی تھی اور پھر اسی طرح نیچے بیٹھتی تھی۔ کوئی تین ساڑھے تین کا پہلا ہوگا۔ ڈاکٹر مرجانے کو اس وقت منہ اوپر پر بہت ہی ترس آیا۔ وہ بڑی دیر تک اس کے چہرے کے خد و خال اور اس کی شکل و شباہت کو غور سے دیکھتا رہا پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ سلیم کے سرہانے گیا۔ اس کے بازو کو چھو کر اپنے آپ سے کہنے لگا یہ یقیناً اسی کا ہے۔

دوسرے دن ڈاکٹر شفیع نے ڈاکٹر عزیز کو ہسپتال بلایا اور اپنے پیارے شاگرد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: عزیز یہ تمہارا دوست ہے؟

عزیز کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا اور اس کی آواز حلق کے اندر ہی رہ گئی۔

"یقیناً" ڈاکٹر شفیع نے کہا "اس سے کیا ہوتا ہے اگر یہ تمہارا دوست بھی ہوتا تو بھی میری تشخیص یہی ہوتی۔"

عزیز نے کہا "سر ڈاکٹر پیشنٹ ……"

" … " ڈاکٹر شفیع نے ہنستے ہوئے کہا اور مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ میں دراصل حقیقت کی تلخی تھی … سب تھے۔

ڈاکٹر عزیز نے کہا: "تو پھر سر … … اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو پھر کیا کیجیے؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے" ڈاکٹر شفیع نے کہا "بس ہو گیا۔ اور جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب کوئی کر ہی کیا سکتا ہے" میرا

[illegible]

میں: ڈاکٹر عزیز نے کہا [illegible] زندہ نہیں رہ سکتا؟

[illegible] ڈاکٹر شفیق [illegible] ۔۔۔۔ [illegible]

ڈاکٹر عزیز نے کہا [illegible] ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

نمسکار ۔۔۔ نمسکار ۔۔۔ نمسکار، ڈاکٹر شفیق نے [illegible] کھڑے ہوئے ہاتھوں سے [illegible]

[illegible]

"[illegible]" ڈاکٹر عزیز نے پوچھا

"[illegible] ۔۔۔۔۔ [illegible]

ہے تو ۔۔۔۔۔"

[illegible] ہو گیا تھا اور [illegible]

تھا ۔۔۔۔

[illegible] کس طرح [illegible] اور جب ہم نے ان کے [illegible] [illegible]

[illegible] اور جب ان کے ہاتھوں کی گرفت [illegible]

[illegible] ڈاکٹر عزیز [illegible] ڈاکٹر تھا وہ [illegible]

ڈاکٹروں کے [illegible] اور [illegible]

[illegible] نہیں۔

[illegible] ڈاکٹر صاحب [illegible]

[illegible] ہو تا؟"

ڈاکٹر [illegible] نے کہا "[illegible]"

"کیا آپ کے پاس [illegible] ہے؟" ڈاکٹر عزیز نے [illegible] پوچھا

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ "[illegible] نہیں ہے"

پھر [illegible] ڈاکٹر [illegible] اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہاں سے چلے گئے۔

دن سلیم پہلے تھی جب مشرف کی بیوی کو دیکھا جس نے اپنے بیگ سے ایک شیشی کا لپٹا ہوا سا ہاتھ سے نکالی اور اُسے سر کی طرف بڑھایا۔ نرس نے چیل کی طرح وہیں سے لپک کر جھپٹا مارا اور جیسے بجلی کڑکتی ہوئی وہ شیشی لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد مشرف اور اس کی بیوی کا وارڈ میں داخلہ ممنوع ہو گیا۔

سلیم کو باوجودیکہ وہیں لگا کہ تمام دنیا کے لوگ جانتے تھے کہ اس کو تکلیف ہی کیا ہو رہی تھی نہ اُسے نیند آتی تھی نہ غم سے پیٹ بھرتا۔ دنیا کی کشش کم تر ہو گئی تھی۔ سرا اپنی شیشیوں سے ٹکرا کر لہو لہان رہتا تھا۔ اس پر بھی اُسے زندہ رکھا ضرور تھا مگر دنیا بھلے آدمی کو مرنا بھی نہیں دیا جا سکتا۔ وہ نہیں جانتا ہے۔ جینے کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیے۔

ڈاکٹروں سے تقاضے آپریشن تھیٹر پر تا کر اس کے ماموں سے کہا: "ڈاکٹر کا کام زندہ رکھنا ہے۔ ڈاکٹر کی ہر حرکت اسی کوشش پر مرکوز ہوتی ہے کہ زندگی نہ ختم ہو۔ ہم لوگوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں آگے اس کی مرضی۔"

"اس کی مرضی کا ہمیں تو پتہ بھی نہیں چلتا۔" ماموں نے کہا اور ڈاکٹر نے آپریشن تھیٹر کے دروازے بند کر لیے۔

کوئی دو ہفتے کے قریب تمام ہسپتال میں محمد سلیم کا کٹا ہوا بازو اس کے ماموں اور اس کی ماں کے سامنے لایا گیا اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر دھاڑیں مارنے لگے۔

ڈاکٹر محمود شاہ نے کہا "اگر آپ یہ بازو ہمیں مطالعے اور نمائش کے لیے دے دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

"اور اگر آپ چاہیں" ڈاکٹر شفیع نے کہا "تو آپ اسے جا کر دفن بھی کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ملکیت ہے۔"

محمد سلیم کی ماں نے روتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے کہا تم لے لو۔ تم رکھو۔ ہمیں کیا لینا ہے اس بازو سے۔ ہمارا تو بستر ہی لٹ گیا ہے۔"

بازو کٹنے کے بعد سلیم کے چہرے پر سُرخی دوڑنے لگی۔ درد غائب ہو گیا اور پندرہ دن بعد جب اس نے حجام کو بلوا کر شیو کرائی تو نرس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

پورے پینتیس دن بعد جب وہ ہسپتال سے نکلا تو ڈاکٹروں نے اُسے گھیر کر کہا "کہیے سلیم صاحب ڈاکٹر قاتل ہوتا ہے یا مسیحا؟" اور اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ ڈاکٹروں نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور تھوڑی دیر کے لیے خالق اکبر کو دل ہی دل میں شکرا کر دیا۔

اسی رات مشرف کی بیوی نے سلیم سے کہا "تمہارا ابا، تمہاری چچی تو پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی ہے۔"

سلیم نے کہا "دیکھا پھر یوں ہوتے ہیں یاروں کے جٹ چیتے۔" وہ لڑکی ہنسی اور اس کے گلے جبڑے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

لیکن محمد سلیم کی اصل کہانی یہ نہیں۔ یہ تو اس کا ایک رشتہ ضرور اصل کہانی سے بندھا ہے۔

چھ ماہ بعد جب محمد سلیم نے سرکاری کنٹرول کا ہتھ پکڑا سینے پر لگا دیا تو اس کی ماں نے اپنے اکلوتے بیٹے کے خلاف ایک اشتہار دے دیا کہ محمد سلیم ولد عبدالکریم کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اسے مرحوم عبدالکریم کی جائیداد پر کسی قسم کا حق نہیں اس لیے جو شخص محمد سلیم ولد عبدالکریم سے لین دین کرے گا وہ نفع نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔

[illegible]

[illegible] شہر سے فرار ہو گیا۔

ایک سمت دو ہاتھ تھے کہ پانچ [illegible] اس کے پیچھے پڑے [illegible]

[illegible] بھی [illegible] ۔ پھر اس نے [illegible] سمت [illegible] اور تب [illegible]

[illegible] ۔ [illegible] پچاس سپاہیوں نے [illegible] اور [illegible]

کی دیواروں کے پیچھے پیٹ رہا۔ [illegible] تھا اور [illegible] لوگ بیٹھے تھے۔ [illegible]

[illegible] تھی۔ [illegible] تھا اور [illegible] باہر تھا۔ [illegible] پر اس کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر

خود پوچھا: "یہاں کون ہے؟"

حسن سپاہی: "ابراہیم کو گرفتار کرو۔"

لال دین: "لکھو آدمی نے کہا۔"

ابراہیم نے [illegible] نے [illegible] پر [illegible] اور [illegible] کے [illegible]

[illegible] اور ابراہیم نے اس کے دونوں [illegible] آنکھوں سے [illegible]

اس دن بہت [illegible] تھا۔ سردیاں آہستہ آہستہ آ رہی تھیں اور گرمیاں جا چکی تھیں۔ [illegible] لوگ اندر سونے لگے تھے اور [illegible]

باہر [illegible] ابراہیم [illegible] ۔ [illegible] چار روز پہلے [illegible] پانچ [illegible] ۔ [illegible]

اور [illegible] نے [illegible] بہت [illegible] ۔ ابراہیم اپنے [illegible] آدمی [illegible] آنکھیں [illegible] کاٹ [illegible] ۔

آہستہ آہستہ دونوں کی جھریاں نکل جانے لگیں۔

[illegible] کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے [illegible]

[illegible] ۔

ابراہیم [illegible] سے اندر داخل ہوا اور اپنے ایک ہاتھ سے [illegible] پکڑا اس کے پیٹ میں مار کر [illegible]

[illegible]

پھر اس نے [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کو [illegible] سے [illegible]

[illegible] سے [illegible] اور آرام سے [illegible] پر لیٹ گیا۔

دوسرا [illegible] جب اس نے [illegible] کا منہ دیکھا۔

[illegible] ابراہیم ٹھنڈے [illegible] ۔

اے روشنیوں کے شہر

[illegible] الٰہی

تک ٹیرپیٹ پر کھڑے ہو گئے تھے، عزیز و اقارب، دوست احباب [illegible] بارات بن گئی تھی، صرف ڈھاکے نے [illegible] یوں بھی آج شہر میں جگہ جگہ منقش سائبان [illegible] تھیں، ہر طرف روشنی کے شادیانے بج رہے تھے، گلابی ہار [illegible] تھے [illegible] لوگوں نے شادیاں رچا لی تھیں۔

حسب معمول طیارہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے آ گیا .... وہ طیارہ جسے فضا میں دیکھ کے [illegible] جاتے تھے آج اس پر نظر پڑتے ہی کلیجہ منہ کو آ رہا۔

جب یہ طیارہ ایک عجیب پرندے کی طرح چیختا ہوا، رن وے کی سطح کے متوازی ہو گیا تو دل سے بے اختیار نکلا

ساربان آہستہ راں کہ آرام جاں در محمل است

برسوں کے بعد جب طیارے سے کراچی میں نانی اماں کے مکان پر سے پرواز کرتے تو وہ ہمیشہ کہہ اٹھتیں۔

"تمہاری خیر، سب مسافروں کی خیر"

میں گھر میں تم جا رہے ہو ان کی خیر"

ان دعاؤں میں سادگی اور نیکی جھلکتی تھی۔ آج ایک طیارہ مشرقی پاکستان کے [illegible] دیاروں پر سے اڑتا ہوا اس کے [illegible] رہا تھا جو ان کے پوتے کا جسد خاکی لا رہا تھا (شہادت کی امانت، مٹی کو اس کی سپرد خاک کرنے کے لیے) بیوی کا اثاثہ [illegible] جنہوں [illegible] کا، بچوں کا خاموش باپ، وہ ایک بے حد شفیق باپ تھا، ایک نیا عمل اور ایک [illegible] ایک [illegible] دوست بچوں [illegible] جانے والا، ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں برابر کا شریک، انھیں پلک پر سے بٹھانے والا .... یہ اس کی [illegible] کرتا اور نیکی جب اس کے بستر میں سو جاتی تو رات گئے، سونے سے پہلے وہ خود انھیں اپنے اپنے بستروں میں لٹاتے، [illegible] جب [illegible] کے لیے مرکز گئے تو میں نے صنیعہ سے پوچھا تھا۔ ابا اپنے ابا کو بہت [illegible] کرتی ہوگی، تو صنیعہ [illegible] کچھ بھی پوچھتی ہے، آج وہ ماں کی ہے، پاپا اب ہے تو اس سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ بیٹے تمہارے پاپا گئے نہیں [illegible] تم انھیں کبھی دیکھ پاؤ گے، وہ دور وہیں چلے گئے، بہت دور، انسانی دسترس سے دور ...

[illegible] سفر ایک کام سے زیادہ دیتا، اس میں تکلیف تھی، کشمکش، چند لوگوں میں وہ زندگی کی جدوجہد سے آزاد ہو چکا [illegible] کا حصول اس کی حیات [illegible] کے دعوے کا اختتام ہو گئے، بات کی تقسیم ہی ناممکن تھی، [illegible] ہو چکی تھی [illegible] اس میں دلکشی ہوتے تھے، لیکن اس کی زندگی کا پروگرام ختم ہو چکا تھا۔ آفتاب نصف النہار پر [illegible]

گیا وہ پہلے دورہ پر قاہرہ [illegible] کی [illegible] بہت [illegible]

ہوئے پہلے سب سوال پوچھے۔ بہت دقت سے [illegible] اور [illegible] جیسے [illegible]

اور جنگ کے SPECTRUM کا جائزہ لیا [illegible] کا فیصلہ کر لیا

[illegible] تھی۔ [illegible] اس کے [illegible] تھی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں ہوتا [illegible] کا [illegible]

[illegible]

میرا بیٹا اک جیت گیا ہے

وہ جیتے مر کر بہت گئے

کہ وہ بہت اونچا [illegible] بچوں کے لیے شفقت کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ——— اپنا پیارا ———

[illegible]

روشنی بانٹ سکے گا۔

[illegible] کی ذات کی [illegible] میں نے [illegible] میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے

پہلے [illegible] ...... [illegible] میں اپنے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] قدم قدم [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بیٹے کی [illegible] ....

مسلسل سفر کی تیاریاں مکمل تھیں۔ ہر کوئی بے نیاز ہو کر ادھر اُدھر گھوم رہا تھا تو کوئی دیوانہ وار اس کے نشہ میں چور رہا تھا۔ دلوں کی کتابیں بند سی تھیں، ہر دو کی اپنی کتاب سے ٹکرا کر باتیں لیکن ان کا دُکھ کم نہ ہوتا تھا، جب اُسے اُٹھا کر سے پہلے تو ایک شور بپا ہوا۔ ایک اندوہناک گونج اُٹھا سینے کا۔

"یارو کیا غضب کر رہے ہو، اسے کہاں لے جا رہے ہو؟" (اس فریاد میں انسان کی بے بسی کی داستان مضمر تھی۔ روز ازل سے یہ فریاد گنبد گردوں تک جاتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح خالی ہاتھ لوٹ آتی ہے) اسے وہاں لے جا رہے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، جس کا اس دُنیا سے کوئی تعلق نہیں، آنسوؤں کا سیل رُکنے میں نہیں آتا تھا۔

نہیں ٹھہرتا اُن کی رُخصت کا وقت

وہ رو رو کے جب بلا ہوگیا

اس سُنسان اندھیری رات میں آخری ساتھ دینے والے عزیز غم سے چُور خاموشی سے راستے طے کر رہے تھے، کوئی اپنے سوچ کی دُنیا میں گم تھا تو کوئی کسی حرماں نصیب، درماندہ و مایوس کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ قدموں کی مدھم چاپ اس خاموشی میں خلل ہو رہی ہو۔

انہوں نے عزیز ساتھیوں نے پورے اعزاز کے ساتھ رُخصت کیا تھا۔ اب اپنوں نے دل پہ پتھر رکھ کے آخری رسم کی ادائیگی شروع کی، قبر تیار تھی اور اپنے مکین کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ مضافات کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں، قبرستان میں صرف وہی تھی، اداس اور شہر کی تیرگی کو، قدیم گھنے اشجار تھے اور پیڑوں سے ورے خودرو پودے، جن سے لمبے لمبے اور اینٹوں کی ... شروع ہوئی تو عزیزوں نے اس پیکر اخلاص پہ آخری نظر ڈالی، اب چند منٹوں میں دروازہ بند ہوا چاہتا تھا، چند منٹوں میں دنیوی رشتہ منقطع ہوا چاہتا تھا۔ وہ ازلی تنہائی جو زندگی بھر انسان کا ساتھ دیتی ہے اب مجبور، قاصر یاں کی حقیقت میں جلوہ گر تھی، کیفیت غیب و شہود سمجھنے کی ساعت آن پہنچی تھی۔

اے اجل! اے ساعت عشرت اثر

زندگی کی اے وفا نے آخری

اپنا بیگانہ نہ ہوگا جب کوئی پاس

رنگ جس کو کہتے ہیں جلوے کی رات

میں کنول ہو کے کھلوں گی رات میں

وہ پنے آلک سے ملوں گی رات میں

مسرور صاحب زیر زمین چلے گئے، وہ کھلتا ہوا شفیق چہرہ اوجھل ہو گیا۔ وہ شمع جو مشرقی پنجاب میں طلوع ہوا تھا، آدھی رات کے وقت مغربی پنجاب میں آ کر غروب ہوا، گویا زندگی میں پاکستان کی دعوت قبول کی اور پھر شہر خاموشاں کا سفر جو ہمیں کرنے کو تھا، مشرق سے مغرب تک کا سفر زیست سے موت تک کا سفر۔

[illegible]

[illegible] یہ پہاڑ ہمیشہ [illegible] ایک [illegible] سپرد کیجیے۔

[illegible]

[illegible] پہنچ رہی ہے۔

...... جب میں نذیر بھائی کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی [illegible] [illegible]

جس سے [illegible] ہو۔

[illegible] نذیر بھائی [illegible] [illegible] یاد ہیں۔ [illegible]

[illegible] ہے۔

اور نیاز صاحب [illegible] میں شادی کی تقریب تھی۔ خوب گہما گہمی تھی۔ خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ ایک دوست نے مجھ سے آ کے کہا: تم نے سنا [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] جب [illegible] سفید [illegible] سے

رکھی تھی اور جلسے میں پیشتر لوگوں سے ہی وہ آواز نہ لگی تھی اُس روز نیاز احمد مر گئے۔ نیاز احمد جو ملنے والوں کی جان تھا جسے ہزاروں منتخب
شعر زبانی یاد تھے جو کسی کے پہلے مصرع کو زمین اور بحر بتا دیتے تھے اب ہم اُسے کبھی نہ دیکھ پائیں گے اور مجھے نیاز احمد کے وہ الفاظ
یاد آگئے۔

"آخر ہمیں ایک روز اس جہان سے جانا ہے ورنہ ہمارے بچوں کے لیے جگہ کہاں
رہے گی۔"

مجھے کیا معلوم تھا کہ چند ہفتوں میں ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے سربراہ کا جسم خاک و خون میں غلطیدہ چلتی سڑک کے کنارے پڑا ہوگا۔
بے یار و مددگار ——— منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی۔

باغِ جناح کے اوپر پندرھویں رات کا چاند اپنا ازلی سفر طے کر رہا تھا۔ خنک ہوا سبز درختوں میں سرسرا رہی تھی اور وہ گنجینۂ
شعر و روایت منوں مٹی کے نیچے دفن ہو چکا تھا۔

خدا بخشے وہ عجیب آدمی تھے۔ بچوں سے ساتھ شفقت اور بے تکلفی۔ دنیاوی معاملات میں حق گوئی اور بے باکی۔ انسان دوستی
وہ حیدرآباد چھوڑے انھیں کئی سال ہو گئے تھے لیکن مجھے ابھی یاد ہے ان کا حیدرآباد کے فلاں کالج کے لیے کچھ کیا۔ میاں دیکھو
سنبھالو Do something کیسے ہے۔ حیدرآباد پبلک سکول کو کچھ امداد دی۔ وہاں ہمت بیٹھ رہا ہے۔ یہ سکول انھوں نے
حیدرآباد کی کمشنری کے زمانے میں بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ اس بات کو کئی سال گزر گئے لیکن انتظامی فاصلے کے باوجود اس علاقے سے
رشتہ قائم تھا۔

وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ عمر کوتاہ فرصت نہیں دیتی۔ یہ گہری نیند جب اوقات چور دروازے سے دبے پاؤں داخل ہو
جاتی ہے۔ وہ کام کیا کیا جو کر تو سکتے تھے کر نہیں سکے۔ ہر کوئی اُدھار نہ رکھو۔ زبان پیشتر کرنا ہے۔ یہ کام فلاں ناقد، اور میں نے
ان جملوں کے لیے وقف مقرر کر رکھے تھے۔ کسی اُداس دوست کا پیار بھرا خط لکھنا تھا۔ کسی زخم پہ پھایا رکھنا تھا۔ تو آخر وہ
سب کرنا ہے اور عمرِ عزیز مہلت نہیں دیتی۔

کسی پارٹی میں ہم ایک ساتھ کھانے کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ نیاز صاحب نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔
"اس موقع پہ یہ شعر سنو"

یہ موت کا ہی جشن ہے ....

باقی ہمارا ہی دور ہو گیا اچھا ہے نہ سنیے گا۔

میں نے سوچا تھا نیاز صاحب اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے بڑی محفلوں کو گرماتے رہیں گے اور ان کے بیساختہ قہقہے ہمیشہ گونجتے
رہیں گے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ ہاں اور وہ بھی اتنا ہی قبل از وقت۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ حقیقت اتنا زود رس ہے کہ سب سچا
ہی ہو جاتا ہے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ نیاز احمد چلے ہی گئے ہیں ....

اور امر جانی کے متعلق بھی ہمارے ذہن کا شعور یہی ہو گا۔ وہ تو ہمارا ہی تھوڑا سا زندگی کے لیے بہت جینے کے لیے

[illegible]

بسر ہوئی ہوں۔

[illegible]

خیال [illegible]

سرزد کر رہا ہے؟

[illegible]

[illegible]

معاف کردیا گیا ہے۔

یعنی [illegible] "نا" سے [illegible] گیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] وہ صلح کل، صوفیا دوستاں تعلقات، دشمنی سے عاری زندہ تصویر تھا۔ وہ کسی کی طرفداری نہیں کرتا تھا۔ طنز سے اجتناب، اس کی باتوں میں تضحیک کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ نہ ہی اس نے کبھی اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ کوئی قریبی ہو یا غیر، ہر ایک کی خدمت کے [illegible] اس کے عزیز اپنے عہدوں پر فائز تھے لیکن یہ اس کے لیے فخر و مباہات کا موجب تھا اور نہ ہی رشتہ داروں کا چھوٹی جگہ ہونا باعث ندامت۔ [illegible] شفقت کی نظر ہر کہ و مہ کے لیے۔

[illegible] ہمارا ہر کم شخصیت نہ تھی کہ پہلی نظر میں آنکھ میں کھب جائے۔ اس کی بھلی چنگی اور شرافت پیچھے سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ وہ انجانے طور پر اپنے گرد و پیش ہمدردی اور خیر سگالی کے تاثرات بکھیر دیتا تھا اور آپ سوچتے تھے 'یہ شریف آدمی میرے لیے کیوں پریشان ہو رہا ہے' یہ میرے لیے اتنا کچھ کیوں کرنا چاہتا ہے؟ اب [illegible] نہیں [illegible] کے لیے خاموش ہے اس کی یاد سوز جاں ہے۔ جب بھی کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو ہمیں یادوں کے چہرے ماضی کے دریچوں سے جھانک کر پریشان کرتے رہتے ہیں چاہے وہ ایک بچے کی موت ہو یا ایک انسان کی.....

ہماری امیدیں، ہمارے خواب، ہمارے فیصلے ان کی کیا وقعت ہے۔ ایک مجبور و بے بس انسان کی کیا وقعت ہے؟ تقدیر [illegible] رکھتی ہے......

میں سوچتا ہوں نذیر [illegible] پچھلے جانی کی جان بچاتے ہوئے ڈوب گئے۔ جب انھیں [illegible] باہر نکالا گیا تو اس وقت بھی چند سانس باقی تھے۔ اگر بروقت طبی امداد مل جاتی تو .... نیاز احمد ڈار کے اندوہناک حادثے میں جان بحق ہو [illegible] ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے تو شاید بچ جاتے! میں احمد بھائی کے متعلق میں کیا سوچوں؟ [illegible] مہمان [illegible] کا شوقین [illegible] برات میں [illegible] جاں بحق ہوا!

احمد [illegible] کہا کرتے تھے۔ وہ ایک [illegible] کیا ایک خاص عمر کے بعد انسان [illegible] کھانے کے لیے زندہ [illegible] ہے [illegible] نہیں [illegible] اور [illegible] کی موت سے بھی [illegible] ہے۔

آج میں تنہا ہوں [illegible] پتیوں کا مجموعہ [illegible] ڈوبتے سورج کی ضیا اور چمکتی ہوئی شفق [illegible] خوبصورت رنگت [illegible] خاموشی [illegible] زرد پتوں کی چادر بچھ گئی ہے [illegible] درخت [illegible] غروب آفتاب کے بعد میری نظر [illegible] اوپر اٹھ گئی تو دیکھتا ہوں کہ آسمان کا ایک حصہ شفق میں نہایا ہے [illegible] آہستہ آہستہ سرد ہو رہے ہیں [illegible] آسمان [illegible] دھل گیا ہے [illegible] پتیوں میں سے چاندی کا تھال نظر آ رہا ہے اور اس کے عین اوپر ایک روشن ستارہ [illegible] شرکت [illegible] چاندنی [illegible] دریچوں میں سے آتی ہے [illegible] ساری رات [illegible] گزر کے رہ گئے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مٹی کا ادراک

جوگندر پال

نیچے ڈھابے میں کھانا کھانے کے بعد ہم سب نے تنہا کیمنڈ کی پہاڑی کی جانب دیکھا۔

"پہلے ذرا سستا لیا جائے۔" رام ناتھ نے مشورہ دیا۔ "پھر اوپر جا کے کیمنڈ دیکھیں گے۔"

"ہاں بھئی۔" ایرانی نے ڈکار لے کر کہا۔ "بھابی کا کھانا اتنا لذیذ تھا کہ کھا کے اب پیٹ کا بوجھ بھی نہیں اٹھایا جاتا۔"

"آپ لوگ سستاؤ۔" کیپٹن تیجا سنگھ کہنے لگا۔ "ڈارلنگ، ہم اوپر چلیں۔" اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کیا —— "اور تم —— تم اور مہیا بھی سارے برتن دھو کر واپس ڈھابے میں چھوڑ آؤ —— کیوں ڈارلنگ!"

ڈارلنگ اپنے کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو جی۔"

"چلو تم بھی اٹھو۔" رام ناتھ نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اب زیادہ کھانے سے کس کی پیٹ پھٹے گی!"

میں نے ایرانی کے ساتھ ساتھ چلنا چاہا لیکن وہ قدم بڑھا کر مسز رام ناتھ کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "بھابی، تمہارا کھانا ——"

"ہمارے بھائی ایرانی!" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا یکایک یاد آنے پر کہا۔ "آپ نے تو بتایا تھا کہ کوئی گائیڈ ملے گا [illegible] لے جائے گا۔"

"میں یہاں ہوں سرکار۔" ایک سفید ریش آدمی قریب ہی کہیں سے نکل کر ہمارے پاس آ گیا۔

"تو چلو بڑے صاحب، پیچھے ہم سب آ رہے ہیں۔" کیپٹن تیجا سنگھ نے گویا اپنی فوج کا جھنڈا اسے سونپ کر آگے چلنے کا حکم دیا۔ "ڈارلنگ —— وہ نے پہاڑ پر [illegible] تو کیسے لیٹا ہوا ہے بھائی! اٹھو! ——"

"آپ پیچھے آ رہے ہیں۔" اس نے اپنی تنی ہوئی ڈنگی کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتے ہوئے کیپٹن تیجا سنگھ کو جواب دیا۔

"اچھا اچھا سمجھ گیا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "نیچے گر رہا ہے بھائی ...... آؤ ڈارلنگ!"

ہم سب گائیڈ کے پیچھے پیچھے پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

"یہ کیمنڈ ایک انگریز نے دریافت کیا تھا۔" گائیڈ سنا رہا تھا۔ "وہ اپنی بیوی کو پیچھے ایرانی کے ساتھ چھوڑ کر اس کے [illegible] چلا آیا تھا۔ وہ یہیں کہیں شکار کے لیے آیا ہوا تھا۔ جب وہ اس پہاڑی پر پہنچا۔" وہ رک کر ایک پہاڑی کی چوٹی کی جانب دیکھنے لگا۔ "تو اچانک ادھر دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر ——"

"کیوں ڈارلنگ!" کیپٹن تیجا سنگھ کی بیوی اچانک چار سال پہلے کی بات کہنے کے لیے ٹھہر گئی تو اس کا شوہر [illegible] اس سے

[illegible] اس نے [illegible] [illegible]
[illegible] اس نے اپنی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھ کر [illegible]
[illegible]

اس کی بیوی نے پیٹ پر دوپٹہ ڈال لیا۔

"شرم نہیں آتی؟" [illegible]

[illegible] کیا ہم گھنٹہ بھر میں واپس چل پڑیں گے؟

[illegible]

"نہیں، یہ بات نہیں۔" [illegible] "شام کو سات بجے [illegible]"

[illegible] کے ساتھ [illegible] کا انتظار کرنے لگا۔

[illegible] کی طرف دیکھنے لگا۔ [illegible] کتاب

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی طرف [illegible] دیکھنے لگا۔ [illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اس نے اپنا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک بات [illegible]

[illegible] اپنے [illegible]

"کوئی ہندوستانی سالا کیسی مزے کی بات نہیں ہوتا کیا؟" رام ناتھ کہتے رہتے تھا۔ "انگریزی حکومت کو پورے ستر برس ہو چکے ہیں اب بھی بات بات میں صرف انگریز کے بول ہی سننے میں آتے ہیں، پارلیمنٹ میں بھی۔" رام ناتھ پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ اور لیمنٹ کے باہر بھی۔"

"ہم ہندوستانی چپ چاپ میں ہی ساری باتیں کر جاتے ہیں۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوئے پروفیسرا!" کیپٹن تیاگی کہنے لگا۔ "ان سروری صاحب ـــــــ آپ اپنی بات شروع کرو۔"

"میں کہہ رہا تھا جناب، یہ کوئی دعویٰ نہیں جو یہ مٹی کی مورتیں زندہ معلوم ہوتی ہیں، ہم بھی مٹی کی بنی مورتیں ہیں۔ ہماری زمین کی زندگی مٹی سے بنی ہے، اس لیے وہ صاحب بہادر ـــــــ" رام ناتھ کی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرا جانے پر بڑا میاں ذرا اکھڑ گئے ـــــــ "اس لیے میرا ایمان ہے کہ ان سب مورتوں میں بھی جان ہے۔ ادھر آئیے ـــــــ" وہ ہمیں بائیں طرف غار کی بائیں جانب دیواروں کے پہلو میں ایک بستر سنگ پر کسی فنکار کی بنائی ہوئی ماتا پدما کا بُت دائیں کروٹ دراز تھا۔ "یہاں آئیے، دیکھیے!"

یوں معلوم ہوتا تھا کہ ماتا پدما ابھی مسکراتا ہوا خوابناک غنودگی کی کیفیت سے باہر آ کر اپنی آنکھیں کھول دے گا۔

"اور اب یہاں آئیے، اس کو دیکھیے!"

اور اب یوں لگ رہا تھا کہ ماتا پدما اپنے جسم میں نہیں ہے، اور چونکہ وہ ابھی ابھی اپنے جسم کے اندر ہی تھا، اس لیے کچھ یہ کیفیت ہے گویا ابھی ابھی بتی گل ہوئی ہو، اندھیرا گویا روشنی کا سایہ بن کے نظر آ رہا ہو، صرف ایک لمحے کے لیے لیکن یہ لمحہ جاودانی ہو گیا ہو!

ایک وقت میں جینے اور مرنے کا یہ احساس موت میں زندگی کی جھلک، سکون میں حرکت!

"واہ ـــــــ واہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

بڑے میاں میرے قریب سرک آیا۔ "کیوں جناب، مٹی میں جان ہے یا نہیں؟"

"ہاں!" میں نے شدت سے محسوس کیا۔ "زندگی کی ساری داستان مٹی سے عبارت ہے، یہی زندگی کا سارا سرمایہ ہے، یہی زندگی کی موت ہے اور اسی کے بیچ سے سارے پیکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری آرزوئیں، گیت، خواب، ان کے سب کے سب زندگی ہے اور اپنے موت سے دوچار اور بے حد کھلا ہوا ہر دم، حسن اور حقیقت ہے ـــــــ"

"یہ جو ساری باتیں ہیں کیا وہ سروری صاحب؟" کیپٹن تیاگی بڑے دھیان سے کہہ رہا تھا۔ "تو کیا سمجھتے ہیں آپ یہ سب باتیں، یہ جو ہر کوئی پوچھ رہا ہے، یہ سب ٹھیک ہے، اب تو شاید وہ دن دور نہیں جب ہم بھی اپنی چاہتیں جان سے کھو کر صرف کسے ہوں گے۔"

"معاف کیجیے، میں اپنی زبان کا استعمال کر رہا تھا۔"

"جس ؟ ـــــــ" تیاگی کہنے لگا۔ "جس کی یاد ہو رہی ہو ـــــــ پھر کوئی بات نہیں، آگے بڑھو۔"

"دیکھیے۔" بڑے میاں نے کہنے کے بعد کہ ایک دیوار کی طرف اشارہ کیا ـــــ وہ فریز تھی ـــــ "مجھے کچھ یہ
سہ طبقہ بیٹھے ہوئے سے ہیں کے اینٹ کی سے بچے ہیں۔"
"یہ دیوی ہو گی، سرسوتی!" گیتی بولی۔ "یہ آپ بتائیں گے۔ آؤ اندر چلیں۔"
پروفیسر اپنی بیوی کو ایک مورت کی تصویر کی طرف لے گیا۔ "دیکھو جلتے دیکھو گیتی۔ کیسی ہیں؟"
گیتی نے مسکرا کر سر ہلایا۔
"تمہیں پسند ہیں؟"
گیتی نے پھر مسکرا کر سر ہلایا۔
"آؤ کچھ دیر ان مناظر کے پاس بیٹھیں۔" پروفیسر نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ "جب ایک طرف فریز اور کا بیٹھا دیکھ کر
اس کی طرف دیکھتے ہوئے پروفیسر کے سامنے کا خیال آیا جو ایک طرف کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔
میں اس کے قریب چلا آیا۔
"کیا سوچ رہے ہیں شرد صاحب؟"
"میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے گھر اور کلا کو چھوڑ ایک مسلمان کی بھاشا میں کیسے بات کروں؟"
"اس میں کیا برائی ہے شرد صاحب! میں نے تو کئی بار انگریزی میں بات کی ہے۔"
"شکر ہے آپ نے اسے عربی یا فارسی میں نہیں لکھا۔"
"پھر بھی کیا کہتا ہوں، ستی شرد صاحب۔ میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بھاشا کے نام پر ایسی قیمت نہیں دی جا سکتی۔ کوئی ایک خیال کسی مذہب
کی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر خیال کسی بھی مذہب کا نہیں ہوتا۔ یہ تصویریں دیکھیے۔ جن لوگوں نے بنائی ہیں وہ ہندو ہیں
یا کسی سے جدا ہیں اور وہ بہتر سمجھتا ہے اس سے بہتر ہیں۔"
"آئیے صاحبان، اب دوسرے غار میں چلیں۔" بڑے میاں نے ہمیں آواز دے کر مخاطب کیا اور ہم سب دروازے کی طرف
بڑھ گئے اور باہر چند قدم چلنے کے بعد جب ہم دوسرے غار میں داخل ہو رہے تھے تو مجھے خیال آیا کہ شرد ان سب کے ساتھ کیوں نہ
کمرے میں چلا گیا۔ انہوں نے غاروں کی جانب رخ کیا ہے، اور وہ غار میں، پچاگر پھر بلایا تو وہ مسکرا دیا۔ اور میں پیچھے کے پیچھے چلا
ہر ایک سے کا اصل مقام ہی مالک ہے، یعنی دو قسمت چٹانوں میں کٹی ہوئی مورتیاں، رنگ بھری ہیں اور ـــــ اس لیے اجنتا کے غار
کی یہ زندہ تصویریں صرف بیٹھی ہی ہیں کیا یہ شکلیں کسی نے بنائی ہیں۔ جن کے متشر اعضا، عورت کی مسکان میں خاموشی، اپنے آپ میں
اپنی جگہ پر جڑ کر سلیم زندگی میں آ ملے گئے ہیں۔
"ان تصویروں کو بنانے والے کون تھے؟" رام ناتھ نے بڑے میاں سے پوچھا۔
"ان غاروں کے متعلق یہی ایک سوال ہے۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "جو میری واقفیت سے باہر ہے۔ کیونکہ تیار
کرنے والوں نے اپنا حساب بیان کیا۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

جس سوال کا جواب نہیں میں نے سوچا۔ تاکہ بچوں کے ماں باپ کا نام پوچھا جائے تو ٹھیک ہے لیکن جس شخص کے چہرے میں پر بوجھ پیدا کر دیا، اس کی تصویر شخصیت دکھائی دیتی ہو، اس کی اپنی ذات جو اس کی اصل پہچان ہے، ایسا کوئی تصویریں اپنے بالغ شعور میں اس کے دیکھنے والے کے خالق کا خیال نہیں آتا، بلکہ خود انہی کے خیال سے دل و دماغ گم ہو جاتے ہیں۔

میری نظر ایک خوبصورت عورت کی تصویر پر پڑی ہوئی تھی۔

"آپ یہاں سے نیم دائرے میں گھوم کر اس جہت تک جائیے۔" بڑے میاں نے مجھ سے کہا۔ "اس عورت کی نگاہ آپ کے ساتھ ساتھ وہاں تک گھومے گی۔"

لیکن اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ جو زندہ تصویر محض رسمی طور پر زندہ نہیں کہلاتی بلکہ وہ واقعی زندہ ہوتی ہے، خود آپ اپنا آپ ہوتی ہے۔ اس کا خالق اسے بناتا نہیں، وہ خود بخود اس کے ذہن میں بنتی ہے اور پھر ہوبہو اسی شکل میں وہاں سے باہر آ جاتی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ اس کے کسی نقش میں جسم کی تبدیلی بھی واقع ہو، اس کی اپنی فطرت سے اس کا چہرہ زندہ رہتا ہے اور وہ اپنے اس چہرے کی تمام تر جزئیات سے اپنی فطرت کا اظہار پیش کرتی ہے۔ اگر اس کا خالق زبردستی سے ان جزئیات کو بدلنا چاہے تو وہ معرض وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

"یہ دیکھیے دو پیار کرنے والے!" بڑے میاں نے کیلنڈر تھامتے ہوئے کہا۔

"آہا فوارہ!"

یہ دو جاندار پرندوں کی نظروں میں اس لیے ایک دوسرے میں سمائی ہوئی ہیں کہ کیسے سے اپنے آپ اپنے خالق کے ذہن میں آ وارد ہوئیں۔ انہیں اپنے خالق کی موجودگی کا قطعاً احساس نہیں ورنہ یہ دونوں گھبرا کر سنبھل کر ایک دوسرے سے پرے جا کھڑی ہوتیں اور اپنے خالق کی طرف دیکھنے لگتیں۔ لیکن انہیں اس کی خبر ہی نہیں، ان کے لیے اس کا وجود ہے ہی نہیں۔ زندہ تصویر کا کوئی خالق نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وہم سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی رگوں میں اپنا خون دوڑتا ہے۔

میں نے تصویر سے آنکھ ہٹا کر گردن اپنے آس پاس دیکھا۔

"ایرانی بھائی!" رام ناتھ ایرانی سے کہہ رہا تھا جو اس کی بیوی کی طرف وارفتگی سے دیکھ رہا تھا گویا وہ سینے سے چمٹا ہوا گرم گوشت ہو اور ایرانی کی نظریں کہہ رہی ہوں کہ بھائی، یہ گوشت تمہارا ہے مزیدار ہے! باقی سب بکواس، کھاؤ اور کھانے دو، پیچھے دو ——— "ایرانی بھائی ایک بات کہوں؟" رام ناتھ ایرانی کا ہاتھ تھام کر فلک کی ایک جانب سرکنے لگا۔

"ایک نہیں، سو کہو شری رام ناتھ جی۔ لیکن بھائی کا گوشت ایک بار پھر کھلا دیجیے!"

"ایک بار نہیں، سو بار سیکڑوں بار!" رام ناتھ کی آواز دھیمی ہو گئی۔ "یہ بات سنو میری۔ ایکشن قریب آ رہا ہے۔ وہ ... کے مسلمان بھائیوں کے ووٹ چاہتا ———"

"گھبرائیے نہیں رام ناتھ جی۔" اس سے بات کرتے ہوئے ایرانی نے پھر رام ناتھ کی بیوی کی جانب دیکھا۔ "تیس ایک ووٹ ———"

"ہم نے پوچھا صاحبو!" بڑے میاں نے بےچین ہو کر کہا۔ "آپ کو ایک تماشا دکھاؤں۔"

پھر فقیر اپنی جھولی کو ٹٹول کر ایک اور تصویر دکھا رہا تھا۔

"مجھے تو اس سے کچھ بھی دلچسپی نہیں ہے!"

"ذرا ٹھہریے۔ مولوی صاحب ذرا ادھر بھی دیکھیے۔" کیپٹن تیا مجو بڑے میاں کے ساتھ چلنے لگا۔ "مولوی صاحب شاید

کیا بات! ——— آپ تو یاد کر رہے ہیں۔ ہم تو بہت دیر سے تمہاری تلاش میں ہیں۔..........

کیپٹن ہنسنے لگا۔

اور بڑے میاں کو کیپٹن کی یہ بات ناگوار گزری، اس نے اپنی شکل بگاڑ کے ہنسنا شروع کر دیا۔

"بڑے میاں کو کم از کم پانچ روپے دے دیجیے۔" میں نے پشت پر ہاتھ رکھ کر اپنے بھائی سے مشورہ کیا۔

"نہیں، دس روپے دے دیجیے۔" بھائی نے رائے دی۔

"دس!" شوہر نے فوراً آپ کی پشت سے آگے بڑھ کر اعتراض کیا۔ "کس بات کے؟ میں تو اپنے حصے کا ایک پائی بھی ادا نہیں کروں گا۔"

"پھر مولوی صاحب جلدی جلدی اپنا تماشا دکھاؤ۔" میں نے آگے بڑھ کر کیپٹن تیا مجو بڑے میاں سے کہہ رہا تھا۔ "اور یہ رہا ہے:

"تمام تر ہمارا، پیسے کا صاحب۔" بڑے میاں نے جواب دیا۔ "مگر ابھی وہ اب جو دکھاؤں گا، ایسا کہ آپ بیٹھے یاد رکھیں گے۔"

"واہ واہ!" تیا مجو ہنسنے لگا۔ "مولوی صاحب، آپ تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں ——— ذرا ایک

واہ واہ! ——— پھر ہم نے سوچا، یہ پروفیسر کا خیال آیا۔ "اور یہ پروفیسر، آ بھائی۔ تم بھی واہ واہ کرو۔"

"ٹھہریے۔" بڑے میاں کہنے لگا۔ "ادھر بائیں طرف آ جائیے!"

ہم سب اس کے پیچھے پیچھے چل کر ایک جگہ ٹھہر گئے۔

"اب سامنے دیکھیے!"

ہماری نظر جو اوپر کو سامنے دروازے کے اندر پڑی، ہماری آنکھیں ایک دم چمک سے چکاچوند ہو گئیں۔

اب کے ہم ایک بہت بڑے کمرے کے ایک دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

سامنا وہ بڑی حیرت کا کمرہ تھا جس میں کمرے کے سارے کمروں کی جھلک تھی۔ پتھریلی دیواریں سونے کی تھیں۔ سب بڑا جو طرف دیکھو، چمکتا ہوا تھا۔ اب ہم نے غور سے

دیکھا، سب جیسے کسی کی آنکھوں سے ضرور زمرد و فیروز جھانک کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہم ایک اس روشنی کی تاب نہ لا کر ہو گئے، ہم لوگ اب تک

سامنا ہماری طرف بڑھ کے پہلے ہی جگہ سے نکلنے کا ارادہ کر رہا ہو! ——— ہم ڈر سے کھڑے رہ گئے۔ جیسے ہماری کوئی شے

دم بہ دم پتھر کے بنتے ہوں اور وہ مجسمہ زندہ انسان ہو۔ جیسے ہم جیسی آنکھیں رکھتے ہوں، ہمیں دیکھ رہا ہے!

ید بیضا

کوثر چاندپوری

حمزہ خان کھپریل کی چھت والے کچے اور تنگ مکان میں پڑا کھانس رہا تھا۔ اس کو وقت تکلیف ہوتی کھانسی ہو رہی تھی اور بار بار کھانسی کے شدید جھٹکوں سے زیر و زبر ہو رہا تھا۔ پچھلے چار مہینے سے وہ پلنگ پر پڑا اسی طرح کھانس رہا تھا۔ اس کے جاڑے حال کا شروع ہو بیس بائیس سال سے بارہ بارہ گھنٹے تک کھانستا تھا اب گھنٹے لگا تھا۔ پہلے جو لوگ آتے جاتے خالی چوپال کو دیکھ کر سلام کیا کرتے تھے، اب چپ چاپ پٹھان بابا کے گھر کے سامنے سے گزر جاتے ہیں اور صرف کنکھیوں سے ادھر دیکھ لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ پٹھان بابا تین بیٹوں اور کئی پوتیوں کا باپ تھا۔ لیکن یہ ساری اولاد دوغلی تھی۔ آدھی ہندوستانی اور آدھی ولایتی۔ پٹھان بابا سرحد کی طرف سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں آ کر اس نے ایک چمارن گھر میں ڈال لی تھی۔ اسی کے پیٹ سے یہ اولاد پیدا ہوئی تھی۔ پٹھان بابا کبھی کبھی اپنے بڑے بیٹے حمزہ خاں کی کسی غلطی پر خفا ہو کر کہہ دیا کرتا تھا۔

"وہ تیری تو رتی بھی شکل ہے کہ ماں کی باپ کا کچھ پٹھانی کی کرامت سے تم پیدا ہو تو شیر بچہ کہلاتا۔"

مگر حمزہ خاں کی ماں چمارن ہی کہلاتی تھی اور بہت بڑے گھیر کی شلوار پہنتی تھی وہ پشتو نہیں بول سکتی تھی لیکن پٹھانوں کے لہجہ میں باتیں کرنے لگی تھی۔ اور دانت صاف کرنے کے بجائے اخروٹ کی چھال چبایا کرتی تھی۔ پٹھان بابا کے تینوں بیٹے جوان ہو چکے تھے اور بلا میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگے تھے لیکن ان کا وہ رعب داب نہ تھا جو خان بابا نے قائم کر لیا تھا۔ گاؤں کے جو کسان خان بابا کے قرض دار رہتے وہ ان کی بیماری سے بہت خوش تھے۔ غازی کے پیٹ میں بھی ایک قسم کا سکون تھا۔ مہینوں سے پٹھان بابا کی گالیوں کی گونج نہیں سنی گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی نہ سنی جائے گی۔ وہ کتوں، بیلوں، مرغیوں اور بیلوں کو بھی گالیاں دیا کرتا تھا اور یہ گالیاں بالکل ویسی ہوتی تھیں جو آدمیوں کو دی جاتی تھیں۔ وہ آدمیوں اور جانوروں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ دیہات میں اس کی یہ پالیسی بہت کامیاب تھی۔ جانور اس سے ڈرتے ہوں یا نہ ڈرتے ہوں انسان بلا مبالغہ کانپتے تھے اور جس کی طرف اپنی سرخ موت تھی وہ بہت زیادہ مرعوب رہتا تھا۔ کسانوں کے نزدیک غازی خاں کسی طرح شیر سے کم نہ تھا جو مرتے مرتے بھی ایک آدھ کو نوالہ بنا جاتا ہے۔ سب کو یقین تھا کہ وہ پچھلے داؤ پیچ ہے پھر بھی وہ بعض قسم کے لوگ احتیاط کرتے تھے جس طرح مردہ شیر کی موت کا اطمینان کرنے کی غرض سے دور ہی سے پتھر پھینکا کرتے ہیں اسی طرح وہ غازی خاں کی موت کے بارے میں دیکھ کر بھی ایک دم سے اپنا رویہ نہیں بدل رہے تھے اور شام کو کھیتوں سے لوٹتے وقت اس کا حال پوچھ لیا کرتے تھے اور پٹھان بابا بکھرے نشہ نہیں تھا۔ جو پچھلے والے چوپال میں بیٹھا کرتے تھے اور اس کے رعب خان کی کم کر طرح طرح کے سوالات کرنے لگے تھے۔ ان میں سے ہر سوال کی وہ حیثیت ہوتی تھی جو مردہ شیر کی جانب پھینکے جانے والے پتھر کی ہوا کرتی ہے۔

کیسے ہو چچا ابا!

• [illegible]

• کہا جاتا ہے کہ کسی سے [illegible] نہیں ہوتا۔ [illegible]

• چچا ابا کو ہسپتال میں داخل کر دیا جا چکا ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نہ لے جایا جا سکتا۔

• چچا ابا کے گھر کی [illegible] ہے:

• نوٹ: ———— [illegible]

[illegible]

[illegible]

کر جاتا تھا، وہ اکثر برسات کی کالی راتوں میں پٹھانوں کی لاشوں کے واقعات سنا کرتا تھا اور اپنے دادا جبال خان کی موت کا ملال بیان کرتے وقت اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی تھیں، وہ آج بھی سینہ زوری کی موت کے گھاٹ اتار دینے کا آرزومند تھا۔

جب خان کو معلوم تھا کہ غازی خان، چنگیز خان کا اکلوتا بیٹا اپنا وسیع کاروبار چھوڑ کر بہت مالدار ہو گیا ہے، لیکن وہ اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ غازی کی گڑھے میں جب جب خان کی آنکھیں کھل گئیں، پٹھان بابا کے قبضہ میں ہزاروں بیگھہ زمین تھی جس میں [illegible] پیسا ملتا تھا، مشورہ پر مدد بھی ہوتا تھا اور کسانوں کو امداد بھی تقسیم کرتا تھا جو فصل پر دوگنا ہو کر لوٹ آتا تھا۔ اپنے علاقہ پر اس کا اثر تھا، تحصیل اور تھانے کے اہل کار اور افسر اس کے یہاں حاضر رہا کرتے تھے۔ وہ مجروں اور مرغوں سے ان کی تواضع کیا کرتا تھا۔ جب خان نے بہت بار یہاں سے چلے جانے اور اپنے [illegible] پہنچنا چاہا مگر پٹھان بابا نے اسے یہیں رہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جب خان کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"جب خان، دنیا کو کوئی وجہ نہیں، دشمنی تمہارے باپ دادا سے تھی، وہ اب جیتے تو ضرور بدلہ لیتا، تم میرے مقابلے کے نہیں ہو، مگر پٹھان کو قسم پروردگار کی جان سے گئے وہیں سیدھے میں گولی مار کے گولی سے اڑا دیتا اور پٹھان بابا کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ لیکن میں شیروں پر ہاتھ اٹھاتا ہوں، گیدڑوں پر نہیں۔"

جب خان جوان ہو کر مطمئن ہو گیا مگر وہ پٹھانوں کے جذبۂ انتقام سے واقف تھا۔ بہرحال وہ غازی کی گڑھے میں رہ پڑا اور کھیتی کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک دفعہ تھانے کے لیے تحصیل میں درخواست بھی دی مگر خان بابا نے اسے منظور نہ ہونے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب خان ...... اس کا محتاج ہو کر رہے، جس طرح اور بہت سے نوکر ہیں وہ بھی اسی حیثیت سے رہے۔

پٹھان بابا نے تینوں لڑکوں سے کہہ دیا تھا کہ جب خان کو میں نے صرف اس لیے نوکر رکھ لیا ہے کہ زہریلا سانپ بھی بند رہے، اور خطرہ ہر وقت پیش نظر رہے مگر میں اس کی طرف سے چوکنا رہوں، تم لوگ بھی اس سے ہوشیار رہنا۔ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوتا ہے اور سینہ کی [illegible] ہے اور ہماری اس سے پشتینی لاگ ڈانٹ ہے لیکن اس کے بیٹوں نے جو خود پٹھان بابا کی نظر میں [illegible] تھے ان باتوں کو بالکل اہمیت نہیں دی، ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیا۔ وہ اس زمانے کی فضا میں پلے [illegible] بعد سے پیدا ہوئے تھے، وہ پرانے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ پٹھان بابا اپنی جگہ ہر طرح سے ہوشیار تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی غافل نہ تھا اور جب خان کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ اس کی بیٹیاں جب خان سے بہت [illegible] پردہ کرتی تھیں، پھر بھی جب خان جانتا تھا کہ بڑی لڑکی مہر النساء کی ایک آنکھ چیچک میں بیکار ہو چکی ہے، اس کے منہ پر گہرے گہرے نشان ہیں اور منجھلی فیروزہ زریں بہت حسین ہے، وہی اس غازی گڑھے کی رونق اور [illegible] ہے اور سب سے چھوٹی [illegible] زرتاج [illegible] ہے، مگر [illegible] ہے۔

فیروزہ زریں سے اس کی صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی، وہ اپنے کچھ [illegible] ساتھ باغ میں [illegible] آئی تھی، واپسی میں ایک بہت لمبا سانپ مل گیا تھا۔ وہ سہم کر وہیں کھڑی ہو گئی تھی، سامنے سے جب خان آ گیا تھا اور فیروزہ زریں نے چیخ کر کہا تھا:

"پٹھان سانپ ہے:"

جب [illegible] پہلے [illegible] کی طرف دیکھا تھا پھر [illegible]۔

یہ بات [illegible] ہے [illegible] میں بہت خطرناک سانپ ہے۔

اور پھر اس نے سانپ کا سر کچل دیا تھا۔

جب خان [illegible] ایک سال [illegible] پٹھان بابا [illegible] انگریزوں [illegible] آیا [illegible] ہو گیا اور [illegible] پٹھان بابا [illegible] بہت [illegible] اپنی [illegible] اس وقت تھا [illegible] خدمات [illegible] تھا [illegible] بی بی ہو گئی ہے [illegible] سال [illegible] کی [illegible] پٹھان بابا [illegible] ایک دن [illegible] جب خان [illegible] کر دی گئی۔

جب خان [illegible] نہیں [illegible]

جی بابا [illegible] اب [illegible] کتاب [illegible] اس دن پٹھان بابا نے [illegible] جب خان کے [illegible] زمین پر [illegible] اس نے جب خان [illegible] آواز دی۔

جب خان [illegible] او جب خان!

جی بابا!

اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں [illegible] ہمارے پاس رہا کرو۔

جی بابا [illegible] جب خان نے پٹھان بابا کی [illegible] زیادہ [illegible]

اور اس کے بعد وہ پٹھان بابا [illegible] پٹھان بابا [illegible] بہت [illegible] جب خان [illegible] وقت [illegible] جب خان [illegible] پٹھان بابا [illegible] سانپ [illegible] جانے [illegible] پٹھان بابا [illegible] جب خان کی [illegible]

[illegible] جب خان [illegible]

عجب خان بہت ہنسا لیکن اس نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ابھی ہونٹوں ہی سے لگایا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ پردے [illegible] اٹھ گئی، وہاں فیروزہ زریں کھڑی تھی اور زور سے انگلی ہلا کر دودھ پینے کو منع کر رہی تھی۔ عجب خان جلدی سے بولا۔

"ابھی جی نہیں چاہتا پھر پی لوں گا۔"

"خنزیر! ——— سور کا بچہ!! وہ بگڑ کر بولا۔ پرہیز کرتا ہے، ابھی پیا ہوگا میرے سامنے!"

عجب خان لپکا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ فیروزہ زریں گول گول سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی رہی، جیسے اس [illegible] دونوں کے بیچ میں سانپ آگیا ہو۔

"عجب خان! ——— پٹھان بابا [illegible] تیرا باپ [illegible] خان سیندی ایک غزوے میں سینہ کھول کر ایک [illegible] کی رائفل کے [illegible] کھڑا ہوگیا تھا، گولی اس کے کان کے پاس سے سنسناتی نکل گئی تھی مگر اس نے [illegible] اور تو میرا بچہ دودھ پینے ہی سے [illegible] ——— بچہ! کہیں کا، میرا بیٹا پہاڑ خان دو دفعہ [illegible] زمین پر کھڑا ہو کر شیر مارتا ہے۔"

پٹھان بابا کا پہاڑ جیسا ڈیل ڈول تیزی سے گھلتا رہا۔ وہ دن رات میں سیروں بلغم اگل دیتا جس میں [illegible] وہ [illegible] عجب خان محض اس امید پر اس کے مظالم سہ رہا تھا کہ آخر وہ کب تک زندہ رہے گا، کسی دن اسی طرح ایڑیاں رگڑتے رگڑتے دم توڑ دے گا۔

پٹھان بابا کبھی کبھی موڈ میں ہوتا تو اسے اپنی پٹی کے قریب بیٹھنے کو کہتا۔

"سیندی شیر میرے پاس آجا ——— دیکھ تیرا دادا رضا خان سیندی بہادر تھا، وہ اکیلا رائفل کندھے پر [illegible] پہاڑوں میں گھومتا اور جب کوئی ہوائی جہاز آسمان میں اڑتا نظر آتا تو رضا خان تاک کر ایسی گولی چلاتا کہ جہاز ہوا میں ڈولنے لگتا، [illegible] کئی [illegible] کا مقابلہ کیا ہے۔ رضا خان جتنا بہادر تھا اتنا ہی مکار بھی تھا۔ وہ چیتے کی طرح دشمن پر گھات لگاتا تھا۔ ایک [illegible] کی آڑ میں چھپ کر اس نے [illegible] دادا جیال خان کے گولی ماری تھی اور وہ گولی [illegible] گز تک [illegible] کر دیتا تھا [illegible]

[illegible] پٹھان بابا اس کے دادا رضا خان کو [illegible] سناتا تو عجب خان کا جی چاہتا کہ اس کا گلا دبا دے [illegible] وہ بار بار [illegible] اور [illegible] کرتا، مگر اسی وقت [illegible] زریں کی [illegible] کے وہ بال یاد آجاتے جو اکثر اس کے ماتھے پر بکھرے رہتے تھے اور پھر اس کی وہ گول گول آنکھیں یاد آجاتیں [illegible] جیسے آسمان میں [illegible] جب عجب خان کی آنکھیں نم ہو جاتیں [illegible] پٹھان بابا پر ترس آنے لگتا۔ پٹھان بابا کے تینوں بیٹے جو ان تھے [illegible] مگر [illegible] کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ ڈرتا تھا صرف فیروزہ زریں [illegible] زیادہ [illegible] اور [illegible] پٹھان بابا [illegible] عجب خان کو [illegible] دیتا۔

"عجب خان ہاتھ چھوڑ!"

عجب خان ہاتھ چھوڑ دیتا اور پٹھان بابا اس کی ہتھیلی پر [illegible] دیتا [illegible] لگتا، اور

گئی تھی۔
"تجھ پہ ہم؟"
"سر کا پتا؟"

جب خان کی یہ حالت دیکھ کر تاب کانپ گئی تھا اس کی حالت میں فرق آیا جاتا، جس نے فیروزہ مزدوری کا شکنجہ خیال اس کے گرد گھیرا میں بہت کی شکل بن کر رہ جاتا اور اس کی بہت سی باتیں بیان کیا تھا۔ تو چٹان بابا کی اس کی پیروی کا مزہ چکھا سکتا تھا اور ذرا نظر کو سے کو باہر اور اس کے لاکھوں کی ترغیب سے منہ موڑ کر بال سکتا تھا۔ تب سے اس کا ذہن کا مزہ جیسے ایک طرح کا پیاسا ہو گیا تھا۔ جس کو کوئی بھی نام دے سے تعبیر کیا گیا تھا، مار کھا پیار اور مار میں بڑا فرق ہے۔ نہیں دونوں کا فرق، وہ دیکھیں تو کہیں بھی ایک جا۔ اس کی تسلی کی ہو گئی تھی، جبکہ اس میں شدت کی جس ہونے لگی۔ وہ سر چاہے جس وقت نہیں ہو مرنے کی تیاری میں آ سر وقت ہوئی تھی جب اس نے انکار اور اتر جیب میں چھپایا تھا۔ بہت بزدلی نہ ہو سکا جس طرح سے ـــــــ سے ایک جیسی اور ایک ذرا سے فرد اور چار دم کا ہوا ہے۔ وہ دیکھ سر چلے گئے منہ میں تھوک کر آ رہا:

چٹان بابا کی پھر ایک چھت کے نیچے کر رہے تھے بڑی لگن سے۔ پھر اس کی چھپی سے چھٹ گیا تھا اور اس کی گردن ایسی لگ رہی جیسے جس پر بھی پانی ہو جیسے قبر میں پڑی رہ جاتا اور شکار ہو۔ چٹان بابا کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ موت کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ مستقل وقت سے اس کا اندازہ تھا کہ اس کا خاندانی دشمن جب خان بھی جلد ہی اس کے پیچھے قدم پہچانے گا۔ اس نے جب خان سے شدید انتقام لیا ہے۔ دونوں کی موت سے پہلا نہیں مل سکا۔ ایک دوسرے پر دم ہوا جاتا ہے وہ آگ ضرور ہے۔

ایک دن اس نے تیسری لڑکی اور لڑکیوں کو کہا میں جو کر دیا جو، ان میں سے فیروزہ خان کو منتخب کر کے۔

وہ ـــــــ بہت بحث کر رہی کہ میں سانپ پکڑنے جا رہا ہوں۔ میں نے اس طرح اس کا سر کچل دیا ہے کہ وہ بھی کیا اٹھی ہو گا۔ مجھے یقین ہو گیا۔ جب خان کے کانوں کی سرخی کم ہونے لگی ہے۔ وہ زرد بھی ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی، اپنا بچہ اور دودھ پلایا ہے اور بیسیوں مرتبہ اس کی تسلی کر چکا ہے۔

اس روز سب لوگ چٹان بابا کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ جب خان کو وہاں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ رات ٹھیک پچھلے پہر موت بہت نزدیک ہو گئی۔ سب لوگ سمٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ باہر جیسے کوئی آ رہا۔ رات بہت تاریک اور بے ایمانی کی طرح گہری تاریکی میں چھپا ہوا تھا اور آسمان پر چمکتا ستاروں کی گہری جھلملاہٹیں، رفتہ رفتہ وہ بھی بجھنے لگیں۔ اور سب فرشتوں کی آمد سے پہلے وقت جب خان جو جھک گیا، پلنگ کے قریب فیروزہ نے بیکار کی تھی، آہستہ سے بولی۔

"جب خان ہاتھ پھیلاؤ!"

اور جب اس نے ہاتھ پھیلایا تو فیروزہ نے اپنے ہونٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ جب خان کو یوں لگا جیسے ابھی ابھی سنا خان نے گولی چلا دی ہے اور وہ جبار خان کو چھوڑ کے پار ہو گئی ہے۔ اس نے مٹھی زور سے بھینچ لی۔ ڈر تھا کہ کھل گئی تو بہت چاندنی کھل جائے گی۔

راکھ

غلام الثقلین نقوی

ایک سیدھا سادا حادثہ تھا:

تیزاب کی بوتل اور دوا کی شیشی الماری کے ایک ہی دراز میں پڑی تھیں۔ متوفیہ نے دوا کی بجائے تیزاب پی لیا اور نتیجے کے طور پر موت واقع ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کر دی تھی۔ جنازے میں محلے کے سبھی لوگ شریک تھے۔ انھیں میں اسرار احمد اسرار بھی تھے جو میونسپل کمیٹی میں ایک اچھے منصب پر فائز تھے اور جن کا محلے کے پڑھے لکھے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بڑی اچھی غزل کہتے تھے اور ان کی شہرت مقامی مشاعروں سے نکل کر بیرونِ شہر تک پہنچ گئی تھی

منصور متوفیہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ قبر کے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کی خشک آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد [illegible] بہت آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا اور [illegible] کہ متوفیہ [illegible] کے ڈھیر نے چھپا لیا اور منصور کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ پاس کھڑے [illegible] سب کو یوں محسوس ہوا جیسے منصور کے دل سے کوئی چیز اتر کر اسی قبر میں دفن ہو گئی ہو!

مدت ہوئی جب انھیں استاد شکیل کی وفات کی خبر ملی تھی تو وہ چونک سے گئے تھے۔

استاد مر گئی! انھیں بے حد حیرت ہوئی۔ استاد مر نہیں سکتی۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ استاد مر گئی ہو لیکن شاد [illegible] شاد جوانی کی غزل کے ایک ایک شعر میں زندہ و سلامت تھی [illegible] انھوں نے اپنی بیاض میں محفوظ کی تھیں۔ شاد نہیں مر سکتی کیونکہ [illegible] اسرار نے کبھی کا آبِ حیات پی لیا ہے

نہیں! شاد بیگم مر گئی تھی جو منصور کی ماں تھی:

بیگم شاد بیگم [illegible]۔ لوگ مرتے رہتے ہیں [illegible] ازل سے مرتے چلے آئے ہیں۔ تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ [illegible] ہے [illegible] اقبال [illegible] پریشان حال ہوں [illegible] شاید اس لیے [illegible] اقبال کے [illegible] تقدیر کے قاضی کا [illegible]

اور چند ماہ بعد [illegible] جو متوفیہ [illegible] شاد بیگم کی چارپائی کے گرد کھینچا تھا:

تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ شاد بیگم [illegible] محروم ہو گئی تھی۔ [illegible] ایسا لگتا [illegible] جیسے اس نے [illegible] سے [illegible] کیا ہو!

[illegible] نہیں ہوتا:

[illegible] کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کی روشنی مدھم ہو گئی تھی۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] قریب سے دیکھا تھا ...... [illegible] سال کا [illegible] چہرے پر [illegible] پیشانی پر [illegible]
[illegible] ...... [illegible] ...... [illegible] ...... [illegible]
[illegible] ...... اب [illegible]:

بیشاد بیگم! واقعی مر چکی ہے۔

شاداں بھی زندہ ہے۔ [illegible] شاد کے گھر سے نکل آئے!

نعیم جب امجد اور [illegible] شاد کے گھر سے نکلے تو گلی سونی اور سنسان تھی!

گلی میں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ کسی گھر سے کوئی آواز نہ آتی تھی۔ ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی جیسے کسی نے گلی کو [illegible] ہو۔ [illegible] گلی کے [illegible] ایک [illegible] [illegible] تھا۔ [illegible] ایک [illegible] [illegible] نعیم اور [illegible] ساتھ چل رہے تھے۔

[illegible] شاداں سے [illegible] رہے ہو؟

[illegible] امجد نے [illegible] گلی میں [illegible] روشنی [illegible]۔ شاداں کے [illegible]

[illegible] پیچھے میں [illegible] نہیں [illegible] ہے؟

میں ...... نہیں تو ...... امجد نے [illegible]۔

میں ...... نہیں تو ...... شاداں نے [illegible]۔

[illegible] روشنی کی [illegible]
ہو گئی۔

[illegible] گلی میں [illegible] روشنی [illegible] ہو گئی ہے [illegible] پہنچ گیا ہوں؟

[illegible] ہے [illegible] دل [illegible] گیا۔

[illegible] دل کی [illegible]

[illegible] ہے جس نے [illegible] ہے [illegible]

میں [illegible] ہوں۔ [illegible] شاداں [illegible] گلی کا [illegible] ہے۔ اس کا [illegible]
[illegible]

بت بنا ہے تو تم سے ملنے سے پہلے اندر ہی۔ ہمارے پسینے کی کمائی کھاتا ہے یہی پوری بات ہے جیسے ایک نقطے کے پیچھے ساری دنیا کا احاطہ
ہوئے رہا ہے۔ تب وہ اٹھا جیسے کپڑے دینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا تو میں پہننے کے لیے آگیا۔ میرے پاس کام پر جانے کے لیے صاف
لباس نہیں تھا شاید گھر پر ہی نہیں تھا۔ میں اٹھا تو......"

"تم کپڑے پہننے آئے تھے؟" شاہدہ نے پوچھا

"میں..... ہاں....."

"پھر یہیں ٹھہرو۔ میں جب تک واپس کر دوں یہیں ٹھہرے رہو۔"

وہ گلی میں سر جھکائے کھڑا رہا۔ آتے جاتے لوگ اس کے پاس سے گزرتے رہے۔ ایک دو نے اُسے حیران ہو کر دیکھا بھی اور اس
کے چہرے پر شرم کے پسینے آتے رہے اور وہ سوچتا رہا: میں ایک قدم آگے بڑھاتا تو جانے کیا ہو جیسے پاؤں زمین کے ساتھ
جیسے چپک گئے ہیں؟"

"تم یہیں کھڑے ہو؟" شاہدہ نے پوچھا۔

"میں..... نہیں تو....."

شاہدہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"یہ لو اپنے کپڑے..... میں..... نہیں تو....."

اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے ساتھ کپڑے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔

"نہیں..... ایک بار نظر اٹھا کر تو دیکھو۔"

وہ پسینے میں بھیگ گیا۔

"نہ جانے وہ شاہدہ!"

"میں چاہتی ہوں تم ایک بار دیکھ تو لو۔ جیسے آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے میں اُن کا ساتھ دے کر بیاہ رکتی ہوں۔"

اور اس کی آنکھوں میں شرمندگی اور شرمیلا زور بھرا تھا۔ اس لڑکی کو آنکھ بھر کر دیکھ لینے پر مجبور ہو گیا۔

اُسے یوں لگا جیسے اُس نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا ہو۔ یہ ابھی لڑکی جو بڑے دلنواز انداز میں مسکرا رہی تھی اور اس مسکراہٹ
سے چودھویں رات کے چاند کی زرد زرد کرنوں کی بارش ہو رہی تھی۔ چودھویں کا چاند جو گرمیوں کی ایک رات کو چمک رہا ہو اور اس
رات میں جس میں ایک معطر پسینے کی خوشبو زمین کے ذرے ذرے سے پھوٹ رہی ہے۔ ابھی نہیں پاتی اور الگ الگ سے پسینہ پھوٹ
رہا ہے۔

وہ اس چہرے کو دیکھتا رہا اور اپنی جگہ سے نہ ہل سکا:

اور یکایک شاہدہ شرما گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ شرمیلی چنچل آنکھیں اپنے آپ میں کھو گئیں۔ جیسے دماغ زرد زرد سا
ہو جائے ابھی گرم گرم زندگی سے بھرپور تھا۔ یکدم زرد زرد سا ہو گیا۔ ہونٹوں کی آنچیں اور اس ٹھنڈی شام میں زمین سے لگی

پھر تو کی [illegible]

اس [illegible] وہ چپکے سے [illegible] اس کی ایک [illegible] جو [illegible]

[illegible] گھر کی طرف [illegible] ایک قدم [illegible] اٹھتے جا رہے تھے:

اور لڑکی نے جیب سے پکڑے اس کے ہاتھ میں تھما دیے!

ستارہ گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ نے اس کا راستہ روک کر پوچھا: ستارے! ان لوگوں نے شاعر سے کیا کیا باتیں کی ہیں؟

کچھ بھی نہیں۔ اس نے [illegible] کے عالم میں [illegible] سے گزر گیا۔

وہ [illegible] ستارے! [illegible] پہنچ گئے آپ کے؟

ستارے نے [illegible] سائیکل [illegible] کی طرف روانہ ہو گیا۔

[illegible] وہ سائیکل پر [illegible] تھا [illegible] شاعر [illegible]

تھا [illegible] گیا۔

اس [illegible] وہ شاعر ہو گیا۔

[illegible]

[illegible] اس نے سوچا وہ [illegible] شعر [illegible] سے [illegible] شعر [illegible]

[illegible] نہیں [illegible]

[illegible] شعر [illegible] نہیں [illegible] سکتا!

شاعر نے یہ شعر سنا اور وہ [illegible] ملا!

[illegible] شاعر [illegible] اس کے [illegible] کو قتل کر [illegible]

[illegible] وہ شعر [illegible] تھا۔ [illegible]

[illegible] اس کی وہ [illegible] بیوی [illegible] کے [illegible]

[illegible] بیوی کی [illegible] اور اس [illegible]

[illegible] شاعر [illegible]

[illegible] ہو سکتا ہے۔ وہ [illegible] شعر [illegible] ہو سکتا ہے، شاعر نہیں ہو سکتا اور شاعر [illegible]

[illegible] شعر [illegible] ہے۔ وہ ایک [illegible] بیوی [illegible] ہے۔

وہ پھر [illegible]

"تم شگفتہ کو ڈھونڈنے جا رہے ہو؟"

"ہاں!"

"بڑے بے وقوف ہو تم۔ ارے اتنا وقت ہو گیا ہے۔ آج شام تک ڈھونڈ لیں گے۔ پھر میں انہیں خود اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گی۔ دیکھنا ایک منٹ میں شرمندہ ہوں گی۔ تمہاری ایسی کریز ڈال دوں گی کہ ہفتے بھر تک خراب نہ ہو گی۔ پھر تم چپکے چپکے ہو کر اس گلی میں سے گزرو گے؟"

"کیا ... نہیں تو ..."

"میں ... نہیں تو ..." اس نے سوڈا کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل بے فکر تھا۔ فیروز ڈرائی کلیننگ اینڈ ڈائنگ ورکس کے سامنے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ فیروز ڈرائی کلیننگ کا مالک بڑے چہرے والا ایک شخص تھا۔ اس کی مونچھوں پر خضاب لگا تھا اور وہ مونچھوں کی نوکیں سنوار رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ چہرے پر [illegible] کوئی استری [illegible] کر سکی تھی۔ جھریوں کا جال۔ جال کہ ایک مکڑی کا جال تھا اور شگفتہ جیسے کسی مکھی کی طرح اس جال میں پھنس کر پھڑپھڑا رہی ہو۔

"شگفتہ ... شگفتہ ..." وہ تڑپ کر پکارا۔

مونچھوں کی نوکیں پھڑکیں۔

"تم کس شگفتہ کو پکار رہے تھے؟"

اس کا جی چاہا کہ کہہ دے ایک شگفتہ جال میں پھنس کر رہ گئی ہے۔

لیکن اس نے بتایا: "شگفتہ ... میں نے کسی شگفتہ کو نہیں پکارا۔"

"پہلے معلوم ہوتے ہو۔ کس محلے میں رہتے ہو؟"

"شاد گنج میں ..."

"اس شہر کا کوئی محلہ شاد گنج کے نام سے مشہور نہیں۔ دوسرے شہر سے؟"

"کیا بات ہے کہتے ہو؟"

"اس بار کہو ... کوئی پاگل ہے بیچارہ۔ کوئی محلہ شاد گنج بھی ہے ہمارے شہر میں؟"

"نہیں تو۔"

"یہ بابو کہتا ہے میں اس محلے کا رہنے والا ہوں۔ ابھی یہ کسی شگفتہ کو پکار رہا تھا۔"

"شگفتہ والی بات ٹھیک کہی ہے اس نے۔"

"ہاں شگفتہ ... جاؤ بابو ... کوئی گوشت پوست والی لڑکی [illegible] دوکان کے شیشے میں ... پہلے

نہ جانے کس کا نام تھا۔ شگفتہ ... دو دن کی [illegible] ..."

[illegible] کے ملنے کے سلسلے کا تھا؟

[illegible] نے سلسلے پر [illegible] تو شاہدہ [illegible]۔

[illegible] ہو؟

"ہاں!"

"[illegible]۔"

[illegible]

"[illegible]؟"

"نہیں...... تو...... [illegible]۔"

شاہدہ نے [illegible]۔

[illegible]

[illegible]۔"

"نہیں... [illegible]"

"نہیں...... شاہدہ نے [illegible]

[illegible]

"[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]"

"[illegible]۔"

[illegible]

شاہدہ [illegible]

[illegible]۔

[illegible]

"[illegible] شاہدہ!"

[illegible] شاہدہ کے [illegible]۔ شاہدہ

[illegible]

شادو کو ایک خوبصورت سا آل سے اظہار ... پہنا دیا ہے۔

قیصی ... کے سامنے اُس نے سائیکل کو کھڑا کر دیا۔ حمید ایک کرسی پر بیٹھا تو اُس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ امرتا کو دیکھ کر ... آیا: حمید، ... ہو گزر رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے: ذرا ٹھہر جاؤ ... اس سے ایک بات پوچھیں۔

"ہاں!" شیسے نے ... اُس نے سائیکل روک لیا۔

"تم کس محلے میں رہتے ہو؟" حمید نے پوچھا۔

"پیچھے بہرے میں۔"

"تم شادو کو جانتے ہو؟"

"ہاں......"

"پہلے ... تم شادو کی گلی میں رہتے ہو۔"

"شادو کے محلے کا نام ... ہے۔ تم جس شادو کو پوچھ رہے ہو وہ ... کی بیٹی ہے نا؟"

"ہاں... ہاں... تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہاں... نہیں..." امرتا نے ... انداز میں کہا: "پر تم کیوں پوچھ رہے ہو اس کے متعلق؟"

"وہ ... رہنے والی ہے؟ بہت ... تمہارے محلے میں ...۔"

حمید ... سے جتا اور امرتا کے سر پر ... سے چلتے رہے۔

"شادو ... رہنے والی ہے" حمید ... اس کا مالک ہے جس کی ... سے کالی ... اور ... شادو ...... جس کا ... کا ... ہے۔ جس کی آنکھوں میں ... اور جس کے سانس میں ... کی خوشبو ہے۔

... امرتا نے ایک ... سا ... کیا ... اُس کے گلے میں ... اور اُس نے شادو کو ... بانہوں میں ڈال دیا ہے ... پھر اُس نے ... کر شادو اُس کے گلے کی ... ہے

نہیں...... نہیں......

"سائیکل چھوڑ دو ... کا ... ایک ... گرنے کو۔"

اُس نے ... سائیکل کو سنبھال لیا۔

سائیکل سنبھل گیا لیکن وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا۔

وہ ... گیا اور ... وہاں ... گیا!

... پر وہ شادو کے ... کے سامنے ...۔

شاذہ [illegible]۔ اس نے سینے کا [illegible] [illegible] کی [illegible] ہو گئی [illegible]

[illegible] [illegible]۔ [illegible] کی شکل اور نشان تھی۔

"مجھے [illegible] اصل پیار ہو! میں آج [illegible] [illegible] ہوں۔"

"اشفاق بیگم! میں نے اسے دیکھا۔"

"یہ شاذہ کو کر [illegible] سے اور اب [illegible] نے مجھے دیکھا؟"

"[illegible] میرے اندر [illegible] [illegible] ہاتھوں سے [illegible] ڈال دیں

[illegible]۔" شاذہ کے [illegible] چہرے پر [illegible] [illegible] چہرہ [illegible] [illegible]۔

"اب [illegible] میرے اندر [illegible] اصل پیار [illegible]" شاذہ نے [illegible]

انداز میں کہا۔

"شاذہ!" [illegible] پکار کر۔

"کمرہ ساتھ!"

"میں تیرے پیار کے قابل نہیں۔ تیرے پیار میں [illegible] [illegible]۔"

"ساتھ!" شاذہ [illegible] "پیار [illegible] [illegible] ہیں۔"

"نہیں!"

"ساتھ! [illegible] تیرے پیار [illegible] [illegible]۔"

"نہیں!"

"بیگم جی!" شاذہ کی [illegible] [illegible]۔"

[illegible] شاذہ کی آتش [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]۔ [illegible] [illegible]:

اس نے پوچھا: "ساتھ! تو شاذہ سے کیا [illegible] ہو [illegible]۔"

"کچھ نہیں۔"

"[illegible] شاذہ نے [illegible] [illegible]"

"[illegible] [illegible]۔"

"پیار [illegible] شاذہ [illegible] [illegible]

[illegible]۔"

"جانتے ہو وہ لڑکی کون تھی؟"

"ہاں! تم قریشی ہو اور شاہدہ دھوبن ہے۔ تم اسے کیا چاہتے تھے؟"

"ہاں ہے...... وہ کیا میرے خاندان کی پشت پر شرافت کا پیوند ہے۔ میں جل بھی جاؤں تو یہ پیوند نہیں جل سکتا۔"

سلمہ! اگر تم دل سے تو پیار کا نباہ کیا جائے۔ شاہدہ نے اپنے اسی پیار کا ایک پاکیزہ قطرہ بھی بخش دے تو میں اسے لے کر زندگی بہت خدا ہو جاؤں گا۔ تو تو آگ سے کھیلنے لگا؟"

نعیم کی آواز آئی۔ بلکہ گال پر ہنستے ہنستے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"ابھی تیرا پیار زندہ ہے سلمہ! پر جب تیرا پیار خودکشی کی موت مر جائے تو میرا سینہ شاہدہ تک ضرور پہنچا دینا۔"

ابھی شاہدہ کی گلی سُرخی اور سُنسان بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے پیار نے خودکشی کر لی۔

ابھی چند کا ایک نغمہ بھی نہ آیا تھا۔ نعیم نے شاہدہ کے جانے کے بعد ایسا کہہ دیا تھا کہ اس نے شکست قبول کر لی تھی۔ گلی اس سرِ شام ہی بکھر گئی تھی کیونکہ اس شام کی راکھ سے کل جو شعلہ نکلا تھا، وہ وہیں شام ہی بکھر گیا تھا اور رات کے اندھیروں میں سناٹے بسے تھے اور قمر خراب سے نے اور اپنی بیٹھک میں بیٹھا تھا۔ ابھی تک اس نے لیمپ روشن نہیں کیا تھا۔ لیمپ روشن ہو بھی جاتا تو اس کے دل کی گلی اندھیری تھی!

اس کی بیٹھک کا دروازہ کھلا تھا اور کھڑکی دروازے میں سے گلی کا اندھیرا اندر آ رہا تھا!

"سلمہ؟ اندھیرے میں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔" "میں شاہدہ۔"

"تم کیوں آ گئی شاہدہ! میں تو جی کر بھی چلا جاؤں۔ جا! میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

"سلمہ پیار کرنے والے سچے ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں۔ میرے پیار کو ضرور آزما دے۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لو اور مجھے لے چلو۔ میں نے سنا ہے خدا کی دنیا بہت کھلی ہے۔"

"شاہدہ! میں بہت مجبور ہوں۔ جاؤ! کل پیچھے سے ڈولی میں بیٹھ جانا۔ میں آ کر گرنے والے دوں گا۔"

"سلمہ! تم تو بہت بزدل نکلے۔ بے وفا! تم میرے ساتھ اتنے قدم کیوں چلے۔ مجھے اب شور... یا میں سمجھ کر کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں بھی نہیں۔ میں وہیں گلی میں ہوں شاہدہ! پر میں تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

اندھیرے میں ضعف کی آواز آئی اور اسے سینے میں سنا گیا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ ... پیچھے ہٹ گیا۔ ...

...

تو اُس کے چہرے سے اُس کا جیسا ہو گیا تھا۔

وہ شعیب میں پیار اور اپنائیت اس کے ملے جلے کو اپنے کی خوشبو پاتی تھی!

[illegible]

لیکن اداؤں۔ شعیب سے دور [illegible] اُسے پتہ تھا [illegible] ساحل [illegible]

[illegible]

ذرے دھوں کی آنچ گئی :

سعد جیسا ایک شخص کبھی نہ ہوتا، شاہدہ کو اس پر ناز تھی۔ وہ بیٹے کی کمپنی کو ایک قطرہ اندر سے لگا تھا خود اگلی [illegible] ستاروں کی محفل [illegible] شاہدہ نے بیٹے کی عزت کا جنازہ نکال دیا تھا...... اس بیٹے کا نام خاک میں ملا گیا ہے...... اس کو بھلے بیٹے کی ناک کاٹ دی...... بیوہ ہو گئی...... تاج ہی سنبھال نہ سکی...... وہ بھی چاہے نیا ہو تو بیٹے کا نام آج کیوں ہے......

بیٹے کے دل سے شاہدہ کا سر [illegible]

اتنی کمی زیادتی اس کی بیٹے کو بچا نہ سکی تھی۔ بیٹے نے [illegible] شاہدہ کو ساتھ لے گیا۔

دیا بجھ کر [illegible] اس کی پشت پر شرافت کا وہ بوجھ رہا تھا، اپنے کندھوں پر شاہدہ کی ذلت کا بوجھ اٹھائے۔

اُس دن سے ماں، اور طلال کے شاہد ہو چکے تھے!

اور تو شاہدہ مر چکی تھی!

اس نے غصے سے تیزاب کا ایک گھونٹ پی لیا تھا۔ اس کے بیٹے سعود نے ایک [illegible] تھی جیسے اس کے جینے پر سے ایک بوجھ اتر گیا ہو!

تیزاب کا ایک گھونٹ...... شاہدہ کو تیزاب کے ایک گھونٹ نے قتل کر دیا تھا...... نہیں...... سعود اور طلال نے اپنی ماں پر گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا مگر اس دروازے سے ایک دھکا دینے والی [illegible] بار بار تھی

شاہدہ تو اسی دن مر چکی تھی جس دن وہ بیٹے کے گھر سے نکالی گئی تھی:

شاید......

لیکن اس کا غم سہا ہوا تھا۔ وہ گھر [illegible] کی منزل کی طرف آہستہ آہستہ [illegible] دیکھتے دیکھتے [illegible] اس [illegible] سعود ابھی آٹھ سال کا تھا [illegible] خضاب [illegible]

شیر تھیں یا ایک گھاس کے ڈھیر کی طرح پھٹ گیا۔ اُس کی جائداد تقسیم ہوئی تو شادو اپنے آبائی مکان میں اُٹھ آئی۔ فینسی ڈرائی کلیننگ اینڈ ڈائنگ ورکس کی دکان بند ہو گئی۔ شادو اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اسد اور اسرار میونسپلٹی میں ملازم ہو گئے اور ان کی ایک نہایت شریف گھرانے میں شادی ہو گئی۔ اب وہ شادو کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ پر جانے کیوں جب کبھی وہ کسی مشترکہ شہر کی گلی میں ہوتے تو شادو ان کے سامنے ستارے کے آ کھڑی ہوتی اور انہیں اپنے اطراف تازہ سے شادو کے کنوارپنے کی تیز خوشبو آنے لگتی اور وہ چکرا کر رہ جاتے!

منصور سکول میں داخل تھا۔

شادو کو بچوں کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

بوڑھا باپ دیر تک اُس کا ساتھ چھوڑ گیا اور اب شادو کو افسوس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اُس نے یہ خلا حبیب کے دست شبیہ کے ساتھ نکاح کر کے پورا کر لیا۔ شبیہ ابھی صرف چند سال ساتھ نبھا سکا اور ایک لڑکے کا تحفہ دے کر غائب ہو گیا۔ شبیہ کے بعد اُس نے کسی سے نکاح نہ کیا۔ وہ ایک امیر گھرانے میں برتن مانجھنے پر ملازم ہو گئی۔ ایک دن گھر کے مالک نے کسی تقریب کے بہانے ایک روپیہ کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ نوٹوں کا یہ سلسلہ قائم ہو گیا اور منصور پڑھتا رہا۔ اُس کے بہن بھائی پلتے رہے۔ ایک دن گھر کی مالکن نے شادو کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا!

شادو نے گھر کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔

محلے والوں کی آنکھیں ذرا دیر سے کھلیں۔ دبی زبان میں باتیں ہوئیں اور باتوں کا شور بلند ہوا تو کھیتوں کی سنسناہٹ شادو کے گھر تک جا پہنچی۔

دیکھو شادو! اب جو تم نے کام شروع کر دیا ہے، اس سے محلے کی رہی سہی عزت بھی جاتی رہے گی۔ پہلے بھی تم نے اپنے گھر سے بھاگ کر ہماری ناک کاٹ ڈالی تھی۔

شادو خاموش ہو گئی!

اُس نے محلے والوں سے توبہ کیا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

پھر محلے والوں نے ایک کانفرنس کی۔ اس میں اسد اور اسرار بھی شامل تھے۔ طے پایا کہ شادو کے گھر جا کر اسے متنبہ کیا جائے۔ شادو نے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔ اُس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اُس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک چہرے کا جائزہ لیا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں اسد کے چہرے پر ٹھٹک گئیں۔

ان آنکھوں نے کہا: تم بھی!

اسد اور اسرار نے نظریں چرا لیں لیکن ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں پھر بھی برس رہی تھیں۔ اسد کو یوں لگا جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ سیلاب آئے گا اور سارا محلہ ڈوب جائے گا۔ یہ لوگ ڈوب جائیں گے اور ان میں سے کوئی بھی اس سمندر میں سے ابھر نہ سکے گا۔ کیونکہ ان سب کی پشتوں پر شرافت کا بوجھ لدا ہے۔

غصے سے پھر دروازہ بند کر لیا!

اس نے منصور کا کام چھوڑ دیا۔ وہ آج تک اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر شادو کو منصور سے کیا کیا امیدیں تھیں: منصور کی بدنامی ہوئی۔ شادو منہ نہ کرتی۔ کچھ پتا نہ چلا۔ منصور جہاں جہاں اس نے دھنی کی دکان کھول لی۔ اس کا کام چل نکلا۔ کیمیکل ایجنٹ وغیرہ کا ہر روز بنایا۔ منصور کی دکان نے خوب ترقی کی۔ اب اسے شادو کی فکر لگی۔ جس نے کبھی شریف دل میں اس سے شادی نہیں کی تھا!

اور منصور کو بھی بازار پر فخر تھا۔ اس نے اس کی محنت کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا تھا۔ وہ یہ کبھی نہ بھولی تھی کہ اس نے منصور سے، شادو سے کیسا کیسا سلوک کیا تھا۔ پھر وہ بات بات پر اس سے لڑتی تھی اور آخر اسے اس کا دروازہ بند کرنا پڑا:

اور اس دن شادو نے دیکھا کہ منصور کے ہاتھ میں دو بوتلیں تھیں۔ دونوں میں ایک ہی رنگ کا پانی بھرا تھا۔ اس نے حیرت سے ایک جیسے لہجے میں کہا: دونوں آدمی کی دونوں سے نسخے کام میں بنتے ہیں۔ ان کے لیے دوائی لایا ہوں۔"

"دونوں بوتلوں کا رنگ ایک ہی ہے۔"

"دوسری میں تیزاب ہے۔ بازار سے آتے ہوئے لے آیا۔ کل صبح دکان پر لے جاؤں گا۔"

"تیزاب کس کام آتا ہے؟"

"ڈرائی کلینگ میں۔۔۔ کپڑا رنگنے میں۔۔۔"

"اور ہاں یاد رہے۔ کہہ بیٹھے۔ میاں منصور ان بوتلوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنا۔"

اور اس رات شادو نے غلطی سے تیزاب کا گھونٹ پی لیا!

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مر چکی تھی۔

ایک سیدھا سادا حادثہ تھا!

تیزاب کا ایک گھونٹ ایک سیدھی سادی عورت کو قتل کر گیا تھا!

شادو کا قاتل تیزاب کا ایک گھونٹ تھا!

منصور نے تو غلطی کی کہ ایک رنگ کے پانی کی دونوں بوتلوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا!

قاتل منصور تھا جس نے احتیاط نہ کی!

نہیں۔۔۔

ہو سکتا ہے شادو نے خود اپنے آپ کو قتل کر لیا ہو۔

وہ منصور کے رستے سے ہٹ جانا چاہتی تھی جیسے اس کے گناہ نے ماضی کی وجہ سے کوئی شریف رشتہ نہیں مل رہا تھا!
شادو کی قاتل شادو تھی....
نہیں.....
پھر قاتل کون تھا.... ایک گھونٹ .... ایک حادثہ.... ایک لمحہ....
نہیں....
اب یہ راز قبر کی آغوش میں سنگ مرمر کے نیچے دفن ہو گیا تھا!
اسرار قبر سے ہٹ کر دو قدم دور چلے گئے.
یہاں ایک بوڑھا اداکار کھڑا تھا اور اس کی جھانجھنوں سے ایک ماتمی نغمہ بکھر رہا تھا مسلسل. نغمۂ موت...
جون اور بیری کی سوگوار جھاڑیوں پر صدیوں کی دھول جمی تھی!
اور لوگ قبرستان سے جا چکے تھے. صرف منصور کھڑا تھا.
پھر وہ سہما سہما منصور بھی چلا گیا.
تو قبرستان کا اسرار چاروں کھونٹ سے لپک کر آیا.
جھانجھنوں سے پائل کی جھنکار اٹھی.
قبرستان کے آنگن میں موت رقص کرنے لگی. اس کے پائل کی جھنکار میں آواز نہیں تھی.
"تم کون ہو؟"
پائل کی جھنکار مجسم ہو گئی. اس کے حسین چہرے پر موت کی زردی تھی.
"میں ہوں شادو!"
"تم!"
اس کا رنگ زرد پڑ گیا. وہ کانپ گیا. وہ ڈر کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا.
"ابھی ابھی تم پوچھ رہے تھے شادو کو کس نے قتل کیا؟"
"ہاں!"
"جاننا چاہتے ہو اس کا قاتل کون ہے؟"
"نہیں!"
"سنو تو، وہ قاتل تم ہو."
"نہیں!"
اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کا گلا گھونٹ دیا.

اللہ کا حکم

احمد سعید

اس کو جب کے ہاتھ جتنے پیسے لگتے وہ ان سے بہت سے رنگ برنگے پرندے پنجروں میں بند پرندے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر چھوڑ دیتا۔ انہیں ہوا میں ایک ایک کر کے فضاؤں میں اڑتا دیکھ کر [illegible] ننھے ننھے پرندے اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں جب پنجرے سے باہر فضا کی وسعتوں میں ایک [illegible] دائرہ بناتے ہوئے اڑ جاتیں تو اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو ڈبڈبا آتے۔ اسے بچپن ہی سے یہ شوق پیدا ہو گیا تھا جو آہستہ آہستہ جنون کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اگر اس کے پاس پرندے انہیں رہا کرنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ [illegible] اور [illegible] پیچھے [illegible] پرندے یہ بات دیکھ کر حیرت ہوتی کہ وہ پرندے اس کے پاس آ جاتے۔ اس لیے کہ اس کے [illegible] پتا تھا وہ [illegible] بہت سے لوگ [illegible] کہتے ہیں کہ [illegible] جیسے قدرت کی ہر چیز کتنی آزاد ہے [illegible] زندہ رہتی ہے۔ اس کی سوچ کی [illegible] پرندے اور جانور پنجروں میں بند رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے اس نے [illegible] اپنا بیشتر وقت ضائع کر دیا ہے جو دوسرے بچے اور نوجوان تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرتے ہیں اور اس سے فارغ ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

"جب [illegible] تو [illegible] کا [illegible] کیسے ہو گا۔ [illegible] پرندے چھڑانے کی نذر کرتا رہے گا؟"

اس کی ماں اپنے سالہا سال سے سمجھانے کی بے سود کوشش کرنے کے بعد ایک روز فیصلہ کن انداز میں اس پر اس کی [illegible] کے سامنے [illegible] بیٹھے پر اور اپنی پھوٹی قسمت پر آنسو بہایا کرتی۔ [illegible] زندگی میں ایک موڑ [illegible] انتہائی [illegible] پیدا ہونے کی بجائے اس پر ایک [illegible] جلال اور سرشاری کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور جب اس کی ماں نے بھی اسے ایک بیکار [illegible] [illegible] اور کہا "کاش تم پیدا ہی نہ ہوتے [illegible]" تو اس نے جواب دیا "ماں خوش ہو جاؤ اللہ نے مجھے کل رات [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔"

"دنیا کے سارے بند پرندوں کو آزاد کرانا ہے۔"

اس کے جواب میں بیٹے کی آنکھیں [illegible] اس نے کہا۔ "ماں تم نے آدھی بات پوچھی ۔ ۔ ۔"

"میں نے بھی جواب [illegible] اگر میں تیرے دل کا [illegible] تو [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ میری نظروں کے سامنے

...پوچھا :"

"میرے پیغمبر پر دُنیا پہلے ہنسا کرتی ہے ماں۔"

"توبہ کر، توبہ۔ مردود۔ تیری یہ مجال!"

"ہاں میں نے رات خواب دیکھا ہے۔ اس میں اللہ میاں نے مجھے ———"

لڑکے کا فقرہ اس کے گال پر ماں کا زور سے ایک تھپڑ لگنے نے مکمل کر دیا۔ وہ خود خوف سے کانپنے لگی کہ اس لڑکے کو کیا ... ہے۔ اس کا دماغ تو کہیں نہیں چل گیا۔ ویسے شیر جیسے جوان پر یوں بھی ہاتھ اُٹھاتے کون نہ گھبراتا۔ لیکن لڑکے نے اس کے جواب میں ... سے سر جھکا دیا اور اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر پتھر کی مانند گر پڑا اور دیکھتے دیکھتے یوں سو گیا جیسے اُسے بڑی نیند آئی ہو۔

ماں کے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے پر کھانا کھانے کے لیے اُٹھا۔ نیم خوابی کی سی حالت میں دو چار نوالے لیے اور پھر سو رہا۔ باپ ... رات باہر سے واپس آنے پر اس کی طرف دیکھنا تک گوارا نہ کیا لیکن ماں نے چپکے سے اُس کے سرہانے بیس روپے کے نوٹ ... رکھ دیے۔ حسب عادت وہ جب بھی اس پر خفا ہوتی تو اس کے سرہانے سوتے وقت کچھ پیسے چھوڑ جایا کرتی ....
... نے رات ایک خواب دیکھا تھا کہ پنجرے میں بند جانور بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اسے اپنے ... میں اللہ کا یہ حکم صادر ہوتا سنائی دیا۔ "اُٹھ میرے پیغمبر۔ جا اور سارے جانوروں کو آزاد کرا!"

جب لڑکے کا ہاتھ نادانستہ کسی سرسراتی شے سے لگا تو اُسے وہاں بیس روپے کے نوٹ پڑے دکھائی دیے جنھیں اس ... نے خدا کے حکم پر تعبیر کیا۔

اس سفر ریل کے ذریعے بارہ گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ لاہور پہنچا جہاں اس نے اپنا مشن پورا کرنا تھا۔ دُور ہی سے اُسے ... کی طرف جانا ہوتی تھی پہنچا تو اسے پتا چلا کہ کھلنے سے پہلے ڈیڑھ گھنٹے اس نے باہر انتظار کرنا پڑا۔ اس کا دروازہ کھلتے ہی وہ ... شیر کے پنجرے کی طرف لپکا۔

شیر پنجرے کے اندر بڑی طمانیت سے ٹہل رہا تھا۔ نوجوان نے پنجرے کے قریب پہنچ کر اس سے ... "میں آگیا، میں آگیا۔ اب فکر نہ کرو" کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازو اس کی طرف یوں پھیلا دیے جیسے اسے اپنے ... سے لگانا چاہتا ہو۔ وہ ساتھ ساتھ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ جب شیر اس کی جانب آتا تو نوجوان کی آنکھیں ... اور شگفتہ انداز میں پھیل جاتیں اور وہ اسے اشارے کرتا ... دکھائی دیتے ... پنجرے کے ... تماشائی ... ہو گیا تھا۔ نوجوان اس کی موجودگی سے بے خبر تھا حتیٰ کہ شیر ... اندر کی کوٹھڑی میں چلا گیا۔ اس کے باعث نوجوان ... ہو کر پنجرے کا طواف کرنے لگا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ تماشائی بڑھتے ... قدرے ... انداز میں ... کچھلے ... ——— وہ تو پنجرے کے اندر چلا گیا تھا جہاں قدم رکھنا ممنوع تھا۔ ... پنجرے کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر

ڈال کر شیر کو باہر [illegible] سکتے ہیں۔" ابا! ابا!" کی آواز آئی۔ سے سن کر شیر نے جب [illegible] باہر گیا [illegible]

[illegible] کرنے کے [illegible] صاحب [illegible] دیا۔

"[illegible] پاس آ جیسی [illegible]" [illegible] اپنے [illegible] صاحب [illegible]

کرتا تھا۔ [illegible] شیر [illegible] پاس [illegible] دیتے ہوئے [illegible]

کر شیر [illegible] بیٹھے [illegible] ہاتھ میں [illegible]

"[illegible]" سے [illegible] نے [illegible] صاحب [illegible] کر دیا۔ اس کے

[illegible] ہیں گا۔

"[illegible] ہو جائے گا۔"

[illegible] بات [illegible] دیا [illegible] پاس [illegible] چنانچہ وہ

[illegible] شیر [illegible] پکڑ [illegible]

[illegible] تھا [illegible]

[illegible] نے [illegible] نے اپنے

[illegible] طرح پیار کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیر [illegible]

چار پانچ [illegible] کے [illegible] تھا۔ [illegible] پیار کیا۔

[illegible] وقت [illegible] ہو گیا۔

"خان، [illegible] بند کر دو۔"

"[illegible]"

[illegible] سے [illegible] کی [illegible] میں [illegible] جب [illegible] نے خان [illegible] کو [illegible]

[illegible] سے [illegible] کے [illegible] وقت

[illegible] دیتے۔ [illegible] پیار کرتے [illegible]

[illegible] سے [illegible] کے [illegible]

[illegible] سے [illegible]

"خان [illegible] ——— [illegible]

تو [illegible]

سات آٹھ سال میں زوبی نے چوکیداروں کی خاطر تواضع پر سب پیسے خرچ کر ڈالے تو انھوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔ اس کے [illegible] چوکیداروں نے کہا: ہمیں پاگل سے پالا پڑا ہے۔ کہیں تم کو رکھا تو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا، ورنہ کہیں حسان بابا [illegible] صاحب سے شکایت کر دے۔ اگر جانوروں سے اتنا پیار ہے تو چڑیا گھر میں نوکری کیوں نہیں کر لیتا۔"

ایک رات جب سب چوکیدار سو رہے تھے اور کبھی کبھار گیدڑ اور لومڑی کے [illegible] چڑیا گھر پر سکوت مسلط تھا تو ایک سایہ [illegible] دروازہ پھلانگ کر اس کے اندر داخل ہوا اور چھپتا چھپاتا شیرنی کے پنجرے کی جانب لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پکڑا [illegible] تھا۔ ایک چوڑی اور پھیلی ہوئی چیز، دوسری لمبوتری۔ کچھ وقفے کے بعد شیرنی کے پنجرے کے تالے پر زور سے ایک ضرب کی آواز آئی۔ جب تالا نہ ٹوٹا تو ایک اور چوٹ لگی۔ یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اس پر سایہ بجلی کی مانند پنجرے کی دوسری جانب بڑھا۔ [illegible] جانور اپنے اپنے پنجروں کی طرف جاتے تھے۔ اب تالے پر اینٹ سے چند وار ہوئے اور پنجرے کے اندر سے شیرنی کے کسمسانے اور [illegible] کی آواز آئی۔ [illegible] کا دم ہوا۔ چوکیدار جاگ اٹھا شاید [illegible] ہو رہی تھی۔ لیکن سایہ [illegible] آخر کار وہ تالا [illegible] میں کامیاب ہو گیا۔ تالا گر پڑا۔ سایے نے پنجرے کا دروازہ اندر کو دھکیلا ——— ایک دراز قامت انسان اسے پوری طاقت سے [illegible] کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ [illegible] اسی دوران کچھ چوکیدار [illegible] کی طرف چلے جدھر سے آواز آئی [illegible] سایے نے [illegible] پنجرے کے دروازے کے پاس رکھ دی اور خود آگے [illegible] اس کے پاؤں باہر [illegible] آنکھیں [illegible] سایے نے اپنے قریب شیرنی کی محسوس [illegible] قریب سے قریب تر آتی محسوس ہوئی [illegible] سانس [illegible] گردن کو چھونے لگا۔

"آؤ، آؤ۔ میں تمہیں آزاد کرنے آیا ہوں۔" سایہ بولا۔

شیرنی نے پیچھے کو سر گھمایا ——— پنجرے سے باہر نکلی ——— [illegible] سامنے [illegible] میں [illegible] آواز آئی اور [illegible] شیرنی [illegible] سے [illegible] کر گئی۔

"خان بابا۔ بندوق!"

"نہیں نہیں۔ فائر کی ضرورت نہیں [illegible] پاگل [illegible] پاگل [illegible] شیرنی [illegible] خان بابا چلاتا ہوا [illegible] کی جانب لپکا۔

" [illegible] قریب پہنچ کر [illegible] نے دیکھا [illegible] اس کے [illegible] ہو چکے۔

"[illegible] خان بابا کی آواز سنتے ہی [illegible] وقت [illegible]

انھوں نے اس سے [illegible] دیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کرسی

ستیش بترا

مسٹر اینڈرسن اپنے ایئرکنڈیشنڈ کیبن میں بیٹھے ڈاک پر دستخط کر رہے تھے۔ یہ اُن کا دفتر میں آخری دن تھا۔ اُن سے ذرا پیچھے نہایت ادب سے کھڑی اُن کی سیکرٹری مس واڈیا باری باری ٹائپ شدہ خط پیش کرتی اور اینڈرسن دستخط کرتے جاتے۔ کبھی کوئی سوال پوچھتے تو وہ نہایت انکساری سے مطلوبہ معلومات فراہم کر دیتی۔ مسٹر اینڈرسن کو مس واڈیا کی فرمانبرداری، اُس کی کاروباری معاملات پر نظر رکھنے کی سوجھ بوجھ اور ٹیپ ریکارڈ جیسی یادداشت نے ہمیشہ متاثر کیا تھا۔ وہ اکثر فرم کے ڈائریکٹروں اور اعلیٰ افسروں سے کہا کرتے "مس واڈیا تو اس فرم کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا ہے!"

جب مسٹر اینڈرسن آخری خط پر دستخط کر چکے تو انھوں نے اپنی سنہری عینک اُتار کر میز پر رکھ دی۔ اور اپنی نیلگوں آنکھوں ... ہتھیلیوں کو پُشت سے ٹکاتے ہوئے مس واڈیا کی طرف دیکھا اور پھر اُن کا جھرّیوں بھرا چہرہ مسکرا دیا۔

"مس واڈیا! تیس سال کے لمبے عرصے کے بعد میں آج اپنی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔ آج اس فرم کو شروع ہوئے بھی اتنا ہی عرصہ ہو گیا ہے۔ لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں جس رفتار سے فرم کا کام بڑھا ہے اور جس طرح سے ان بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں کو نبھانے میں جو مدد تم نے مجھے دی ہے میں اُس کے لیے بے حد شکرگزار ہوں!" اور وہ اُس سے ہاتھ ملانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مس واڈیا کا ذہن ایک دم جیسے ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اُسے مسٹر اینڈرسن کے ساتھ کام کرنے میں جو لطف آیا تھا وہ اُسے کبھی بھی نہ بھلا سکے گی۔ اُس کا گلا شدّتِ جذبات سے بھر آیا۔

"میں آپ کی مہربانیوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی سر! میں بلکہ فرم کے سب لوگ آپ کو ہمیشہ مِس کریں گے!" اُس نے آگے بڑھ کر مسٹر اینڈرسن کا ہاتھ تھام لیا۔

مسٹر اینڈرسن شفقت بھری نگاہوں سے اُس کی طرف چند لمحے دیکھتے رہے اور پھر میز کے دراز پر نظر ڈالتے ہوئے بولے "مس واڈیا! میں تمھاری برسوں تک خدمات کے لیے ایک نہایت معمولی سا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں!" انھوں نے میز کی دراز کھول کر ایک سونے کی گھڑی نکالی اور اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

"مسٹر اینڈرسن!" وہ اتنا قیمتی تحفہ دیکھ کر چونک پڑی اور پھر اُس نے شدّتِ جذبات سے مسٹر اینڈرسن کی ہتھیلی کی پُشت کو چوم لیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

جب مسز ہیتھ نے ان کو ... دیکھا ... دیکھو! [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

دنیا اسے [illegible] ہاتھ میں پہچانتے تھے۔

دروازہ پر ایک جانی پہچانی دستک ہوئی۔
"کم بخت!" اس کی آواز میں ایک شگفتگی ابھر آئی۔ اس کا قیاس بالکل درست تھا۔ وہ جیک گراہم ہی تھا!
"ایڈی! تم تو بہت دبلے ہو رہے ہو۔ میں نے سوچا ایک ریٹائر ہونے والے ڈائریکٹر کے حضور میں اپنا سلام
عرض کر دوں!"
"اور ڈونٹ بی سلی بیکی!" ایڈرسن نے اٹھ کر گراہم کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں فرم سے
علیحدہ ہو رہا ہوں۔ تم سے تو نہیں! میں ویسے بھی اب فرم کی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔ فرم کو جوان خون کی
ضرورت ہے!"
"اور تجربے کی بھی!"
"وہ تجربہ تو تمہارے جسم کی رگ رگ میں رچ بس چکا ہے!" ایڈرسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تمہارے نئے
[illegible] نئی نسل کا جوش اور [illegible] اور تمہارا جہاندیدہ تجربہ اس فرم کو اور دور تک لے جائیں گے! میرے لیے کیا اتنا فخر کم ہے
کہ اس فرم کے نام کے ساتھ میرا حقیر نام بھی منسلک ہے!" اور پھر وہ ہنس دیے۔
"یاد ہے وہ دن جب تم نے اس فرم کو شروع کرنے کا پروجیکٹ میرے سامنے رکھا تھا! میں تو کچھ دیر کے لیے کانپ گیا
تھا!"

"ایڈی! تم تو [illegible] جانتے ہو کہ اس فرم کو چلانے میں [illegible] کے کتنے کارنامے [illegible] اور جب کبھی [illegible]
[illegible] تو ہمیشہ تمہاری ثابت قدمی اور خود اعتمادی نے مجھے سہارا دیا! یاد ہے وہ [illegible] جب انہوں نے اپنی [illegible] سامنے
[illegible] اور تم نے ان [illegible] والے کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے کتنی [illegible] سے کہا تھا "ایڈرسن اور گراہم کی فرم [illegible]
[illegible] سے [illegible] تھی۔ ایڈرسن اور گراہم کے [illegible] اور [illegible] میں اب بھی اتنی ہمت اور
طاقت ہے کہ وہ [illegible] پھر جنم لے سکیں۔"
مسٹر ایڈرسن مسکرا دیے۔
اتنے میں دروازے پر پھر ہلکی سی دستک ہوئی اور [illegible] دروازے میں سے [illegible] کے [illegible]
[illegible] سامنے آ کھڑا ہوا۔
"[illegible] کی [illegible] میں [illegible] تھی!" مسٹر ایڈرسن نے اپنی پرجوش آواز میں
[illegible] کہا
"مسٹر ایڈرسن [illegible] کو [illegible] تھا!" اس نے اپنا ہاتھ [illegible] آگے بڑھا دیا۔

[illegible] تجربے کا یقین [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] Wish you the very best [illegible]

ہو گیا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہوا ——— لیکن اس وقت تو یہاں بالکل سناٹا تھا۔ اس دنیا میں ہال کی کرسیاں اور میز بالکل خالی نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ صدر دروازے کے قریب جو ریسپشن کاؤنٹر تھا وہ بھی صاف ستھری و بے صدا تھی۔ یہ تمام میز کرسیاں، الماریاں ایک ایک کرکے اُن کی نظروں کے سامنے پھیل رہی تھیں۔ یہ اتنی بڑی تعداد کیسے ہوگئی؟ کیونکر ہوگئی؟ پانچ آدمیوں سے تین ہزار! تین ہزار خاندان اس فرم کی بدولت اپنی زندگی بسر کرتے تھے! اس شاندار ترقی میں ان کا کتنا بڑا ہاتھ تھا! وہ رکتے، جھجکتے، گردن گھماتے، دھیرے دھیرے چلتے، دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ دربان نے نہایت ادب سے دروازہ کھول دیا۔

"اچھا جوزف! بائی بائی!" اور دربان نے نہایت چستی سے سیلوٹ مار دی۔ اُنھوں نے مسکراتے ہوئے جھک کے سر ہلا دیا۔

"آج سیلوٹ نہیں!" اور اُنھوں نے اپنا ہاتھ دربان کی طرف بڑھا دیا۔ جوزف ایک لمحہ بھونچکا سا رہ گیا! اور پھر اُس نے جلدی سے مسٹر ایڈورسن کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے آنکھوں سے لگایا۔ جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ مسٹر ایڈورسن نے اس کے کاندھوں کو تھپتھپایا اور بلڈنگ سے باہر آ گئے۔

سفید نیلی وردی میں ملبوس شوفر نے نہایت ادب سے آگے بڑھ کر دمکتی ہوئی سیاہ پونٹیک کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دھیرے سے تھکے ماندے ایڈورسن کار میں بیٹھ گئے۔

اگلے روز صبح سوا نو بجے دفتر میں معمول کی طرح چہل پہل تھی۔ چند لوگ گروہوں میں بٹے کسی ڈیسک کے گرد دو منٹوں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ باری باری دفتر میں چلے آ رہے تھے۔ ہر آنے والے کے ساتھ "ہیلو"، "گڈ مارننگ" کا شور اُٹھتا اور پھر وہ دفتر کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اپنے منتشر شور کرنے میں جذب ہو جاتا۔ اس شور میں نسوانی آوازیں اور قہقہے نہایت صاف طور پر سنائی دیتے تھے۔ ایک مذاق، کہیں دبی دبی ہنسی۔ دفتر کی سفید تیوروں کے بیچ میں، خوشنما اور رنگین سوئٹروں سے لڑکیوں کی آنکھیں جھانکتی، اول سے فرش پر کھٹ کھٹ، ادھر اُدھر جا رہی تھیں۔ دفتر ٹھیک ساڑھے نو بجے کھلتا تھا۔ ان آخری چند منٹوں میں شور اپنے عروج پہ پہنچ جاتا۔ تو ویسے ہی چلی جاتی تھی کہ ساڑھے نو بجے آپ ناظروں کی کشمکش! جیسے دبی دبی سرگوشیوں نے دوڑ ڈال دیا۔ ایک عجیب قسم کی خاموشی قبضہ جما لیتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ دس بجنے کے قریب جب فرم کے [illegible] بڑے لوگ آنے لگتے تو یہ شور ایک نیا شور بنتا۔ اب ہے کہ دروازے کی ضرورت سے زیادہ بلند آوازیں اور سامنے کے لوگوں کا متوجہ کرنے کا اور [illegible] دوبارہ وہی شور مچ جاتا۔

کرسی کی پیٹر [illegible] سیکریٹری ہاتھ میں اپنے جوتوں پر ٹک ٹک [illegible] دیا۔ لیکن ابھی ابھی وہ [illegible] بیٹھ کر [illegible] ایک دو لیے خشک نظر مسٹر گپتا جنھوں نے ابھی ابھی سگار سلگایا تھا [illegible] جو فرم کے [illegible] سے اپنی کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ مسٹر شفیق حسین نے ایک نہایت [illegible]

کسی شہری کی تمام [illegible] گئے۔ دو چند نگاہیں اور تماشے ہی نظر آئیں۔ وہ مذہب پر [illegible] ایک شیشے کی الماری
تھیں اس سلسلے میں [illegible] مسٹر ایشڈسن کو ... بیٹھا تھا [illegible]
صرف تماشہ دیکھا کر ان کے ہاتھ میں ان کے سچ آویزاں کی جائے صرف نجد ... وہ اخبار [illegible]
سے سرک کر دیکھتے رہے سب کچھ ڈرائنگ کے چھپکلی کی طرح ہو گئے۔

مسٹر لینکس قدم پیمائی کر رہے تھے ... تھا اور انہوں نے ڈیپوٹ ... جب کسی سوال کی تو
اس سے پہلے دن ... مسٹر ایشڈسن کو ... ہوتے ہوئے کہا: "مسٹر ایشڈسن کو کیا ہو گیا
اور معلوم ہو گئی؟" مس ... کا انتقال ہو گیا ... مگر ان سے ... ہو گیا۔ نائیں ... ہوگی ...
نے ... کرتے ہوئے کہا: "ہاں!" اور پھر ان نے ایک ... اپنے ... سے ...
... کہ مس واڈیا ... دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے۔

مس واڈیا بھی ... کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ شاید مسٹر ایشڈسن کو کسی ضروری کام سے جانا تھا جس کی وجہ سے انہیں آنا
پڑا۔ ... مسٹر ایشڈسن ... کام ... تفصیل سے ... شاید کام ... کی ...
... ایک ... کے ... پر ... جا چکے تھے۔ اب ... کوئی کام
تھا۔ ... مسٹر ایشڈسن ... دفتر میں آنا پسند نہ تھا۔ وہ ضرور ... کرنے
کے قابل ہے۔ ... کام ... انتظار کرنے لگی۔

ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا لیکن مس واڈیا کے پاس مسٹر ایشڈسن کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ دفتر میں ... بڑھے
... کرنے کے لیے ... ہو رہا تھا۔ وہ ... جانے کے بجائے مسٹر ایشڈسن
کے کمرے کے سامنے سے گزری اور دروازے میں لگے ہوئے ... شیشے میں سے جھانک کر ... مس واڈیا کی
طرف چلی۔

"مس واڈیا! مس واڈیا!" ان کی آواز میں ایک عجیب گھبراہٹ اور حیرت کا عنصر تھا گویا وہ کوئی انوکھی چیز دیکھ کر آ
رہا ہو۔

سب حیرت اور تجسس میں ڈوبی ہوئی تھیں ... کام چھوڑ کر مس واڈیا کی میز کے پاس پہنچ گئیں۔
"مس واڈیا! آپ کا ... سے میز پر دو ... چڑھائے ... اخبار پڑھ
رہا ہے: مسٹر ایشڈسن ... معلوم ہوتا تھا سب ... پڑیں۔
وہ تھا: "مس واڈیا ... "
وہ سب اخبار پڑھ رہا تھا آپ کو ... تھا: " ... اور پھر ...

مسز رشا نے جلدی اپنے میز پر ٹائپ کرنے میں مشغول ہوگئی۔ سب لڑکیاں اپنی اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھ گئیں۔

مس [illegible] اپنے باس کی شکل میں زیادہ دلچسپی تھی۔ جیسے ہی مسٹر ایڈیسن نے [illegible] ہونے کے بعد دراز میں [illegible] کی ہو۔ اس نے کچھ سوچ کر مسٹر ایڈیسن کے کیبن میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

مسٹر ایڈیسن کے کیبن کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے بیضوی شیشے میں سے ایک سرسری نظر بڑی ادا سے اندر جھانکا جس [illegible] اس نے پچھلے چند سالوں میں مسٹر ایڈیسن کو کبھی اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ اس نے نہایت ادب سے [illegible] اندر سے مسٹر ایڈیسن کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

"کم ان!"

اس نے خلاف توقع تیزی سے دروازہ کھولا اور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں سر!"

مسٹر ایڈیسن نے اخبار بند کرتے ہوئے میز سے ٹانگیں ہٹا لیں۔

[illegible] تم [illegible] کوئی فرق محسوس ہو رہا ہے؟ دیکھو اس کمرے میں کتنی شانتی ہے، کتنا سکون! کل تک یہ ٹیلیفون کی گھنٹیاں متواتر بجتی رہتی تھیں، ہر کوئی ہر لمحہ اپنا مسئلہ حل کروانے یا میری رائے لینے گھسا آتا تھا۔ میں ان سب سے پریشان ہو گیا تھا۔ جیسے دل میں بڑی خواہش تھی کہ میں ایک بار، اس کیبن میں ایسی ہی خاموشی اور شانتی کو محسوس کر سکوں! زندگی کی مصروفیات اور پھر [illegible] کل تک مصروفیات میری زندگی کو ڈسے ہوئے تھیں، آج میں ان پر حاوی ہوں! زندگی جیسے اتنا [illegible] ہو سکتی ہے! میں [illegible] اسی وقت دفتر سے [illegible] کر جا سکتا ہوں۔ کل تک میں [illegible] کرنے کے لیے ترس گیا تھا! یہ کرسی جیسے پاؤں میں زنجیر باندھے ہوئے تھی۔ لیکن آج ——— میں آزاد ہوں، خود مختار ہوں، جو چاہوں کر سکتا ہوں!" اور انھوں نے تیزی سے میز کے قریب رکھا ہوا [illegible] کھسکا دیا۔

اتنے میں ایک جانی پہچانی دستک سنائی دی اور [illegible] نے اندر جھانکا۔ وہ جیسے ایڈیسن کو دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹھک گیا۔ اور پھر وہ مسکراتا ہوا بولا: "ایڈیسن! تم آج یہاں!" اور پھر اس نے گھورتے ہوئے [illegible] کی طرف دیکھا۔

"بڑے اچھے موڈ میں ہو ایڈیسن!"

"ہاں جیکی! میں محسوس کرنا چاہتا تھا کہ ذمہ داریوں کا [illegible] اتر جانے کے بعد انسان اپنے آپ کو کتنا ہلکا محسوس کرتا ہے! [illegible] اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اس کیبن کو ابھی چند روز استعمال کروں گا!"

"ارے واہ ایڈیسن! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! تم جب تک چاہو اس کیبن کا استعمال کرو۔ [illegible] ایڈیسن کے [illegible] میں نے [illegible] کیبن بنانے کے [illegible] انتظام [illegible] گا۔ اور ایڈیسن اگر چاہو تو [illegible] ہمیشہ [illegible] ہے۔"

"تھینک یو۔ [illegible]"

"مجھے [illegible] مس ولایا کی اس کا کیا مطلب ہے؟"
"نہایت اچھا خیال ہے۔ مس ولایا ہے۔ [illegible] بہت مدد کر سکتی ہے؟"
[illegible] تعریف [illegible] اور وہ [illegible] باتیں کرتا [illegible]

چونکہ مسٹر ایلیڈ سن کے علم کو بیشتر [illegible] مس ولایا کو یہ توقع تھی کہ وہ جلد ہی مسٹر [illegible] بلانے جائے گی [illegible] ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی کوئی [illegible] نہیں ہوئے۔ وہ چند دنوں تک مسٹر ایلیڈ سن کو [illegible] لیکن آہستہ آہستہ اس کی [illegible] ختم ہو گئیں۔ وہ مس [illegible] باتیں کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے پاس فرصت کا [illegible] سب وہ [illegible] اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے [illegible] پڑھنے میں مشغول رہتی۔ نہ جانے [illegible] کیوں احساس ہو [illegible] کہ مسٹر ایلیڈ سن کے ساتھ ساتھ [illegible] ہو گئی ہو۔

[illegible] دفتر کے [illegible] وہ اپنے کمرے سے نکل کر چلے گئے [illegible] پر [illegible] اپنے پر [illegible] ہوں۔ [illegible] کی لگن [illegible] احترام کرتے لیکن [illegible] کہ [illegible] نئی [illegible] کے دل میں [illegible]
تھا۔

ایک [illegible] وفتر [illegible] میں [illegible] وہ [illegible] سیکرٹری [illegible]
تھی [illegible] سیکرٹری [illegible] بعد وہ اس [illegible]
بالکل [illegible] اس کی آنکھیں [illegible] اس [illegible] مسٹر [illegible]
[illegible] نہایت خوبصورت [illegible] کہ [illegible]
پاس [illegible] تھی۔ اس کے ساتھ [illegible] گرا تھی۔
مس ولایا [illegible] مسٹر [illegible] کی سیکرٹری [illegible] کمرے میں [illegible] مسٹر [illegible]
یہ سب [illegible] کیا ہے؟
مس ولایا کو [illegible] نہایت [illegible] اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور [illegible]
[illegible] کہ کر چلی گئی —— مس ولایا کو ایسے معلوم ہوا جیسے کسی [illegible] زندگی [illegible]
[illegible] باہر نکال دیا ہو۔
وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر کے مسٹر ایلیڈ سن کے کمرے کی طرف بڑھی اور دستک کے جواب کا انتظار کیے بغیر
داخل ہو گئی۔

مسٹر ہچکاک ڈیپارٹمنٹ ہی میں میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے!"

"ارے کیوں مس وراڈیا!" مسٹر ایندرسن چونک پڑے۔ "تم، تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟"

"مسٹر پٹیل نے اپنے لیے ایک نئی سیکرٹری اپوائنٹ کر لی ہے اور مجھے مسٹر مہتہ کے ساتھ کام کرنے کے لیے آرڈرز دے دیے گئے ہیں!"

"مسٹر مہتہ کے ساتھ؟ اس نے نئی سیکرٹری رکھ لی! کیا وہ فرم میں پہلے سے نہیں تھی؟"

"نہیں، وہ ایک ... کے لیے مسٹر ایندرسن پر چھپ کر ... ہو۔"

"یہ فرم کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے! کیا ہے یہ! اتنا بھی نہیں کہتا!" اور انھوں نے ٹیلیفون اٹھا کر مسٹر پٹیل سے بات کرنے کے لیے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

"ہیلو۔ میں ایندرسن بول رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے لیے فرم سے باہر کی کوئی سیکرٹری اپوائنٹ کر لی ہے!" اُن کی آواز میں ... کی طرح ... تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پالیسی کے بارے میں اپنے فیصلے دیتی آئی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

"لیکن کیوں؟" مسٹر ایندرسن کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "یہ فرم کی بنیادی پالیسی کے خلاف ہے!"

دوسرے سرے سے ایک ... سنائی دیا۔ ایندرسن کے چہرے کی جھریاں ہر لمحہ نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی آواز میں جیسے ایک تھکن سی چھا گئی ہو جیسے سالہا سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج محتاج ہو گیا ہو۔

"ہاں ہے ... تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مجھے فرم کی پالیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔" اور انھوں نے دھیرے سے ... ہاتھوں سے مس وراڈیا سے نظریں ملائے بغیر ٹیلیفون کا چونگا واپس رکھ دیا۔ انھوں نے میز سے اخبار اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

مس وراڈیا دیر تک کھلی آنکھوں سے مسٹر ایندرسن کی خالی جھولتی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتی رہی۔

"مجھے [illegible] مس ووڈیا کہ آپ کا [illegible] بات [illegible] ہے؟"

"نہایت اچھا خیال ہے۔ مس [illegible]۔ وہ تو بہت مدد کر سکتی ہے!"

مس ووڈیا اپنی تعریف سن کر شرما گئی اور [illegible] باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

چونکہ مسٹر ایڈمرسن کے کام کی ساری ذمہ داری مسٹر شیل کو سونپ دی گئی تھی مس ووڈیا کو یہ توقع تھی کہ وہ جلد ہی مسٹر شیل کی سیکرٹری بنا دی جائے گی لیکن ایک ہفتہ گزر جانے پر بھی کوئی ایسے آثار نہیں تھے۔ وہ چند دنوں تک مسٹر ایڈمرسن کے کمرے میں بیٹھی کام کرتی رہی لیکن آہستہ آہستہ اس کی مشغولیات ختم ہو گئیں۔ وہ مسٹر شیل سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کے پاس فرصت کہاں تھی۔ سب [illegible] اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول رہتی۔ نہ جانے کیوں اسے احساس ہونے لگا تھا گویا وہ مسٹر ایڈمرسن کے ساتھ ساتھ ریٹائر ہو گئی ہو۔

ایڈمرسن اس دوران میں باقاعدہ دفتر آتے رہے لیکن دو گھنٹے کے بعد وہ چپ چاپ اپنے کیبن سے نکل کر چلے جاتے گویا وہ تمام عمر پنجرے میں بند رہنے کے بعد فضا میں آزادانہ سانس لینے کے لیے اپنے پر تول رہے ہوں۔ دفتر کے سبھی لوگ اُن کا احترام کرتے لیکن [illegible] کے بعد کچھ دنوں سے ایسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے نئے ڈائریکٹر شیل کے دل میں اُن کا احترام کم ہوتا جا رہا ہو۔

ایک دن جب مس ووڈیا دفتر آئی تو [illegible] میں اس کے لیے نئے احکام رکھے تھے۔ وہ اب مسٹر [illegible] کی سیکرٹری بنا دی گئی تھی۔ مسٹر [illegible] سیلز منیجر تھے اور [illegible] افسروں میں [illegible] تھے لیکن ایک ڈائریکٹر کی سیکرٹری رہنے کے بعد وہ اس زوال کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ [illegible] مسٹر ایڈمرسن اور مسٹر [illegible] سمجھے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان سی لڑکی چست [illegible] اُس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اُس کے ساتھ دفتر کا [illegible] تھا۔

"مس ووڈیا، یہ ہیں مس [illegible] مسٹر شیل کی نئی سیکرٹری۔ آپ چونکہ مسٹر [illegible] کے کیبن میں جا رہی ہیں مسٹر شیل نے اس سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا ہے!"

مس ووڈیا کو جیسے ایک چکر سا آ گیا۔ وہ نہایت مشکل سے سنبھلی۔ اس نے اپنی سیٹ خالی کر دی اور اس پر [illegible] کو بیٹھنے کو کہہ کر چلی گئی —— مس ووڈیا کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی [illegible] نے بوڑھی ماں کو [illegible] گھر سے باہر نکال دیا ہو۔

وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر کے مسٹر ایڈمرسن کے کیبن کی طرف بڑھی اور [illegible] کے جواب کا انتظار کیے بغیر [illegible]

مس ویا! میں مسٹر دست سے شادی کر رہی ہوں۔ میں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"ایسے کیسے مس واڈیا؟" مسٹر ایڈرسن چونک پڑے۔ "تم۔ تم یہ فرم چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟"

"مسٹر پٹیل نے اپنے لیے نئی سیکرٹری appoint کر لی ہے اور مجھے مسٹر دست کے ساتھ کام کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتی؟"

"مسٹر دست کے ساتھ بھی تو نئی سیکرٹری کام کر رہی ہے! کیا وہ فرم میں پہلے سے نہیں تھی؟"

"نہیں! ... وہ ایک لڑکی ہے" مسٹر ایڈرسن پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

"یہ فرم کی پالیسی کے بالکل خلاف ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے!! کیا پٹیل اتنا بھی نہیں سمجھتا!" اور انھوں نے ٹیلیفون اٹھا کر مسٹر پٹیل سے بات کرنے کے لیے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے یہ کبھی نہیں ہو سکتا!"

"جی۔ پی میں ایڈرسن بول رہا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تم نے اپنے لیے فرم سے باہر کی کوئی سیکرٹری اپائنٹ کر لی ہے؟" ان کی آواز میں معمول کی طرح خود اعتمادی تھی۔ وہی آواز جو سالہا سال فرم کی پالیسی کے بارے میں اپنے فیصلے دیتی آئی تھی۔

ٹیلیفون کے دوسرے سرے سے ایک نہایت مختصر سی آواز آئی۔

"لیکن کیوں؟" مسٹر ایڈرسن کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ "یہ فرم کی بنیادی پالیسی کے خلاف ہے!"

دوسرے سرے سے ایک طویل مونولوگ سنائی دیا۔ ایڈرسن کے چہرے کی جھریاں ہر لمحہ نمایاں ہوتی جا رہی تھیں اور ان کی آواز میں جیسے ایک تھکن سی چھا گئی ہو جیسے سالوں سال حکومت کرنے والا بادشاہ آج محتاج ہو گیا ہو۔

"ہاں ہاں! تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ مجھے فرم کی پالیسی کے بارے میں اب کچھ بھی کہنے کا حق نہیں پہنچتا۔" اور انھوں نے دوسرے کمزور ہاتھوں سے مس واڈیا سے نظریں ملائے بغیر ٹیلیفون کا چونگا واپس رکھ دیا۔ انھوں نے میز سے اخبار اٹھایا اور ڈولتے ہوئے کیبن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

مس واڈیا دیر تک کھلی ہوئی آنکھوں سے مسٹر ایڈرسن کی خالی جھولتی ہوئی کرسی کی طرف دیکھتی رہی۔

قرآن حکیم کا سب سے پہلا اردو ترجمہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ جو وقت حضرت شاہ ولی اللہ [illegible] کے فرزند
ارجمند کے گرامی قدر تھے۔ نہایت عالم و فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ آپ کی
سب سے بڑی چیز جو ان کی شہرت کا باعث ہے وہ "موضح القرآن" ہے جس کو سب جانتے ہیں
یعنی آپ کا وہ مترجم قرآن اور مقبول تفسیر جس کو انہوں نے ۱۲۰۵ھ میں ختم کیا ہے
پہلے قرآن کریم کا ترجمہ اس وقت کی مروجہ اردو میں کیا۔ یہ ترجمہ (جس کا نام خود حضرت مترجم
نے موضح القرآن [illegible] ختم کرنے والوں [illegible] تاریخی نام تھا) اس قدر مقبول
اور مقبولیت کے ساتھ پڑھا گیا تھا کہ اگرچہ اس کو آج لکھے ہوئے دو سو برس گزر چکے ہیں مگر اس کی شہرت
اور عظمت آج تک باقی ہے۔

اس تاریخی ترجمے کے مترجم حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ ۱۱۶۷ھ مطابق [illegible] میں
بمقام دہلی پیدا ہوئے اور وہیں ذکر الٰہی اور خدمت خلق کرتے رہے اور قرآن و حدیث کا
درس دیتے رہے۔ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں وفات پائی۔ دہلی میں دہلی دروازہ کے باہر
[illegible] ان کا مزار زیارت گاہ عوام و خواص ہے (تذکرہ علمائے ہند فارسی [illegible]
[illegible] سال وفات [illegible] لکھا ہے جو صحیح نہیں)

اس نادر و نایاب ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ حضرت حکیم [illegible] صاحب [illegible] ریاست
[illegible] کے کتب خانہ میں تھا۔ [illegible] میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد ان کی تمام
عربی و فارسی کتب اور ہزاروں قلمی نوادرات کا بے مثل ذخیرہ ان کے ورثا نے [illegible]
[illegible] کو [illegible] کردیا۔ اس بیش بہا کتابوں سے [illegible] لائبریری [illegible] میں [illegible]
[illegible] سے زیادہ عربی و فارسی کی قلمی اور مطبوعہ کتابیں تھیں۔ میں جب [illegible] میں اس
[illegible] کتب خانہ [illegible] لائبریری [illegible] تو میں نے وہاں [illegible] نایاب مخطوطات کے حضرت
شاہ صاحب کا یہ ترجمہ بھی دیکھا۔ میں نے اس وقت اس کے دیباچہ کی نقل [illegible]
[illegible] کا ترجمہ [illegible] ساتھ [illegible] لکھ لیا تھا جسے [illegible]

سے بعد میں جناب محمد طفیل صاحب مدیر نقوش کی فرمائش پر قارئین کرام کی خدمت میں بطور تبرک پیش کر رہا ہوں۔

یہ دیباچہ آج سے پونے دو صدی پہلے کی اردو کا بہترین نمونہ ہے۔ اس وقت جو رسم الخط رائج تھا اس کے مطابق یہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔ اور میں نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ حرف بحرف اور لفظ بلفظ بالکل مطابق اصل نقل کیا ہے۔ جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ آج سے ۱۷۵ سال پیشتر کس قسم کی اردو بولی جاتی تھی اور وہ کس طریقے سے لکھی جاتی تھی۔ تاریخ ادب اردو کے مورخین کے لیے یہ دیباچہ بہت دلچسپ اور دلکش چیز ہے۔ جو قدیم اردو کی عبارت اور طرز تحریر کو ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے —— جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ دیباچہ پہلے ایڈیشن میں چھپا ہو تو چھپا ہو بعد کے ایڈیشنوں میں میری نظر سے تو نہیں گزرا۔

[illegible]

رام گلی نمبر ۳۔ لاہور — خاکسار، محمد اسماعیل پانی پتی

دیباچہ موضح القرآن

حمد و شکر تیری احسان کا ادا کرے کس زبان سی کہ ہماری زبان کو پائی اپنی نام پر اور دل کو روشنی دی اپنی کلام پر اور سلامت ہو کیا چاہیے اس رسول مقبول کو جو اشرف دنیا اور عقبیٰ ہے جس کی شفاعت سی امیدوار ہیں ہم کہ پاویں دو جہان کی نعمت اور اس کی امت ہیں کہ اس کی امت کو کمال سی ہدایت ملی نصیب کرے حضرت کسی طرح کی اور اپنی عنایت اس پر ہمیشہ افزون رکھ دنیا و آخرت میں اور اس کی آل اولاد پر اصحاب کبار پر اور اس کی امت کے علمای متقدم اور اولیا اصفیا پر اور عزیا و رشفعا پر سب پر آمین یا رب العالمین ۔ بعد اس کے سنا چاہیے کہ مسلمان کو ضرور ہے کہ پہلی سب کو پہچانے اور اس کی صفات جانے اور اس کی حکم معلوم کرے اور معنی و نام معنی تحقیق کرے کہ بغیر اس کی بندہ کے نہیں اور جو بندگی کا دعوی وہ بندہ نہیں اور اللہ سبحانہ کی پہچان آدمی بتانی سی آدمی پیدا ہوتا ہے جاہل نادان سب چیز سیکھتا ہے سکھانے سی اور سکھانے والے ہر چند تقریر کریں اس برابر نہیں جو اللہ نی آپ بتایا اور اس کی کلام میں جو ہدایت ہی وہ سی کہیں نہیں پر کلام پاک اوس کا عربی زبان ہے اور ہندوستانی کو اوس کا دریافت محال اس واسطے اس بندہ عاجز عبد القادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبد الرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل و آسان اب بندہ نے بھی قرآن شریف کو ترجمہ ریختہ ۔ الحمد للہ کہ سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ میں میسر ہوا۔ اب کئی باتیں معلوم کیجیے اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بلفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی ترکیب عربی سی بہت بعید ہے اگر بعینہ وہ ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہووے دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی مگر ہندی متعارف تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانی کو معنی قرآن اس سی آسان ہوئے لیکن پھر بھی استاد سے سند کرنا لازم ہے کہ اول معنی قرآن کا بغیر سند معتبر نہیں دوسرے ربط کلام کا ماقبل و مابعد سی پہچاننا اور قطع کلام سی بچانا بغیر استاد نہیں آتا چنانچہ قرآن

[illegible]

سورة الفاتحة مكية [illegible] وهي سبع آيات

[illegible]

بسم الله الرحمن الرحيم

بنام خدای بخشاینده مهربان [illegible]

الحمد لله رب العالمين [illegible]

[illegible] الرحمن الرحيم [illegible]

[illegible] اياك نعبد واياك نستعين [illegible]

[illegible] اهدنا الصراط المستقيم [illegible]

[illegible] صراط الذين [illegible] عليهم [illegible]

[illegible] غير المغضوب عليهم ولا الضالين [illegible]

[illegible]

[illegible]

دنیائے عرب

بصیر عالم

مغربی مصنف جس علاقے کو "مشرق قریب" کہتے ہیں وہ ایک پاکستانی مصنف کے لیے "مغرب قریب" ہے۔ اسی طرح "مشرق وسطی" پاکستانیوں کے لیے "مغرب وسطی" ہونا چاہیے۔ دراصل ایسی تمام اصطلاحات جن سے سمت ظاہر کی جاتی ہے اضافی ہوتی ہیں۔ تمام سمتوں کا مرکز اس شخص کا محل وقوع ہوتا ہے جو سمت متعین کر رہا ہے۔ اگر یہ مرکز بدل جائے تو سمت کا تعین بھی بدل جاتا ہے۔ مغربی مصنفین نے جس علاقے کو "مشرق قریب" یا "مشرق وسطی" کہا ہے وہ ان کے محل وقوع کے اعتبار سے درست ہے لیکن اہل مشرق کے لیے درست نہیں ہے۔ پھر بھی اہل مشرق اپنی تحریروں میں متذکرہ علاقہ کو یہی نام دیتے ہیں جو مغربی مصنفین نے دیا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اہل مغرب کی تقلید مشرق کی عادت ثانیہ ہو گئی ہے۔ گو مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا ہے لیکن اقتصادی اور کہیں کہیں تمدنی غلبہ ہنوز باقی ہے۔ خصوصاً جدید علوم اہل مشرق نے مغرب سے سیکھے ہیں اس لیے مغرب کی علمی اصطلاحیں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط رواج پا گئی ہیں۔ مشرقی تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق مغرب کی رائج کردہ علمی اصطلاحات کی ترمیم و تنسیخ کے لیے ایک عرصہ درکار ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں اگر اب بھی ابتدا نہ کی گئی تو یہ عرصہ اور بھی طویل ہو جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد تک دنیا کے اس حصے کا مقبول ترین نام "مشرق وسطی" تھا تاہم کئی انگریز مصنفین "مشرق قریب" کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مشرق وسطی یا مشرق بعید کی علاقائی حدود کیا ہیں اور ان میں کون سے ممالک شامل ہیں؟ یہ ابتدائی باتیں سب کے سامنے نہیں ہو سکتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر مصنف اس علاقے کی حدود اپنی مرضی سے متعین کر لیتا ہے۔ جس علاقے کو روایتی طور پر مشرق وسطی کہا جاتا ہے وہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم کا ایک چھوٹا سا علاقہ ہے اور اس میں زرخیز ہلال Fertile Crescent کے ممالک یعنی عراق، شام، لبنان، فلسطین، اردن اور جزیرہ نمائے عرب شامل ہیں لیکن بعد میں مشرق وسطی کی حدود وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ بعض مصنفین نے تمام عرب ممالک کو مشرق وسطی میں شامل کر لیا اور بعض نے ترکی، ایران، افغانستان حتی کہ روس کی ایشیائی ریاستوں اور پاکستان کو بھی شامل کر لیا ہے۔ علاقائی حدود کی اس وسعت کے پیش نظر بعض مصنفین نے "مشرق قریب" کی اصطلاح کو ترجیح دی [illegible] لیکن مشرق وسطی کی طرح مشرق قریب کی حدود بھی غیر متعین ہیں۔ علاقائی حدود کا [illegible] رہنما عوامل کی [illegible] کے منافی ہے۔ [illegible] علاقہ [illegible] ہے۔ [illegible] علاقہ کو مشرق وسطی یا مشرق [illegible] کہا جاتا ہے وہ ایک [illegible] ہے [illegible] اس علاقہ کو [illegible]

کا حصہ ہے۔ دنیائے عرب کی سرحد (افریقہ) مراکش سے شروع ہو کر مصر تک، اور ایشیا میں یہ شام اور فلسطین کے ساحل سے شروع ہو کر خلیج عرب کے جنوبی ساحل تک اور افریقہ میں افریقہ کے شمالی ساحل سے شروع ہو کر بحر اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے دنیائے عرب میں مندرجہ ذیل ممالک شامل ہیں:

مراکش، الجیریا، تیونس، لیبیا، مصر، سوڈان، فلسطین، شام، لبنان، عراق، کویت، بحرین، سعودی عرب، یمن، مسقط و عمان، عدن اور شارجہ کی چھوٹی ریاستیں۔

طبعی حالات اور آبادی

دنیائے عرب کا رقبہ ۰۰۰،۹۵،۰۰،۱ مربع کلومیٹر ہے۔ مگر اس علاقہ کے بہت کم حصے سمندر سے پانچ سو میل دور ہیں لیکن اکثر ساحلوں پر چند پہاڑ ہیں جن کی وجہ سے ساحلی علاقوں میں زیادہ بارش ہوتی ہے اور اندرونی حصوں میں بہت کم۔ اکثر اندرونی علاقے ریگستان ہیں لیکن وہ خطے جنہیں دریاؤں کا پانی میسر ہے نہایت شاداب اور زرخیز ہیں۔ یہ ہیں مصر میں نیل اور عراق میں دجلہ و فرات کی وادی۔ ساحلی علاقوں اور دریا کی وادیوں کو چھوڑ کر بقیہ علاقے یا تو بڑے بڑے گھاس کے میدان اور نیم ریگستانی اور ریگستانی خطے ہیں۔ چونکہ بارش کے نمایاں تفاوت کے باعث ایک ہی قسم کے خطے میں آب و ہوا کا نمایاں فرق اور بعض جگہ تضاد پایا جاتا ہے۔

اس وقت دنیائے عرب کے کل رقبہ کا صرف پانچ فیصد زیر کاشت ہے۔ خصوصاً سوڈان، مصر اور عراق میں زیر کاشت رقبہ کی وسعت کے امکانات ہیں جہاں منظم آب پاشی بہتر بنا کر زیر کاشت علاقوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ عظیم اسوان بند کی تکمیل کے بعد صرف مصر کے زیر کاشت علاقہ میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ہوگا۔

سوائے تیل کے معدنیات کمیاب ہیں۔ فاسفیٹ، کروم، تانبا اور مینگنیز شمالی مغربی افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ پوٹاش بحر مردار کے قریب وافر مقدار میں ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی چیز اس مقدار میں نہیں ہوتی کہ اس کی بنیاد پر بھاری صنعتیں قائم ہو سکیں۔ اگر قدرت نے کوئی چیز دی ہے تو وہ ہے پٹرول۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ دنیائے عرب میں ساری دنیا کے ۶۰ فیصد سے زیادہ تیل کے ذخیرے ہیں۔ یہ تیل زیادہ تر خلیج ایران کے آس پاس تقریباً ۵۰۰ میل کے نصف قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ شمالی صحرائے اعظم میں تیل کے ذخیرے موجود ہیں لیکن ابھی ان کے متعلق پوری معلومات حاصل نہیں ہوئی ہیں۔ دنیائے عرب کے جن ذخیروں سے اس وقت تیل نکالا جا رہا ہے وہ زیادہ سے زیادہ استعمال اور استحصال کے باوجود سو سال تک چل سکتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسی رفتار سے تیل نکالا جائے تو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ذخیرے صرف بارہ سال میں ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے دنیائے عرب کے پٹرولیم میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک کی دلچسپی بہت زیادہ قابل فہم ہے۔ اس دلچسپی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دنیائے عرب میں پٹرولیم نکالنے اور صاف کرنے پر لاگت اس قدر کم آتی ہے کہ یہاں کام کرنے والی کمپنیاں امریکہ اور یورپ میں تیل نکالنے والی کمپنیوں سے کھلے بازار میں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جب سے مقامی حکومتوں اور بدیسی کمپنیوں کے درمیان نصف نصف منافع کے معاہدے ہوئے ہیں سعودی عرب اور دیگر

پیدا کرنے والی ریاستوں کا تقریباً سارا مالیہ تیل کی آمدنی سے حاصل ہوتا ہے۔ گزشتہ سالوں میں اس علاقہ کی حکومتوں کو تیل سے پانچ ارب ڈالر سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر آئندہ دس سال میں یہ آمدنی ڈیڑھ ارب سے ارب ڈالر تک پہنچ سکتی ہے۔ لیکن پٹرول اور اس سے حاصل شدہ ڈالر کھانے کی اشیا اور پانی کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ تیل سے حاصل ہونے والی دولت اور زراعتی افلاس کے درمیان جو تضاد ہے اس کی واضح مثال کویت میں نظر آتی ہے۔ کویت کا رقبہ صرف ۶۰۰۰ مربع میل ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست میں ایک شیخ کی حکومت ہے۔ تیل سے شیخ کو تیس کروڑ سے لے کر چالیس کروڑ ڈالر سالانہ آمدنی ہوتی ہے۔ کویت کی آبادی صرف دو لاکھ ہے۔ گو کویت کا شیخ اپنی دولت کو منصفانہ تقسیم کرتا ہے اور عوام کی آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے پھر بھی انگلینڈ کے بینک میں اس کی جمع شدہ دولت سب سے زیادہ ہے۔ لیکن کویت کے پاس پینے کے لیے پانی تک نہیں ہے۔ سمندر کے پانی کو مقطر کر کے پینے کے قابل بنایا جاتا ہے اور اس مقصد کے لیے تین کارخانے بنائے گئے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں صرف عراق ایسا ہے جس کی آبادی کافی ہے، پانی بھی میسر ہے اور زمین بھی زرخیز ہے۔ اس لیے صرف یہی ایک ایسا ملک ہے جو تیل سے حاصل شدہ آمدنی کو دیگر شعبوں میں ترقی کے لیے خرچ کر سکتا ہے۔ دوسرے ملک مصر، شام، لبنان اور سوڈان ہیں جن کو بدقسمتی سے ان کے پاس تیل کے ذخیرے نہیں ہیں۔ ان میں سے چند ملکوں کو ان کے علاقے سے گزرنے والی پائپ لائنوں سے ضرور کچھ آمدنی ہو جاتی ہے۔

دنیائے عرب کی کل آبادی ۸ کروڑ پچاس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے تقریباً ۸ کروڑ لوگ عربی بولتے ہیں۔ ہر ملک کی آبادی، لسانی اور نسلی تقسیم مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ مراکو: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: بربر ۱۰ فیصد، عربی ۳۰ فیصد، فرنچ ۵ فیصد، دیگر ۲ فیصد۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۳ فیصد، عیسائی ۵ فیصد، دیگر ۱ فیصد

۲۔ الجیریا: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی ۱۰ فیصد، بربر ۲۰ فیصد، فرنچ ۲۰ فیصد (۱۹۶۲ء میں)

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۰ فیصد، عیسائی ۵ فیصد (۱۹۶۲ء میں)

۳۔ تیونس: کل آبادی: ۳۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی اور بربر ۹۲ فیصد، فرنچ ۵ فیصد۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد، عیسائی ۵ فیصد، دیگر ۲ فیصد۔

۴۔ لیبیا: کل آبادی: ۱۰ لاکھ ۰۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: عربی ۸۲ فیصد، [illegible] ۵ فیصد۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۲ فیصد، عیسائی ۸ فیصد

۵۔ سوڈان: کل آبادی: ایک کروڑ ۲۰ لاکھ

لسانی تقسیم: عربی ۵۰ فیصد، کالے اور حبشی قبائل کی زبانیں ۵۰ فیصد

مذہبی تقسیم: مسلمان ۷۰ فیصد، وحشی مذاہب ۳۰ فیصد

۶۔ متحدہ عرب جمہوریہ:

مصر: کل آبادی: ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ۶۰ ہزار۔

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی۔

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۱ فیصد، عیسائی ۹ فیصد

شام: کل آبادی: ۴۰ لاکھ ۷۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: ۸۸ فیصد مسلمان، ۱۲ فیصد عیسائی

۷۔ اسرائیل: کل آبادی: ۲۰ لاکھ ۸۰ ہزار

لسانی تقسیم: عبرانی ۸۹ فیصد، عربی ۱۰ فیصد، دیگر ۱ فیصد

مذہبی تقسیم: یہودی ۹۰ فیصد، مسلمان ۸ فیصد، عیسائی ۲ فیصد

۸۔ غازہ: کل آبادی: ۴ لاکھ

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۹۔ لبنان: کل آبادی: ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: مسلمان ۴۴ فیصد، نصرانی عیسائی ۵۰ فیصد، دیگر ۶ فیصد

۱۰۔ اردن: کل آبادی: ۱۵ لاکھ ۳۰ ہزار

لسانی تقسیم: صد فی صد عربی

مذہبی تقسیم: مسلمان ۹۴ فیصد، عیسائی ۶ فیصد

۱۱۔ عراق: کل آبادی: ۶۵ لاکھ ۶۰ ہزار

لسانی تقسیم: عربی ۸۰ فیصد، کردی ۱۵ فیصد، دیگر ۵ فیصد

مذہبی تقسیم: صد فی صد مسلمان

۱۲۔ سعودی عرب: کُل آبادی: ۷۰ لاکھ

نسلاً تقسیم: سو فی صد عربی

مذہباً تقسیم: سو فی صد مسلمان

۱۳۔ یمن: کُل آبادی: ۴۰ لاکھ ۵۰ ہزار

نسلاً تقسیم: سو فی صد عربی

مذہباً تقسیم: سو فی صد مسلمان

۱۴۔ برطانیہ کے تحت ریاستیں: کُل آبادی: ۱۰ لاکھ ۵۰ ہزار

نسلاً تقسیم: سو فی صد عربی

مذہباً تقسیم: سو فی صد مسلمان

روایتی تمدن | دنیائے عرب کے جدید تمدن کا خاص منبع اسلام ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس علاقے کے کچھ لوگ مہذب، کچھ نیم مہذب اور بعض بالکل وحشی تھے۔ اسلام نے نہ صرف ایک مشترک مذہب کے رشتے میں لوگوں کو منسلک کر دیا بلکہ انہیں ایک سیاسی اور ثقافتی وحدت بھی بنا دیا۔ عربی معاشرہ خانہ بدوش قبائل، گاؤں اور شہروں میں تقسیم ہے۔ ان تینوں میں تقسیم کار یہ ہے کہ گاؤں کے باشندے اناج پیدا کرتے ہیں، خانہ بدوش قبائل مویشی پالتے ہیں اور شہری لوگ صنعت و حرفت اور تجارت کرتے ہیں۔ ان تینوں طبقوں کے درمیان تعلق لین دین یعنی اقتصادی تقاضوں اور ضرورت سے آگے نہیں بڑھا تھا لیکن اسلام نے ان کو ایک ثقافتی اور سیاسی وحدت بنا دیا۔ گو اسلام نے مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے لوگوں کو ایک رشتے میں منسلک کر دیا لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے علیحدہ وجود کو بھی برقرار رہنے دیا۔ ان کے سماجی اور مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہیں کی اور معاشرت و ازدواج سے متعلق ان کے قوانین بھی ان کے ہی رہنے دیے۔ دوسرے اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس مسلم معاشرہ کو مذہبی طبقوں میں تقسیم نہیں کیا۔ گو آلِ رسول اور علما کی عزت کی جاتی ہے لیکن انہیں طبقاتی طور پر کوئی مراعات حاصل نہیں رہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے تک مفتوحہ ملکوں کی اراضیات ریاست کی ملکیت تھیں اور مزارع براہِ راست ریاست کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ لیکن امیر معاویہ نے حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں صرفِ خاص کے لیے شام کی زرخیز اراضیات حاصل کر لیں اور اس طرح مسلمانوں کے معاشرہ میں جاگیردارانہ نظام کی اقتصادی بنیاد پڑی جو بعد میں ملوکیت کی اساس ثابت ہوئی۔ ملوکیت کے اس دور میں حکومت کا اقتدارِ اعلیٰ عسکریت اور خاندانی برتری پر منحصر تھا۔ حکومت کا تسلط زیادہ تر شہروں میں، اس سے کم گاؤں میں اور سب سے کم قبائلی علاقوں میں محسوس ہوتا تھا۔ شہروں پر فوجی صوبیدار یا موروثی جاگیردار حکومت کرتے تھے۔ ان کے معاملات میں مرکز کی طرف سے بہت کم دخل اندازی ہوتی تھی۔ خانہ بدوش قبیلے عموماً حکومت کے شر اور اقتدار سے آزاد رہتے تھے۔ شہروں کی حیثیت اہلِ حرفہ، صنعتکاروں اور تاجروں کی آزاد جماعتوں کے

دیرپا تھی۔ حیات [illegible] برقرار [illegible] معاشی اور سیاسی [illegible] اسلام [illegible]
کا مذہب تھا۔ اسلامی اصول اور اسلام [illegible] حکومت [illegible] معاشرہ پر [illegible] تھے۔ دُنیا کے عظیم مذاہب میں پیغمبر اسلام ہی
ایسی ہستی تھے جو نہ صرف مذہبی پیشوا بلکہ ایک کامیاب سیاسی رہنما بھی تھے۔ اسلام نے [illegible]
دور میں بلکہ بعد میں بھی سیاست کو مذہب سے جدا نہیں ہونے دیا۔ پیغمبر اسلام کے خلیفہ حکمران بھی تھے اور مذہبی پیشوا بھی۔
سیاست و دین کے باہمی ربط سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱. علما اور مذہبی رہنما پارٹی علیحدہ گروہ نہیں بنا سکے اور سیاسی حکمرانوں کے تابع رہے۔ عیسائی مذہب یا ہندومت کی طرح اسلام میں پادریوں یا برہمنوں کا کوئی علیحدہ اور برتر طبقہ نہیں ہے۔ مذہبی رہنماؤں کو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایک وسیلے کی حیثیت بھی حاصل نہ ہو سکی۔ قاضی، مفتی اور قاضی حکومت سے علیحدہ نہیں بلکہ حکومت کے کارندے سمجھے جاتے تھے۔

۲. چونکہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے اس لیے اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اختلافات نے مذہبی فرقوں کی شکل اختیار کر لی۔

۳. اسلام کے سیاسی نظریات میں حکمرانوں کی ذاتی صفات اور خصوصیات پر زور دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی حکمران مذہبی پیشوا بھی ہوتا تھا۔

۴. بین الاقوامی تعلقات میں اخلاقی اقدار کے احترام پر زور دیا گیا۔

۵. جنگ یا جہاد کی صورت میں بھی اخلاقی اقدار اور مذہبی احکام کی پابندی لازمی قرار دی گئی

خلفائے راشدین کے دور میں مندرجہ بالا اصولوں پر سختی سے عمل کیا گیا۔ لیکن جاگیردارانہ نظام اور ملوکیت کے دور میں سیاسی اصول اپنے حق میں کر لیے گئے۔ گو سیاست سے متعلق مذہبی احکام اور اصولوں کی تردید کھلے بندوں نہیں کی گئی اسلامی اقدار لوگوں کے دلوں سے [illegible] لیکن حکمرانوں اور اہل سیاست نے علاوہ ان تمام برائیوں اور مکاریوں کو روا رکھا جو جاگیردارانہ نظام اور ملوکیت کا لازمی نتیجہ تھیں۔ تاہم اسلامی دُنیا میں ملوکیت کا دور عیسائی دُنیا کی طرح تاریک نہ تھا۔ اسلام میں [illegible] اور فراخدلی پائی جاتی ہے اس کے باعث ملوکیت کے دور میں بھی علوم و فنون کی ترقی ہوئی۔ اس دور میں عربوں نے دوسروں سے سیکھا بھی اور دوسروں کو سکھایا بھی۔ ابتدائی دور میں عرب حکمرانوں نے ایرانی، شامی، عیسائی اور یہودی سائنس دانوں، حکیموں اور انجینئروں کو ملازم رکھا اور ان سے علم و فن کی قدر افزائی کی۔ عباسیوں کے دور میں علوم و فنون کو بے حد ترقی ہوئی۔ یونانی حکما اور فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ خلیفہ مامون الرشید نے (۸۱۳۔۸۳۳) سائنس اور حکمت کی کتابوں کے ترجمے کرائے اور سب سے پہلے یونیورسٹی کی طرز کا تعلیمی نظام قائم کیا۔ اہل علم و فن کی سرپرستی خلفا اور حاکموں کے فرائض میں شمار ہونے لگی۔ ایران سے لے کر سپین تک ہر سلطان کے دربار میں ممتاز اہل علم و فن کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کی علمی و فنی روایات

۔ تجربات کر کے کیا گیا اور ان روایات کی بنیاد پر جدید علم و فن کی عمارت تعمیر کی۔ مسلمانوں کی یہ خدمت دُنیا کی موجودہ اور آئندہ نسلیں نہ جھٹلا سکتی ہیں اور نہ فراموش کر سکتی ہیں۔

تاریخی پس منظر

گو دُنیائے عرب قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے تاہم یہ امر تعجب خیز ہے کہ بظاہر جدید تہذیب و تمدن میں قدیم تہذیبوں کے نشانات نہیں پائے جاتے۔ مگر آثارِ قدیمہ دریافت نہ ہوتے تو آج کی دُنیا کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس سرزمین میں بابلی، اسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم بھی لیا تھا یا نہیں۔ یہ اسلام کی برکات تھیں یا معجزہ کہ جس نے اس دُنیا کے قدیم تہذیب و تمدن کو ایک بھولی بسری داستان بنا دیا اور یہاں کے لوگوں کو جدید تہذیب، ترقی یافتہ تمدن اور نئی زبان بخشی۔ اکثر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دُنیائے عرب کے تمدن کی تاریخ ہی اسلام اور عربی زبان سے شروع ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ مگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو اسلام بھی دُنیائے عرب کی قدیم تہذیب و تمدن کے تاریخی سلسلہ کی ہی ایک اہم اور منطقی کڑی ہے۔ خود پیغمبرِ اسلام نے یہ فرمایا ہے کہ قرآن گزشتہ آسمانی صحیفوں میں انسانی تحریفات کی تصحیح کرتا ہے اور اسلام خدا کا دیا ہوا وہی پرانا مذہب ہے جس کی شکل کفار اور منافقوں کے ہاتھوں مسخ ہو گئی تھی۔

دُنیائے عرب میں اگر ایک طرف بنجر اور ویران ریگستان ہیں تو دُوسری طرف دریاؤں کی زرخیز وادیاں ہیں۔ ابتدا میں خانہ بدوش قبائل اپنے مویشی کے لیے چارہ کی تلاش میں دریائی وادیوں تک پہنچے ہوں گے اور پھر یہاں مستقل آباد ہو گئے ہوں گے۔ اس طرح انھوں نے خانہ بدوشی چھوڑ کر زراعتی زندگی اختیار کی ہو گی۔ اس علاقہ کے جغرافیائی حالات ہی ایسے ہیں کہ جس سے معاشی تضاد پیدا ہوا ہو گا اور اس تضاد کی وجہ سے خانہ بدوش قبائل اور زراعتی قبائل کے درمیان ایک مستقل کشمکش اور جنگ و جدال کا بازار گرم رہتا ہو گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ دُنیائے عرب کا علاقہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کا سنگم ہے۔ یہاں تو دُنیا کے ہر حصے سے خانہ بدوش قبائل آتے ہوں گے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے ہوں گے۔ جب دو قبیلے یا دو قومیں ایک دُوسرے سے ملتے ہیں (خواہ وہ میدانِ جنگ ہی میں یا بازار میں) تو ترقی ہوتی ہے۔ جنگ کے دوران ایک فوج دُوسری فوج کے طریقِ جنگ اور ہتھیاروں سے واقف ہو جاتی تھی۔ جنگ کے بعد فاتح قوم مفتوح کو اپنا غلام بنا لیتی تھی اور اس طرح وہ ایک دُوسرے کے رہن سہن، سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں سے واقف ہو جاتے تھے اور کچھ عرصے بعد ان کی زبان، تہذیب اور تمدن ایک دُوسرے میں ضم ہو جاتے تھے۔ بین الاقوامی میلوں اور منڈیوں میں دُور دراز قبائل کے تاجر ایک دُوسرے سے ملتے تھے اور نہ صرف اجناس و مصنوعات بلکہ زبان و خیالات کا تبادلہ بھی کرتے تھے۔ الغرض یہ علاقہ مختلف قبیلوں اور قوموں کے لیے میدانِ کارزار بھی تھا اور مشترک بازار بھی۔ اس لیے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ دُنیا کی اوّلین تہذیبوں کے بیج اسی علاقہ کی وادیوں میں بوئے گئے۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں میں بابلی، اسیری اور مصری تہذیبوں نے جنم لیا اور ان کی شعاعیں دُور دُور تک پہنچی تھیں۔ دجلہ و فرات اور نیل کی وادیوں کے درمیان فونیشیا (موجودہ فلسطین) کا ساحل واقع ہے۔ مغرب و مشرق کے بادشاہوں اور شہنشاہوں کی فوجیں اس علاقہ میں ایک دُوسرے سے نبرد آزما

ختم ہو گئی۔

جب تیرھویں صدی قبل مسیح میں شمال سے آنے والے وحشی قبائل نے مینیائی کریٹ کی تہذیب کو تباہ کر دیا اور ایشیائے کوچک کے باعث مصر کی بھی بساط لپٹ گئی اور دوسری بڑی شہنشاہی سلطنت ختم ہو گئی تو زنشیا کے کنعانیوں پر سمندر کی جانب سے فلسطینی بحری قزاق اور جنوب کی طرف سے سامی نسل کے عبرانی قبائل ٹوٹ پڑے۔ بعد میں کنعانیوں اور فلسطینیوں کو یہ سرزمین چھوڑنی پڑی اور وہ مغربی ساحل کی پٹی میں جا کر آباد ہو گئے۔ وہاں انھوں نے تہذیب کی شمع روشن کی۔ بنی اسرائیل نے یہاں یروشلم اور میدو کے درمیان مستقل قیام کیا۔ حضرت سلیمان (۱۰۰۵ - ۹۲۵ قبل مسیح) کے زمانے میں بنی اسرائیل کو عروج حاصل ہوا۔ ۵۸۶ قبل مسیح میں بابل نے بنی اسرائیل پر حملہ کیا اور ان کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد سے بنی اسرائیل کسی نہ کسی فاتح کے زیر نگیں رہے۔ مگر انھوں نے کبھی بھی غیر ملکی تسلط کو دل سے قبول نہ کیا۔ غیر ملکی حاکموں کے مظالم اور غیر محفوظ حالات نے ان کے تمام عقائد اور روایات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیں جو ایک مظلوم معاشرے کے لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کے متعلق سوچا اور اپنی مصیبتوں کا مداوا دوسری دنیا میں تلاش کیا۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے دنیا کو یہودیت اور عیسائیت کے مذاہب دیے۔ اسلام بھی انھیں مذاہب کے ارتقا کا سلسلہ ہے۔ چونکہ وہ فاتح حاکموں سے ہمیشہ الگ رہے اس لیے انھوں نے تجارت کا آزاد پیشہ اختیار کیا اور دور دراز کے ملکوں سے نہ صرف تجارت کی بلکہ وہاں جا کر بسے بھی۔ لیکن یہ عجیب تعجب کی بات ہے کہ ان کے مذہب اور معاشرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ تجارتی تقاضوں اور غیر محفوظ و غیر یقینی حالات نے ان کے دلوں میں دولت کی محبت پیدا کی۔ انھوں نے پس انداز کرنے کی عادت ڈالی جو بڑھ کر بخل کی صورت اختیار کر گئی۔ قومی معاشرتی اعتبار سے وہ تنگ نظر ہو گئے۔ وہ کبھی دوسروں سے خلوص نہ کر سکے۔ انھوں نے سب کو ہی دھوکہ دیا اور اکثر اپنے پیغمبروں، رہنماؤں اور اپنے آپ کو بھی دھوکہ دینے سے باز نہ آئے۔

اینی نیوا، مصر اور ایشیائے کوچک کی سلطنتوں کے بعد ایرانیوں کا زمانہ آیا۔ ۵۵۰ قبل مسیح میں سائرس اعظم نے ایرانی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا اور دارائے اول نے ایرانی سلطنت کی حدود دریائے ڈینیوب سے دریائے سندھ تک اور بحیرۂ ارال و کوہ قاف سے مصر کے بالائی حصے تک پھیلا دیں۔ ایرانیوں اور یونانیوں میں ایک عرصہ تک جنگیں ہوتی رہیں۔ آخر کار سکندر اعظم کی قیادت میں یونانیوں نے ایران اور مصر پر فتح حاصل کر لی۔ یونانیوں کے بعد رومنوں کا زمانہ آیا۔ وہ ایک عرصہ تک شمالی افریقہ میں کارتھیج (جو فنیشیوں کے بسائے ہوئے فنیشین کنعانیوں کی سلطنت تھی) سے برسرپیکار رہے اور آخر اس پر غلبہ پا لیا۔ انھوں نے سارے فلسطین پر بھی قبضہ کر لیا۔ رومیوں کی سلطنت یورپ سے شام تک اور مصر سے آرمینیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ شمال کے وحشی قبائل اور دوسروں نے روم کی مغربی سلطنت کو ختم کر دیا۔ مشرقی روم کی سلطنت عثمانی ترکوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ غرض تہذیب کی ابتدا سے رومی سلطنت

تک جب بھی کوئی طاقت ایشیا، افریقہ یا یورپ سے ابھری اس نے موجودہ دنیائے عرب کے علاقوں کو فتح کرنا اپنا اولین فرض سمجھا۔ خاص طور پر شام، لبنان، فلسطین اور مصر کے ساحلی علاقے محل وقوع کے اعتبار سے اس قدر اہم تھے کہ ہر سلطنت ان کو اپنے قبضے میں رکھنا دفاع کے لیے ضروری سمجھتی تھی۔

دنیائے عرب کی جدید تاریخ ظہور اسلام سے شروع ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی زندگی ہی میں حجاز کو متحد کرکے جزیرہ نمائے عرب کے اتحاد کی بنیاد رکھ دی تھی۔ ۶۳۲ء میں پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد عرب مسلمانوں نے ایران اور بازنطینی سلطنتوں کو فتح کرلیا۔ اسلامی فوجیں ایران سے وسط ایشیا اور ہندوستان تک پہنچ گئیں۔ شام، مصر، شمالی افریقہ اور اسپین پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا اور آخرکار وہ فرانس تک پہنچ گئے۔ ۶۳۲ء سے ۶۶۱ء تک پہلے چار خلفا کی حکومت رہی۔ ۶۶۱ء میں امیر معاویہ نے خلافت حاصل کرلی اور بنو امیہ نے شام کے شہر دمشق سے ۷۵۰ء تک حکومت کی۔ بنو امیہ کا تختہ بنو عباس نے الٹ دیا۔ انھوں نے عراق میں بغداد کا شہر آباد کیا اور اس دارالحکومت سے ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک حکومت کرتے رہے۔ عباسیوں کا دور امن اور فارغ البالی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ان کے زمانے میں ایرانیوں کو دربار اور حکومت میں بہت کچھ دخل ہوگیا۔ ۸۶۰ء کے بعد صوبائی حکمران تقریباً خودمختار ہوگئے اور عملاً خلیفہ کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ گیارھویں صدی کے وسط میں سلجوق ترکوں نے ایران پر قبضہ کرلیا۔ وہ ۱۰۵۵ء میں بغداد پر بھی قابض ہوگئے اور ان کی سلطنت ہندوستان سے بحیرۂ روم تک پھیل گئی۔ دسویں صدی میں خلافت دو خاندانوں میں بٹ گئی۔ مصر میں فاطمی خلیفے تھے جن کا سکہ شمالی افریقہ اور کبھی کبھی شام تک چلتا تھا۔ ادھر اسپین میں بنو امیہ کی خلافت تھی جو ۱۰۳۱ء تک قائم رہی۔ اسپین میں مسلمانوں نے تقریباً ۸۰۰ سال تک حکومت کی اور ان کے دور میں یہ ملک یورپ کا سب سے زیادہ مہذب ملک سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۵۸ء میں منگول آئے اور انھوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا نام بھی باقی نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی سلجوق ترکوں کی سرداری بھی ختم ہوگئی۔ پھر عثمانی ترکوں نے ایشیائے کوچک میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ جلد ہی انھوں نے بلقانی ریاستوں پر غلبہ حاصل کرلیا۔ ۱۴۵۳ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کرلیا تو مشرق کی بازنطینی رومی سلطنت کا آخری چراغ بھی گل ہوگیا۔ عثمانی ترکوں نے شام، فلسطین اور مصر کی مملوک سلطنت پر بھی قبضہ کرلیا۔ وہ دو سو سال تک ایران کی صفوی حکومت سے نبرد آزما رہے اور آخرکار عراق پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا۔

یورپ کے عیسائیوں نے ترکوں کے زمانے میں صلیبی جنگوں کا آغاز کیا۔ گو یہ جنگیں مذہب کے نام پر لڑی گئیں لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے عرب سے بے دخل کرکے ہندوستان اور مشرق بعید سے ہونے والی تجارت کا راستہ صاف کرلیا جائے۔ مگر یورپ کے عیسائیوں کو اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی اور فلسطین میں آخرکار صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں انھیں شکست ہوئی۔ پھر اسپین اور سسلی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ آخرکار ایک

منتقل ہو گیا اور عثمانی سلطنت کمزور ہو گئی اور جیسے جیسے زوال پذیر ہوئی تو یورپی طاقتیں ترکی سے مراعات حاصل کرتی گئیں۔ خصوصاً انگریز تاجر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح وہ براہ راست ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک سے تجارت کریں اور مسلمان تاجروں کا درمیانی واسطہ ختم ہو جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے یورپ نے صلیبی جنگیں لڑی تھیں۔ لیکن جہاں صلیبی شاہی فوجیں اور مذہبی رہنما ناکام رہے وہاں انگریز تاجروں نے کامیاب ہو کر دکھایا۔ ۱۵۸۰ء میں انگریزوں نے لیوانت کمپنی بنائی اور ترکی سلطنت سے تجارت کی مراعات حاصل کر لیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی گئی۔ خلیج فارس میں پرتگالیوں نے ہرمز کے جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ شاہ ایران نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے مدد کی درخواست کی اور انگریزوں کو ایک نئی منڈی ہاتھ آگئی۔ انھوں نے ہرمز سے پرتگالیوں کو بے دخل کر دیا اور ولندیزی ہالینڈ والوں اور فرانسیسیوں کو بھی اس علاقے سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اور تجارتی و جنگی حیثیت سے انگریزوں کی نظر میں خلیج فارس بہت اہم تھی۔ جب نپولین مصر پر قابض ہو گیا تو ۱۷۹۸ء میں انگریزوں نے مسقط کے عربوں اور دیگر ساحلی ریاستوں سے معاہدے کر کے انھیں اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ۱۸۳۹ء میں انھوں نے عدن پر قبضہ کر کے وہاں بحری اڈہ قائم کر لیا۔

سلطنت عثمانیہ زوال پذیر تھی۔ ۱۷۹۸ء میں فرانس نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ سولھویں صدی میں آسٹریا دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس کے ایک صدی بعد روس نے بھی پاؤں پھیلانے شروع کر دیے۔ مصر کے پاشا محمد علی نے بغاوت کی اور اس کی فوجیں استنبول تک پہنچ گئیں۔ روس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک معاہدہ کی رو سے سلطنت کے دفاع میں مدد کے بدلے ترکی کے بعض اندرونی معاملات میں دخل دینے اور بوقت ضرورت دردانیال بند کرنے کے حقوق حاصل کر لیے۔ اس معاہدے سے برطانیہ روس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جب دوسری بار محمد علی نے استنبول پر حملہ کیا تو برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں نے دخل اندازی کی اور تنازعہ کا پرامن تصفیہ کرا دیا جس کے نتیجہ میں مصر خود مختار ہو گیا۔ ۱۸۲۷ء میں برطانیہ، فرانس اور روس نے مل کر سلطنت عثمانیہ کے بحریہ کو تباہ کر دیا جس کا براہ راست نتیجہ یہ ہوا کہ یونان سلطنت کے قبضہ سے نکل گیا۔ ۱۹۱۲ء تک بلقان کی تمام عیسائی ریاستیں اور جزیرہ کریٹ سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکل گئے اور طرابلس (لیبیا) پر اٹلی نے قبضہ کر لیا۔

انیسویں صدی میں برطانیہ کی پالیسی یہ تھی کہ سلطنت عثمانیہ کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھا جائے۔ انگریزوں کو ڈر تھا کہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے جو خلا پیدا ہوگا وہ روس پر کرے گا۔ چنانچہ کریمیا کی جنگ میں برطانیہ اور فرانس نے روس کے خلاف سلطنت عثمانیہ کی مدد کی اور برطانیہ نے اس کے معاوضہ میں سائپرس کا جزیرہ حاصل کر لیا۔ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ مصر پر قابض ہو گیا۔ ترکی کا سلطان اب بالکل مجبور اور بے بس تھا۔ انیسویں صدی کے آخر تک کریمیا اور کوہ قاف کے کچھ علاقے روس کے قبضے میں چلے گئے۔ الجزائر اور تیونس پر فرانس قابض ہو گیا۔ بوسنیا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا نے دبا لیا۔ جرمنی ہی ایک ایسا ملک تھا جس نے سلطنت عثمانیہ کے کسی علاقے پر قبضہ نہیں کیا تھا اور قیصر جرمنی ترکی کے سلطان کی دوستی

کا دعویٰ کیا تھا۔ اس دوستی کا اظہار اس وقت ظاہر ہوا جب جرمنی نے ترکی کی وساطت سے برلن سے بغداد تک ریل بچھانے کی سکیم نکالی اور ترکی فوج کو تربیت دینے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس صورتِ حال کا توڑ برطانیہ نے یوں کیا کہ اپنے پرانے دشمن روس سے دوستی کا معاہدہ کر لیا۔

پہلی جنگِ عظیم

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ سلطنتِ عثمانیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے شریف مکہ اور شاہ سعود سے خفیہ معاہدے کر کے عربوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر تیار کر لیا۔ یہ بغاوت ۵ جون ۱۹۱۶ء کو شروع ہوئی۔ جنگ کے دوران عربوں کی یہ بغاوت ترکوں کی شکست کا پیغام تھی۔ ترکوں کو بیک وقت انگریزی فوجوں اور فرانسیسی و روسی (؟) کی قیادت میں لڑنے والے عرب گوریلوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ جنگ کے دوران عربوں کو توقع تھی کہ انگریز اپنے وعدے پورے کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریزوں نے عرب ریاستوں اور فلسطین کی آزادی کا وعدہ کیا تھا لیکن دوسری طرف ۱۹۱۶ء میں برطانیہ، فرانس اور روس نے خفیہ معاہدے کر کے دنیائے عرب کو آپس میں بانٹ لینے کی سکیم بھی بنا لی تھی۔ یہ علاقے بعد میں ترتیبی نظام کے ماتحت تقسیم ہوئے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ انگریزوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو اعلانِ بالفور کے ذریعے یہودیوں سے یہ وعدہ کیا کہ فلسطین میں ان کی قومی ریاست قائم کی جائے گی۔

شام میں ترکوں کی شکست کے بعد انگریزوں نے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۱۹ء کو امن کانفرنس میں طے کیا گیا کہ عرب علاقوں کو ترکی سے علیحدہ کر لیا جائے اور فاتح ملکوں کو ان کا کنٹرول بنا دیا جائے۔ برطانیہ اور فرانس ترتیبی علاقوں کی سرحدوں کے سوال پر متفق نہ ہو سکے۔ چنانچہ دو امریکیوں کو یہ کام سپرد کیا گیا کہ وہ لوگوں کی خواہشات معلوم کریں اور اپنی تحقیقاتی رپورٹ امریکی صدر کی خدمت میں پیش کریں۔ اس رپورٹ کی سفارشات برطانیہ اور فرانس نے قبول نہیں کیں کیونکہ کنگ اور کرین نے اپنی رپورٹ میں شام پر فرانسیسی نگرانی کی مخالفت کی تھی اور بالفور اعلان کو بھی غیر دانشمندانہ قرار دیا تھا۔

ستمبر ۱۹۱۹ء میں برطانیہ اور فرانس میں ایک معاہدہ ہو گیا جس کی رو سے انھوں نے عرب علاقوں کے حصے بخرے کیے۔ ۸ مارچ ۱۹۲۰ء کو شام کے سربرآوردہ لوگوں کی کانگریس نے امیر فیصل کو شام اور فلسطین کا تاج پیش کیا لیکن برطانیہ اور فرانس نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔ ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ء کی سان ریمو کانفرنس نے شام اور لبنان کو فرانس کی نگرانی میں اور فلسطین اور عراق کو برطانوی تولیت میں دے دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ بالفور اعلان کی پالیسی پر عمل کیا جائے۔ لیگ آف نیشنز نے سان ریمو کانفرنس کے فیصلوں کی توثیق کر دی۔

فرانس نے امیر فیصل کو شام سے نکال دیا اور انگریزوں نے انھیں عراق کا بادشاہ بنا دیا۔ بعد میں ان کے بھائی امیر عبداللہ کو شرق اردن کی سرداری بھی دے دی۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ عربی علاقوں کا نظم و نسق تبدیل ہو گیا۔ عرب قومیت جس نے آزادی کی توقع میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا انقلاب مغربی طاقتوں کے ہاتھ میں ...

اقتصادی غلبہ کا شروع ہوگیا

ترکی میں شیخ الاسلام کا قیام ... عثمانی سلطنت ... خلافت کا ادارہ ...

بعد ترکی نے خلیفہ کا لقب ... بہ سبب ... سلطنت کا شیرازہ ...

قوت سے دست بردار ہوگئے ... اس کے بعد ... ایک ... ہو کر رہ

گئی۔ مغربی تسلط کے دوسرے ... جدوجہد آزادی، عربیت اور عرب اتحاد نے

لے لی۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ... جنگ عظیم کے ... عربیت کی تشکیل و تنظیم کا سبب

دوسری جنگ عظیم کے بعد ... عربیت کی سیاسی اور ... جدوجہد کا دور شروع ہوتا ہے جو ہنوز

جاری ہے۔ اس سے قبل کہ ہم اس جدوجہد کا تاریخی جائزہ لیں ... عرب پر مغربی اثرات کا مختصر جائزہ لیا جائے

(باقی آئندہ)

اختر صاحب

محمد طفیل

"اپنے ہیرو کے قریب نہ جاؤ۔ اُس کی عظمت
مداحوں کے قرب کو برداشت نہیں کر سکتی!"

مذہب ـــــــ اور ـــــــ اردو زبان :

انھی دو حقیقتوں میں اختر صاحب گم ہیں۔ آپ انھیں ڈھونڈ نکالیں۔

ویسے تو یہ پروفیسر ہیں اور کام پر پروفیسر، اور میں ادب کا طالب علم ہوں اور غیر معروف طالب علم۔ اس لیے میں ایک ایسی ہستی کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں جسے پہنچنے کے لیے لڑکی کی سیڑھیاں طے کرنی پڑیں ـــــ اور پرکھنے کے لیے! ـــــ اس کے لیے تو اس سے بھی زیادہ ڈگریاں چاہییں۔ شخصیت پرکھ کی ڈگریاں! ـــــ وہ کہتے ہیں کہ کتابیں نہیں پڑھ سکتے تو انسانی چہرے پڑھو۔ میں کتابوں کتابیں پڑھنے کے باوجود انسانی چہرے نہیں پڑھے جاتے

مجھے اختر صاحب سے تحقیق یا کالج میں درس لینے کا موقع نہیں ملا۔ کہ ذہنی طور پر میں انھیں استاد مانتا ہوں۔ اور مانتا ہوں، کہ تمام علم کے معاملے میں! اور کسی اور معاملے میں!

بات طالب علم اور استاد کی چل نکلی ہے۔ اس لیے میں بھی اختر صاحب کو طالب علمی کے زمانے سے پہچاننے کی کوشش کروں گا۔ صرف کوشش! جو ناتمام بھی ہو سکتی ہے اور ناکام بھی!

تصور کیجیے۔ اس وقت ایک محقق کی روح مجھ میں حلول کر گئی ہے اور وہ پورے [illegible] کے ساتھ بول رہی ہے:

ابتدائی تعلیم زیادہ تر [illegible] میں ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں میٹرک [illegible] ڈویژن میں پاس کیا۔ اور اسکالرشپ لی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک سائنس کالج پٹنہ میں رہے۔ اسکالرشپ لی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء [illegible] بی اے [illegible] میں کیا۔ [illegible] ۱۹۳۳ء میں [illegible] فرسٹ کلاس فرسٹ [illegible] ۱۹۳۵ء میں کیا۔

یہاں حاضر شدہ محقق کی روح سے معذرت چاہتے ہیں [illegible]

مگر [illegible] واقعات میں [illegible] اور واقعات کا اضافہ کر دیا جائے [illegible] ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۳ء تک کی [illegible] ۱۹۳۳ء [illegible]

[illegible] کو وقت ہی پہنچ [illegible] [illegible] کہ انہیں [illegible] کا جواب [illegible] [illegible] بہت ہی [illegible] رہی [illegible] ہیں [illegible] اگر کبھی کبھی [illegible] کر [illegible] ہی [illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] دیکھا [illegible] شاگردوں [illegible] ہیں۔ اس کے [illegible] شاگرد [illegible] ہیں [illegible] [illegible] ہیں [illegible] کے درمیان اپنے [illegible] لیتے ہیں۔ احباب یہ [illegible] اور احباب [illegible]:

کھانے میں، [illegible] میں، [illegible]، اور [illegible] اس قسم کی [illegible] ہے۔

کھانے میں —— [illegible]، [illegible]، [illegible]، [illegible]، [illegible]

[illegible] —— [illegible] —— [illegible] شامل، [illegible] شامل —— [illegible] ——

[illegible] ہو۔ [illegible] ایشیائی [illegible] ہو گا!

[illegible] میں نے چند ہی سطروں میں [illegible] کا حال لکھ دیا۔ [illegible] پسند [illegible] اور

[illegible] دیا۔ [illegible] مضمون [illegible]!

[illegible] بے!

[illegible] ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے جب [illegible] ہے [illegible]

[illegible] ہیں۔ [illegible] [illegible] میں [illegible]:

[illegible] میں [illegible] میں [illegible] میں [illegible] میں [illegible]

[illegible] میں [illegible] اور [illegible] میں [illegible] کے مضمون۔

[illegible] —— مضمون [illegible] —— [illegible]!

میں اس مضمون میں [illegible] [illegible] ——

[illegible] —— [illegible] ہے!

[illegible] ہیں [illegible] ہیں [illegible] ہیں۔ [illegible]،

[illegible] —— [illegible] ہو۔

[illegible] میں [illegible] دلچسپی [illegible] ہے [illegible] [illegible]

[illegible] ہیں۔ [illegible] میں [illegible]

[illegible] ہیں۔ [illegible] ہیں [illegible]

[illegible] ہے۔

کالج میں پہنچے تو اور لڑکوں کی طرح یا اچھو تھر ان کا بھی روزمرہ تھا۔ یہ قدرتی ہوتی ہے جب آدمی اپنے آپ میں نہیں ہوتا۔ ہر چونکنے والی بات کی دھن، مرکز نگاہ بننے کی آرزو، ہر شرارت پر طبیعت آمادہ، ہر ذمہ داری سے آزاد، یہ دور بھی یادطلب ہوتا ہے جس میں مسرتوں کا واسطہ ہر بے راہ روی سے وابستہ ہوتا ہے۔

انھوں نے بھی متعدد رہبر کالجیا بننے کی کوشش کی۔ بورڈنگ کے رہتے تھے۔ لڑکیوں کی طرف سے مطمئن تھے کہ کالج کے ہیرو ہیں ہم تو ہیں۔ اس خوش فہمی کے بعد سپرنٹنڈنٹ کے خلاف فارسی اور عربی میں نظمیں لکھیں۔ شاہ جہاں مال کوس اور ہیرو بننے میں انھیں گالیاں دیں۔ اس پے کردار ستے تار دڑاتے تھے ——

ان کے ایک یار کالج میں تھے جو ان کی تصویریں بنایا کرتے تھے اور وہ لڑکوں اور لڑکیوں میں تقسیم کر دی جاتی تھیں جس پر بنانے بھی ہوتے تھے۔ گالیاں بھی پڑتی تھیں۔

نوجوان جو آزاد اور عشق فرماتے تھے وہ سب کے سب ان کے پاس بار بار آ کر داد بیان کیا کرتے تھے۔ ان کی شیر والیا کرتے تھے، [illegible] کیا کرتے تھے جب [illegible] ہوتو بھلا بتائیے یہ خود کیسے [illegible] سے یہ بھی اپنے معاشقوں کی داستان سناتے تھے [illegible] [illegible] [illegible] نگاہ کو جو ان پہ اچاٹ پڑتی ہو اپنے معاشقے [illegible] کر لیتے ہیں۔ [illegible] معاشقوں کی بھی [illegible] [illegible] پہ بیٹھے بھی وہ سادہ تھے۔ وہ سب ایسے تھے جو [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible] [illegible] یا [illegible] کا یہ حاصل کر لیتے تو وہ اختر صاحب ہی شاگرد ہو جاتے۔ اختر صاحب بھی اپنے استاد کے شاگرد ہوتے میں یعنی قابلیت محض شرارت [illegible] کر پاس نہیں آتی

بھی چاہتا ہے کہ ان دنوں کا ایک واقعہ سنا ہی دوں:

جن دنوں یہ [illegible] [illegible] پڑھتے تھے [illegible] [illegible] [illegible] پڑتی ہے [illegible] [illegible] پہلے ہی ہوتے ہیں۔ وہ بھی ہوتی ہیں۔ [illegible] [illegible] [illegible] اور وہ [illegible] ایسے میں کسی ایک فریق کو شرارت کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کچھ زیادہ [illegible] شرارت میں بھی مجھ سے زیادہ [illegible] ہوں گے

پچھے [illegible] [illegible] شرارتیں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میں غزل لکھی، جو فاقہ میں [illegible] [illegible] ہوتی ہے

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] تو یہ غزل خوب چلی۔ لڑکوں کی زبانوں سے [illegible] ہوتی تو وہ [illegible] کے پیاروں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] —— [illegible] ——

پہلے [illegible] [illegible] پڑگئی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بھی [illegible] [illegible] [illegible]

ان کی شادی کی سوچی۔ یہ اتفاق ہے کہ [illegible] سے باز نکل گئے۔ [illegible] میں ان کی شادی کر دی گئی تاکہ برخوردار [illegible]
[illegible] میں اضافہ کرے۔

باتوں باتوں میں [illegible] صاحب نے بتایا کہ انھیں ایک نہایت متقی بیوی کی تلاش تھی۔ اس کے ساتھ رومانیت کے خواب بھی
دیکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مذہب میں بھی [illegible] کی گنجائش ہے۔

[illegible] زندگی میں ہمیشہ [illegible] ہے۔ وہ خود بھی مذہب کی [illegible] کا شکوہ ہے کہ انھیں بیوی مذہبی
[illegible] کے موقع [illegible] تھے۔

باتوں ہی باتوں میں [illegible] صاحب سے پوچھا ——— کیا آپ [illegible] قسم کا بیج بول سکتے
ہیں؟

[illegible]

[illegible] کی گنجائش ہوتی مگر بات [illegible] سے نکل گئی ——— [illegible]
[illegible] یہاں تک کہا گیا کہ [illegible]

[illegible] ——— [illegible] سے محبت ہے۔ [illegible] میاں سے
[illegible] اولاد [illegible] ہوتا۔ دونوں
میں [illegible] ہے۔

[illegible] نے صاف [illegible] کیے [illegible] ——— [illegible]
قائل ہوگیا۔

[illegible] تھا۔ [illegible] ہے۔ انھیں [illegible]
[illegible] ——— [illegible]

[illegible] گیارہ سال کی عمر میں [illegible] صاحب [illegible]
[illegible] کبھی [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] ——— [illegible] رہے اور محبت [illegible]
[illegible]

[illegible] صاحب [illegible] کے قائل نہیں۔ اپنی [illegible]

[illegible] اس کے گلے میں [illegible] ہوگیا۔

یہ خوبیوں سے بھی آگاہ ہیں۔

دیکھیے ایک دور وہ ہوتا ہے جب انسان اپنے محبوب سے معشوقوں کا حال بیان کرتا ہے اور ایک یہ وقت آتا ہے کہ سچی باتوں پر بھی زبان نہیں کھلتی۔

ویسے اتنا ضرور ہے کہ یہ بات بات پر تڑپ سکتے ہیں۔ بات بات پر پھڑک سکتے ہیں ۔ ذرا تڑپنے اور پھڑکنے کی بات کی وضاحت کر دوں تاکہ معاملہ قابو میں رہے

تڑپنے والی بات تو یہ ہے کہ سارے جہان کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ دنیا میں کہیں کوئی ظلم ہوتا ہو، درد کی ٹیس ان کے جگر میں اٹھے گی۔ پھڑکنے والی بات یہ ہے کہ بس ذرا جواہر لعل کی طرح اچکن میں پھول ٹانکنے کے عادی ہیں۔ اس کے علاوہ ویسا زبردست اچھا ہے۔

لیجیے! بچپن کے دن اور جوانی کی راتوں کے قصے ختم ہوئے!

ساری دنیا اختر اورینوی کے رشتے سے شکیلہ اختر کو جانتی ہے۔ مگر میں نے اختر صاحب کو شکیلہ کے رشتے سے جانا۔

ادبی حلقوں میں اختر صاحب کی دھاک برسوں سے ہے۔ میں بھی ان کی ادبیت سے واقف تھا۔ خط و کتابت بھی تھی۔ مگر جب ۱۹۶۰ء میں شکیلہ بہن ملیں تو اختر صاحب سے بات ہوئی، ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقاتیں اور تعارفی مضمون سے باتوں ہی باتوں میں اختر صاحب کی تصویر آنکھوں کو دکھا دی

۱۹۶۶ء میں میرا دلی جانا ہوا تو شکیلہ کے گھر پہنچ ہی جانا پڑا۔ ابھی میں پہنچنے سے پہلے ایک دراز شخص ادھر آ نکلے وہ کے پہنچنے پر ایک صاحب ملے۔

جالبی صاحب السلام علیکم۔

جی!

میں شکیلہ کی بہن کا شوہر ہوں۔

اچھا اچھا!!

مجھے شکیلہ نے کہا تھا کہ جالبی آ رہے ہیں۔ ... جب ہم ... پہچان ... لیا

آپ نے کیسے پہچان لیا میں ہی جالبی ہوں۔

واہ جالبی کو پہچاننا بھی کوئی مشکل بات ہوتی ہے۔

پہلے صاحب ابھی پہنچے ہی تھے کہ شکیلہ کے ... اور باہر نکلے ... اختر صاحب کو بھی دیکھا۔

حمید نے کہا: "آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کے استقبال کے لیے اختر صاحب بھی آئے ہیں۔ ورنہ تو کسی کے لیے نہیں آتے۔" پہلے ہی مرحلے پر اختر صاحب کی عنایت اور قربت کا احساس دلا دیا۔ [illegible] پاس [illegible] بیٹے [illegible] خوابیدہ [illegible] تھے۔ [illegible] مرحوم ہو چکے تھے۔ [illegible] حسین [illegible] نصیب ہے [illegible] کی بات دوسری ہے [illegible] زبان [illegible]

یہ ساری [illegible] تھے [illegible] تبصرہ کر رہے تھے۔ مگر میں بھی ایسا [illegible] انسان [illegible] کسی سے کچھ طلب نہیں ہوتا۔ [illegible] دماغ ہی کا [illegible] ہے۔ [illegible]

اب میرے سامنے اختر صاحب ہیں اور میں ہوں ـــــ اختر صاحب کا گھر [illegible] کے ایک [illegible] میں ہے۔ گھر سے متعلق [illegible] صاحب [illegible] دنیا بنا لیا جائے۔

یہ [illegible] لوگ ہوتے ہیں۔ [illegible] ہوتے ہیں [illegible] نہیں ہوتی۔ [illegible] جیسے گھر کو کوئی [illegible] بہت [illegible] بیوی کو [illegible] سیٹ کر دیا۔

اختر صاحب بیوی کو [illegible] سیٹ کہتے ہیں [illegible] کیا جانوں [illegible] افسانہ نگار [illegible] دونوں [illegible] پر کیا اثرات ہوں گے۔ [illegible] جانے۔ [illegible] کہ دونوں [illegible] سکتے ہوں۔

[illegible] ادب پر سیاست پر [illegible] مذہب پر [illegible] موضوع [illegible] روانی کی طرح [illegible] لگے [illegible] ـــــ [illegible] جنگ اور [illegible] کی طرف جاتا ہے۔

اختر صاحب کی [illegible] ہاتھ [illegible] پتا ہے [illegible] ایک خوبی [illegible] ـــــ [illegible] پہنچا دو [illegible] کی تشہیر [illegible]

[illegible] اختر صاحب [illegible] دونوں [illegible] اپنے [illegible] اپنے شاگرد [illegible] تھی۔

اختر صاحب [illegible] کرتے [illegible] مگر مجھے معلوم ہوا کہ اختر صاحب میری [illegible] ساتھ [illegible] انھوں نے تو [illegible] تھا۔ [illegible] میں [illegible] چھوڑنے [illegible] ـــــ یہ ہیں وہ!

ستمبر پچیس کرا مسم وہ چار بجے شام کا۔" چلو چلیں:"

"کہاں ؟"

"انجمن تماشائے ادب نے آپکے اعزاز میں دعوت کی ہے۔"

"نہیں جناب میں نہیں جاتا۔"

"صرف چلنے کی دعوت ہے۔ وہاں کوئی مقالہ وغیرہ نہیں پڑھنا ہوگا۔ بعد میں اگر کوئی سوال پوچھے تو جواب دے دینا۔"

"اس دعوت کو گول کیجیے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے اور شکیلہ نے بھی وعدہ کیا ہوا ہے۔"

جی چاہا کہ ابھی اپنا سوٹ کیس اٹھاؤں اور واپس چل دوں۔ اس لیے کہ میں ہنگاموں سے گھبراتا ہوں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو ہنگاموں میں زندہ رہتے ہیں۔

ناچار ساتھ ہو لیا مگر اس طرح جیسے کوئی پکڑے ہوئے لیے جا رہا ہو۔ میں نے دو چار سطریں لکھنے کی کوشش کی کہ اگر سر پہ پڑ جائے تو کچھ کہہ بھی سکوں۔

گھر سے چلا تو سب سے پہلے مجھے رشید احمد صدیقی کا وہ فقرہ یاد آیا جو انھوں نے ایک جلسے میں کہا تھا۔۔۔ "گھر سے جو کچھ یاد کرکے آیا تھا۔ وہ یہاں آکر بھول گیا ہوں۔"

اس کے بعد جو کچھ کہا۔ وہ دیگر یادداشتوں کے ساتھ محفوظ رہا۔ اُسے نقل کیے دیتا ہوں۔

وہ تحریر:

قبلہ اختر اور نیازی صاحب میرے بارے میں آپ کا خیال ہوگا کہ نہایت معقول آدمی ہیں! انھوں نے میرے ساتھ کسی قسم کی معقولیت کا ثبوت نہیں دیا۔ انھوں نے ابھی ابھی مجھے یہ خبر سنائی کہ ادارہ تماشائے ادب کے جلسے میں جانا ہے۔ میں نے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ خدا کے لیے مجھے نہ لے جائیں۔ اس لیے کہ میں جو شخصیوں کی محبت پہ جیتا ہوں۔ اُن سے میری زندگی کا فقدان اتنی ہی ہیبت میں گزرا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف کر دیا جائے گا۔ مگر یہ نہیں مانے اور یوں میرے جذبات کو ٹھیس لگنے کے باوجود آنا پڑا۔

بات یہ ہے کہ کچھ پڑھنا اور چیز ہے اور زبانی جواب دینا کے ذریعے آدمیوں کے دلوں کو مسخر کرنا اور چیز۔ میں نے پڑھا لکھا نہیں، میری عقل و مرکز شامت تو ہے۔ [illegible] کہ ادب کا سنگ میل ہو۔ [illegible]

اپنا محسن ہے [illegible]

میں نے اختر صاحب سے پوچھا کہ بھائی میں نے یہ تو تا دیجیے کہ انجمن تماشائے ادب [illegible] کیا ہو گا تو انھوں نے بتایا تھا۔ وہ لوگ آپ سے سوال پوچھیں گے جواب دے دینا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ [illegible] جواب [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] بینا پسند نہیں کرتا۔

دیکھئے، اختر صاحب نے یہی بتایا تھا کہ تحسین دان پاکستان میں اردو کے مستقبل پر بات چیت کرنا ہوگی۔ بہرحال یہ سوال معصوم سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کا جواب ہونا آسان نہیں۔ اس لیے کہ ہم پاکستانیوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ اردو کو کیسے بھی سوچنا چاہیے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے اردو کی پوزیشن کچھ ایسی ہو گئی ہو کہ جیسے کوئی ہندو لڑکی اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ گئی ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کو نہ ہندوستان والے سمجھتے ہیں اپنا نہ پاکستان والے۔ یوں تو ہماری سرکاری زبان اردو ہی ہے۔ مگر ہمیں جب تک انگریزی [illegible] نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مغربی پاکستان میں بیٹھا ہے کہ اردو دیکھ آؤں تو وہ [illegible] ہو کر رہ جاتا ہے [illegible] گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی سی۔ مگر ابھی پاکستان میں ایسے اشخاص ہیں جو اسے اپنی ہی زبان سمجھتے ہیں۔

مجھے زیادہ وقت نہیں ملا کہ میں اس موضوع پر سوچنے کے لیے تیار ہوتا [illegible] اختر صاحب کا شکریہ ادا [illegible] آپ کی [illegible] ہوں۔ [illegible]

[illegible] اختر صاحب پر مضمون لکھ دیا۔ مگر ان کی چند ایک شعر تو یاد نہیں تو سوچا ——— یہی وقت سے [illegible]

[illegible] جو شخص اردو [illegible] [illegible]

[illegible] ——— [illegible]

[illegible] اختر صاحب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

انھوں نے ابتدائی تعلیم قادیان ہی میں پائی۔ اُردو فارسی، انگریزی اور قرآن حکیم اپنے والد سید وزارت حسین صاحب سے پڑھا۔ قرآن شریف با ترجمہ اور تفسیر اور دُوسری مذہبی کتابیں اپنے چچا سید ارادت حسین صاحب اور حکیم خلیل احمد صاحب سے پڑھیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور اُستادوں کے نام بھی بتلائے تھے۔ چند ایک نام لکھتا ہوں۔ مثلاً ژلی سادھو خاں، چارلس ریڈ، چودھری حمید اللہ خاں، پروفیسر بے ایل۔ بی، فضل الرحمٰن اور ڈاکٹر گیان چند[1] ـــــ بقول ان کے یہ سب ایسے مشفق اُستاد تھے کہ جنھوں نے انھیں بیٹی سے سوا جانا ـــــ ویسے اتنا اندازہ تو میں نے بھی لگایا کہ انھوں نے اپنے اُستادوں کا ذکر خصوصاً عزت اور عقیدت کے ساتھ کیا تھا۔

میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ کن کن کتابوں سے متاثر ہوئے۔ کہنے لگے۔ قرآن حکیم، احمدیت اور حقیقی اسلام (جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد)، اسلام کا اقتصادی نظام اور نظام نو (جناب مرزا بشیر الدین محمود احمد)، اینا کرینا (ٹالسٹائی)، اسلام کا احیاء (برگ)، وومن اینڈ (لارنس)، فار ہوم دی بیل ٹولز (ہیمنگوے)، مومنٹ ان پیکنگ (لن یوٹانگ)، بانگ درا، بال جبریل (اقبال)، نگارستان، جمالستان (نیاز فتح پوری)، الفاروق (شبلی)، اقبال کی ساری فارسی کتابیں، مثنوی مولانا روم، جوش کی ساری نظمیں، اختر شیرانی کی رومانی نظمیں۔

دیکھا آپ نے متاثر ہونے والی کتابوں میں پہلا نام تو انھوں نے قرآن حکیم کا لیا اور آخری ـــــ جوش اور اختر شیرانی کی رومانی نظموں کا ـــــ اور یہ اختر صاحب انھی دو جذبوں کے اندر بند ہیں اور ان جذبوں میں جو کشمکش ہے وہ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ ایک طرف خدا سے رشتہ ہے، دُوسری طرف اس کے خاص بندوں سے۔ انھی دو انتہائی جذبوں کی کشمکش اور کھٹک کے سلسلے پر اپنی زندگی کو سمیٹے بیٹھے ہیں۔

انھوں سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کن لوگوں سے متاثر ہوئے تو یہ فوراً جواب دیتے ہیں، مردوں میں حضرت محمد صلعم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، مرزا غلام احمد، پروفیسر کرشنا، سعدی، اقبال، شیکسپیئر، ابو محمد بن قاسم، مہاراجہ، جناب [illegible]، شاہ ولی اللہ، پنڈت جواہر لال نہرو، محمد علی جناح۔

خواتین میں ـــــ مرزا بشیر الدین محمود احمد، امام جماعت احمدیہ کی نسبتی بہن، پروفیسر [illegible]، مشفق محترمہ [illegible]، والدہ صاحبہ، احباب فقید اختر اور ازواج۔

اور تو ساری باتیں ٹھیک ہوئیں۔ مگر یہ بھی یہ تو اپنی بیوی سے بھی متاثر نکلے۔ یہ عجب انوکھی بات ہے جو ذرا کم ہی ملتی ہے۔ خواتین تو اسے زوجیت کے حق سمجھتی ہیں کہ ہم اپنے شوہر سے متاثر ہوں ... مگر ان کی زن پرستی کا عالم

---

۱ یہ گیان چند وہ نہیں جنھوں نے اُردو کی نثری داستانیں لکھ کر شہرت حاصل کی۔
۲ مرحوم فقید اختر کی جرمن بیوی ہے۔ مگر اختر صاحب اسے ایک شخصیت ہی سمجھتے ہیں۔
۳ [illegible]۔

بلکہ [illegible] صاحب!

میرا خیال ہے جو کر لیتے ہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں [illegible] پوچھا جائے کہ آپ کن کن واقعات سے متاثر ہوئے اس سوال کے جواب میں ہم ان سے کچھ ذرا پوچھیں گے۔ مت پوچھ لیں گے۔ اور آج جواب وہ واقعات بتائیں گے۔ جس سے آپ متاثر ہوئے؛

شاعر یعنی کی حیثیت سے [illegible] ان کا یہ ہے۔ میں متاثر ہوا ہوں۔ جنگ بدر، جنگ حنین، جنگ قادسیہ، جنگ یرموک، واقعہ کربلا، فتح سندھ، جنگ پانی پت، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، تقسیم ہند ۱۹۴۷ء، انقلاب [illegible] اپنی والدہ کی موت (جب اختر [illegible] سال کے تھے)، چچا کی موت، اپنے بھتیجے [illegible] کی وفات ——— اور اپنی شادی سے!

پیچھے صاحب ہم لوگ ان مشکل پہیلیوں سے حل کرنے [illegible] ریاضی کے سوال تھے۔ [illegible] ہم چاہتے ہیں کہ یہاں [illegible] آپ جانتے ہیں [illegible]۔

یہاں ایک دلچسپ قصہ سنیے تاکہ ذہن کو ذرا سی آسودگی ملے۔ عام طور پر ان کی زندگی بڑی دلچسپ گزری۔ [illegible] حالات و دنیا میں [illegible] تو غالب سے [illegible] ان میں [illegible] تیزی کی [illegible] روزانہ [illegible] قصہ یہ ہے [illegible] سب [illegible] ـــــ

بزرگوں اور [illegible] سے [illegible] ایک [illegible] جنات کا سایہ ہے۔ چنانچہ اختر صاحب نے ان [illegible] بلانے کے لیے [illegible] تیار کی۔ رات [illegible] چھت پہ لیٹے [illegible] تشریف [illegible] اور غائب ہو گئے۔ [illegible] سب [illegible] اختر صاحب متاثر ہوئے۔ مگر [illegible] کا [illegible] کے [illegible] اور [illegible] سے [illegible] تھا۔

[illegible] آئے تھے۔ [illegible] سو گیا۔ [illegible] کھڑے ہوتے ہیں۔ [illegible] کی ہیں۔ [illegible] نے اپنی [illegible] سے [illegible] اٹھایا۔ اور ایک [illegible] جنات کو عربی اور فارسی کے [illegible] [illegible] اور [illegible] کو اہل اسلام [illegible]۔

پھر دونوں کے بعد [illegible] کبھی کبھی [illegible]۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ [illegible] تھا۔ [illegible] ہوئے اور [illegible] کے [illegible] سامنے [illegible] سے [illegible]۔ جنوں کا سایہ تھا۔ [illegible] نے [illegible] کیا۔

[illegible] فضل اللہ تعالیٰ کی [illegible] خاص رحمت ہے۔ [illegible] نے اس سے فیض اٹھایا ہوگا۔ مگر یہ [illegible] سے [illegible] نہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز اور ہے۔ [illegible] کے [illegible] بہت خوش ہیں۔ [illegible] چاہتے تھے [illegible] امریکہ جائے اور تبلیغ اسلام کرتے۔ [illegible] کی [illegible] ہوئی۔ [illegible] کی وصال

یہ اپنے حلقے میں ان سے مشورہ لیتے ہیں کہ نہیں نہیں۔ یہ منصب بھی ان کی آرزوؤں کے مطابق ہے۔

ان تمام مشاغل کے علاوہ ان کی ایک عادت اور بھی ہے وہ یہ کہ چپ چاپ بستر پر بیٹھے رہیں اور کوئی بھی انھیں پریشان نہ کرے ——— خواہ یہ بیماری ہو یا لوگوں کی آمد و رفت ہو۔ جو اپنے من کی بات دوسروں سے نہ کہہ سکتے ہوں اور یہیں وہ تنہائی میں خیالوں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں اور خود کلامی میں لطف پاتے ہیں۔

جہاں تک میں نے انھیں پڑھنے کی کوشش کی پتہ یہی چلا کہ یہ کسی طرح بھی مطمئن نہ ہوتے۔ اب جب کہ یہ اپنی یونیورسٹی میں اپنے شعبے کے سربراہ ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر بنتا اور آزادانہ پریکٹس کرتا تو اچھا ہوتا۔ اگر یہ واقعی ڈاکٹر ہوتے تو یہ کہتے۔ میں کہاں آ پھنسا، یہ آپریشن، یہ گندی بیماریوں کی تشخیص اپنے بس کا روگ نہیں۔

ایک وقت میں یہ کہتے تھے کہ ان کی صحت پڑھنے سے اچھی نہیں ہے۔ یہ بڑی ایثار پسند اور وفا شعار ہیں۔ لیکن مزاج میں تیزی کا اور ایک خاص قسم کی انفرادیت ہے جو ان کا حق ہے۔ یہ ذہن صاف ان کی شادی اگر ٹھیک سے نہ ہوئی ہوتی تو اب تک یہ سنیاس لے چکے ہوتے۔

یہ اپنے معمولات میں بڑے باضابطہ ہیں۔ زندگی مقررہ سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بیماریوں نے اور بھی زیادہ با اصول بنا دیا۔ پروگرام میں ذرا بھی تبدیلی ہو جانے تو چڑچڑا جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بے ضابطہ بھی ہو جاتے ہیں، مگر صرف احباب کے ساتھ۔ ورنہ شوق، مطالعہ وغیرہ ہی کا ہے۔

طبیعت میں حد درجہ سنجیدگی اور بانکپن کے ساتھ، خوش مزاجی اور ظرافت کی بھی چاشنی ہے۔ ہر وقت ابوالکلام بنے نہیں بیٹھے ——— 'حلقہ یاراں' کی آبرو بھی ہیں!

گو سطور سابقہ میں ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑی ہوگی۔ محمد حسن کے مذہبی خیالات اور رجحانات پر ابھی کچھ مزید کہنے کی ضرورت ہے۔

اگر یہ مذہب کے بارے میں ان کے خیالات جاننا چاہیں گے تو اس سلسلے میں آپ کو بڑی سچائی کے ساتھ بتائیں گے۔ تمام مذاہب میں اسلام کو سب سے زیادہ ترقی یافتہ مذہب سمجھتا ہوں۔ زندگی کو اسلام اور آفاقی تخیل انسانیت نے اسے مذہب کو مزید سمجھتا ہوں۔ اخلاق کا بہترین معیار پیدا کرنا بغیر مذہب کے ناممکن ہے۔ سماجی سطح پر بغیر مذہب کے بھی قیام ممکن ہے لیکن رفعت و لطافت اخلاق جس کو روحانیت کہا جاتا ہے، صرف خدا تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق سے حاصل ہو سکتی ہے۔

غیر مذہب کے لوگوں سے بھی رواداری اور تعصب نہیں برتتے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اسلام تعصب سے منع کرتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین اور لا اکراہ فی الضمیر ان کا عقیدہ ہے۔ رشتہ داروں اور احباب میں شیعہ، سنی، وہابی، حنفی، دہریہ، اشتراکی، اشتمالی، ہندو، عیسائی سبھی ہیں اور سبھی سے اچھے تعلقات ہیں۔ عقیدتاً بھی دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مطلق جہنمی نہیں کہتے۔ نجات کا انحصار صرف خدا اور بندے کا معاملہ سمجھتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے یہ اسلامی جمہوریت اور خلافت کے قائل ہیں۔ اسلامی اقتصادی نظام جس میں اشتراکیت کی خوبیاں اور

حصولِ دولت کی سہولتیں موجود ہوں۔ اسلامی نظام میں ایسی اخلاقی قدریں رہ سکتی ہیں۔ غریب لوگ ... کو ... سمجھتے ہیں۔ قومیت کے بارے میں اقبال کا یہ شعر لکھا سمجھتے ہیں۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

عورت وقت کی حاجت بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر عقیدہ اور حقیقت نہیں کے ساتھ :

میں آپ کے سوال کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے اتنے بڑے قسم کے آدمی کے بارے میں میری رائے دریافت کی۔ ... کو برداشت بھی میں یہ جانتا ہوں کہ آپ نقوش سے صرف ... ادبی نظریات اور پسند کے بارے میں بات چیت ہو کی ... جانتا شاید ضروری نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ ... اس سوال کی روشنی میں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ اپنے آپ کو ... خاص اہمیت دیتے ہیں۔ ... نہیں ہے کا خیال ہے کہ تنقید میں ... تقاضا یہ ہے کہ ... تخلیقات کا بھی کم قیمتہ کیا جائے اور یہ کہ ... اپنی حقیقت کو ... سے بھی نہیں کر سکتا۔

۵۔ پہلے پرسوں ... اپنے پسندیدہ ادیبوں میں ہیں ... دیکھیے ٹیگور، ... جبران، ... منٹو، نظیر اکبرآبادی، انیس، غالب، اقبال، شاد عظیم آبادی، راسخ عظیم آبادی، مرزا رسوا، پریم چند، ... شبلی، حالی، ... منٹو اور اختر شیرانی ——— اور ——— جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، کرشن ... ماجد ...، قرۃ العین حیدر، عبادت حسین، ... صدیقی اور احمد ندیم قاسمی ہیں۔

جو سوال یادداشتیں وہ ہیں جو میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا۔ انہیں ختم کرنے کے بعد ملاقات کی فہرست اس کے بعد جو کچھ کہا جاتا وہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ مگر میں کیا کروں۔ اختر اورینوی کی خبر میری ... ملاقات کے لیے رک نہیں سکتا۔ اس خبر میں میری شرکت ضروری تھی۔ ... کی خریداری کے سلسلے میں ... کوشش آئی تھی۔

یہ مضمون پٹنہ کے ایک ماہنامے میں چھپا تھا۔ ان کی اجازت سے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

۵ ۵ ۵

مہندر ناتھ

کھڑکی میں بیٹھے ہوئے زملا نے گزرے ہوئے برسوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ پندرہ سال پہلے اُس کی عمر صرف پندرہ برس کی تھی اور وہ لاہوری دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اُس کا باپ بچپن میں مر چکا تھا۔ صرف ماں زندہ تھی۔ ماں نے اُسے کیسے پالا پوسا تھا، اُس کے متعلق اُسے کوئی خاص علم نہ تھا اور زملا نے یہ جاننے کی کوئی خاص کوشش بھی نہ کی۔ پانچویں جماعت تک ماں نے زملا کو پڑھایا تھا۔ اُس کے بعد وہ ناچ سیکھنے لگی تھی۔ چند برسوں میں وہ نرت سے اچھی خاصی واقف ہو گئی۔ جب کبھی وہ کوئی دھن کا نغمہ سنتی تو خود بخود اُس کے پاؤں ناچ کی دھن پر تھرکنے لگتے۔ نہ جانے اُسے ناچ سے اتنا عشق کیوں ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہ ناچتا تھا۔ نہ باپ کو اس قسم کے آرٹ سے شغف تھا اور نہ ہی ماں کو۔ اور دور دور تک کے رشتے دار جب ملنے آتے انہیں تو اس پیشے یا آرٹ سے سخت نفرت تھی۔ صرف اُس کی ماں ہی تھی جس نے اُسے ناچنے کے فن میں دلچسپی لینے کی ترغیب دی۔ یوں زملا کا قد خاصہ لمبا تھا۔ سرو قد کہنے میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

لمبی لمبی مخروطی انگلیاں مضبوط اور توانا بانہیں۔ چہرے کا رنگ گندمی نہ تھا بلکہ گندمی رنگ سے زیادہ صاف اور شفاف۔ اٹھا ہوا ماتھا۔ بال گہرے سیاہ، آنکھیں موٹی موٹی، چہرہ بھرا بھرا اور پاؤں بے حد حسین تھے۔ اگر کوئی آدمی پہلے زملا کے پاؤں دیکھ لیتا تو شاید اُس کے چہرے کی طرف نگاہ نہ ڈالتا۔ یوں تو کچھ خاص ڈیل ڈول کی تھی۔ جسم کی ہڈیاں ابھری نہیں۔ وہ نازک اندام سی لڑکی نہ تھی مگر چھوئی موئی کی طرح بل کھا کر سمٹ جاتی۔ جب سامنے کھڑی ہو جاتی تو ایک باوقار لڑکی لگتی۔ کبھی کبھار تو یوں احساس ہوتا کہ کسی جاٹ کی لڑکی ہے جس کے باپ نے کھیتوں میں ہل چلایا ہوگا۔ یہی تو جسم سے ایک توانائی اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا جو بہت کم لڑکیوں کے جسموں سے جھلکتا ہے۔

زملا کا مستقبل اتنا روشن نہ تھا۔ ماں کی عمر اُس وقت پینتالیس برس سے اوپر کی تھی اور اُس کا سہارا [illegible] تھی۔ مگر زملا کی پرورش متوسط طبقے میں نہ ہوتی تو زملا کب کی [illegible] کی نذر ہو جاتی۔ زملا کی ماں نے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ اسی واسطے اس نے دکھ کھایا تھا اور زمانے کے [illegible] اُس کی رگوں میں موجود تھا اور اُس نے اپنی جوانی بیوگی کے ٹھنڈے پانی میں ڈبو ڈالی تھی [illegible] درختوں کے تنے بیٹھ کر شیریں آم چوستے تھے۔ زملا کی ماں آسانی سے اُس راہ کی طرف نہ جا سکی اور نہ ہی زملا کو اس راہ پر چلا سکی۔

جب لڑکی جوان ہو، جوان ہو، ماں بوڑھی ہو اور گھر کے اندر گھنگرو چھلکتے ہوں تو خود بخود راہ کھل جاتی [illegible]

پہلے زہرہ نوں کی [illegible] ضرورت نہیں تھی۔ زہرہ کو اندازہ تھا کہ کس کس کر گرد بہت سے چند رہ کر [illegible] اور
بھی اس کے [illegible] رکھتے۔ یار مگر اس نے ایک چال چلا دیا تو سے جس کا مجھ کو چلنے
کہ یہ اس گھر [illegible] کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو بے حد چالاک اور سمجھدار ہو۔ جو بات کہی گئے
معلوم ہو کر محض دوستی اور ہمدردی کا خوف اندازہ کر اس نے ادھر رُخ کیا ہے۔ اس کے ذہن پر رشتے کا نظریہ کر گیا
بڑھنا چاہیے۔ اس کا انداز ایسا ہے کہ پاس کی حرکتوں سے اس کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکے۔ وہ بھول جائے اس کو کر
دکھانے کا شوق دیکھے تو بات بن سکتی ہے۔

سیٹھ جواد علی اسی محلے میں رہتا تھا جس نے دیکھتوں کے بزنس میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ ابھی تیس پینتیس برس کی عمر تھی۔
صرف ایک شادی کی تھی۔ تین اور شادیاں کرنے کا ارادہ تھا۔ بے حد بد شکل رنگت کالی مگر دل کا بڑا شوقین لگتا تھا۔ خوبصورت
کو دیکھتا تو بے اختیار ریشہ خطمی ہو جاتا۔ سیٹھ ادھیڑپن کے پار [illegible] نہیں ہوتا۔ مکان اونچا لگنے کے علاوہ
نیا مکان تیار کرا کے بھی اونچا لا دیا۔ مگر تمام [illegible] شرم [illegible] پیسے کھونے سے زیادہ تھی۔ بخت اگر ذرا بھی خوش شکل
ہوتا تو ڈاکٹر ماجد کی طرح ایک [illegible] ادا کر دیتا۔

اس لیے جب کبھی زہرہ اس کے قریب سے گزرتی تو اس کا دل مچلنے لگتا۔ سارے جسم میں ایک عجب جھرجھری سی آ جاتی۔ وہ
اتنا قادر پیشہ اس لیے [illegible] تھی اور اس کے پہنچ سے باہر تھی۔ مگر انسان اس کم زور دل سے کیا کرے۔ زہرہ کو دیکھ کر اس
کی [illegible] ہے۔ وہ دل کھینچ لیتا ہے۔ بس سے کچھ وہاں سے آ رہی ہے۔ اپنے بد صورت چہرے
آئینہ میں سکتے [illegible] اور زہرہ کی خوبصورتی کا اندازہ کرتے ہوئے یہی مناسب تھا کہ پہلے اس سے راہ و رسم بڑھائی جائے
پہلے دن وہ مٹھائی کا ایک خوبصورت ڈبہ لے کر زہرہ کے گھر وارد ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے اپنا تعارف کرایا اور
بولا "[illegible] میں آپ کے محلے میں رہتا ہوں۔ نام جواد ہے۔ اس لیے سوچا آپ سے ملنے چلوں۔" زہرہ کو اس نے
[illegible] کر دیا۔ [illegible] بد صورت آدمی تھا۔ لیکن ڈبہ خوبصورت لایا تھا۔ اس کی باتوں میں چاشنی اور لطافت تھی۔ بات بات میں
[illegible] کرتا رہا۔ جیسے زہرہ سے اسے دلچسپی نہیں [illegible] شاعری [illegible] زیادہ نمایاں تھا اور خوشامد سے تو خدا بھی
راضی ہو جاتا ہے۔ زہرہ کو اس کی [illegible] ایک صفت لگی جو جواد علی کا نام سن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جواد علی ایک امیر آدمی
ہے۔ اس لیے زہرہ کو اس نے خوشی سے مٹھائی کا ڈبہ لے لیا۔ جواد علی نے ادھر ادھر دیکھا ضرور۔ مگر اسے زہرہ نظر نہ
آئی۔ بس دل ہی دل میں اس کا فراد حسینہ کے حسن کی داد دے کر اور [illegible] کر باہر چل دیا۔

زہرہ گھر پہنچی تو ماں نے جواد علی کا ذکر کیا اور ساتھ ہی مٹھائی کا ڈبہ دکھایا۔

زہرہ نے جواد علی کا نام سن رکھا تھا مگر اس کی شکل و صورت نہ دیکھی تھی۔

"ماں کیسی صورت ہے اس کی؟"

"بس بیٹی، کچھ پوچھو نہیں۔ دیکھو تو بس ہنستے رہو۔ کالا کلوٹا۔ مگر باتیں شہد کی طرح میٹھی اور رسیلی کرتا ہے۔"

"ماں وہ کیسے انسان کے پاس خوشی کیسے آتی ہے؟"

"شاید خوشی بھی رنگ روپ نہیں دیکھتی۔ اُنہی کے پاس زیادہ آتی ہے جن کے پاس پہلے ہی خوشی ہوتی ہے۔"

"کیا کہنے آیا تھا؟"

"بس یہ ڈبہ دیا اور چلا گیا ——— ماں یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔

ادھر جواد علی نے ایک نظر میں بھانپ لیا کہ پتھر چلایا جا سکتا ہے۔ ماں اتنی تنگ نظر نہ تھی کہ وہ اُس حد تک واقفیت میں سما نہ سکتا۔ نرملا کی ماں کو اس کا آنا برا لگتا تو وہ مٹھائی کا ڈبہ واپس کرتی۔ اگر ماں نے اُس کے آنے جانے پر کوئی روک تھام نہ لگائی تو بیٹی کو رام کرنا مشکل نہیں۔ جواد علی نے نرملا کے گھر آنا جانا شروع کیا۔ اکثر ماں سے ملاقات ہوتی۔ جب کبھی جواد علی آتا کوئی نہ کوئی چیز ساتھ لاتا۔

بڑے ادب اور سلیقے سے بیٹھتا۔ باتیں ماں سے کرتا اور نگاہیں نرملا کو ڈھونڈتیں۔

"بس ماں جی۔ تازہ خربوزوں کا ٹوکرا کیا آیا کہ میں نے سوچا کہ پہلے ماں جی کے پاس چلوں۔ اُمید ہے اس غریب کا تحفہ قبول کریں گی۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو بیٹا۔ ارے تم اس علاقے کی ناک ہو۔"

"نہیں ماں جی میں آپ کی جوتیوں کی خاک ہوں۔ بس آپ کے لئے چلا آتا ہوں۔ آپ کی نظرِ عنایت چاہیے ماں جی۔ دولت نے کس کا ساتھ دیا جو میرا ساتھ دے گی۔ بس مجھے تو صرف اللہ پر بھروسہ ہے۔ خدا عزت سے رزق دیتا رہے یہی میری دلی تمنا ہے۔ اچھا ماں جی۔ مجھے اجازت دیجیے گا۔"

"بیٹا کچھ چائے پانی؟"

"پھر کبھی ماں جی۔"

یہ کہہ کر جواد علی چلا جاتا۔ یہ عجیب و غریب سی بات تھی کہ جب کبھی جواد علی آتا تو نرملا گھر میں نہ ہوتی اور ماں بھی نرملا سے جواد علی کے خلوص، ایثار، انسانی دوستی اور بھائی چارے کا ذکر کرتی۔

"بڑا خوش خلق اور سیدھا سادہ آدمی ہے نرملا۔"

"کم بخت کی صورت بڑی بدصورت ہے ماں۔"

"سیرت کا جواب نہیں۔"

"سیرت کس نے دیکھی ماں۔ ظاہری خوبیوں سے کیا پتہ چلتا ہے ماں کہ انسان کے اندر کیا ہے؟"

"اندر کی بات تو بھگوان ہی جانے بیٹی۔"

جواد علی نے ماں کو تحفے دے دے کر اس پر جادو سا کر دیا۔ سنجیدہ انداز میں باتیں کر کے اپنی شرافت کا سکہ جمایا۔ جواد علی اب موقعے کی تاک میں تھا کہ وہ نرملا سے بات چیت کا سلسلہ شروع کرے۔ اور یہ دیکھنے کو [illegible] نرملا کی نفرت

سے کیا اثر پڑا۔ آہستہ آہستہ جواد علی نے یہ محسوس کر لیا کہ اُن تبدیلیوں میں تبدیلی نہیں۔ کبھی کبھار جب جواد علی [illegible] سے باتیں کرنے لگتا تو وہ سیدھی [illegible] کمرے میں چلی جاتی اور جب تک وہ باتیں کرتا رہتا وہ کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ جواد علی نے اس نفرت کو محسوس کر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر کسی کی بات کی تو [illegible] کی کھانی پڑے گی۔ ایک شادی کے بعد دوسری شادی ہو چکی تھی۔ وہ مسلمان تھا اور نہ ہندو۔ وہ بدصورت تھا اور نہ خوبصورت۔ وہ زہرہ سے عمر میں بھی بڑا تھا۔

بس ایک بات میں وہ زہرہ سے بہتر تھا کہ وہ امیر تھا۔ ماں اور بیٹی کی زندگی مشکل سے گزر رہی تھی اور جواد علی کو اس بات کا احساس تھا۔ روپیہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کھوٹے کو کھرا بنا سکتا ہے اور سچے کو جھوٹا۔ ان سکوں کے آگے اچھے اچھوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ یہ تو محض دو عورتیں تھیں۔ اکیلی۔ بے سہارا۔ بے بس۔

پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم رکھنا چاہیے۔ محض روپیوں کی نمائش کر کے مسلمان نہیں خریدے جاتے۔ کچھ سلیقہ، کچھ طور طریقہ وقت اور حالات کو دیکھ کر آگے بڑھنا چاہیے۔ پہلے زہرہ کی ماں سے بات کی جائے۔ بڑھیا کے دل میں ڈوب کر اس [illegible] کو سیپ سے باہر نکالا جائے۔ بس اسی اُمید پہ جواد علی خود زہرہ کی ماں سے ملا اور جب لوٹ کر گھر آیا تو ہاتھ میں نہ سیپ تھا نہ موتی۔ ایک فقیر کی طرح دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ماں نے صاف کہہ دیا۔ "میں آپ کو اتنی کند ذہن حیثیت کا انسان نہ سمجھتی تھی۔ سوچ سمجھ کر تو بات کرتے۔ ہم ٹھہرے ہندو، آپ مسلمان۔ پھر آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ عمر میں زہرہ سے ڈبل ہیں آپ۔ کسی طرح بھی یہ بات جچتی نظر نہیں آتی۔ دوبارہ ایسی بات منہ سے نکالیے نہیں تو میں بہت بُری طرح پیش آؤں گی ——"

جواد علی اپنا سا منہ لے کر چلا گیا۔ جب کبھی زہرہ سے ایسا سلوک ہوا کہ دل کی بستی پر کسی نے شب خون مارا تھا اور سارا مال متاع لے کر چلا گیا۔ جواد علی کا شمار ایسے [illegible] عاشقوں میں نہ ہوتا تھا کہ گریبان چاک کر کے کسی ویرانے کی طرف منہ کرتے —— وہ تو بیسویں صدی کا عاشق تھا۔ سیمنٹ اور چونے کا بیوپاری جس نے گھروں کو تعمیر کرنا سیکھا تھا، اُجاڑنا نہیں۔ [illegible] کے بعد، اپنے آپ کو ختم کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ لیکن وہ ایک بات سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ زہرہ کی تصویر ان کے دل و دماغ پر ایسی اُبھری کہ جواد علی نے اسے مٹانے کی بہت کوشش کی مگر یہ تصویر ایسی اُبھری کہ پرانے نقوش مٹتے گئے اور ایک ایسی [illegible] شروع۔ [illegible] کی تصویر [illegible] سامنے [illegible] ہو گئی۔

پانچ برس اور گزر گئے۔ زہرہ اور اس کی ماں نے وطن چھوڑ کر بمبئی کا رخ کیا۔ بمبئی تو [illegible] کا شہر تھا۔ چاندی کے سکوں سے جگمگاتا ہوا شہر جہاں حسین لڑکیوں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ جہاں روپیوں کی کمی نہیں اور حسن کے پجاریوں کی بھرمار ہے۔ بس لڑکی حسین، خوبصورت اور پرکشش ہونی چاہیے۔ [illegible] تب بھی چلے گی اور شہر میں [illegible] کی [illegible] مر جائے گی۔ [illegible] رات کی [illegible] آواز میں کھنک اور جادو ہو اور زلفیں [illegible] پریشان ہوں۔ چال البیلی اور مستانی ہو، آنکھیں نیلی نیلی کسی گہری جھیل کے پانیوں کی طرح، اور جب سیاہ زلفیں فضا میں بکھر جائیں تو آسمان پر کالی گھٹا چھا جائے تو پھر اور کیا چاہیے؟ آپ کے پاس ہے اور اس سے فائدہ نہ اُٹھاؤ۔

ت ہے۔

نرملا نے اس شہر میں وارد ہوتے ہی طوفان مچا دیا۔ فلمی جوہریوں نے اس موتی کو پرکھ کر اپنے دل کا رول دیا۔ نرملا کے پاؤں ایسے تھرکے کہ ہر قدم پر نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ دو برس میں نرملا ... پھر ... کر ایک اچھے خاصے فلیٹ میں وارد ہو گئی۔ اس کے بعد نرملا کے پرستاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔ حسن کے پجاریوں نے آگے بڑھ کر نرملا کا ہاتھ تھامنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ماں نے سوچا ابھی تو کشش کی ابتدا ہوئی ہے۔ ان حالات میں نرملا کا ... ایک عاشق کے ساتھ وابستہ ہو جانا ایک بہت بڑی غلطی ہو گی اور نرملا بھی تو اپنی ماں کی بیٹی تھی جذبات کی رو میں بہنا بیوقوفی ہے ... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ روپے کی جھنکار نے عقل پر تالہ لگا دیا۔ ایک نئے عاشق جانباز نے کہا ... سندری! اپنا کل جسم میرے سپرد کر دو اور میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھو۔ یہ نیا عاشق لقے پر ٹپک لگاتا تھا اور ... موتی پہنتا تھا۔ مرغ اور مچھلی کھاتا تھا مگر ... کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے گھوڑا ریس میں بھاگتا ہے۔ اور ہر حالت میں ... آنے کی کوشش کرتا۔ مگر ... بہت ہر چہرہ عمر رسیدہ تھے۔ سب کے بال تقریباً سفید ہو چکے تھے۔ خضاب لگا کر وہ شباب ... مگر بڑھاپے میں جوانوں سے سبقت لینے کی کوشش کرتے۔ جب کسی لڑکی کو دل دے بیٹھتے تو روپے پیسے کی پروا نہ کرتے۔ جس کو ... کہہ دیا اس کی ہر آرزو کو پورا کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے۔ نرملا کو دیکھتے ہی ... اگر تم باقی عاشقوں سے آنکھیں پھیر لو۔ نرملا اور اس کی ماں مان گئی۔ حسن کے پجاری نے اپنی پونجی ایک فلم بنانے میں لگا دی۔ ماں باپ ... بچوں کی پروا ... کہ کل ان کا کیا ہو گا۔ اسی چکر میں ... سب اپنی خواہش سے آگے۔ باقی سب ... اس دنیا میں انسان ... آتا ہے۔ یہ ... گنگا بہانے چلے ——— فلم بنی اور بری طرح فیل ہو گئی۔ ... نے ... بعد جیسے خواب دیکھے تھے ... ان خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھا ... یہ فلم بنانے میں لٹا چکے تھے۔ دوستوں اور رشتہ داروں نے سخت ملامت کی ... نرملا کے گھر کی طرف رخ کرتے۔ نرملا ... کی طرف ... نظروں سے دیکھتی اور ایک دو آنسو بہا کر ٹال جاتی ... عدم ہو گیا۔

ان تین چار برسوں میں نرملا کی شخصیت میں بھی تبدیلیاں ہو گئیں۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا اثر صورت اور جسم پر ضرور پڑتا ہے۔ وہ معصومیت اور پاکیزگی جو اس کے چہرے سے عیاں تھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی۔ حسن اور شباب کا بھولپن غائب ہو گیا۔ اور اس کی جگہ چہرے پر ایک رنگینی سی ... جسم پر گوشت کی ایک تہ کا اضافہ ہو گیا ... وہ ... کشش نہ رہی۔ پھر بھی تیور وہی تھے ... جسم میں ... نہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ نرملا ... کوشش رہتی کہ کوئی ایسا شخص ... مل جائے جو دولت مند بھی ہو اور ... بھی ... ادھر جو عاشق آتے وہ ... ہو گئے ... زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ... کھوکھلے ... جاتے اس لیے وہ منظم

آنسو تھیں، اور کتابیں جو ابھی تک پیدا نہ ہو سکی تھیں، ابھی تک نگاہوں کے سامنے آ رہی تھیں۔

انہیں دنوں جواد علی پھر آ دھمکا۔ یہ کمبخت کہاں سے آن ٹپکا۔ جواد علی کا رنگ اور سیاہ ہو گیا تھا۔ جسم فربہ ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا دل یہاں بمبئی میں نہ لگا اور ماں نے اُن کے چلے جانے کے بعد بھی کاروبار کیا۔ میاں کی کمائی اُسے خوب راس آئی۔ وہی اینٹ اور چونے کا بیوپار۔ ماں جی ایسا رنگ جما ہے کہ روپیوں کا انبار لگ گیا۔ آپ کی دعا سے دو اور شادیاں کر لی ہیں۔ یعنی اب کل تین عدد بیبیاں ہیں اور بیٹے آٹھ عدد ہیں۔ سب بیویوں کو الگ الگ مکان دے دیے ہیں۔ مزے سے کٹ رہی ہے۔ ماں جی میرا جی تو ... آپ کی دعا سے پہلے بھی کسی بات کی کمی نہ تھی اور اب بھی نہیں۔" جواد علی نے کمرے میں نگاہ ڈال کر کہا — "زہرا کہاں ہے ماں جی؟"

"طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر سے ملنے گئی ہے۔" زہرا کی ماں نے جواب دیا۔

شاید زہرا کی کمی تھی جسے جواد علی نے شدید طور پر محسوس کیا تھا۔ پھر جواد علی نے چلتے ہوئے کہا — "ماں جی کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہیے گا۔ بس یا تو پرچہ لکھ کر حکم دیجیے۔ اگر آپ کی خواہش پوری نہ ہو تو لعنت ہے اپنی کمائی پر۔"

زہرا کی ماں نے محسوس کیا کہ چند برسوں میں سیدھا جواد علی کافی ڈھیٹ اور منہ پھٹ ہو گیا تھا۔ روپے کی فراوانی نے اُسے کافی بد اخلاق اور بے شرم بنا دیا۔ شاید یہ شہر ہی ایسا ہے۔ جو یہاں آتا ہے بڑی جلد بے شرم اور بے غیرت ہو جاتا ہے... وہ خود بھی تو ...... یہ سوچ کر رہ گئی۔

اتنے میں زہرا آگئی اور ماں نے جواد علی کا ذکر کیا۔

"اس کا رنگ کیسا ہے؟"

"اس کا رنگ زیادہ خوب چمکتا ہے بیٹی! وہ یہی گھومتا ہے۔ زہرا مردوں کی نخوت کو دیکھتی ہے اور ... جنس دیکھا جاتا ہے۔"

"سچ کہتی ہو ماں! پھر بھی مجھے اس شخص سے نہ جانے کیوں نفرت سی ہے؟ ایک بار تم نے صاف جواب دے دیا تو اب پھر......"

"بیٹی وہ آتا ہے تو ہم سے کچھ لے کے نہیں جاتا۔" پھر ماں نے زہرا کی طرف دیکھا۔ زہرا کی غیرت کو دیکھ کر وہ خاموش سی ہو گئی۔ جواد علی کافی منہ زور تھا۔ وہ کبھی کبھار چکر ضرور مارتا اور اُن کی مالی حالت کا پتہ چلاتا رہتا۔ ابھی مالی حالت اتنی بری نہ تھی کہ جواد علی اپنے دل کی بات کر سکتا۔ اب وہ دل کی بات اس وقت کہے گا جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ زہرا دب جائے گی۔ ... شکستہ ... دیکھنا ہی کہاں کی عقل مندی ہے۔

اسی طرح پانچ سال اور گزر گئے۔ زہرا کی اقتصادی حالت بہتر ہونے کے بجائے دگرگوں ہو گئی۔ ... کی ایک ہی ... تھی۔ زیادہ تر عاشق کنگال ... نکلے۔ بلیں بجانے کی ہمیں کافی تھیں۔ ... پیسہ نہ ... کسی ... الگ کر اور چاہے ...

پی کر چلے جاتے۔

[illegible] کی تو خواہش تھی کہ کوئی گانٹھ کا پورا اور عقل کا اندھا مل جائے تو مستقبل سنور جائے۔ اسی دوران میں نیوی کا ایک افسر جو شراب پی کر نرملا کے گھر پڑا رہتا۔ شراب، کھانے پینے کے اخراجات، باہر کی تفریح، سینما، کپڑے، سب کے لیے روپے دیتا مگر ان روپوں سے زندگی تو نہیں چلتی۔ جب نرملا نے تنگ آکر شادی کے لیے کہا تو نیوی کا افسر ایسے رفو چکر ہو گیا اور پھر نرملا سے ملنے نہ آیا۔

کچھ اسی قسم کے چکروں میں نرملا نے اپنا حسن و شباب کھو دیا۔ حسن کو بڑی فراخدلی سے لٹایا جس چیز کی لوگ قیمت ادا کرتے ہیں اُسے سنبھال کر نہ رکھا۔ وہ محرابوں اور قوسوں کا تاج محل ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا۔ اب بھولے بھٹکے مسافر آتے اور کھنڈر کو دیکھ کر کہتے۔ عمارت ضرور عظیم ہوگی۔

یہ وہی لمحات تھے جب نرملا نے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر سوچا کہ زندہ رہنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ اب تو سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی دوران میں جواد علی پھر وارد ہوا۔ اُس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو بھانپ لیا کہ اب سب پنچھی اُڑ گئے ہیں۔ شمع حسن بھی بجھی بجھی سی ہے۔ جس نخوت اور رُعب داب سے نرملا بات کرتی تھی اُس کی جگہ نرمی اور اپنائیت نے لے لی۔ جواد علی نے اپنا رویہ نہ بدلا۔ وہی خوشامدانہ انداز گفتگو رہا۔ دل بے تاب کی دھڑکنوں کو اپنے قابو میں رکھا۔ یہ پرانا عاشق شرابی، ضدی اور خود سر تھا۔ ظاہری نرمی تلے ـــــــ استقامت، مضبوطی اور توانائی کی تہ تھی۔ وہ دل کی بات کہہ کر دوبارہ رسوا نہ ہونا چاہتا تھا۔ بس ماں جی سے کہتا ـــــــ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندہ حاضر ہے۔ اللہ کی مہربانی سے میرا کاروبار خوب چمکا ہے۔ اگر میں آپ کے کام آسکوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ چلیے بازار، آپ کو باہر گھما دوں۔

اس دن نرملا اور اس کی ماں کار میں بیٹھ کر باہر چلی گئیں۔ واپسی پر جواد علی نے نرملا کو کچھ چیزیں خرید دیں اور جب نرملا گھر میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں جواد علی کی خریدی ہوئی چیزیں تھیں۔ یہ جواد علی کی پہلی فتح تھی۔

اب ہر دوسرے تیسرے دن جواد علی [illegible] آجاتا۔ نرملا کی ماں جو فرمائش کرتی جواد علی پوری کرتا۔ نرملا دل ہی دل میں کڑھتی رہتی۔ پھر ماں کے کہنے پر بیٹی جواد علی کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی۔ دونوں گھوم پھر کر [illegible] نکل جاتے، میرین ڈرائیو پر کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل جاتی۔ نرملا نے اس تمام عرصے میں [illegible] جواد علی اچھا لگنے لگا۔ جس کالے رنگ کو دیکھ کر وہ منہ پھیر لیتی تھی وہی کالا رنگ اسے پیارا لگنے لگا۔ کیا یہ روپے کا جادو تھا یا جواد علی کے خوشامدانہ طرز گفتگو کا اثر یا آنے والی زندگی سے بچنے کے لیے اس نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ اب زندگی کو سنوارنا ہے تو سنوار دو۔ ادھر جواد علی پر یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ رات کی رانی راہ راست پر آ چکی ہے۔ جواد علی نے دل کھول کر روپیہ صرف کیا اور ساتھ ساتھ نرملا کو اس کے مستقبل کے متعلق اشارے کرتا رہا۔ [illegible] موقع ہے اپنی زندگی

او۔ میں تو تیرا (ا) عاشق ہوں، جنم جنم کا ساتھی۔ وہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا تو اُس وقت صرف ایک شادی کی تھی [illegible]
میں دو شادیاں اور کر چکا ہوں لیکن تمہیں پانے کے جذبے نے دیوانہ کر دیا۔ میں وہ مجنوں نہیں کہ گریبان پھاڑ کر صحرا صحرا جنگل جنگل
گھوموں۔ تمہیں پانے کا تو طریقہ ہے۔ اور جب تک زندہ رہوں گا تمہیں پانے کے لیے میرا دل تڑپتا رہے گا۔ اس معاملے میں
بات ـــــــ کے علاوہ دو بات کہنا چاہتا ہوں۔ اپنی بیویوں کو پالتا ہوں۔ اپنے بچوں کو پیدا کرتا ہوں۔ دوستوں کی
مدد کرتا ہوں۔ غریبوں میں روپے تقسیم کرتا ہوں۔ کافی بزنس پھیلایا ہے۔ تم میری چوتھی بیوی بنو گی اور میری آخری بیوی۔ سیٹھ
پرشمت خود ہوں مگر دل کا بہت خوبصورت۔ قسمت کا دھنی ہوں۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔ زندگی تمہیں جنت سے کم نہ لگے گی۔ تمہارے
قدموں میں بچھ سکتا ہوں۔ اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ اگر کہو تو سب سے پہلے نیا فلیٹ خرید کر دوں گا۔ نئے فرنیچر سے ایسا سجاؤں گا کہ
بستی کی تمام بوڑھی عورتیں عش عش کر اٹھیں۔ ان دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ سے باہر نکلو اور ایک خوشگوار اور باوقار زندگی
گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

اور بندہ جو آج سے دس سال پہلے سیٹھ کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتی تھی آج اُسی کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔
سوچ رہی تھی وہ کیا ہوا ہے۔ آج سے دس سال پہلے اُس کے ہونٹوں کا ایک قطرہ بھی اس شخص سے ہمکلام ہونے کے لیے تیار
نہ تھا مگر آج قسمت اُس کا فیصلہ کر رہی تھی۔ اور وہ بازی ہار گئی تھی۔ [illegible] کیوں کر جوانی کے اُن تمام فقروں
کو شوہر کے دل نے وحشت نہ کی۔ ذہن نے بغاوت نہ کی۔ سب ہی کچھ تو ہو رہا تھا۔ شاید درست ہو رہا تھا۔ اس طرح میں زندہ
ضمیر و خواہش سیٹھ سے کی۔ جو دل نے خلوص سے پورا کیا اور یہ لکھیں اس طرح ہوئیں کہ کہیں کہ سیٹھ کی گرفت زندگی پر مضبوط ہوتی گئی۔ وہ
شہرت پسند [illegible] تھی وہ چپکے سب [illegible] چھوٹ گئے تھے۔ وہ سب کچھ کرے گی۔ وہ
دنیا کو حکم چلایا کرے گی۔ غریب ہی کیا کرتا ہے۔ [illegible] کب سجدہ میں جائے
گی۔ [illegible] زندگی گزارنے کے لیے وہ [illegible] کرے گی اور جو کچھ سیٹھ کہے گا کرے گی۔ وہ بچوں کی پرورش نہیں
چاہتی۔ وہ ان دو کمروں میں [illegible] چاہتی۔ دونوں [illegible] نہیں چاہتی۔ اب تو کار کا چسکا بھی پڑ گیا
تھا۔ پھر ایک دن وہ پیچھے سے مہرالنسا بن گئی اور سیٹھ کے نئے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ سیٹھ نے واقعی اُس مکان پر کافی خاصی
خرچ کی تھی۔ بہترین فرنیچر سے فلیٹ کو سجایا تھا۔ اب سیٹھ روز مہرالنسا کے ساتھ رہنے لگا۔ تین سال پورے ہوئے تو خوب گزرے۔ اس
کے بعد واپسی ہو گئی۔ مہرالنسا نے سوچا تھا کہ اُس نے [illegible] کر کے سیٹھ کو [illegible] لیا ہے لیکن [illegible] بیویوں سے بات
مہرالنسا پر عیاں ہو گئی کہ سیٹھ بھی [illegible] ہے۔ کمبخت کسی بیوی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے علاوہ بھی بیوی کی تعداد
ہے۔ وہ [illegible] میں دو روز اُس کے ساتھ گزارتا اور باقی پانچ دن دوسری بیویوں کے پاس۔ مہرالنسا نے ہر طرح سے استعمال
کر کے دیکھ لیا۔ رات رات جاگ کے دیکھ لیا۔ خدمت کر کے دیکھ لیا۔ گھر میں سنگار کر کے دیکھ لیا مگر سیٹھ جو دل کے [illegible]
وہ سوکن میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ سیٹھ نے ایک دن صاف صاف کہہ دیا۔ "تم مجھے قید کرنا چاہتی ہو۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ تمہاری ضد
مجھے مجبور نہیں بنا سکتی۔" تب مہرالنسا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ شخص ایک عورت کا ہو کے نہیں رہ سکتا۔ یہ شخص آوارہ

... بدمعاش ہے۔ اس نے اپنے من کی خوشی کے لیے مجھ سے شادی کی تھی تاکہ اپنی برسوں پرانی خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے اور جب اس کی خواہش کی تکمیل ہو گئی تو سیٹھ نے اصلی روپ دکھا دیا۔

اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے گلہ کرے؟ کس سے شکایت کرے؟ یہ کوئی میاں اور بیوی کی زندگی نہ تھی۔ محض آقا اور غلام کا رشتہ تھا۔ وہ دن بھر انتظار کرے؟ کیوں انتظار کرے؟ محض دو وقت کھانا کھانے کے لیے۔ لوگوں کو ایک جاندار فیشن دکھانے کے لیے۔ اور سیٹھ جواد علی کا جہاں جی چاہتا ہے چلا جاتا ہے۔ کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ نجانے اس وقت کس بیوی کے پاس ہو گا۔ یہ سوچ کر اس کا خون جوش مارنے لگتا اور وہ بڑبڑانے لگتی۔ اس بار تو سیٹھ پانچ دن کے وقفے کے بعد گھر آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ صفیہ النساء نے سیٹھ کو گریبان سے پکڑ لیا۔ سیٹھ نے جوابی حملہ کیا اور دو تین تھپڑ رسید کیے۔ وہ بھی چلائی۔ اس نے روکا۔ دو تین جڑ دیں۔ اس دن تو مار برداشت کر گئی۔ اس کے بعد تو تقریباً جب کبھی اس نے کوئی شکایت کی جواد علی فوراً دو چار گندی گالیاں دیتا۔ اور ایک دو تھپڑ رسید کرتا اور ساتھ ہی کہتا ——— عورت کے مزاج کو ٹھیک کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسے ... پیٹا جائے۔ اسے اس جواد علی کو کیا ہو گیا۔ بیاہ سے پہلے اس نے کبھی جھڑکا تک نہ تھا۔ چاپلوسی کرتے کرتے اس کی زبان تھک جاتی تھی۔ اب تو ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں۔ اس شخص نے اس کی خوشیاں اٹھا لی تھیں۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اس گھر میں رہی تو وہ پاگل ہو جائے گی۔ یہ مارپیٹ، یہ گندی گالیاں، یہ وحشیانہ سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ شخص اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا۔ ان حالات میں وہ اس کے پاس نہیں رہ سکتی۔ اور ... ان دونوں کا مزاج نہیں ملتا۔ دونوں کی سوچ کچھ ... مختلف ہیں۔ یہاں رہنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اگر چند دن اور گزر گئی تو پاگل ہو جائے گی اور پھر ایک دن فیصلہ کر کے وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی آئی کہ دوبارہ جواد علی کے گھر نہ جائے گی۔

وہ اپنی پرانی کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور سارا ماضی اس کی نگاہوں کے سامنے گزر رہا تھا۔ ... یاد ہے جب وہ صرف پندرہ برس کی تھی تو جواد علی کا جھگڑا ہوا تھا۔ پانچ سال گزرنے کے بعد وہ بھی جوان ہو گئی ... کا فاصلہ ... گئے۔ سیٹھ جواد علی پھر آیا۔ اب حالات بدل چکے تھے۔ سیٹھ کے ساتھ شادی کی۔ شادی کے بعد نفرت پیدا ہوئی اور علیحدگی۔ کوٹھڑی میں بیٹھے بیٹھے وہ سب اس کی نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے کیونکہ اس کی زندگی ... پانچ برس کے بعد ایک ... تبدیلی ہوئی ... تو وہ اس جگہ پہنچ گئی تھی جہاں سے اس نے سفر آغاز کیا تھا۔

ڈاک گھر کی شہزادی

کشمیری لال ذاکر

اس کا گھر ڈاک گھر کے عین سامنے تھا۔

ڈاک گھر اس پہاڑی شاہراہ کے قریب کے متعدد دیہاتوں کی خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ اس کے پیچھے پوسٹ ماسٹر کی رہائش تھی۔ وہاں موسم گرما میں شہر والے آتے تھے تو اس کی رونق بڑھ جاتی تھیں۔ لیکن سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی۔ پہاڑ پر برف گرتی تھی تو ڈاک گھر کے صاحب سے کوئی ملنے والا بھی نہ آتا تھا۔ ہر روز صبح وہ ڈاک لے کر آنے والے ہرکارے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اگرچہ اس کے فرائض زیادہ نہیں تھے لیکن اس کے باوجود وہ دن کو مصروف رہتا تھا۔ ڈاک گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں ایک لڑکی رہتی تھی۔ پوسٹ ماسٹر جب بھی اپنے دفتر سے باہر آتا تو اس کی نظر اس مکان پر پڑتی تھی۔ اس کی کھڑکی اور دروازے پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا اور کبھی کبھی وہ پردہ ہٹا کر باہر دیکھ لیا کرتی تھی۔

اس کا نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔

بچے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بڑی شان سے ڈاک گھر کے سامنے سے گزرتے تھے۔ ایک نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟

جواب میں اس کی آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

لیکن اس کی ہنسی کے پیچھے کوئی راز چھپا ہوا تھا اور اسی لیے وہ اس گاؤں میں ایک معما بن کر رہ گئی تھی۔

وہاں پوسٹ ماسٹر کی ملازمت بڑی عجیب تھی۔ شہر کا آدمی نہ تھا، لیکن پہاڑی گاؤں میں اکیلا رہنا اس کے لیے مشکل تھا۔ سردیوں کے دنوں میں جب چاروں طرف برف ہی برف ہوتی تو وہ کمرے میں آگ جلا کر بیٹھ جاتا۔ اس کے سامنے والے مکان کی کھڑکی بند رہتی تھی۔ ہر روز صبح جب ہرکارہ ڈاک لے کر آتا تو وہ لڑکی بھی کسی نہ کسی بہانے ڈاک گھر آ جاتی تھی اور پوچھتی کہ اس کے نام کوئی خط آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک عجیب سی لرزش تھی جب وہ پوسٹ ماسٹر کے سامنے آتی تھی۔ وہ نیلی آنکھوں والی خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ اس سے اس کے بارے میں پوچھے لیکن وہ خاموش رہتا تھا۔ اسے جب وہ نظر آتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ اسے روز کھڑکی کے پیچھے سے دیکھا کرتا تھا اور اسی وقت اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوتی کہ وہ اس کی صورت دیکھے۔ لیکن

کسی خاص قسم کے آدمی کا انت دیکھنے سے ہمیشہ بچتا تھا۔ جب کبھی شور و غوغا [illegible] اس کے ماتھے تک [illegible] اس کا دل بڑا کھٹکتا تھا۔

صبح سویرے اٹھ کر ویال نمبردار کی حویلی، شہر والے گھر، محلے کے کنویں اور پھر ڈاک گھر کی پرانی عمارت پر نظر ڈالنا کیدار کا معمول بن چکا
تھا۔ یہ اس کے روز مرہ کے پروگرام کا ایک جزو تھا۔ ویسے تو ڈاک گھر کی ساری عمارت ہی اسے کال کوٹھری سی نظر آتی تھی لیکن اس کا سڑک کی طرف
کھلتا ہوا برآمدہ اسے اور بھی اکھرتا تھا۔ لوہے کی سڑی ہوئی سلاخوں والی کھڑکیوں کے پیچھے میزوں پر جھکے ہوئے پوسٹل کلرک اسے ان قیدیوں کی طرح
نظر آتے جنہیں عمر بھر کی قید ملی ہو اور جنہیں دیکھنے کے لیے تماشائی برآمدے میں کھڑے ہوں اور ان کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اسے ان کلرکوں پر بڑا
ترس آتا اور ان تماشائیوں پر بے حد غصہ۔ کون ہے جو قیدی نہیں؟ وہ سوچتا۔ کون ہے جو آزاد ہے؟ کس نے کوئی جرم نہیں کیا؟ کس کے سر کسی کا
خون نہیں؟ پھر کون کس کو مجرم ٹھہرا سکتا ہے؟

اور اس کے ان سوالوں کا جواب اسے چمپا نے دیا تھا جسے وہ دو سال سے دیکھتا آ رہا تھا۔

چمپا کا اصلی نام کیدار کو معلوم نہیں تھا۔ شاید چمپا بھی اسے بھول گئی تھی۔ وہ کہاں سے اور کیسے یہاں آئی تھی۔ اس سے یہاں کون لایا تھا اور کیوں
لایا تھا۔ ان سب باتوں کا کیدار کو علم نہیں تھا۔ اسے تو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک عجیب و غریب [illegible] خوبصورت گورے
رنگ کی عورت نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ [illegible] بال بکھرے ہوئے تھے اور کپڑے میلے کچیلے [illegible] اس نے کسی اجنبی زبان میں کچھ [illegible]
[illegible] اور اس کے پیچھے کچھ بھی نہ پڑا۔ [illegible] اور [illegible] کے علاوہ کوئی اور [illegible] وہ اس کی بات [illegible] لیکن اس کے
[illegible] پتا نہیں [illegible] اس کے [illegible] عورت کی بات سمجھنے کی کوشش کی لیکن نہ سمجھ سکا اور جب وہ آگے بڑھنے
لگا تو اس عورت نے اس کا بازو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ کی دو انگلیاں جوڑ کر ہونٹوں کے ساتھ لگاتے ہوئے [illegible] کی طرف [illegible] وہ جان پایا
کہ اسے سگریٹ کی حاجت تھی۔ [illegible] سگریٹ کا پیکٹ نکالا [illegible] سگریٹ [illegible] اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور [illegible] اس کا
[illegible] اپنا سگریٹ جلا کر [illegible] کے [illegible] اس عجیب پاگل عورت [illegible] کیدار
[illegible] کیدار [illegible] پاگل عورت نے [illegible] کیدار [illegible] وہ اجنبی عورت
ڈاک گھر کے برآمدے میں بیٹھی رو رہی تھی۔ وہ ڈاک گھر پہنچ گیا۔

کیدار نے اب صبح سویرے چھت پر چڑھنے کی بجائے [illegible] کی عادت ڈال لی تھی۔ وہ جب [illegible] بھی
پاگل عورت سامنے کھڑی ہوتی۔ اسے دیکھ کر مسکراتی۔ وہ اسے ایک سگریٹ دیتا اسے سلگاتا [illegible] اور [illegible]
تھے بس کا پیچھا کرتے رہتے۔

بہت دنوں تک یہ معمول چلتا رہا۔ کیدار نے اب [illegible] اور جانے کس نے اس
کا نام چمپا رکھ دیا تھا۔ بازار میں آس پاس کے دکاندار اسے چمپا کہہ کر پکارتے تھے اور اس سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔ [illegible] سے
[illegible] کچھ کہتی تھی [illegible] سگریٹ [illegible] اس قسم کی چیزیں
دیتے [illegible] کچھ کہتے تھے [illegible] کے
[illegible]

کمرہ تھا اور بیٹری جلتی رہتی۔ وہ اسی ڈرائنگ روم کے برآمدے میں ایک طرف چارپائی ڈالے رضائی لپیٹ کر سو جاتی اور صبح دو بجے اٹھ بیٹھتی۔ نہ جانے پاگل پن کے باوجود اس میں شعور کا کتنا حصہ باقی تھا جس نے اسے یہی سمجھا دیا تھا کہ پہلے وہ صبح سویرے سگریٹ پیا کرتا تھا۔ سب بچوں کا انتظار رہتا تھا اور جب ایک دفعہ بیگم چڑ گئیں اور ڈرائنگ روم سے باہر ڈال کر چپ کرنے میں کامیاب ہو گئیں صبح اس کا انتظار کرتی رہتی تھیں اور بیٹھی رہتی۔ کسی نے اسے سگریٹ دیا تو چپ ہو کر سے لیا۔ کیا سگریٹ پینے والے کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس کی سکونت میں اس کی صحت سنبھال رہی تھی۔

کیا اسے معلوم تھا جب وہ ایک جزو ہو گئی تھی اسے یوں لگتا تھا جیسے یہ ماحول جس میں وہ جی رہا تھا نامکمل تھا۔ نیم پاگل شاہ گوہر بات کرتی رہی، یہ سب کسی کہانی کے حصے تھے جن کی کڑی ادھوری تھی۔ جب وہ بیچاری تھی یہ کہانی مکمل ہو گئی تھی۔ کہانی کے جیسے جیتا جاگتا، سانس لیتا ہوا، حرکت کرتا ہوا انسان مل گیا تھا۔

بیچاری سے ایک قربانی ہوئی تھی۔ وہ بہت مرتبہ تنگ آ گئی تھی اور وہ صبح ڈرائنگ روم کے برآمدے میں بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کرتی تھی۔ اس کے بالوں میں کالے سفید تار چمک رہے تھے۔ اس کا جسم بھی ڈھل گیا تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں ایک تبدیلی سی آ گئی تھی۔ لوگوں کی چہ میگوئیوں کے باوجود اب وہ صبح اٹھ کر چلتی تھی کہیں نہیں۔ باوجود اس کے کہ اس کے پیچھے ایک بھی آدمی نہ تھا۔ وہ بھی آتی اور جتنا بھی اس نے بتایا اس سے اس کی خوشبو سے محسوس ہوتا تھا۔ اس کے جسم کے اندر سے گویا ڈبل بجتے تھے۔

جب اسے اپنے کمرے کے پاس پہنچا تو اسے لگا جیسے وہ کسی کو بلا رہی ہے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی کے سوراخ سے دیکھا، وہ پلنگ پر بیٹھی ہاتھ میں کچھ لیے گن رہی تھی۔

"کیوں کیا کر رہی ہو، تمہاری گنتی ختم ہو گئی۔ خدا کے لیے بتاؤ تم کیا کرتی ہو۔"

پھر کہا، "چونا"

"میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنا لفافہ اٹھا کر پلنگ پر پھینک کر باہر چلی گئی۔ اور پھر اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔"

اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے اسے گنتے دیکھا تھا۔ وہ جو کچھ ڈرائنگ روم کے برآمدے کے سامنے کھڑا دیکھا۔ کیونکہ جب اسے پکارا تو وہ سر جھکائے آگے بڑھ گئی۔ یہ سالا اس پاگل عورت کو بھی اپنی جائداد سمجھتا ہے۔

وہ کہہ رہی تھی اس کی آواز اس کے ہونٹوں پر رہ گئی اور وہ کچھ نہ بول سکی۔

"اس کی آواز میں پیار ہی پیار تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی کی جائداد کی حفاظت کر رہا تھا۔"

لیکن ہم بھی بیچاری کے جھگڑے کی آواز نہیں سن سکے۔ وہ اب اکیلی دنیا میں رہ رہا تھا۔ اب نہ وہ ملتے، دوسری طرف کی دنیا کی تعمیر اور فرنیچر کا انتظام ہو گیا تھا۔ جس میں کسی کو کوئی فکر نہ تھی۔ اس میں سے اس کے کمرے کی چابی بھی تھی۔ جب وہ کمرے سے نکلتے تو پہلے راستے میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ بلکہ ڈرائنگ روم کے برآمدے میں رضائی لپیٹے پڑی رہتی تھی۔ وہ کمرے سے ڈرائنگ روم کے برآمدے میں

نہ سگرٹ دیتا تھا اور کبھی کبھی تو وہ گری پڑی سوتی ہوتی تھی اور کیدار سگرٹ اس کے تکیے پر رکھ کر سیر کو نکل جاتا تھا۔

پھر ایک روز کیدار کو یہ جان کر بے حد صدمہ ہوا کہ چمپا پیٹ سے تھی اور حالات خاصی نازک صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی شکست کے کارن اس کی جان ٹوٹ گئی تھی۔ وہ دن اس کا بڑا تلخ گزرا۔ اسے یقین تھا کہ اس گناہ کا مرتکب بازار کا ہر کیدار ہو سکتا تھا لیکن اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر کہ چمپا کا کیا حشر ہوگا کیدار پریشان ہو جاتا اور آنے والے حالات کا انتظار کرتا رہا۔ بازار کے لوگ اور چمپا کو چھیڑنے والے اسے ستاتے اور تنگ کرتے۔ وہ اس کے پیٹ پر ہنس کر آوازیں کستے اور وہ پیتے اور ٹھٹھے لگاتے۔ کیدار دیکھتا تو وہ انہیں ڈانٹ بھی دیتا۔ لیکن وہ ہر گھڑی وہاں تھوڑی موجود رہتا تھا۔ لوگ جب بھی موقع پاتے چمپا کو پریشان کرتے اور وہ سہہ جاتی۔ وہ ایک اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئی۔ لیکن اس کے بالوں کی لٹیں اب بھی کالی تھیں، اس کے دانتوں کے موتی اب بھی چمکتے تھے اور اس کے حسن کی جاذبیت اب بھی قائم تھی۔

آدھی رات کے قریب کیدار نے چمپا کی چیخوں کی آواز سنی۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ ذہن کی گمراہ شہزادی برآمدے میں پڑی بری طرح چیخ رہی تھی۔ کیدار سیڑھیاں اتر کر فوراً اس کے پاس پہنچا۔ اسے سگرٹ دیا لیکن اس نے سگرٹ نہیں لیا صرف پیٹ پر ہاتھ مارتی رہی۔ کیدار نے پاس کے بس اسٹینڈ سے ایک رکشا والے کو بلایا۔ چمپا کو بڑی مشکل سے اس میں ڈالا اور راستے فوراً ہسپتال لے گیا۔ وہ تمام راستے چیختی اور چلاتی رہی۔ ایمرجنسی وارڈ میں داخل کرا کر اس نے چمپا کو ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود ہسپتال کے احاطے میں دوسری طرف کے درخت کے نیچے بیٹھا سگرٹ پھونکنے لگا۔ اس نے پہلی بار درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگا کہ بچہ پیدا ہوا تو اسے سینے سے لگا کر چمپا کو اتنا ہوش کہاں ہوگا کہ وہ اس کی دیکھ بھال کرے۔ [illegible] کیدار نے اس بے کس اور لاچار عورت پر جیسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اس مصیبت کہاں لے جا رہا تھا۔ اس نے ایک [illegible] عورت کے [illegible] کا گھر نہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے کیدار کے پیچھے چیخ گئی اور اس نے اسے پاگل ڈھونڈی جو پہلی سے ایک [illegible] کی ہڈیاں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں اور اس کے جسم کا ایک ایک انگ کٹ گیا تھا۔ کیدار اسی طرح کی باتیں سوچتا رہا اور سگرٹ پھونکتا رہا اور رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی اور چمپا ایک نئے انسان کی تخلیق میں مصروف ہو کر تڑپتی رہی۔ اور پھر صبح کا اجالا کسمسایا اور ایک پریشان نرس سے باہر نکلی ہوئی نرس نے بتایا کہ بچہ مردہ پیدا ہوا تھا اور کیدار پھٹی پھٹی آنکھوں سے نرس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور اس کی انگلیوں میں تھی سگرٹ سلگتی رہی۔ اور پھر وہ دھیرے دھیرے ہسپتال کے احاطے سے گیٹ کی طرف بڑھا۔ اس کے دل و دماغ پہ ایک وہ بوجھ تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پاگل اور بے سہارا [illegible] ایک انجانا رشتہ تھا۔ ایک ایسا تعلق جس کی وہ تشریح نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسا [illegible] کوئی مذہب [illegible] نہیں سکتی تھی، لیکن جو ایک گہرے انسانی جذبے پر مبنی تھا۔ ایک ایسا جذبہ جو انسانوں کو [illegible] ایک دوسرے کے قریب لے آتا ہے۔

چمپا کچھ روز ہسپتال میں رہی۔ کیدار صبح شام اسے دیکھنے جاتا۔ جب تک اس کے جسم میں طاقت [illegible] وہیں وہ بستر پر پڑی رہی اور جب اس کے نڈھال جسم میں طاقت آ گئی تو وہ ایک شام ہسپتال سے بھاگ آئی اور ذہن کی [illegible] برآمدے میں پھر

[illegible] ایک تکیہ چادر [illegible] کے ساتھ لاتا۔ جیسے وہ پہلے ہنستے بچے کی باتیں سنتی [illegible] ہو جیسے وہ مسکراہٹ [illegible] کرتی ہو۔ وہ [illegible] کی پہلی [illegible] صفت [illegible] جیسے کوئی اس نے پکارا [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] جیسے چہرے [illegible] ساتھ بیٹھ کر [illegible] سے پھر [illegible] کی [illegible] اس کی آنکھوں میں [illegible] اس کی چھاتی سے لگ جاتا۔

گیان اب بھی اسے سگریٹ دیتا۔ وہ بہت تیزی سے دھوئیں کے کش سے [illegible] ڈال دیتا اور کبھی کبھی اس کے جسم پر پھول پھینک دیتا۔ لیکن اب وہ مسکراتی نہیں تھی۔ بس بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتی رہتی اور ایک لفظ تک نہ بولتی۔ جیسے اس کی بولی کھو گئی ہو۔ جیسے وہ سکتے میں آگئی ہو۔ اور دن گزرتے گئے۔

اور پھر ایک صبح گیان نے دیکھا ایک نوجوان مرد اپنے جسم پر ایک پھٹا ہوا کمبل لپیٹے بیڑی پیتے ہوئے بازار میں سے گزرتے ہوئے آیا اور زنگ لگے ہوئے [illegible] کے ساتھ پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ گیان نے جان لیا کہ پرستش کرنے والوں کی بستی میں ایک اور دیوانہ وارد ہوا ہے۔ زنگ لگے ہوئے [illegible] ایک اور [illegible] تھا۔ اور چپا [illegible] زنگ لگے [illegible] کا [illegible] تھا [illegible] جوانی کی [illegible] جا رہی تھی۔

یہ نیا دیوانہ بھی بے نیاز قسم کا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز نہ مانگی۔ کبھی کسی دکان کے سامنے کھڑا نہ ہوا۔ کسی دوسرے [illegible] بیٹھا رہے گا۔ [illegible] جب تک [illegible] ختم نہیں ہو جاتا۔ شہر میں دیوانے تو اور بھی تھے لیکن یہ تو دیوانوں کا بادشاہ تھا۔ بالکل الگ اور انوکھا، جس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اس نے چپا کی طرف بھی دھیان نہ دیا۔ جیسے زنگ لگے [illegible] کے سامنے اس کے کسی [illegible] نہ تھا [illegible] گیان نے سب [illegible] شہر کے دوسرے [illegible] میں [illegible] تھی اور اب [illegible] آگیا تھا، جو [illegible] زیادہ تھا، پھر [illegible] رہتا تھا۔

اور ایک دن گیان نے صبح سویرے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو چپا اپنے گھٹنے [illegible] سے [illegible] رہی تھی اور دیوانہ [illegible] کا سارا [illegible] اٹھا رہا تھا اور [illegible] چپا کو ایک [illegible] سے [illegible] رہا تھا۔ چپا کا گدرایا ہوا جسم اس کی پھٹی ہوئی قمیض سے باہر جھانک رہا تھا۔ جیسے [illegible] چاندنی [illegible] کی [illegible] ہنستا ہوا [illegible] رہا ہو۔ [illegible] کی نظریں [illegible] گڑی رہتیں [illegible] کون جانے کیوں گیان کو یہ سب اچھا لگا۔ ایک پرستش کرنے والا انسان دوسرے پرستش کرنے والے میں دلچسپی لینے لگا تھا اور [illegible] ایک [illegible] کرنے لگا تھا۔ ایک [illegible] کی بنیاد [illegible] جا رہی تھی۔ گیان کی [illegible] کا یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اس کے جنون کی ایک نئی [illegible] تھی۔ [illegible] محسوس ہوا جیسے زنگ لگا [illegible] سے [illegible] ہوا [illegible]۔ اس کے [illegible] کی طرح [illegible] لوگ سب زندگی میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ زندگی [illegible] خوبصورتیاں [illegible] اور [illegible] تھی [illegible] بھر بھر کر [illegible] رہی تھی۔ پرستش کرتے ہوئے لوگ [illegible] تھے [illegible] پرستش کی [illegible]

سے کٹ رہے تھے جو نئی زندگی کی خوبصورتیوں سے محروم رکھتی ہیں اور ان بیماریوں میں داخل ہو رہے تھے جہاں سے بچپن کے سنگ میل شروع ہوتے ہیں جہاں شیشم کی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں اور سمندروں کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور تمناؤں کی کلیاں چٹکتی ہیں اور کلپنا کی کہکشاں پر جگمگاتی ہوئی ایک ایک کر [illegible] کرتی ہے اور رات اپنے گیسو کھولے ستاروں کے دریچے سے جھانکتی آتی ہوئی معطر ہواؤں کا استقبال کرتی ہے۔

اور پھر کیدار کچھ دنوں کے لئے باہر چلا گیا۔

ڈاک گھر کے سامنے کھلتی ہوئی کھڑکی بند ہو گئی۔

اور سامنے کے مکان میں رہنے والی نیناں کی ڈانٹ دار آواز اور بھی اونچی ہوتی گئی۔

اور جب دس روز کے بعد کیدار واپس لوٹا تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی اسے چمپا کا خیال آگیا۔ اور اس کے ساتھ اس پروانے کا بھی جو ایک صبح چمپا کو بڑی لگن سے گھور رہا تھا۔ یوں تو گاڑی ٹھیک چار بجے پہنچتی تھی لیکن لیٹ ہونے کے کارن آج چھ بجے پہنچی تھی۔ کیدار قلی سے سامان اٹھوا کر رکشہ میں بیٹھا اور رکشہ والے کے پوچھنے پر کہ اسے کس جگہ جانا تھا، اس نے جواب دیا۔

"ڈاک گھر کے سامنے۔"

یہ الفاظ کہتے ہی اسے چمپا کا دھیان آیا اور اس کے بھرے بھرے جسم کا، اور اس کی وحشی آنکھوں کا اور اس نے [illegible] ان کا اور اس کے تیکھے [illegible] کا جسے وہ ہر لمحہ سے چھپائے رکھتی تھی۔

رکشہ کے پہیے گھوم رہے تھے اور کیدار نئے پروانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانے کیا کر رہا ہوگا۔ اس وقت وہ شاید سو رہا ہوگا۔ لیکن اب تو [illegible] جاگ رہے ہیں۔ سویرا ہونے والا تھا۔ نہیں وہ جاگ رہا ہوگا۔ اور بیڑی پی رہا ہوگا اور پروانے کے ساتھ نئے چمپا کے گھر سے ہوتے ہوئے اس کو گھور رہا ہوگا۔ جو اس کی چھتی ہوئی قمیص کے دریچوں سے باہر جھانکتے رہتے تھے۔ کیدار نے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگا لیا۔ وہ صرف صبح سویرے سگرٹ نہیں پیتا تھا۔ پہلا سگرٹ وہ اس وقت پیتا تھا جب چائے کی گرم پیالی اس کے ہونٹوں کو چھوتی تھی۔ لیکن جب اس کا دماغ سوچ کی بھول بھلیوں میں ہوتا تو وقت کی کوئی تخصیص نہیں۔ سگرٹ دیر تک سلگ سکتا تھا۔ چاہے آدھی رات ہو یا سویرا ہو رہا ہو۔ اور اب [illegible] کے جھٹپٹے اجالے میں سگرٹ کا دھواں فضا میں بس رہا تھا اور رکشہ کے پہیے تارکول کی سڑک پر گھوم رہے تھے۔

رکشہ رک گئی تھی۔

ڈاک گھر آگیا تھا۔

کیدار نے رکشہ والے کو کرایہ دیا اور اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر گلی کی طرف بڑھا۔ [illegible] کھلی [illegible] ابھی [illegible] جاگ رہا تھا۔ کھڑکیوں کی چوکھٹ پر بھی وہ ایک سائے حرکت کر رہے تھے۔ گلی جو ابھی [illegible] سے پیلی ہونے لگی تھی [illegible] نہیں دیر تک [illegible] گلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سوچا وہ ڈاک گھر کے [illegible] کی طرف ایک نظر

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

چہرے پہ بےخبری سی چھا گئی تھی کیونکہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی تھی ۔

ننھی گڑیا شہزادی کی طرح بن گئی تھی ۔

کیا وہ گلی میں جانے کو دوڑا ۔ وہ کسی چیز کی طرف کھینچے ہوئے اپنے کیبن میں چلی گئی تھی ۔ اس نے دیکھا یہ تو کچھ تھا جسے چھپا کر رکھے اپنے ساتھ چپکائے رکھتی تھی کہ سب جانتے کب سے خاموش تھے اور اس کی مدد ادھر ادھر پھیر رہے تھے وہ پیار کرتی جیسے اس کی گڑیا بن گئی تھی ۔ ایک ننھی گڑیا اور پرانا سا کھلونا تو تھا آخر !

ایک لڑکا اور ایسی حقیر چیزوں سے کیا واسطہ !

وہ پل بھر ٹھٹکا کہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف بڑھ گیا ۔

ادبی روایت اور ذہنی استعداد

مصنف: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ترجمہ: سید افضال حسین نقوی

انگریزی ادب میں ہم شاذ و نادر ہی روایت کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ گو ہم کبھی کبھی اس نام کا استعمال ضرور کر لیتے ہیں تاہم اس کی عدم حیثیت پر بحث کر سکیں۔ ہم کسی "خاص ادبی روایت" یا کسی "عام ادبی روایت" کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس لفظ کو صفت کی صورت میں کسی شاعر سے منسوب کر کے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر کا کلام "روایتی" ہے اور فلاں شاعر کا کلام "انتہائی روایتی"۔ بہرحال مشکل ہی سے یہ لفظ کا استعمال ہو سکتا ہے تاوقتیکہ اسے تحسین یا مذمت کی صورت میں استعمال نہ کیا جائے اور نہ دوسری کسی صورت میں اس کا استعمال مشکل ہی سے مستحسن قرار پا سکتا ہے کیونکہ یہ اپنے اشارات کے لحاظ سے جس کاوش کو بہتر گردانتا ہے وہ فنی تعمیر کی نئی اور عمدہ تراش خراش سے متعلق ہوتی ہے۔ غرض آپ مشکل ہی سے اس لفظ کو انگریز سامعین سے مانوس کر سکیں گے تاوقتیکہ آپ کو واقعی مستانہ فن تعمیر کی طرف رجوع کرانا ہو۔

یقیناً اس لفظ کا تنقیدی حیثیت سے کسی زندہ یا مردہ اہل قلم کے متعلق مستعمل ہونے کا بظاہر امکان نہیں کیونکہ ہر قوم اور ہر نسل کا نہ صرف اپنا تخلیقی دماغ ہوتا ہے بلکہ اس کا اپنا الگ ایک تنقیدی مذاق بھی ہوتا ہے اور یہ دماغ اپنی تخلیقی استعداد کے مقابل اپنی تنقیدی جبلت کی کوتاہیوں اور قیود سے بے خبر رہتا ہے۔ ہم فرانس کے ضخیم تنقیدی سرمایہ سے جس سے اس کی زبان پر ہے اس کے تنقیدی انداز اور جبلت کا پتہ پاتے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہماری بے حسی مسلّم ہے اور فرانسیسی ہمارے مقابلے میں زیادہ "تنقیدی" مذاق رکھتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ فرانسیسی ہمارے مقابلے میں کم سریع الحس ہیں۔ ممکن ہے فرانسیسی ایسے ہی ہوں لیکن ہمیں اپنے آپ کو یہ ضرور یاد کرانا چاہیے کہ تنقید اتنی ہی ضروری اور بدیہی چیز ہے جتنا کسی ذی روح کے لیے سانس کی آمد و شد۔ چنانچہ ہمیں کسی چیز کے پڑھتے وقت اس کے مطالب اور ادراک کے اور جذباتیت سے متاثر ہونے میں قباحت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ایسی صورت میں ہم اپنے ہی لیے ذہن کو کسی تنقیدی کاوش پر مزید تنقید کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ اس انداز فکر کی روشنی میں جو حقائق ہمارے سامنے ظہور میں آتے ہیں ان میں ایک بار کسی بات پر زور دیا جانے کا رجحان ہے۔ مثلاً جب ہم کسی شاعر کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور اس کی شاعری کا ایسا رخ اجاگر کرتے ہیں جس کی دوسرے شاعر کے یہاں ذرا مشابہت نہیں تو یقیناً ایسے ہی پہلو کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ [illegible] شاعر [illegible] کے کسی خاص انداز [illegible] کی طرف [illegible] کرتے ہیں کہ معلوم کریں کہ [illegible] روایت [illegible] کلام [illegible]

[illegible] کہ کسی شاعر کی تخلیق کا بہترین [illegible] حصہ [illegible]
[illegible] مرحوم شعرا [illegible] ہے۔ ہم [illegible] کا تنقیدی [illegible]
سلسلہ ہو سکے۔ مگر ہم اس لفظ روایت سے بہت کچھ مراد لیتے ہیں [illegible] ہوتا ہے کہ صرف
پچھلی نسل کی [illegible] تقلید ہی روایت [illegible] نہیں [illegible] کیونکہ اس کے معنی
[illegible] مقامات پر پہنچانے والا حاصل کر چکے ہیں۔ بہرکیف اس طرح [illegible] نہیں بلکہ اس روایت
سے [illegible] کو چھوڑ سکتا ہے۔

تاہم اگر ادبی روایت صرف گزری ہوئی نسل کی کامیابیوں کی اندھی تقلید یا کمزور پیروی کا نام ہو تو یقیناً ایسی روایت کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ روایت کے ایسے دھارے بہت جلد ریت میں پھنس کر گم ہو گئے۔ چنانچہ جدت تکرار سے کہیں بہتر ہے۔ ادبی روایت ایک بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ یہ ورثے میں حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے حصول میں آپ کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ادبی روایت کے ضمن میں تاریخی شعور سب سے پہلے ابھرتا ہے جس سے ہر وہ شخص [illegible] جو پچیس سال کی عمر سے زیادہ بحیثیت شاعر اپنا وجود منوانا چاہے۔ یہ تاریخی شعور ایک ایسی حس ہے جو نہ صرف ماضی کی ماضیت کا ادراک ہے بلکہ اس کی موجودگی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ تاریخی شعور ایک آدمی کو نہ صرف اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ محض اپنی نسل کے متعلق لکھے جو اس کی ہڈیوں میں رچی بسی ہے بلکہ اس احساس کے ساتھ لکھے کہ یورپ کا پورا ادب جو ہومر ([illegible]) سے شروع ہوتا ہے جس میں خود اس کے اپنے ملک کا ادب ایک ساتھ حیثیت رکھتا ہے ایک ہم عصر ضابطہ ہے۔ یہ تاریخی شعور جس میں زمانی اور ابدی کا بیک وقت شعور ہو اور دونوں کی یکجا شامل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہی شعور ایک شاعر کو روایتی بناتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہل قلم کو اس کے اپنے دور، اپنا مقام متعین کرنے میں صاحب شعور اور ذکی الحس بناتا ہے۔

کسی شاعر یا کسی فنکار کی کوئی علیحدہ مکمل حیثیت اور معنی نہیں ہوتے۔ اس کی اہمیت اور اچھائی دراصل اس کے ان تعلقات کی پسندیدگی میں مضمر ہے جو اسے اپنے مرحوم شاعروں اور فنکاروں سے ہوتی ہے۔ آپ اسے اس کی واحد حیثیت کے لحاظ سے نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کو اس کی انفرادی حیثیت ختم کرنی پڑتی ہے تاکہ آپ اس کا تقابل پچھلے لوگوں سے کر سکیں۔ اس سے میری مراد تاریخی اصول تنقید ہی نہیں بلکہ جمالیاتی اصول تنقید بھی ہے۔ جو اس لیے کہ کسی نئی کاوش کے جنم لینے میں جو [illegible] مطابقت کا مسئلہ آتا ہے ہمیشہ انہیں پریشانیوں سے پچھلی تصنیفوں اور کاوشوں کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ موجودہ ادبی یادگاریں خود ایک آئیڈیل ضابطہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں نئی کاوشوں سے ردوبدل کی جا سکتی ہے۔ موجودہ ضابطہ اس وقت تک مکمل رہتا ہے جب تک کہ کوئی نئی تصنیف وجود میں نہیں آتی کیونکہ کسی نئی اور اچھوتی چیز کی آمد پر پورا نظام [illegible] سے برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس اصول کا تجزیہ یہ ہوتا ہے کہ اس تناسب میں تبدیلی رد و بدل اور ایک دوسرے سے [illegible] تعلقات میں ہر چیز بجائے خود میں آتی ہے۔ یہی وہ مطابقت ہے جو نئے اور پرانے نظام میں پائی جاتی ہے۔ جو شخص بھی اس نظام تصور

ریپٹ کرتا ہے اور انگریزی یا یورپی ادب کو بھی اُسی طرز پرستش قرار دیتا ہے وہ اس امر کو ضروری خیال کرتا ہے کہ ماضی کو حال سے بدل دیا جائے لیکن یہ تبدیلی اُسی حد تک ہونی چاہیے جس حد تک ماضی نے حال کو متاثر کیا ہے۔ جو شاعر اس حقیقت سے آشنا ہے وہ یقیناً بہت سے مصائب اور بہت سی ذمہ داریوں سے بھی کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے۔

ایک مخصوص خیال کے مطابق اُس کی اس امر سے بھی آگاہی ضروری ہے کہ اُسے ماضی کے اصولوں پہ جانچا اور پرکھا جانا چاہیے۔ میں نے اپنے مدعا کے اظہار کے لیے جانچنے اور پرکھنے کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ ایسا لفظ جس سے توڑ پھوڑ کے معنی استنباط کیے جا سکیں۔ تاہم اوّل تو یہ تنقید اتنی اچھی یا اتنی بُری نہیں ہونی چاہیے کہ ہر گز شکستی کیفیت کا شکار ہو کر رہ جائیں اور دوم یہ تنقید حتمی طور سے پرانے ہی نقادوں کے اصولوں پر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ فیصلہ بھی ہے اور تقابل بھی جس سے دو چیزوں کو ناپا جا سکتا ہے۔ محض مطابقت کے معنی نئی تصنیف کے لیے یہ ہوں گے کہ فی الحقیقت مطابقت ہوا نہیں ہوا۔ اور یہ کاوش نئی ہرگز نہ متصور ہوگی اور ادب کا شہ پارہ نہ قرار پا سکے گی۔ ہم پوری طرح نہیں کہہ سکتے کہ نئی تصنیف فقط اس لیے بہتر ہے کہ حالات سے مطابقت کرتی ہے اگر یہ مطابقت اُس کی اہمیت کے لیے امتحان ضرور ہے۔ یہ امتحان حقیقتاً تدریجی اور سوچ سمجھ کر ہونے کا ارادہ چاہیے کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی شخص مطابقت کے لیے ایسے حکم کی حیثیت نہیں رکھتا جس سے غلطی سرزد ہونے کا امکان نہ ہو یا جسے ہم معصوم کہہ سکیں۔ ہم کہنے کو تو کہہ سکتے ہیں کہ کوئی کاوش بظاہر حالات سے مطابقت کرتی ہے یا منفرد ہے یا بظاہر منفرد نظر آتی ہے اور اس کا امکان رکھتی ہے کہ مطابقت کرے لیکن ہم یہ مشکل حتمی طور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے متعلق ہم کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقیقتاً وہی ہے کوئی اور دوسری چیز نہیں۔

مزید ذہنی خواہش کے لیے اگر کچھ بڑھا جائے تو اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا ہو گا کہ ایک شاعر کا اس کے ماضی سے کیا تعلق۔ ہم دیکھیں گے کہ نہ تو وہ اپنے ماضی کو ایک بے مصرف ڈھیر سمجھتا ہے اور نہ ہی اپنے ماضی کو ہر روگ کے لیے تریاق سمجھتا ہے۔ نہ وہ ایک آدھ ذاتی اور انفرادی تعریف سے اپنے آپ کو کلی طور سے ہم آہنگ کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی خاص دور سے اپنے آپ کو کلی طور سے متعلق کرتا ہے۔ پہلا طریقہ کار نامناسب ہے دوسرا شباب کا تجربہ ہے اور تیسرا ایک عمدہ اور پسندیدہ ضمیمہ ہے۔ شاعر کو ادب کے خاص دھاروں اور رجحانات کا علم ہونا چاہیے لیکن میلانات اور رجحانات کا ضروری نہیں کہ شہرت ہی صحیح و معیار ہو۔ اُسے سمجھنا چاہیے کہ ادب کا معیار کبھی بلند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب کا مواد کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ اس کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یورپ کا دماغ یا اس کے اپنے ملک کا دماغ یا ایسا دماغ جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ ذاتی اور انفرادی ذہانت سے بالاتر ہے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یہ تبدیلی ترقی کے مترادف ہے لیکن یہ ترقی درمیانی چیزوں کو کالعدم قرار نہیں دیتی۔ شیکسپیئر (Sha[illegible]) یا ہومر ([illegible]) یا [illegible] یعنی خاکوں ([illegible]) کو کوئی چیز منسوخ نہیں کی جا سکتی۔ یہ ترقی یہ تھا یا ایک معنوں میں ذہنی الجھاؤ کسی خاکے کے نقطۂ نظر سے ترقی کے مساوی نہیں اور نہ ہمارے معیار ہی کے مطابق یہ ترقی کہلانے کی مستحق ہے شاید آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ترقی مشینوں اور اقتصادی الجھاؤ کا نتیجہ ہے۔ ماضی اور حال کا یہ فرق در اصل احساس

اندر موجود عمل کی [illegible] ہے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ اسے کنا … کا عمل نہیں کہا جا سکتا۔
کسی شخص کا قول ہے۔

"مرحوم قوم کا رہ سب سے پہلے ہیں کیونکہ ہم ان سے سب سے زیادہ جانتے ہیں۔"

حضرات یہ وہ باتیں ہیں جن کو ہم بخوبی جانتے ہیں۔

میں اس عام اعتراض کے جواب کے لیے اتنا حاضر و آمادہ ہوں کہ بتا سکوں کہ نظم کا کیا کام ہے اور یہ سب کلام کا مجموعہ ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ شاعری کے لیے بے اندازہ تجربہ علم کی ضرورت ہے۔ علم ہی ایک اہم اصول ہے جو ہر دور کے شاعروں کی حیات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ علم کی بہتات شاعری کو مضمحل کر دیتی ہے۔ تاہم اس یقین پر ہم بجا ہیں کہ ایک شاعر کو کم از کم اس حد تک ضرور جاننا چاہیے جو اس کی ضروریات کے لیے ضروری ہو۔ میں اتنے وقت اور مناسب کسب علم سے نیز اپنے ذہنی کاہلی کا شکار نہ ہو جائے۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ علم کو اس حد تک محدود کیا جائے کہ وہ صرف فائدہ مند شکلوں ہی میں تبدیل کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر جس کا امتحان لیا جا سکے یا جسے ڈرائنگ روم کی زینت بنایا جا سکے یا جسے تشہیر کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ بہت سے لوگ علم کو جذب و کسب کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ بہت سے جاہل اس کے بوجھ تلے پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ شیکسپیئر (Shakespeare) نے پلوٹارک (Plutarch) سے اتنی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ضروری تاریخی مواد حاصل کیا ہے جتنوں نے پورے برٹش میوزیم سے استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے — اب یہاں جس چیز پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ شاعر اس امر کی صلاحیت رکھتا ہو جس سے وہ ماضی کی آگاہی حاصل کر سکے اور ماضی کو کما حقہ تفصیل سے پیش کر سکے۔ یہ صلاحیت اس کی اپنی پوری ادبی زندگی میں جاری و ساری رہنی چاہیے۔

ہوتا یہ ہے کہ ایک فن کار کو اپنی مسلسل خود سپردگی اعلیٰ قدروں کے حوالے کرنی پڑتی ہے۔ ایک فن کار کی کامیابی اور ترقی کا انحصار اس کی اپنی مسلسل قربانی اور شخصیت کی موت پر منحصر ہے۔

اب باقی یہ رہ جاتا ہے کہ اس عمل کی تعریف کی جائے جس کی رو سے شخصیت کی نفی حاصل ہو سکے اور اس ضمن میں شخصیت کا ادبی روایت کے تصور سے تعلق بتایا جا سکے۔ اسی عدم شخصیت کی رو سے ادب اور فن سائنس کے درجے تک پہنچتا ہے۔ میں اس سلسلے میں درخواست کروں گا کہ ذیل کی مثال کی روشنی میں آپ غور فرمائیں اور کسی نتیجے پر پہنچیں کہ کیمیائی عمل کا کیا ردعمل ہوگا جب ہم ایک پلاٹینم کے عمدہ تار کو ایک ایسے خانے سے گزاریں جس میں آکسیجن اور سلفر ڈائی آکسائیڈ دونوں موجود ہوں۔

(۲)

حقیقتاً دیانت دارانہ تنقید اور تعریف کا رخ شاعر کی طرف نہیں بلکہ شاعری کی طرف ہوتا ہے نہ کہ شاعر۔ اگر ہم اخباری نقادوں کے بے ہنگم شور و غل اور … کے پہلے سروں میں عام تاثر پر غور کرتے ہیں تو ہمیں شاعروں کے ناموں کی تعداد میں کم ملتے ہیں …

مریم جب (؟) نیکی مرکز کی اشاعت پر بہرہ ور ہو سکتے ہوتے شاعری سے صرف حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم مشکل ہی سے [illegible] سکتے ہیں جس کا یہیں تلاش ہے۔ میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ اس چیز کو بیان کیا جائے کہ ایک نظم کا دوسرے مختلف [illegible] کی نظموں سے کیا رشتہ اور تعلق ہے نیز شاعری کا ایسا تصور پیش کیا ہے کہ وہ تمام شاعری کو جو کبھی بھی نظم کی گئی ہو اصل ایک زندہ کل ہے۔ دوسرا رخ اس نظریہ غیر شخصی شاعری کا ہے کہ نئی نظم کا اس کے مصنف شاعر سے کیا تعلق ہے۔

میں نے ایک تمثیل کی مدد سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ پختہ دماغ شاعر غیر پختہ دماغ شاعر سے نہ صرف شخصی حیثیت سے مختلف ہوتا ہے جو کہ عام طور سے پسندیدہ نہ ہو بلکہ ایک کل منفرد کی شدت میں منفرد ہوتا ہے جو ہر قسم کے احساسات و خیالات کو نئے انداز میں ترتیب دے سکے۔ یہ تمثیل ترکیب کیمیاوی عمل کی اس تجربے سے ظاہر ہے جب کہ متذکرہ بالا گیس ایک پلاٹینم کے تار کی موجودگی میں ملتی ہیں تو تیزاب سلفیورک کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ مرکب اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب پلاٹینم موجود ہو تاہم یہ نیا تیزاب پلاٹینم کا کوئی جزو نہیں رکھتا اور نہ ہی بظاہر اس عمل سے پلاٹینم متاثر ہوتا ہے۔ درحقیقت پلاٹینم ساکن، غیر متعلق اور ناقابل تبدیل رہتا ہے۔ شاعر کا دماغ پلاٹینم کے تار سے مشابہ ہے۔ یہ جزوی یا خصوصی طور سے کسی شخص کے اپنے تجربے پر عمل کرتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جتنا زیادہ پختہ فن کار ہوگا اتنا ہی اس میں زیادہ شدت سے الگ الگ اس کے اندر کا انسان جو کام کو کرتا ہے اور اس کا اپنا دماغ ہوگا جو تخلیق کرتا ہے۔ غرض اسی شدت سے اس کا مکمل دماغ جذبات و احساسات جو اس کے مواد ہیں مکمل طور پر ہضم کر سکے گا اور ان کو ترسیل بھی کر سکے گا۔ اس تجربے کی روشنی میں آپ دیکھیں گے کہ غیر متوقع تبدیل ہونے والی شے (شاعر کا دماغ) کی موجودگی میں جو دو عناصر داخل ہوتے ہیں وہ اصل میں جذبات اور احساسات ہیں۔ کوئی شعر یا کسی ادبی یا فنی تخلیق کو دیکھ کر حظ حاصل کرتا ہے وہ اس اثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو وہ غیر ادبی شے سے تجربے کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی واحد جذبے کا اثر ہو یا مختلف جذبات کا میل ہو۔ مختلف احساسات جو کسی مصنف کو خاص لفظوں یا محاوروں یا پیرایوں کی صورت میں شاعر [illegible] کے ظاہر ہوتے ہیں دراصل کسی تخلیق کو کمال تک پہنچانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بہتر سے بہتر شاعری بغیر جذبات کے استعمال کیے صرف احساسات کی مدد سے ظہور میں آ سکتی ہے۔ انفرنو ([illegible]) کے پندرھویں کینٹو (برونیتو لاطینی)* میں جذبات تیزی کا عمل دخل ہے جیسا کہ اس کی [illegible] ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا اثر گر کر تنہا اور واضح ہے جیسا کہ کسی دوسرے ادبی شاہکار کا ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں [illegible] کی تفصیل کا نتیجہ ہے۔ آخری بند ایک ایسا تصور پیش کرتا ہے جو نہ صرف خود بخود ظہور میں آتا ہے اور کچھ متعلقات کی مدد سے بڑھتا ہے بلکہ شاعر کے دماغ میں غیر یقینی صورت میں باقی رہتا ہے جب تک کہ ایک مناسب ترکیب اضافے کے لیے داخل نہیں ہو جاتا۔ . . . . شاعر کا دماغ دراصل بے شمار احساسات، محاورات اور تصورات کے لیے اکتساب اور ترسیل کا ایک [illegible] ہے۔ جہاں یہ اس وقت تک رہتے

---

* Brunetto Latini

میں آ کر شامل ہو جانے تک ایک نیا مرکب بنانے میں شامل ہونے کے لیے موجود رہا تھا۔
اگر آپ بڑی اعلیٰ شاعری کے مختلف اقتباسات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ شاعری کس قدر وسیع اور مختلف قسم ارتباطات کا مجموعہ ہے اور یہ کہ "رفعت" کا کوئی نیم اخلاقی معیار اس نقطہ نظر سے کتنا بے کار ہے کیونکہ "جذبات" کی عظمت یا شدت سے فرق نہیں بلکہ فنی عمل اور اس دباؤ کی شدت کا تعلق ہے جو ترکیب کے دباؤ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاؤلو (Paolo) اور فرانسسکا (Francesca) کا قصہ ایک خاص جذبہ کی عکاسی کرتا ہے لیکن شاعری میں شدت بالکل ہی ایک چیز ہوتی ہے اور اس تجربے سے قطعاً الگ ہے جو کسی شے سے متاثر ہو کر حاصل کیا جاتا ہے۔ علاوہ اس کی شدت اس درجہ نہیں ہے جتنی کہ کینٹو چھبیس، یولیسس کے سفر میں ہے جس میں جذبات کو براہ راست معنویت حاصل نہیں ہے۔ جذبات کی مختلف شکلیں بدلنے کے بے شمار طریقے ممکنات میں سے ہیں۔ آگامینن (Agamemnon) کا قتل یا اوتھیلو (Othello) کی پریشانی ایک اصلی اور فنی اثر پیدا کرتے ہیں جو بظاہر دانتے سے اچھا پیش کرتے ہیں جو کہ دانتے (Dante) کے مناظر سے زیادہ قریب کے حامل ہیں۔ آگامینن میں فنی جذبات کا اثر حقیقی تماشائی کے جذبات کے قریب تر ہوتا ہے۔ اوتھیلو میں یہ جذبات اداکار خصوصی کی حد تک محدود رہتا ہے۔ آگامینن کے قتل میں جو اجزا کا اجتماع اتصالی پیچیدہ اسی طرح ہے جتنا یولیسس کے سفر میں ہے اور ہر دو صورتوں میں عناصر کا پگھلنے والا ایک عمل ہے۔ کیٹس (Keats) کی اوڈ "عندلیب کو" بہت سے قسم کے احساسات کا مرقع ہے جن کا عندلیب کی ذات سے کوئی تعلق نہیں لیکن جو غالباً ایک حد تک اس کے خوبصورت نام کی وجہ سے اور کسی حد تک اپنی شہرت کی باعث اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ یکجا ہو سکیں۔

میں جس نقطہ نظر کو رد کرنا چاہتا ہوں وہ دراصل کچھ ارتقاء روح کا مابعد الطبیعاتی نظریہ ہے۔ میرا مقصد یہ کہ شاعر کے پاس اظہار کے لیے اپنی "شخصیت" نہیں بلکہ ایک خاص ذریعہ (میڈیم) ہے جو کہ فقط ذریعہ ہوتا ہے شخصیت نہیں جس میں تجربات و تاثرات انوکھے طور سے متحد ہو جاتے ہیں۔ تاثرات و تجربات جو انسان کے لیے اہم حیثیت رکھتے ہیں شاعری میں ان کا کوئی مقام نہیں ہوتا اور جو تاثرات شاعری میں کچھ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں وہ انسان اور انسان شخصیت کے لیے غیر اہم ہو سکتے ہیں۔

میں ایک نظم کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس کو اس لیے غیر مانوس تر رہنے دے کر اسے مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں نئی توجہ حاصل ہو جائے۔ ۔

میں سوچتا ہوں کیوں نہ اپنی ذات کو ملامت کروں
کہ عاشق اس کے حسن کا پرستار رہا
جس کی موت کے مستحق ہو تم اس کا شدید انتقام لیا جائے گا

کیا یہ ریشم کا کیڑا تیری خاطر اپنی سنہری محنت طول کرتا ہے؟
کیا مرغ تیرے لیے وہ موت کے منہ میں جانا پسند کرتا ہے؟
کیا صاحبِ مقدرت اپنی بیگمات کی پل بھر کی خوشی کے لیے اپنے زیور ڈالتے ہیں؟
کیوں وہ شخص صراطِ مستقیم سے بھٹکتا ہے،
اور اپنی زندگی قاضی کے کشمکش لب کے حوالے کرتا ہے۔
(کیا اس لیے کہ وہ) اپنے نظریات کو جلا دے سکے،
اور نوبت و نقارہ رکھ کر اپنی بہادری کا ڈھنڈورا پیٹ سکے۔

یہ اقتباس (جیسا کہ سیاق و سباق سے ظاہر ہے) منفی اور مثبت جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ایک طرف تو حسن کے لیے ایک شدید اور مجبورانہ قسم کی کشش ہے اور دوسری طرف اتنی شدت سے دوسری کی طرف رغبت بھی ہے جو ہر پہلے کا اثر زبردست متناسب بلکہ پہلا کا اثر ختم بھی کر دیتی ہے۔ یہی متضاد جذبات کا بیلنس ڈرامائی پوزیشن کی جان ہے جس کے لیے زبان خاص اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن صرف پوزیشن ہی اس کے لیے کافی نہیں۔ یہ دراصل ایک ترتیبی اور ترکیبی جذبہ ہے جسے زبان مہیا کرتا ہے۔ لیکن یہ کل تاثر اور فلسفہ ہر بے شمار تنگ و محسوسات کا تجربہ ہے جو ایسے جذبات سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا لیکن دراصل یہی جذبہ دوسرے اجزا سے مل کر ایک نئے 'ادبی جذبہ' کی تخلیق کرتا ہے۔

کوئی شاعر اپنے ذاتی جذبات یا اپنی زندگی کے خاص واقعات کی وجہ سے ممتاز اور پسندیدہ شمار نہیں کیا جاتا [illegible] خاص جذبات سادے سے سادے عام اور سپاٹ ہو سکتے ہیں۔ لیکن شاعری میں یہی جذبہ انتہائی پیچیدہ اور الجھی ہوئی [illegible] بات ہے مگر اس وجہ پیچیدگی نہیں جیسے عام لوگ اپنی زندگی میں غیر معمولی اور الجھے ہوئے جذبات رکھتے ہیں۔ [illegible] ایک شاعرانہ مذاق اور غلطی ہے کہ شاعری میں نئے انسانی جذبات کے اظہار کی راہیں ڈھونڈی جائیں اور پھر وہ [illegible] پر اس جدت کی تلاش کی جائے جس کا نتیجہ فن کے غیر فطری پن پر ختم ہوتا ہے۔ شاعر کا کام یہ نہیں ہے کہ نئے جذبات [illegible] بلکہ اس کا کام عام جذبات کی شاعری اور ان کا استعمال ہے۔ انہیں محسوسات کا اظہار کرنا ہے جو حقیقی جذبات [illegible] نہیں رکھتے اور ایسے ہی جذبات کا شاعرانہ استعمال کرنا ہے جن کا اسے بذاتِ خود تجربہ نہ ہو۔ انہیں [illegible] سے [illegible] وہ مقصد [illegible] کا قوی امکان ہے۔ چنانچہ ہمیں باور کرایا ہے کہ جذبات کا سکون کی حالت میں [illegible] لی جا سکتی [illegible] صورت میں تو ہو سکتے ہیں مگر [illegible] ہوئی باتیں [illegible] ہیں جو غالب ہے جب تک [illegible] کی صورت اور ہیئت میں تبدیلی نہ کی جائے جو اس سکونی کیفیت [illegible] کیفیت کا [illegible] اس کے تجربہ کے نتیجے [illegible] ہیں [illegible] ہیں جیسے ایک ہوشیار اور باعمل [illegible] تجربات کا درجہ نہیں دیتا۔ [illegible]

ان تجربات [illegible] کی بات کی [illegible] بہت [illegible] تجربات کا اس طرح ۱۷۰۰ء [illegible] لازمی [illegible] حال ہے۔ [illegible] جیسی [illegible] بہت [illegible] کر کر شاعری کرنے کا [illegible] ہے۔ حقیقت میں خوب شاعری [illegible] جذبہ [illegible] اس میں جگہ [illegible] کا ثبوت دے جاں اس سے پہلے جذبہ زیادہ شدت سے ہے۔ دونوں خیال اس کے فنی شخصی [illegible] شاعری [illegible] جذبات [illegible] کام [illegible] جذبات سے [illegible] کام ہے۔ یہ شخصیت کے اظہار نہیں بلکہ اس سے گریز کا عمل ہے۔ [illegible] شخصیت اور جذبات دونوں کے مالک ہیں یہ بات [illegible] سکتے ہیں کہ ان دونوں چیزوں سے گریز کیا معنی رکھتا ہے۔

(۳)

"دماغ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ [illegible] کا حال ہے اور اپنی جگہ ایک غیر متاثر حیثیت رکھتا ہے:" * (ارسطو۔ ڈی۔ انیما۔ باب چہارم)

اس ضمن میں [illegible] قریب ہو کر جانا چاہیے۔ اس [illegible] نتائج تک [illegible] چاہیے۔ شاعری میں دلچسپی لینے والا [illegible] کرے۔ شاعر سے [illegible] شاعری کی طرف [illegible] قابل ستائش [illegible] کیونکہ یہ عمل اس کی ماہیت کا تجزیہ کرنے میں [illegible] اور [illegible] حقیقی شاعری کا [illegible] بہت سے [illegible] پر خلوص اظہار کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کم ایسے ہیں جو فنی مہارت کو پہچان سکتے ہیں [illegible] یہ جان سکیں کہ اہم اور خاص جذبے کا کب اظہار ہوتا ہے جس کی حیات کے نشان [illegible] شاعر کی سوانح میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ شاعر اپنی شخصیت کی اس وقت تک نفی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ جس کام کی تکمیل [illegible] اپنے کو [illegible] کے حوالے نہ کر دے۔ اور نہ ہی اس وقت تک جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے تا وقتیکہ وہ اپنے دور میں نہ صرف جینے کا [illegible] بلکہ [illegible] کے موجودہ [illegible] گزری ہوئی باتوں کا ہی نہیں بلکہ اپنے دور کی موجود اور زندہ حقیقتوں کا بھی علم ہو چکا ہے۔

---

* Aristotle, De Anima, Chap. IV

چہار شنبہ مبارک

(ابتدائیہ)

شاعر: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ مترجم: سید فیضی

بیتی باتوں کی طرف لوٹ کے جانے کی مجھے ،
اب نہیں خواہش کوئی !
اب کوئی امید نہیں
اب نہیں خواہش کوئی!
اب یہ خواہش بھی نہیں ہے
کہ کسی کا مجھے اسلوبِ فراواں مل جائے ،
یہ تمنا بھی نہیں ہے کہ مجھے
غیر کی قدرِ فراواں مل جائے
میں اب ان چیزوں کی خاطر
کسی کوشش کے لیے بھی تو نہیں ہوں کوشاں
سال خوردہ پر جوشاہیں
تو پرواز کو پر کس کے لیے پھیلائے !
عہدِ رفتہ کی گئی تاب و تواں
ماتمی کیوں مجھے اپنا ٹھہرائے

(۲)

میرا اب ساعتِ رفتہ کے ذرا یاب قبل سے
نہ ملنا ہوگا !
اور وہ میرے خیالوں میں بھی اب
بار نہیں پا سکتی
اور میں جان گیا ہوں
کہ یہ بس رفتہ لمحوں کی نشانی کو اب
پھر سے نہ پاؤں گا کبھی ،
اب میں سایۂ گل میں اب جو
بر سرِ کشتِ زیست نہیں ہو سکتا

(۳)

اور میں جان گیا ہوں کہ
زماں تو ہے سدا سے قائم !
اور میں جان گیا ہوں کہ
متعلق جنہیں کہتے ہیں وہ اک خاص زماں
خاص مکاں کے ہیں فقط زمانی !
میں اس ایک سے ہی خوش ہوں
کہ یہ عادتِ اشیاء تو یہی ہے اگر جو ہے !!
اب کسی چہرہ و شادابی
گنگناتی ہوئی آواز

[illegible] کہا ہے
ابھی اور اک سبب سے خوش ہوں
کہ میں اپنی خوشی کے لیے
جیا اور جی سکتا ہوں
اور ـــ اللہ سے دعا کرتا ہوں
کہتا ہوں ـــ کہ

اے میرے خدا
مجھ کو ہر چیز بھلا دینے کی توفیق عطا کر دے
کہ میں ـــ
خود سے،
ہر اک بحث کے الجھاوے سے،
ہر اک بات کی تفصیل سے
آزاد رہوں:
وہ ـــ کہ جو ہو چکا
اب پھر تو نہیں ہو سکتا!
واپس رفتہ کی طرف
میرا پلٹنا بھی نہیں ہو سکتا!!

یہ دعا ہے ـــ
کہ ترا اصل ہمیں
تیری عنایت ہی سے دوچار کرے
یہ پر و بال کہیں ـــ
اب پرِ پرواز نہیں،
یہ پر و بال ـــ
جتنا بھی کر سکتے ہیں!
یہ تھکا ماندہ ہوا
خشک ہوا!!
میرے دل سے بھی تنگ آیا ہوا،
خشک ہوا!!

اے خدا!
ہم کو یہ توفیق عطا کر دے
کہ ہم شکر کریں،
غم نہ کریں،
اور سکون اور تسلی کے بھی پیکر بن جائیں!

ہم گنہگاروں کی خاطر،
کر دو کچھ اب بھی دعا!
اور
دمِ آخر بھی دعا!!
ہم گنہگاروں کی خاطر کر دو،
کچھ اب بھی دعا!
اور ـــ
دمِ آخر بھی دعا!

آنگن اور اندھیرا

عذرا بخاری

زندگی گویا صفت کا ایک ایسا مشکل سوال بن کر گلے میں اٹک گئی تھی جیسے اس کی جان کہیں اٹک گئی ہو۔ نہ اتارے بنے نہ اُگلے بنے۔ عجب مصیبت تھی۔

کمرے کی فضا سخت بیزار کن اور بوجھل ہو گئی تھی۔ فرخندہ اکثر کھڑکی کے قریب کھڑی گھنٹوں فضا سے اس کے بند کواڑوں کو گھورا کرتی رہتی۔ اور جب اسے شعوری طور پر یقین ہو جاتا کہ کھڑکی بند اور مقفل ہے تو اسے اچانک کمرہ پہلے سے زیادہ تنگ اور گھٹا گھٹا محسوس ہونے لگتا۔ تب اس کا جی چاہتا کہ بند کواڑ اور تنگ ہوتی دیواروں کے ساتھ سر پھوڑ کر مر جائے۔ مگر اسی وقت اسے محسوس ہوتا کہ آپا اپنی سرخ آنکھوں سے گھورنے کے ساتھ لگے اسے اچانک سہم جاتی سردی کی ایک لہر اس کی رگوں میں دوڑ جاتی۔ وہ پھر سہم کر دروازے کی طرف دیکھتی رہتی۔ اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ دروازے میں کوئی شخص موجود نہیں، تو وہ ایک گہری سی نظر کمرے کے چاروں طرف ڈالتی۔

بشریٰ کی چارپائی اب بھی کھڑکی کے قریب جوں کی توں پڑی تھی۔ اسے یاد تھا سب سے پہلے وہ اس گھر میں آکر رہے تھے تو بشریٰ نے کیسے جبر سے اس سے یہ جگہ چھینی تھی۔ لیکن اب بشریٰ کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بشریٰ کی چارپائی کو وہاں سے ہٹانے کی ہمت نہیں کر سکی تھی۔ وہ خوفزدہ تھی کہیں کوئی اسے بشریٰ جیسا نہ سمجھنے لگے۔ وہ بشریٰ نہیں تھی۔ فرخندہ تھی۔ سر سے پیر تک فرخندہ اپنی اس الگ تھلگ شخصیت کو منوانے پر بضد۔ سردی کی سختی اور برسات کی حبس راتوں میں بھی وہ اپنے اسی کونے میں سوتی جہاں ہوا اور روشنی کا گزر تک نہ تھا اور بشریٰ کی چارپائی اسی اکڑ اور ڈھٹائی کے ساتھ وہاں پڑی تھی۔ ابا اور اماں کو بھی اسے وہاں سے ہٹانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ بستر کی چادر پڑے پڑے میلی ہو گئی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اماں سے کہے کہ بھلا اسے دھو کیوں نہیں جاتا۔ لیکن پھر وہ چپ رہی۔ اور بھی تو بہت سی ایسی باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ چپ تھی۔

مثلاً بشریٰ کی وہ تصویر جو ایک پرانی طرز کے فریم میں جڑی میز پر رکھی تھی۔ اور وہ بشریٰ بھی کس قدر آمرانہ خیالات کی مالک تھی۔ کمرے کی واحد میز کو اس نے صرف اپنی تصویر کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس میز پر فرخندہ کا بھی بشریٰ جتنا ہی حق تھا۔ لیکن اب بشریٰ کے جانے کے بعد بھی اس کی تصویر میز پر پہلے کی طرح قبضہ جمائے تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک دن ابا نے کمرے کا جائزہ لیا سونگھ سونگھ کر دیکھتے ہوئے اس تصویر کو الٹا کر دیا تھا اور اب۔ فرخندہ کو تصویر میں بشریٰ کے بے نیاز چہرے پر پھیلی ہوئی ناگواری سی مسکراہٹ نظر آتی تھی۔ اس تصویر کے علاوہ ایک ہی تھا یہ بھی بشریٰ کی ملکیت میں تھا۔ اس چھت میں اوپر تلے نہایت بھیانک

[illegible] ناول اور رسالے زیادہ تر وہ تھے جو کسی سے پڑھنے کے لئے [illegible]
[illegible] کتابیں اور [illegible] بشریٰ نے دو بڑی سے ہٹ کر پچھلی [illegible] ایک ساتھ [illegible]
سلسلے [illegible] خریدے جاتے ہی تھے۔ [illegible] کتابوں [illegible] خاص طور پر [illegible] ساتھ [illegible]
اُستاد ہوتے ہیں کچھ رسالے بھی۔ ابا کو جتنی چڑ تھی ایسی کتابوں اور رسالوں سے، اتنا ہی بشریٰ انہیں ٹھونس ٹھونس کر [illegible] رکھتی
[illegible] کر رکھتی۔ ابا کو سب معلوم تھا، مگر بشریٰ کا پیار جیسے قفل بن کر ان کے ہونٹوں پر لگ گیا تھا۔

بس یونہی کبھی اماں سے دبی زبان میں ذکر کر دیتے۔

"یہ بشریٰ کتابیں خریدنے کو اتنے پیسے کہاں سے لیتی ہے؟"

"میں کیا جانوں۔ جیب خرچ سے بچا لیتی ہوگی۔" اماں جیسے پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔

"بہت خود سر ہو گئی ہے۔" ابا کا لہجہ اور دھیما ہو جاتا۔

"پیار میں بچے بگڑتے ہی ہیں۔ نفرت تو کبھی دیکھی نہ دیکھی۔" اماں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگتیں۔

"آپ جو ٹھیک ہو جانے کی بات کہہ رہے ہیں نا۔" ابا بات کے سنجیدہ پہلو کو بچانے کی کوشش کرتے تو اماں تڑخ کر جواب دیتیں

"بچپن تو اس کا سارا گزر چکا ہے۔ سیانے کہتے ہیں۔ لڑکا بگڑے تو گھر بگڑے۔ لڑکی بگڑے تو [illegible] بگڑے۔ مگر آپ کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بس چپ۔ بے وقوف۔ جاہل۔ کچھ سوچتی ہی نہیں بس بولتی چلی جاتی ہے۔" ابا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو جاتیں۔ ان کی گرج کے آگے اماں کی کیا ہستی۔ مگر وہ پھر بھی خاموش نہ ہوتیں۔

"تم بھی جانتے ہو کہ وہ شادی کے نام سے کتنی چڑتی اور نفرت کرتی ہے۔ لڑکیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ یہ کوئی گھر رکھنے کی چیز تھوڑی ہیں۔"

"اب وہ جوان ہو گئی ہے تو جانے کیا ہو۔ کیا میں اپنا سر پھوڑ کر مر جاؤں؟ لڑکی کو کسی کنوئیں میں دھکیل دوں؟ کچھ مل بیٹھ کر کوئی مناسب رشتہ ہو تو بات بھی کروں۔"

ابا جیسے تھک ہار کر جواب دیتے۔

"رشتہ تو ڈھونڈنے ہی سے ملے گا۔" اماں کہتیں۔

"ڈھونڈ کر کہاں جاؤں۔ سب پیسے کے پیر ہیں۔ ہم غریبوں کو تو خدا ہی ڈھونڈے تو بات بنے۔"

"تو پھر تم اپنے جیسا گھرانہ ڈھونڈو۔ بات پکی کر چھوڑیں اگلے سال شادی ہو جائے۔"

"اور تم سے تو بات کرنا مصیبت مول لینا ہے۔ ایک دفعہ کہہ دیا ہو جائے گا سب کچھ۔ اب کچھ نہ بولنا۔" ابا کے سر پہ غصے کا جوالا مکھی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ دونوں خاموش ہو جاتے۔

وہ شرمندہ سی سوچتی رہ جاتی۔ واقعی ابا کو شادی کے نام سے اتنی چڑ کیوں ہے۔ دو سال بیت گئے۔ [illegible] کی ہر کوشش [illegible]

کی سرد مہری کے آگے پانی کا بلبلہ ثابت ہوئی۔ بشریٰ ایک دفعہ بی اے میں فیل ہو کر پھر اس کی تیاری میں مشغول تھی۔ اب اس نے ماں کی ان کوششوں میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔

اب اس سلسلے میں کوئی عورت ان کے ہاں آتی اور اماں اسے اندر جانے کو کہتیں تو وہ فوراً انکار سے جواب دیتی۔

"فرخندہ کو دکھا دیجئے۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟" اماں تیکھی ہو کر پوچھتیں۔

"میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔" بشریٰ فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیتی۔ "بی اے کر کے میرا ارادہ سروس کرنے کا ہے۔"

اماں بے چاری عجب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ ایک طرف ابا اس کے کاموں میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ دوسری طرف صاحبزادی اکڑ بیٹھی تھیں۔

ابا بشریٰ کی باتیں سنتے اور چپ رہتے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ابا کو بشریٰ پہلے سے زیادہ عزیز ہو گئی تھی۔ بشریٰ بشریٰ کرتے ان کا منہ نہ سوکھتا۔ باہر سے جب بھی آتے بشریٰ کے لئے ضرور کچھ لاتے۔ یوں لگتا تھا جیسے بشریٰ کے ارادوں سے ابا خوش تھے۔

لیکن یہ تو صرف فرخندہ کو معلوم تھا کہ بشریٰ کے ارادے کیا تھے۔ دو سال کے اس ناٹک نے جو ابا اور اماں اس کی شادی کے بارے میں کھیلتے رہے تھے آخر اب اس کے اندر کسی نئے جذبہ کو بیدار کر دیا تھا۔ اور اب وہ کیوں اس بات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔

وہ بشریٰ کی رازداں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی رازداں تھی۔ وہ سب حالات کی بات بشریٰ نے بیان بھی کی، صاف دل سے کام لیا تھا اور جذبہ ایک منزل کے [illegible] اس کی خواہش اور رائے کا خیال کئے بنا اپنے حق میں طے کیا تھا۔

باتیں چلتے ہوئے جب وہ اچانک اس سے کہتی "فرخندہ آج میں کچھ دیر سے آؤں گی اماں سے کہہ دینا، ذرا ان کلاس کی لڑکی کلثوم جا رہی ہے" تو فرخندہ کچھ جواب نہ دیتی لیکن گھر پہنچ کر اماں کے استفسار پر پیچھے سے بشریٰ کے الفاظ دہرا دیتی۔

اماں سن کر چپ کی چپ رہ جاتیں۔ ابا کے [illegible] ایک لفظ کہنے کے لئے تیار ہو جاتا، بولیں بس وہ سنبھل کر کہتے "اور یہی تو مصیبت ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی کلثوم۔ پڑھائی کم اور کلثوم زیادہ۔ تم بھی فرخندہ اس کے ساتھ رک جایا کرو۔ اب وہ کیسے آئے گی۔ اچھا میں جا کر لے آؤں گا۔" اور فرخندہ ایک دم گھبرا کے کہتی "دوسری [illegible] والی سب ہی لڑکیاں ہیں۔ وہ ان ہی کے ساتھ ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

ابا کے گرتے وجود کو جیسے سہارا مل جاتا۔

"تمہی دو سر پہ ہاتھ رکھ کر رو گے۔" اماں تنک کے کہتیں۔

"تم تو فضول ہی کچھ بکتی ہو۔" ابا [illegible] سے جواب دے کر [illegible] بیٹیاں [illegible] سب [illegible] جانتے ہیں۔ بشریٰ نے آپا پر بھی دھونس جما کر انہیں اپنا رازداں بنا لیا ہے۔

تب وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں آ جاتی۔ یہ کمرہ ان کے ہاں بشریٰ کے لئے وقف تھا [illegible]

کھلا کر وہ جھٹ سے بیٹھ میں جا گھسی۔ [illegible] بیگوں کو ایک قطار پہ پھر پھر آئی [illegible] کا کمرہ [illegible] جاگ۔ وہ سوچتی اس وقت بشریٰ اخلاق کے ساتھ کسی سینما ہاؤس میں فلم دیکھ رہی ہوگی۔ اخلاق سے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ [illegible] دیکھا تھا اور وہ بھی چند ایک بار۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکی ہے۔

اسے افسوس تھا کہ بشریٰ اخلاق کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ لیکن وہ خود اکثر سوچتی رہتی۔ بشریٰ کے پاس جو اونچے اور خوبصورت خواب ہیں اخلاق ان کی تعبیر نہیں بن سکتا۔ بشریٰ اس چھوٹے سے گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں پرواز کرنا چاہتی ہے۔ اسے [illegible] سے بھرپور ہنگامی زندگی چاہئے۔ اسے بہاروں سے محبت ہے۔ اس کے خواب بہت خوبصورت اور بہت قیمتی ہیں، اخلاق انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ بشریٰ کو سمجھائے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بشریٰ ایک تحقیر آمیز تبسم کے ساتھ اسے [illegible] بشریٰ بہت زیادہ جذباتی تھی اور اخلاق کے بارے میں تو وہ انتہائی شدت پسند ثابت ہو رہی تھی۔ وہ خاموش طبع تھی اور اس کی خاموشی میں وہ [illegible] جیسا کہ [illegible] اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

[illegible] ابھی ابھی [illegible] تھے۔ اور وہ [illegible] کا جھونکا سا [illegible] سے کمرے [illegible] جل رہی تھی اور [illegible] جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سامنے سیڑھیوں کا [illegible] ایک منزل کی طرف نظر آ رہا تھا۔ اور ابھی ابھی بشریٰ [illegible] چلا جانے والے راستوں کی قطاروں کے درمیان [illegible] ایک راستے پر خوشی کے جگنو جلے تھے [illegible] فضا میں گم ہو گئی تھی۔ بشریٰ کو تو بہاروں سے پیار تھا۔ پھر وہ کیوں [illegible] اتر گئی تھی۔ [illegible] روشنی پانے کے لئے [illegible] وہ کانپ کانپ کر [illegible] جا رہی تھی اور اس [illegible] میں [illegible] کے ساتھ [illegible] تھی۔ بشریٰ نے اس کی مرضی کے خلاف اس پر اعتماد کر کے اسے ایک بڑی الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک مجرم محسوس کر رہی تھی۔ [illegible] پھر اس سے چھپ کر [illegible] نہیں گیا۔ ایک بار اس کا جی [illegible] بشریٰ [illegible] کوشش کرے۔ مگر پھر [illegible] گھر ہی رہی۔

[illegible] کی [illegible] ہنستی ہنستی آنکھوں کے ساتھ [illegible] اس پر [illegible] کی [illegible] بستر میں [illegible] اس کی ماں [illegible] کو [illegible] پر بیٹھنے لگی۔ [illegible] بشریٰ آ گئی۔ [illegible] ایک دوسری پر بیٹھنے چلی گئیں۔ ساری رات وہ ایک [illegible] کی طرف دیکھتی رہی۔

صبح ماں نے اسے آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ ایک پراسرار افسردگی طاری تھی اور دل و دماغ بوجھل ہو رہے تھے۔ ماں نے ابا کو جگانے اور بشریٰ کو اوپر سے بلانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ اور وہ حیرت میں ڈوبی اپنی چارپائی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ابا کو تو وہ جگا دے گی۔ مگر بشریٰ کو وہ کہاں سے لائے گی۔ بشریٰ جو وہم کی طرح ہر جگہ تھی بھی اور نہیں بھی تھی۔ ماں کی دوسری آواز پر وہ مجبوراً اٹھی اور کوٹھے کی سیڑھیوں پر زور سے پاؤں مارتی اوپر گئی اور سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے آواز نکالی: "اے بشریٰ اوپر ہو؟" لیکن بشریٰ اوپر نہیں تھی۔ وہ آہستگی سے نیچے اتری۔

"بشریٰ اوپر نہیں ہے۔" ماں کو یہ اطلاع دیتے وقت اسے آواز کو حلق سے کھینچ کر نکالنا پڑا۔

"اوپر نہیں ہے؟" ماں کے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر زمین پر آ رہی۔

"غسل خانے میں دیکھو۔" اور پھر اسے غسل خانے کے علاوہ گھر کا کونہ کونہ دیکھنا پڑا۔ لیکن بشریٰ [illegible] رہ جائیں کو وہ گھر کے کسی کونے سے نہ پکڑ سکی۔ تب ماں سر میں خاک ڈالتی [illegible] سے باہر نکلی اور صحن میں [illegible] کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑی۔ ابا اچانک سوتے سے جاگ پڑے۔ انہوں نے [illegible] آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

"یہ یہ کیا ہوا تمہیں؟" پھر انہوں نے روتی ہوئی فرخندہ کی طرف دیکھا پھر گھبرا کر سوال کیا: "بشریٰ کہاں ہے؟" یہ سوال [illegible] طرح کیا گیا تھا، جیسے خطرے کی اطلاع وہ بہت پہلے کی دیکھ چکے ہوں۔

بشریٰ کے جانے کے بعد گھر کی فضا یکسر بدل گئی تھی۔ گھر پر ہر وقت ایک سوگوار سا سناٹا چھایا رہتا۔ [illegible] کے ساتھ گھر میں سایوں کی طرح چلتے پھرتے۔ [illegible] اور خاموش [illegible] کسی [illegible] میں ایک دوسرے سے [illegible] ماں کو دیکھ کر ابا کی آنکھوں میں [illegible] ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے کو کوئی الزام دینا چاہتے ہیں [illegible] مگر پھر وہ خاموشی کے [illegible] رہ جاتے ہیں۔ اور فرخندہ سوچتی [illegible] تو گھر کی کڑی فضا میں شاید کوئی خوشگوار تبدیلی آ جائے [illegible]

ایک دن فرخندہ کو کالج سے آنے میں دیر ہو گئی۔ جب وہ آئی تو ابا اور [illegible] بیٹھے ہی ابا نے کڑے لہجے میں پوچھا: "اتنی دیر کہاں رہی؟"

"بس گھڑی لگ گئی تھی۔" یہ مختصر سا جواب دے کر وہ جلدی سے کمرے میں آ گئی [illegible] تھا۔ اور سب سے زیادہ تو اسے یہ بات ناگوار گزری تھی کہ [illegible] کی پیشانی کی شکنیں [illegible] کی نہایت ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کم از کم اس معاملے میں [illegible]

تھوڑی ہی دیر بعد ابا کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے [illegible]

" [illegible] دم گھٹ کر رہ گیا۔ [illegible]

[illegible] کسی بیتی تھی [illegible]

بہت سے بدوں جیسی ہو گئی تھی [illegible]

اپنے کمرے کی [illegible] کے مطلب [illegible] کے میدان [illegible] ہو جاتے [illegible]

چیزوں کو ٹال کر اس کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ وہ جب کبھی گھر آتی یا کھانے پر چلی جاتی تو اس کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے وہاں کے [illegible] دیتیں۔ وہ بشریٰ نہیں تھی، پھر بھی اسے بشریٰ [illegible] وہ عجیب سی [illegible] اور بے بسی محسوس کرتی تھی۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی اسے بشریٰ بن جانے پر مجبور کر رہا ہے۔ وہ کیوں نہ بشریٰ بن جائے۔ مگر پھر وہ ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک دیتی۔ [illegible] ہو سکتا ہے۔ [illegible] اور بشریٰ میں زمین آسمان کا فرق ہے [illegible] ثابت کر [illegible] بشریٰ کے لئے نفرت محسوس کرتی۔ [illegible] بیٹھنے خیالات کی [illegible] تھی۔ کئی بار اسے بشریٰ پر غصہ بھی آتا۔ اس کے [illegible] تھی۔ [illegible] کے لئے ٹکڑوں کے [illegible] اس پر [illegible] تھے۔

[illegible] بابا سائیکل پر [illegible] چھوڑنے جاتے۔ پھر سائیکل پر [illegible] واپس آتی۔ [illegible] دیکھ رہی تھی کہ بابا [illegible] جا رہی تھی۔ اور [illegible] ہوتی جا رہی تھی۔

کبھی [illegible] وقت کوئی [illegible] سائیکل کے نیچے [illegible] مضطربانہ [illegible] کر مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے تو اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگتے۔ اسے یوں لگتا جیسے [illegible] کے قریب [illegible] کا تصور کر رہے ہیں۔ [illegible] ہو جاتے تو وہ بالکل [illegible] ہو جاتی۔ بعض اوقات تو اسے محسوس ہوتا جیسے اسے [illegible] کیا جا رہا ہے۔ اسے کہا جا رہا ہے کہ وہ بشریٰ ہے اور اسے اپنے جرم کا اقرار کر لینا چاہئے۔ بعض اوقات تو یہ احساس اتنا شدید ہوتا کہ اسے یوں لگتا جیسے کسی عدالت کے [illegible] صاف صاف کہہ دے گی۔ [illegible] کر جاتی ہوں۔ [illegible] سے محبت ہے [illegible] کے ساتھ بھاگ جانے کا [illegible] کر لیا ہے۔ لیکن [illegible] کام آتی اور وہ یکدم [illegible] کو سنبھال لیتی۔

شروع شروع میں [illegible] صورت [illegible] لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ [illegible] حالت [illegible] ہو گئی۔ اب کبھی وہ [illegible] کوئی فرمائش کرتی [illegible] سے جواب دیتیں۔ بس [illegible] فرمائش پوری کرنے کا [illegible] نہیں رہا۔ [illegible] بہت چاؤ [illegible] کر کے دیکھ لیا۔ یہ باتیں اسے ناگوار گزرتیں۔ [illegible] بشریٰ کے برابر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کچھ [illegible] رفتاری سے دن رات گزرنے لگے۔ [illegible] بعد [illegible] محسوس کی۔

اس دن [illegible] تھیں اور بابا [illegible] سائیکل [illegible] کہیں غائب ہو گئے تھے۔ ———— شام کو جب

وہ وقت گزارنے کو اماں خود کے گھر نشستوں کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانا نکالتے نکالتے وہ یکدم برس پڑیں۔

• "کہاں چلے گئے تھے آپ؟" انہوں نے کیا جیرح کی طرح پوچھا۔

• "کیوں کیا کوئی ضروری کام تھا؟" بابا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

• "کہا جو تھا آج کچھ عورتیں آ رہی ہیں، آپ کہیں نہ جائیں" اماں نے جل کر جواب دیا۔

• "عورتوں سے میرا کیا کام؟" ابا بھولے بن رہے تھے۔

• "عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے اور بے وقوف منہ کے بل گر کر بھی ہوشیار نہیں ہوتا" اماں نے استعارہ استعمال کیا تو ابا یکدم بھڑک اٹھے "پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

• "میں کیا کہوں گی، دنیا کہتی ہے کہ اس آدمی نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔ لیکن آپ یاد رکھو زخندہ کو میں اس کنوئیں میں گرنے دوں گی۔ اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

• "اپنی اولاد کا برا کون چاہتا ہے۔ تم سے زیادہ مجھے فکر ہے۔ مگر میرا کہاں سے آئے گا؟ رشتے ہو جاتے تو شادی کا بھی انتظام کریں گے۔ ہماری کون سی دس اولادیں بیٹھی ہیں۔ ایک اکیلی لڑکی کو بھی بیاہ نہیں سکتے؟" ابا خاموش ہو رہے لیکن اس کے بعد ابا اور اماں کے درمیان اکثر جھگڑے ہونے لگیں اور وہ سمجھ گئی۔ آج سے دو سال پہلے کا ناٹک دہرایا جا رہا ہے۔ وہ اپنے اس چھوٹے سے بند کمرے کی دائرے کھڑکی میں بیٹھی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ خوف تھی کور میں آتیں اور اسے ڈبلا دال کی طرح دکھایا جاتا۔ پھر بھاؤ تاؤ ہوتا اور آخر میں تان ادا پر ٹوٹتی جو بعد میں کہیں غائب ہو جاتے۔ اسے نہ باپ پر غصہ تھا نہ اماں سے شکایت وہ بشری نہیں تھی زخندہ تھی، ایک خاموش تماشائی۔

اور پھر ایسا ہوا کہ اماں کی دو سال کی کوششیں رنگ لائیں۔ اس کی منگنی ہو گئی۔ دولہا محمد یوسف ادھیڑ عمر خوب صورت بڑا تھا جس کی مجرگ میں ذاتی کوٹھی تھی اور شاندار نوکری تھی۔ زخندہ کی قسمت پر ہر کسی کو رشک آ رہا تھا۔ ابا کی صحت بھی شادی کی چاہیے۔ ابا جو کل تک سرد مہری کا اظہار کرنے پہلے ہونے تھے، شادی کے دن کو قریب آتا دیکھ کر وہ بھی سستی جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چیزوں کی خرید و فروخت میں وہ صبح گھر سے نکلتے تو شام ہی کو واپس آتے۔ اماں نے سونے کے بعد ہی ابا نے اپنی بساط سے بڑھ کر جہیز تیار کر دیا تھا۔ صبح سے شام تک چیزیں ڈھوتے ابا کی کمر ٹیڑھی ہو جاتی۔ شام کو تھک ہار کر بیٹھتے تو بار بار ناک سے ہانپنے لگتے یا پھر بیٹھے بیٹھے لمبی لمبی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے۔ ان دو چار مہینوں میں جیسے وہ اور بوڑھے ہو گئے تھے۔ چندیا کے بال جھڑ گئے تھے۔ اور جو تھوڑے بال چندیا کے کناروں پر تھے وہ بھی سفید ہو گئے تھے۔ گالوں اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ گردن کا گوشت لٹک گیا تھا۔ جیسے نٹ پڑے ہیں ویسے ہو گئے تھے۔

ایسا کیا کیا ہے۔ زخندہ جب بھی کچھ سوچتی اسے بشری یاد آ جاتی اور وہ اپنے آپ کو بشری سمجھ کر ایک نئی طرح محسوس کرتی۔ پانچ سال سے اس گھر کسی نے یاد نہ کیا تھا۔ اس کا نام تک کسی کی زبان پر نہ آتا تھا۔ پھر بھی زخندہ کو محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تک اس گھر پر بشری کا تسلط قائم ہے۔ وہ جا کر بھی نہ گئی۔ اس کی چھاپ پانچ سال سے یہیں تھی

پلاٹنگ دیکھا ... انہیں وہاں سے ہٹا دینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی بیٹوں کے غم میں پڑے ہوئے تھے
احساس جب اس کے بیٹوں کی محبت پر تمام کر رہی تھی ان کے بڑھتے ہوئے خاموشی آ رہی تھی یہ سب باتیں فرخندہ کے لیے پہلے
ہی بھاری تھیں۔ وہ اس گھر میں تنہا جیسے رہنے کی بجائے آپ کو بشریٰ کے سامنے بے بس و مجبور محسوس کرتی۔ شادی کے اس عرصے
میں ابھی تک اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ پھر ایک دن اماں نے یہ بات چھیڑ دی۔
" شادی یا بشریٰ کو نہیں بلاؤ گے " ؟ اماں نے چاول کی چھان پھٹک کرتے ہوئے بات چھیڑ دی۔
ابا نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے چمک سی آئی۔ لیکن پھر فوراً ہی ان کا چہرہ کچھ بجھ کر
بے جان اور بے حس ہو گیا۔ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔
فرخندہ کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی کام چھوڑ کر وہ بہانے سے کمرے کے سامنے سے گزری۔ ابا کا سوکھا ڈھانچہ کرسی پر ڈھیر
تھا اور وہ سامنے کی دیوار کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں پھنسا ہوا سگریٹ دھوئیں کے ساتھ سلگ رہا تھا۔
ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد ابا کے روزمرہ کے معمولات میں بڑی یکسانیت آگئی تھی۔ صبح سویرے اٹھنا، بازار
سے ضروری اشیا مثلاً دودھ دہی، سبزی گوشت وغیرہ لانا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لمبی تان کر سو جانا۔ یا اپنا پرانا کھڑکھڑاتا ہوا
سائیکل لے کر باہر نکل جانا۔ شام کو کسی دکان پر جا بیٹھنا اور رات گئے تک بیٹھے گپ شپ میں مشغول رہنا اور رات کا کھانا کھا کر سو
جب سے بشریٰ گئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتے۔ جیسے وہ بشریٰ کے خیال سے
ڈر گئے ہوں۔ اور یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے کبھی بشریٰ کے متعلق سوچا نہ تھا۔ بشریٰ ان کے دل کے بند کواڑوں کے پاس پانچ سال سے
کھڑی سسک رہی تھی۔
اماں نے ذکر چھیڑا تو اچانک انہیں محسوس ہوا جیسے بند کواڑ خود بخود کھل گئے ہیں اور بشریٰ بے دھڑک اندر آگئی ہے اب جب
وہ اپنی سوچوں سے پوچھتے انہیں یہ جان کر صدمہ سا ہوتا کہ ان کی سوچ کا مرکز سوائے بشریٰ کے اور کچھ نہ تھا۔ بشریٰ ان کی سوچوں
جیسے دھنستی جا رہی تھی۔ کسی ریت کے کھیت یا پتھر کے بت کی طرح جو ہونے نہ ہونے کے نکالے نہ نکلے۔
یہ انہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا وہ غرور، وہ شان وہ اونچی لمبی ناک کیوں خاک میں ملتی جا رہی تھی۔ لیکن بشریٰ کو ذہن سے نکالنا
دینا ان کے اختیار میں نہ رہا تھا۔ ان کے دل پر پڑی مضبوط گرہیں خود بخود کھلتی جا رہی تھیں۔
بازار میں یا پارک میں کھیلتے ہوئے ننھے بچوں کو دیکھتے تو انہیں عجیب محسوس ہوتا۔ جیسے ان کے ماضی ہاتھوں کی گرفت والے
کسی نرم نرم اور میٹھی میٹھی چیز سے لگ رہے ہیں۔ چلتے چلتے وہ بے دھیانی میں رک جاتے۔ اور جب وہ چونکتے تو کسی چیل والے یا مٹھائی والے
کی دکان پر کھڑے ہوتے۔
" کیا چاہیے جانی صاحب ؟" دکاندار کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ وہ جھک کر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھتے جیسے ان کا کچھ کھو گیا
ٹھیک اسی وقت کوئی ان کے کان کے پاس تالی بجا کر دور بھاگ جاتا، چھپ جاتا، کہیں گم ہو جاتا۔
" صاحب کا کچھ کھو گیا ہے " دکاندار کی دوسری تمسخر آمیز آواز انہیں بالکل پریشان کر دیتی۔

"تھی —— ہاں —— ہاں —— نہیں نہیں کچھ نہیں کھویا، کچھ بھی تو نہیں کھویا" وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے جاتے پارک کے نزدیک پہنچ کر وہ پھر ٹھٹھک جاتے۔ فٹ پاتھ پر اب بھی فوٹوگرافر اپنا اڈہ جمائے تھے۔ پس منظر کے لئے کالے نقشین پردے تانے کرسیاں بچھائے، کیمرے رکھے وہ گاہکوں کے انتظار میں سگرٹ پھونکتے رہتے۔

"یہاں بیٹھ جاؤ بشریٰ!" کندھوں سے اچک کر وہ بشریٰ کو کرسی پر بٹھا دیتے۔

"ذرا بھی پھر ہو جائے فیروزن فوٹو" وہ کیمرہ مین سے کہتے۔

"ایسی تصویر اتاروں گا کہ جناب کی طبیعت خوش ہو جائے" کیمرہ مین پیچھے پیچھے دانت نکوستے کیمرہ فٹ کرنے لگتا۔

"صاحب تصویر کھنچوائیے گا" وہ چونک پڑتے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ فوٹوگرافر کو کیا جواب دیں۔ پھر وہ احمقانہ انداز میں سر کو جھٹکتے۔ "نہیں بھئی اب کون سی غرض رہ گئی ہے تصویر کھنچوانے کی۔ بس یوں ہی ذرا دیکھنے کو کھڑا ہو گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں" فوٹوگرافر سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر سگرٹ پھینک دیتا۔ وہ کچھ دیر تک اس سے [illegible] دیکھتے پھر یوں چلتے جیسے پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہو۔

گھر میں بھی عجب مصیبت ہو گئی تھی۔ بہت سی چیزوں نے ایکدم سامنے آ کر انہیں ستانا شروع کر دیا تھا۔ [illegible] کی الماری میں پڑی ہوئی تصویریں، کتابوں اور رسالوں سے لبالب بھرا بک ریک، بہت سی چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر انہیں بشریٰ یاد آ جاتی۔

بشریٰ کا خیال انہیں ستاتا رہا اور وہ بشریٰ کے اس اقدام کے اسباب و نتائج پر غور کرتے رہے اور اس [illegible] بشریٰ کے تصور کا موازنہ کرتے رہے۔ ان کا تصور کیا تھا۔ لیکن ان کا تو تصور کچھ نہ تھا بشریٰ ہی [illegible] تھی وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر وہ جلد باز تھی۔ وہ نفسیات کی چند کتابیں پڑھ کر اپنے آپ کو [illegible] سمجھنے لگی تھی۔

ایک دن دوپہر کو کمرہ بند کر کے انہوں نے مقفل صندوق سے وہ خط [illegible] سب سے پہلے بشریٰ [illegible] تھی۔ کسی نام کسی القاب کے بغیر لکھا تھا۔

"آج جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ میں اس گھر میں کبھی [illegible] مجھے ہمیشہ [illegible] سمجھا [illegible] ہے۔ میں اپنے باپ کی احسان مند ہوں [illegible] مجھے [illegible] محبت کی۔ لیکن مجھے افسوس [illegible] ہو گئی۔ وہ میری زندگی [illegible] چاہتی ہوں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] یہ خط پڑھ کر [illegible] [illegible] تھی جس کی صحت میں ان کی شبیہ تھی وہ [illegible]

لاتعلقات چند ہاتھ ہی ... کسی صحت کی طرح وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے علاوہ کے کھانے کے لئے بھی نہ سوچتے بچے پڑھنے کے لئے حرکت کرنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیا تھا۔ اور جب بچے وہ عورتوں کی کمرے میں ملنے آتیں تو انہوں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ ان کے دل میں بشریٰ کے لئے نفرت اور غصے کے سوا کچھ نہیں رہا۔

لیکن اس دن جب انہوں نے وہ پرچہ نکال کر پڑھا تو انہیں بشریٰ پر دکھ کی بجائے غصہ آیا اور صدمہ پہنچا۔ انہیں بشریٰ چھوٹی سی معصوم سی خود سر اور ضدی لڑکی نظر آئی جس نے محض اپنی ضد اور خود سری میں اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور اب وہ پچھتا رہی تھی۔ ان سے ملاقات ہو کر اور سر ... کرنے میں شرم ... چند نظروں سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ جب آ گئی اور اس کو ستائیں ان کے چہرے پر بجلی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"پگلی نہیں لی وہ تو ... آ جائیں گے۔"

مگر جب یہی بات انہوں نے ماں سے کہنے کی کوشش کی تو ان کا حلق خشک ہو گیا۔ اور ہونٹ سن ہو کر رہ گئے۔ اور انہوں نے اپنی اونچی خاندانی ناک میں ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ بھلا وہ یہ بات اس طرح کھلم کھلا کس طرح کر سکتے ہیں۔ وہ انتظار میں رہے شاید ماں پھر یہ ذکر چھیڑیں تو وہ سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ لیکن ماں خاموش تھیں۔

تو یہی لگتے وہ گھر میں جمع ہوتے بڑے بچے تھے۔ اور فرخندہ خاموشی سے گھر میں چلتے پھرتے یا بند کھڑکی والے کمرے میں چپ چاپ بیٹھے حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہتی۔ تنہائی اور گھر وحشی ہوتی ویران اور خالی آنکھوں میں اچانک کسی کا انتظار آ بسا تھا۔ وہ اجاڑ کمرہ ویسی آنکھیں گھر کے کونے کونے میں کسی کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ لیکن ماں خاموش تھیں۔ دوسری رشتہ داروں میں سے بھی کسی نے بشریٰ کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ ابا اداس اور ... تھے۔ اور فرخندہ ویران تھی۔

شادی میں دو ایک دن ہی رہ گئے تھے کہ ایک دن ماں نے فرخندہ سے کہا۔

"اے بیٹی یہ اپنے کمرے کو ذرا ٹھیک تو کر لے۔ جو بھی آئے گا اندر جھانکے گا۔ باہر نکال دے۔ بیٹھنے کو کوئی ستھری جگہ تو ہو۔" ماں کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے فرخندہ ٹھٹک گئی۔ اسے بشریٰ کی چیزوں کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کشمکش و رنج میں رہنے کے بعد آخر کار اس نے کمرہ صاف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اس نے ریک کو صاف کیا۔ فلمی رسالے اور سستے ناول نکال کر اس نے باہر صحن میں پھینک دیئے اور ان کی جگہ انگلش اور اردو کے چند معیاری ناول سجائے۔ جو بشریٰ کی الماری میں رکھی ہوئی تصویر ... کر نیا میز پوش بچھایا۔ اور اس پر ایک خوبصورت سا چھوٹا ٹیبل لیمپ رکھ دیا۔ نیلی چادر والا بستر چارپائی بھی وہاں سے ہٹا دی اور کھڑکی کے قریب بڑا پلنگ بچھا کر اس پر نیا بستر لگایا۔ نیا تکیہ۔ نئی کاڑھی ہوئی چادر۔ دیواروں پر سے بشریٰ کے ہاتھ سے لگائے ہوئے کیلنڈر اور تصویریں اتار کر نئی تصویریں اور کیلنڈر لگائے۔ صرف ایک تصویر کو ہٹانے کی وہ ہمت نہ کر سکی۔ یہ ایک گول مٹول سرخ کپڑوں میں ملبوس بچے کی تصویر تھی۔ موٹے موٹے سیب کی طرح سرخ سفید گال۔ بچے پانیوں جیسی نیلی اور گہری آنکھیں بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ اس تصویر کو دیکھ کر اسے اچانک بشریٰ کے بچے کا خیال آیا۔ کیا اس کا بچہ بھی ایسا ہی سرخ سفید اور موٹا ہو گا۔ فرخندہ کا دل ان دیکھے بچے کی محبت سے بھر گیا۔ تبھی اسے خیال آیا کہ اس نے سنا تھا کہ بشریٰ کا بیٹا ہے۔

اس نے زمین پر گری ہوئی بشریٰ کی تصویر کو اٹھا کر دیکھا۔ بشریٰ مسکرا رہی تھی۔ فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔
اس نے دوپٹے کے پلّو سے تصویر کو صاف کیا اور پھر چپکے سے اُسے اپنے بکس میں چھپا دیا۔

فرخندہ اس نئے کمرے میں کرسیوں کی ترتیب کو ٹھیک کر رہی تھی کہ آبا اچانک اخبار پڑھتے ہوئے اندر آ گئے۔ فرخندہ کو یوں لگا جیسے وہ محض بہانے سے اندر آئے ہیں۔ فرخندہ نظریں نیچی کئے کسی مجرم کی طرح کرسیاں اِدھر سے اُدھر کرتی رہی۔ نہ جانے اُسے کیوں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

"اخبار — آج کا اخبار کہاں ہے۔" اُن کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ انہوں نے گھومتی سی ایک نظر کمرے میں ڈالی۔ جھک کر میز پر سے لیمپ کے قریب پڑی ہوئی تصویر اٹھائی۔

"اوہ!" تصویر انہوں نے فوراً نیچے رکھ دی۔ یہ بشیر کی تھی۔

فرخندہ نے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

آبا کی پھیکی، ویران اور بے رونق آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ انہوں نے باری باری جھک کر پلنگ اور ریک کو دیکھا۔ بشریٰ کی تمام نشانیوں اور یادوں کو مٹا دیا گیا تھا۔ اب وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے دیکھ کر بشریٰ بے اختیار یاد آ جائے۔

"اخبار نہیں ہے یہاں؟" انہوں نے جیسے وہاں بے مقصد کھڑے رہنے کی وجہ پیش کی۔ پھر باہر جانے کو مڑتے ہوئے اچانک ان کی نظر بند کھڑکی پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹک گئے۔ انہیں وہ وقت یاد آیا جب اس کمرے کی کھڑکی کے پاس بشریٰ بڑے شوق سے بیٹھی الّم غلّم رسالے پڑھا کرتی تھی اور وہ خود صحن میں نیم کے نیچے بان کی کھاٹ پر بیٹھے اس کی ان حرکتوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھایا کرتے تھے۔ بشریٰ انہیں اس کھڑکی کے بہت نزدیک بہت قریب محسوس ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر فرخندہ کی طرف دیکھا پھر ان کے تھرتھراتے ہونٹوں کو جنبش ہوئی:

"اماں سے چابی لے کر یہ کھڑکی کھول دو۔"

نقوش

اگر آپ زیادہ صاحب ذوق ہیں

تو

آپ بیتی نمبر ۲

ڈی لکس ایڈیشن منگوائیے

(بیحد خوبصورت۔ مجلّد اور کرافٹ کاغذ۔ قیمت ۔ دس روپے)

طاہر نیوز ایجنسی۔ ... روڈ۔ کراچی

کھلے خط

طفیل صاحب تسلیم

میں نقوش کے شماروں میں [illegible] جو [illegible] ہے [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] جواب [illegible] کی [illegible] نقوش کی [illegible] اشاعت میں [illegible] غالب [illegible] متعلق [illegible]

ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] ہے۔ [illegible] سے [illegible] غالب [illegible] کی [illegible] کے [illegible] ۔ [illegible] غالب [illegible] کی [illegible] غالب کی [illegible] ہے :

مرزا غالب کی [illegible] غالب [illegible] ۔ غالب [illegible] ۔ غالب [illegible] غالب [illegible] ۔ [illegible] یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ [illegible] پیش آیا تھا جو انہوں نے [illegible] کے متعلق [illegible] کسی طرح [illegible] کیا [illegible] شاید یہ ہے کہ [illegible] ۲۱ اگست [illegible] اور [illegible] ۔ [illegible] کیونکہ [illegible] کی [illegible] ۲۱ اگست [illegible] اور [illegible] میں [illegible] صاحب [illegible] تھا [illegible] کے مطابق تھی۔

مہر صاحب کے بیان میں ایک تضاد اور بھی ہے ان کا خیال ہے کہ مرزا صاحب کو [illegible] یا اس کے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنیاد خود ان ہی کے بیان کے مطابق "[illegible] اخبار" [illegible] کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ اول تو یہی باور کرنا مشکل ہے کہ [illegible] سے تقریباً سو برس پہلے [illegible] جلدوں کی [illegible] مکاتبات سے ہر روزہ خبریں مل جاتی تھیں اس سے قطع نظر کر کے بھی [illegible] جب کہ ایک [illegible] صاحب نے

اسعد خاں کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ "دہلی ۱۵ جمادی الثانی سے شروع ہوا ہے" اس کا
مطلب یہ ہے کہ آئندہ بیان جو شروع ہوا خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الثانی کو پہنچی گئی تھی ظاہر ہے
کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اسی تاریخ کا یا اس سے قبل کا ہوگا۔ بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔
جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کی پندرہ تاریخ ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے۔ لہٰذا مرزا صاحب کی
گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونی چاہیے۔ اخبار "فوائد الناظرین" جلد ۲، نمبر ۱۰، مورخہ ۳۱ مئی
۱۸۴۷ء میں دہلی کی خبروں کے تحت یہ عبارت درج ہے۔ "۲۵ مئی کو بیچ مکان مرزا نوشہ
اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی چنانچہ کوتوال صاحب یہ خبر پا کر وہاں گئے اور
چلکہ مرزا صاحب کو مع اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب
دیکھنا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے حق میں کیا حکم دیتے ہیں۔" یہ واضح ثبوت ہے اس امر
کا کہ مرزا صاحب کی گرفتاری ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء مطابق ۹ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ کو عمل میں
آئی تھی۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ شاہ نصیر کے ایک شاگرد [illegible] دہلوی (متوفی
بقول مرتب دیوان ۱۲۹۶ھ و بقول گارساں جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ و [illegible]) نے اس
واقعہ کے متعلق ایک قطعہ تاریخ لکھا ہے اور قطعہ کے ساتھ نثر میں واقعہ کی بابت پر
روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مادہ ہائے تاریخ سے بھی ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء نکلتے ہیں۔ نثر
کی عبارت یہ ہے

مرزا نوشہ شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب متخلص بہ غالب [illegible]
کو توال دہلی کو ناحق عداوت ہو گئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کروا دیا، جس کی
تاریخ مندرجہ ذیل نکالی گئی۔

سر و کد سے فضل میں [illegible] ہے
[illegible]
تعلق غالب [illegible]
دل [illegible]
[illegible]
سر باز [illegible]
اسد کو [illegible] ہے

[illegible]

حوالے [illegible] کے انہیں بہت [illegible] گرفتار کر کے قید کر لیا بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے اور عدالت میں برأت کے ساتھ گئے مگر قید ہو گئی۔

ایک روز مرزا اس صاحب [illegible] قید یا جیل کو خاک کرتے کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے اور حال دریافت کیا آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

چپرا ہے کہ ہم خوردۂ زنجیر بلا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا (کلام جامی ۱۲۲ صفحہ)

اس بیان سے چار امور بتصریح واضح ہو جاتے ہیں (۱) کوتوال کا نام (۲) گرفتاری کی تدبیر (۳) مرزا صاحب اور اُن کے رفقاء کے ساتھ پولیس کا غیر شریفانہ سلوک (۴) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۵) اور جس سے سفارش کی گئی تھی اس کا تعین (۶) مرزا صاحب کے ایک شعر کی وضاحت اور چونکہ یہ معاصر بیان ہے ہم اس سے خود مرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تائید اور بعض کی تصحیح کر سکتے ہیں۔"

یہ حاشیہ ہے جو محترم عرشی صاحب نے اپنی کتاب مکاتیب غالب میں غالب کی حراست کے واقعہ پر لکھا اس وقت میرے سامنے مکاتیب غالب کی تیسری اشاعت ہے جو ۱۹۴۳ء میں ہوئی۔ دوسری اشاعت ۱۹۴۰ء میں ہوئی ہے اس میں یہ حاشیہ کچھ مجمل ہے، پر موجود ہے بہر حال اگر ہم ۱۹۴۳ء کے تفصیلی حاشیہ کو ہی پیش نظر رکھیں تو بھی ڈاکٹر نارنگ کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ غالب کی حراست کے سلسلہ میں خاص واقعہ اب تک پیش نہیں کیا گیا کیونکہ پندرہ برس پہلے عرشی صاحب تو مکاتیب غالب کی تیسری اشاعت میں دے دیا ہے۔

سب سے غالب کی حراست کے متعلق ڈاکٹر نارنگ کے اخذ کردہ نتائج تو وہ بھی تقریباً وہی ہیں جو مکاتیب کی اس اشاعت میں پیش کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ڈاکٹر نارنگ جیسے "کتاب خور" کی نظر سے یہ کتاب نہ گزری ہو۔ بہر حال میں اس سلسلہ میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ نقوش کے محترم قارئین کو غلط فہمی سے بچانے اور ڈاکٹر نارنگ کی اصلاح کے لیے آپ مناسب طریقہ اختیار کریں۔

میرے اپنے خیال میں عرشی صاحب نے قطعے کے ساتھ نثر اپنے اشعار کی تفہیم کے لیے لکھی ہے کیونکہ جب تک کوتوال کو رستے میں [illegible] ہو جانا اور جوتی چلنے وغیرہ کا واقعہ معلوم ہو کہ کوتوال کا "دشمن [illegible]" ہو جانا اور اسد کو جوتیوں سے گھیر کر زنداں میں ڈالنا" یہ سب مطلب چیستاں رہ جاتے ہیں۔

توقع ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ والسلام۔

مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۶۱ء

مائل یزدانی

"نقوش" کا تازہ شمارہ موصول ہوا اور اس میں "فراق کا تغزل" نامی مضمون پڑھ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی[1] نے ایک ساتھ بہت سی باتیں چھیڑ دی ہیں اور جا بجا ایک بھی نہیں ڈھونڈ پائے۔ فراق کی شاعری کے بارے میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ خود ان کے مضمون پر صادق آرہا ہے اور وہ یہ کہ اس طرح پر ______ کے مضمون کا مطالعہ کرتے وقت صاحب ذوق کے ذہن کو یہ شاید کھٹکتے ہیں اور ذوق و شعور کو متوازن رکھنا آسان نہیں رہ جاتا۔ اسے پڑھ کر طبیعت کچھ اس طرح برہم ہوتی ہے کہ مضمون کی معقولیت پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔" یہاں پر مضمون نگار نے خود اپنے طور پر بہت سے مفروضے تیار کر لیے اور اس کی بنیاد پر فراق کے تغزل کی کاٹ چھانٹ شروع کر دی۔ وہ شاید یہ بھول گئے کہ فراق نے بیسویں صدی میں شاعری کی ہے بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں نہیں۔ غالب کا دور ایک الگ دور تھا اور فراق کا دور ایک الگ دور ہے۔ غالب کے دور پر فارسی اور عربی کی چھاپ تھی اور ان دونوں زبانوں کے پیچھے عرب کا ایران کا کلچر تھا۔ چنانچہ اس وقت کی شاعری میں اس کلچر کی خوبیاں اور خامیاں دونوں موجود ہیں۔

مغل شہنشاہ کے ہاتھوں سے فرمانروائی گئی اور انگریزوں کے سر پر تاج سروری آیا۔ اب اردو پر انگریزی زبان اور انگریزی کلچر کی چھاپ پڑنے لگی۔ ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کے بعد ہی اقبال جیسی شخصیت نے جنم لیا۔ انھوں نے اردو شاعری پر نگاہ ڈالی اور اپنی فکر کو تولا۔ اب ان کے سامنے سوائے بغاوت کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ بغاوت کو انھوں نے اپنا کر اردو کو نئے نئے موضوعات دیے۔ ان موضوعات پر [illegible] اگر وہ غالب کو [illegible] تو شاید غالب [illegible] جیسے ڈاکٹر مغنی نے فراق کی شاعری سے منہ بگاڑا ہے۔

انگریز گئے اور ملک کو آزادی ملی۔ اردو شاعری اب نئے موڑ پر تھی۔ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اسے ہندی زبان کا بھی اثر قبول کرنا تھا۔ اس بات کو تو سب ہی لوگ مانتے ہیں کہ فراق نے انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت زبانوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان زبانوں سے فائدہ اٹھائے گا اس کی [illegible] دونوں زبانوں کے [illegible] اور [illegible] کے رنگ پھولوں کا بھی اثر پڑے گا۔ فراق کا لکھا ہوا "سراپا" [illegible] ہے۔ [illegible] ضرور پڑھ جانا چاہیے۔ جو "سراپا" لکھا گیا ہے انھوں نے "چاندنی" [illegible] ہوتی ہے [illegible] (ملک محمد جائسی کی آنکھ بچپن میں چیچک کی وجہ سے جاتی رہی تھی) [illegible] جائسی نے "پدماوتی" کا جو "سراپا" لکھا۔ وہ ان کی پدماوت [illegible] چھپی ہوئی کتاب کے [illegible] ہندی [illegible] سے ترجمہ کر کے دے رہا ہوں:

بال

"اس کے بال مشکی بھونرے کے ہیں اور وہ مشک [illegible] ہے

---

[1] عبدالمغنی صاحب پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی کے شعبہ میں [illegible]

[illegible] جیسے [illegible] ہیں
جب مسکرا کر بولتی ہے تو ——
[illegible] ہے :

ناک

اس کی ناک ایسی ہے جیسے قمر کی دمدار پر نور
کوئی آسمان جیسے چوٹی پر رکھ دیا گیا ہو
اور اس ناک میں جو موتی پڑ دیے گئے ہیں
وہ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے جنت میں گنگا .

بھوں

سیاہ بھویں مثل کالے کے [illegible] ہیں
جس طرف اٹھتی ہیں ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں .

پلک

پلکوں کا کیا بیان کروں ——
گویا وہ خود ہی آپس میں تیر اندازی کر رہی ہیں
گویا علم اور ستاروں کی فوج جنگ کے لیے تیار ہے
دونوں پتلیاں بیچ میں سکندر کی طرح [illegible] ہیں .

ہونٹ

اس کے منہ نے جنت کو دیکھ کر آب حیات سے بھی
[illegible] نے چھلکا بند کر دیا ——
گویا دو پیر کی طرح ان ہونٹوں کا مکھ مست ہے
وہ جب باتیں کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں .

دانت

دانتوں کا شمار موتیوں کی طرح ہیں
دانتوں پر مسی ملی ہوتی ——
جیسے بادلوں کے نیچے بجلی کی چمک .

سینہ

اس کا سینہ مثل تھالی کے ہے جس میں دو [illegible] ہیں
جیسے سونے کے لٹو کاٹ کر رکھ دیے گئے ہیں
جیسے بھونرا اپنا نقش کلی پر چھوڑتا ہے .
جس طرح اس کی کلیاں انگیا سے نکلا چاہتی ہیں .

پیٹ

اس کے پیٹ کی شکنیں مثل صندل کے ہیں
جو مکھ اور صورت پر مثل زعفران کے ہیں
پیٹ کے رونگٹے مثل کالے ناگ کے ہیں
جو ناف سے نکل کر سینے کی طرف مائل ہیں .

ناف

اس کی ناف مثل گرداب بلندی کے ہے
اس کا سامنا وہ کرے جس کی قسمت اچھی ہو .

ران

اس کی دونوں رانیں اس طرح ہیں ——
جیسے کیلے کے دو سڈول پیڑ .

شب وصل کے بیان میں تو جانکی، تن من اور [illegible] کے چشم دید گواہ ہو جاتے ہیں :

آنکھ کھل گئی اور منہ سے ہونے بال بکھر گئے
انگیا ریزہ ریزہ ہو گئی اور بند ٹوٹ گئے
چوڑیاں بالیاں اور کنگھی سب ٹوٹ گئے
بدن کا صندل آگ کی تپش اور قشقہ ختم ہو گیا . ([illegible] . پدماوت . [illegible])

مثال کے طور پر یہی موضوع سنسکرت میں دیکھیے:

بارش کے دو قطرے پاروتی کی پلکوں سے بہہ کر آنکھوں پر آئے اور آنکھوں سے نکل کر اس کے ناچشیدہ ہونٹوں تک پہنچے۔ گلاب جیسے ہونٹوں کو چوم کر وہ قطرے گردن تک پہنچے اور پھر کچھ اور نیچے کھسک کر ———— نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

[کمار سمبھو۔ کالیداس]

کلام جوش دیکھیے:

زیرِ دامن سینہ میں وہ موسیقیِ بے صوت ۔۔۔ یہ شکر ریز ہونٹوں کی ہے گلزار بداماں
قامت ہے کہ کہسار پہ اٹھتا ہوا دھواں ۔۔۔ جوبن ہے کہ ہے چشمۂ خورشید میں طوفاں
ہر جنبشِ اعضا میں چھلکتے ہیں صد جام ۔۔۔ ہر گردشِ دیدہ میں کئی گردشِ دوراں

پہلے دونوں نمونے ہندی اور سنسکرت ادب کی روایتیں ہیں اور وہ بھی ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ڈاکٹر صفی لکھنوی بجا طور پر عورت کے سراپا کی بیان غیر تصویری کہتے ہیں۔ اب دیکھیے جوش نے سراپا کیا کہے ہیں:

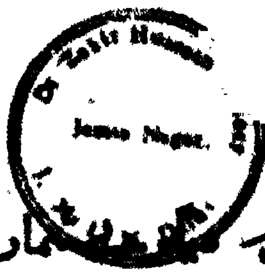
ہمارے یہاں کے مثنوی نگاروں نے کچھ "سراپا" ایسے مقرر کر رکھے ہیں وہ سادہ اور گوشت پوست کی عورت کو دیکھ کر ہم بیرحمی سے یا شکر تسنیم کا لیبل لگا کر انھوں نے پردے کے اندر والی "عورت" کو دیکھا اور اس عورت کا روشن چہرہ کپڑے میں شاپنگ کرتی ہے۔ کب میں رقص کرتی ہے، فیکٹری میں کام کرتی ہے، ہسپتال میں تیمار داری کرتی ہے اور عدالتوں میں وکالت کرتی ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ذوق کے "سراپا" میں جس پیمانے کی "متحرک عورت" کی تصویر ہوگی وہ اور نسیم والی عورت کی تصویر کیسا نہیں۔ یہ بیان والی عورت "آؤٹ آف ڈیٹ" ہے۔ اس زمانے کے عورت جسے بیان پر لوگ مشکل ہی سے بحث کریں گے اور اس شاعر کو بھی قابل ہے اکثر اس پر بیٹھک دیں گے۔ ذوق کے "سراپا" والی عورت تو نازک اندام والی عورت ہے جو ذی حیثیت گھرانے کی، رنگ محل میں بیٹھنے والی اور پردہ نشین ہے اور پھر یہ ذرا تصویر لفظی ہے۔ اس بات کو دیکھ کر دونوں اصنافِ قدیم وقت نے یہی فکر ڈاکٹر صفی نے عورت کی بیان سے مختلف انداز کر کے ان دیکھنے والوں کی نظر میں اصلیت تک پہنچا ہے۔ "عورت میں اس کا اظہار انداز دیکھ دلنشیں ہے۔" لہٰذا ذوق نے اپنی عورت پر اپنی شاعرانہ صفت سنواری۔

حبیب اللہ حبیب

سکول یونیفارم ۔ بب ۔ فیڈر ۔ سن سوٹ

تحفہ سیٹ (PRESENT SETS)

نیکر بش شرٹ ۔ پارٹی فراک



اور بے شمار اشیاء



ہمارے
بڑا مرکز

بچوں کے
ریڈی میڈ کپڑوں

۴۵-کمرشل بلڈنگ مال روڈ

لاہور - فون نمبر ۶۲۰۶۲

چلڈرن
ڈریس کمپنی

دین

برانچیں:- ۱۳۶-انارکلی - لاہور • ۲/۴۲-ایڈورڈ روڈ - راولپنڈی (فون)

نقوش

کے سابقہ نمبر

		صفحات
۱ - غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲ - افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳ - مکاتیب نمبر	اُردو خطوط کی سو سالہ تاریخ	۱۰۲۸
۴ - شخصیات نمبر	مشاہیر ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵ - طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶ - لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷ - ادب عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸ - آپ بیتی نمبر	خود نوشت حالات! چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴

---

۹ - پطرس نمبر	: پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۶۴۰
۱۰ - منٹو نمبر	: منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱ - شوکت نمبر	: شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۶۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر — ناولٹ نمبر — پنج سالہ نمبر

دس سالہ نمبر — خاص نمبر [illegible] — سالنامے

نقوش

کے سابقہ نمبر

			صفحات
۱	غزل نمبر	اُردو غزل کی پونے دو سو سالہ تاریخ	۷۵۲
۲	افسانہ نمبر	اُردو افسانے کی ڈیڑھ سو سالہ تاریخ	۱۰۹۰
۳	مکاتیب نمبر	اُردو خطوط نگاری کی سو سالہ تاریخ	۱۰۴۸
۴	شخصیات نمبر	مشاہیر ادب کی سو سالہ شخصی تاریخ	۱۵۱۴
۵	طنز و مزاح نمبر	طنزیہ و مزاحیہ ادب کی سوا سو سالہ تاریخ	۹۲۸
۶	لاہور نمبر	لاہور کی نو سو سالہ مستند مگر جامع تاریخ	۱۲۰۴
۷	ادب عالیہ نمبر	نقوش کی دس سالہ تخلیقات کا انتخاب	۱۲۷۲
۸	آپ بیتی نمبر	خود نوشت حالات، چار سو سالہ شخصی تاریخ	۱۹۶۴
۹	پطرس نمبر	پطرس کے سارے ہی مضامین کے ساتھ فن اور شخصیت پر مکمل کام	۴۴۰
۱۰	منٹو نمبر	منٹو کے منتخب افسانوں کے ساتھ فن اور شخصیت پر بھرپور کام	۳۸۴
۱۱	شوکت نمبر	شوکت کی اہم مزاحیہ تخلیقات کے ساتھ فن اور شخصیت پر دلچسپ کام	۴۲۴

اور ان کے علاوہ :-

آزادی نمبر — ناولٹ نمبر — پنج سالہ نمبر
دس سالہ نمبر — خاص نمبر اور — سالنامے

نقوش کے یہ نمبر دوبارہ چھپ رہے ہیں اگر ان میں سے
کسی نمبر کی ضرورت ہو تو آج ہی آرڈر بک کرا دیں۔